بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

جولائی 2016

سالگرہ نمبر

July 2016

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض
مدیرہ — رخسانہ جمیل
مدیر منتظم — آذر ریاض
مدیرِ اعزازی — امت الصبور
فوٹوگرافی وژن — شاہین رشید
اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

عید مبارک

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

جولائی 2016
جلد 30 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91، بی 1، ای، بی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com
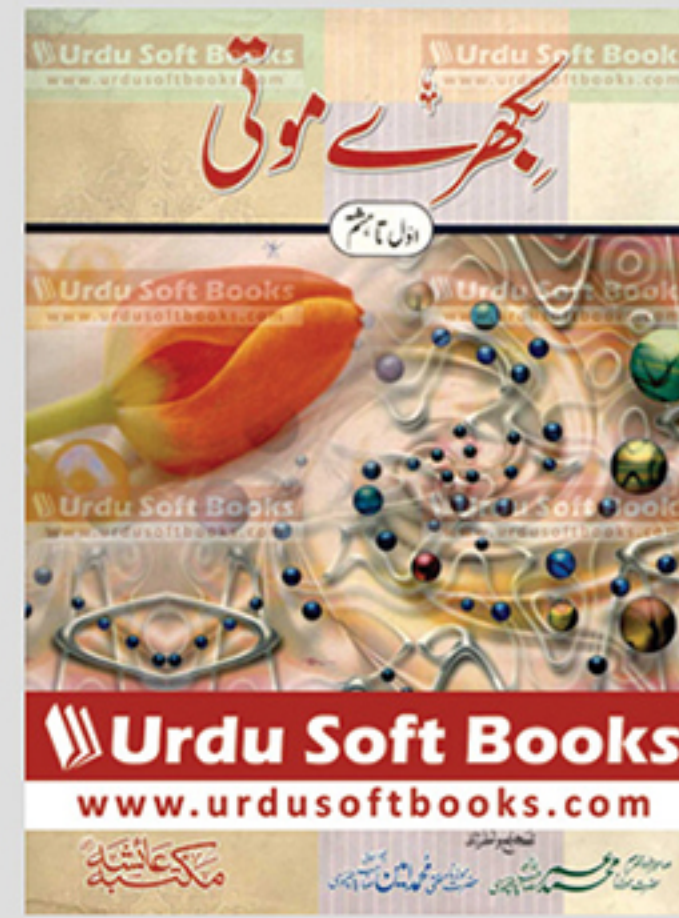
رضیہ جمیل

پہلی شعاع
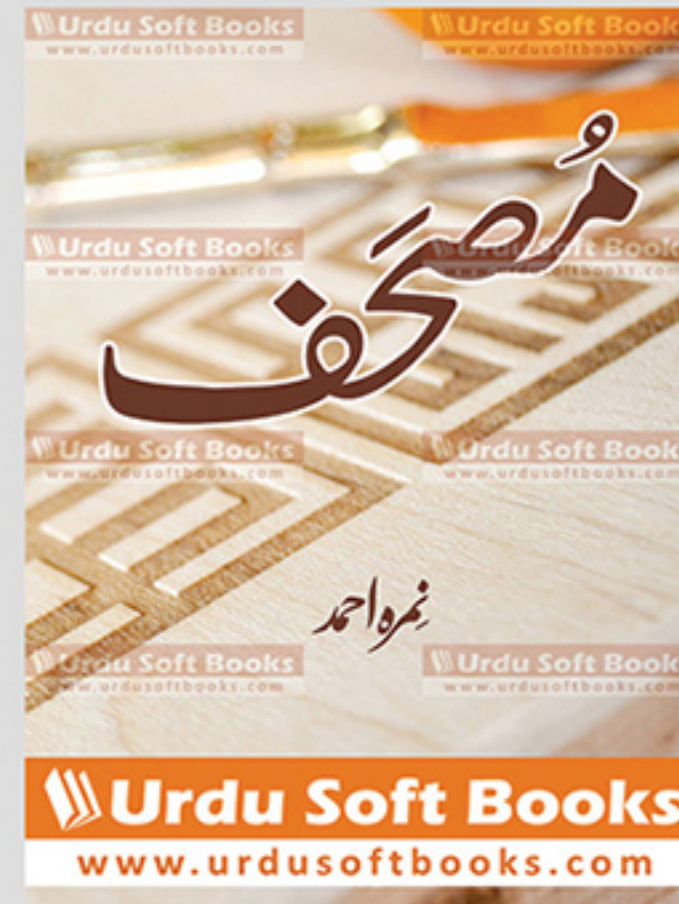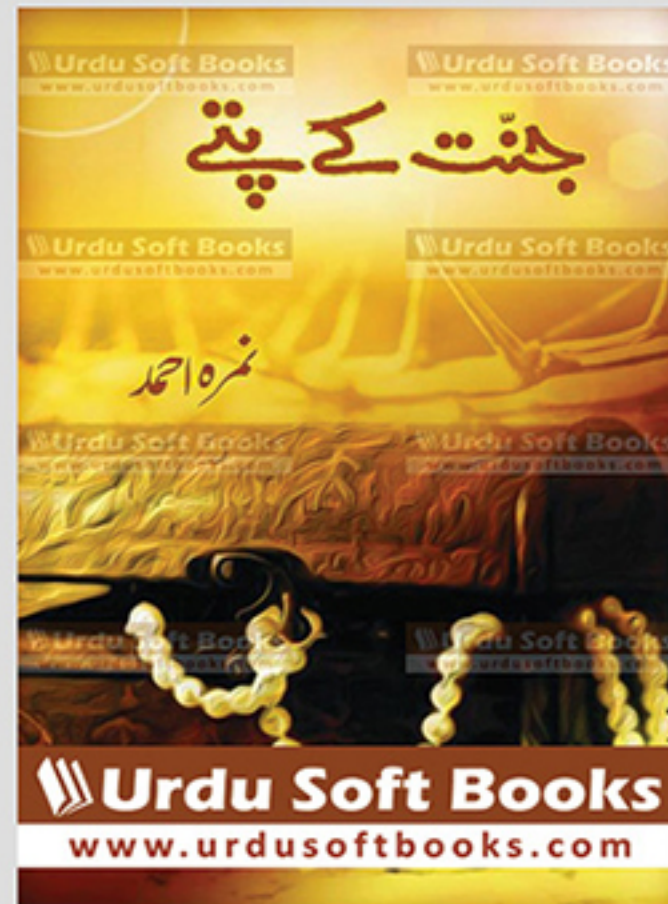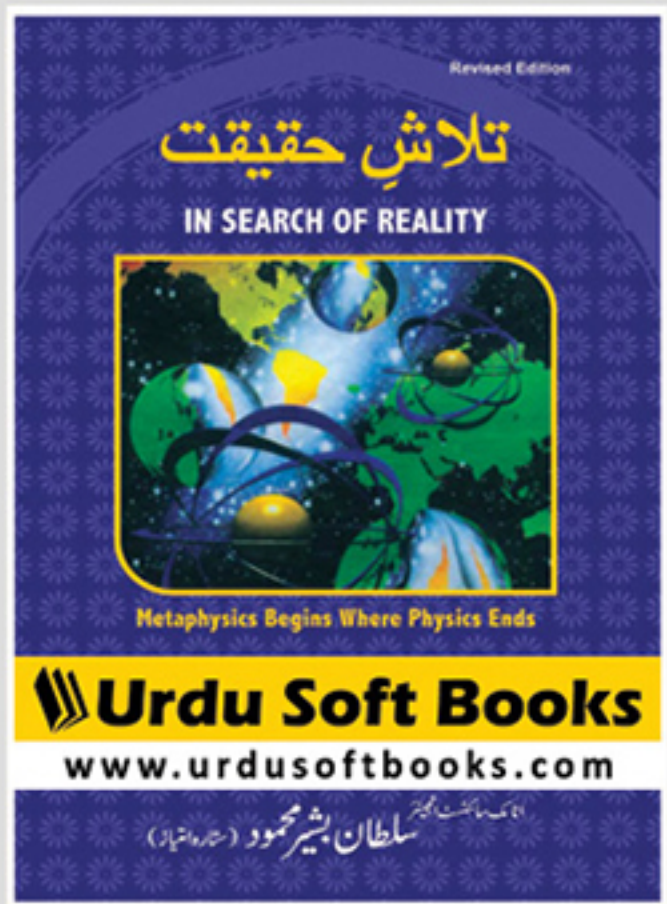
شعاع کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

عیدالفطر ہمارا مذہبی تہوار ہے، جسے تمام دُنیا کے مسلمان جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ مشرقی روایات اس تہوار کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ صبح صبح اُٹھ کر تیار ہونا، بزرگوں کو سلام کر کے ان سے دُعائیں لینا، بچّوں کو عیدی دینا، مہمانوں کی خاطر تواضع، مہندی، چوڑیاں، خوبصورت ملبوسات، صاف ستھرا بارونق گھر اور تتنے نئے پکوان سے سجا دسترخوان اس تہوار کا حسن بھی یہی اور اہتمام بھی۔ ایسے میں کچھ روٹھے بھی خود بخود من جائیں اور دل صاف کر کے گلے لگ جائیں تو عید کی خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔

قارئین کو ہماری جانب سے دلی عید مبارک۔

اس دُعا کے ساتھ کہ عید کا دن آپ کے لیے حقیقی خوشیاں لے کر آئے۔ آپ کے دل شاد و آباد اور آپ کے دسترخوان ہرے بھرے رہیں۔ آمین۔

سالگرہ نمبر۔ سروے،

اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمرِ عزیز کے 31 سال پورے کر لیے ہیں۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ ایک خصوصی سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ کیا آپ سالگرہ مناتی ہیں؟ تحفہ دینے اور لینے کی روایت کیسی لگتی ہے؟

2۔ کہانی کار کہانی لکھتے ہوئے کبھی کبھی ایسے جملے لکھ جاتا ہے جو آفاقی سچائی کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی جملہ جو آپ نے شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں پڑھا؟

3۔ شعاع میں شائع ہونے والی کوئی تحریر جس نے آپ کی شخصیت یا زندگی میں تبدیلی پیدا کی ہو؟

اس شمارے میں،

- پیال ساز۔ ایمل رضا کا مکمّل ناول،
- من دیپک، راگ محبت۔ امۃ العزیز شہزاد کا مکمّل ناول،
- صدف آصف، بدیع الجمال اور صائمہ اکرم کے ناولٹ،
- عطیہ خالد، شازیہ الطاف ہاشمی، نرگس نایاب کھوکھر، شازیہ سحاب، سعدیہ اصغر، عائشہ رباب، رابعہ افتخار شیخ اور رفعت سحر کے افسانے،
- عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- شادی مبارک ہو۔ نعیمہ ناز کے قلم سے بھائی کی شادی کا احوال،
- محبتوں کا پیام ہے عید۔ معروف شخصیات سے سروے،
- روشن ہے عید کا چاند۔ قارئین سے سروے،
- دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

جولائی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

راہی ہیں سب، منزل تُو
اکمل تُو ہے، کامل تُو

سو خوشیاں اس پر قربان
ہو جس غم کا حاصل تُو

ہر کشتی کا تُو نگراں
سب موجوں کا ساحل تُو

سب دروازے کھلتے جائیں
جس جانب ہو مائل تُو

سورج میں ہے دھوپ تری
ہر تارے کی جھلمل تُو

جو بھی، جس رستے سے آئے
سب رستوں کی منزل تُو

ہم ہی تجھ سے غافل ہیں
کب ہے ہم سے غافل تُو

امجد اسلام امجدؔ

نورِ سراپا خُلق مجسّم
وہ ہیں عروجِ ابنِ آدم
صلی اللہ علیہ وسلّم
صلی اللہ علیہ وسلّم

ان کے قدم سے اہلِ زمیں کی
اہلِ فلک کی قسمت جاگی
ان کی نظر ہے دین کا پرچم
صلی اللہ علیہ وسلّم

ان کے قدوم با برکت سے
ذرّے تارے بن کر چمکے
کون و مکاں کے نیّرِ اعظم
صلی اللہ علیہ وسلّم

دُنیا کی تقدیر سنواری
لی عقبیٰ کی ذمّہ داری
دونوں جہاں ہیں ان سے منظّم
صلی اللہ علیہ وسلّم

نور بانو محجوب

ادارہ

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

قرآن کریم پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ "قرآن (کثرت سے) پڑھا کرو، اس لیے کہ قیامت والے دن یہ اپنے (پڑھنے والے) ساتھیوں کے لیے سفارشی بن کر آئے گا۔"

(مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں قرآن کریم کی تلاوت اور اس پر عمل کرنے کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ عمل کے بغیر محض خوش الحانی سے پڑھ لینے کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہوگی۔

2۔ سفارشی کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کو قوت گویائی عطا فرمائے گا اور وہ اپنے قاری اور عامل کے گناہوں کی مغفرت کا اللہ سے سوال کرے گا، جسے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا، جیسا کہ دوسری روایات میں ہے۔

سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "قیامت والے دن قرآن کو اور ان لوگوں کو جو دنیا میں اس پر عمل کرتے تھے (بارگاہ الٰہی میں) پیش کیا جائے گا۔ سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران ان کے آگے آگے ہوں گی، اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گی۔" (مسلم)

فائدہ

بارگاہ الٰہی میں قرآن کریم اور خاص طور پر مذکورہ سورتیں اپنے پڑھنے والے اور ان پر عمل کرنے والے کے لیے سفارش کریں گی اور رب تعالیٰ سے اصرار و تکرار کر کے ان کی مغفرت کروائیں گی۔

بہتر شخص

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو قرآن سیکھے اور اسے سکھلائے۔"

(بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں قرآن کریم کی تعلیم و تعلم یعنی خود سیکھنے اور دوسروں کو اللہ کی رضا کے لیے سکھلانے کی فضیلت ہے۔

2۔ عصر حاضر میں قرآن مجید اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے اکثر و بیشتر ان خاندانوں کے بچے ہوتے ہیں جو مالی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور کئی لوگ ان طلبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس حدیث میں ایسے لوگوں کے لیے تنبیہہ ہے کہ یہ قرآن پڑھنے والے سب سے افضل لوگ ہیں۔

3۔ دینی تعلیم سے وابستہ علماء اور طلبہ کو بھی اپنی قدر و منزلت پہچاننی چاہیے۔ خودداری اور وقار کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔

دگنا اجر

"جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور (صحت کے ساتھ) قرآن کریم پڑھنے میں ماہر ہے تو وہ (قیامت والے دن)

بزرگ، نیکو کار فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو قرآن اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اس کے پڑھنے میں اسے مشقت ہوتی ہے، اس کے لیے دگنا اجر ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائدو مسائل

1۔ ماہر سے مراد قرآن کریم کا حافظ اور تجوید و حسن صوت سے پڑھنے والا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت کے الفاظ اور ان کی تبویب سے واضح ہے۔

2۔ دوسرا وہ شخص ہے جو حافظ نہیں ہے اور تجوید و حسن صوت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ اس لیے قرآن فصاحت و روانی سے نہیں پڑھ سکتا، لیکن اس کے باوجود ذوق و شوق سے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور پڑھنے میں جو مشقت ہوتی ہے، اسے برداشت کرتا ہے، اس مشقت کی وجہ سے اسے دگنا اجر ملے گا۔

3۔ سفرۃ سے مراد وحی پہنچانے والے فرشتے ہیں۔ یہ سافر کی جمع ہے۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے معنی کیے ہیں صلح کرانے والا۔ فرشتوں کو بھی، جو اللہ کی وحی اور اس کی طرف سے تادیب لے کر اترتے ہیں، ان سفیروں کی مثل قرار دیا گیا جو لوگوں کے درمیان صلح کرواتے ہیں۔

(صحیح البخاری تفسیر سورہ عبس)

قرآن پڑھنے والا

"اس مومن کی مثال جو قرآن کریم پڑھتا ہے، ترنجبین (نارنگی، سیب) کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور ذائقہ بھی۔ اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا، کھجور کی سی ہے کہ اس کی خوشبو نہیں لیکن ذائقہ میٹھا ہے۔ اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، خوشبو دار پودے (جیسے نازبو، یاسمین وغیرہ) کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی ہے لیکن ذائقہ تلخ ہے۔ اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا، اندرائن (تمہ) کی طرح ہے جس کی خوشبو بھی نہیں اور اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہے۔ (بخاری و مسلم)

1۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا حافظ اور اس پر عمل کرنے والا مومن تو خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل کی طرح عند اللہ بھی مقبول ہے اور لوگوں میں بھی اس کی عزت ہے اور جو مومن حافظ قرآن نہیں ہے، تاہم قرآن کا عامل ہے، اللہ کے ہاں اور لوگوں کی نظروں میں یہ بھی اچھا ہے اور قرآن پڑھنے والے منافق کا ظاہر اچھا ہے لیکن باطن گندا اور تاریک ہے اور آخر میں اس منافق کا ذکر ہے، جو قرآن نہیں پڑھتا، اس کا ظاہر و باطن ناپاک ہے۔

2 اس میں حاملین قرآن کے لیے یہ وعظ ہے کہ ان کا اخلاق اچھا ہونا چاہیے اور ان کا کردار خوش ذائقہ پھل کی طرح ہونا چاہیے جو اپنے کاٹنے والے کو بھی برابر مزا دیتا ہے۔

عزت اور ذلت

"اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو سرفراز فرمائے گا اور اسی کی وجہ سے دوسروں کو ذلیل کردے گا۔" (مسلم)

فائدہ

سرفراز، اللہ کے حکم سے وہی ہوں گے جو قرآن کے احکام کو بجالائیں گے اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کریں گے اور اس کے برعکس کردار کے حامل لوگوں کے لیے بالآخر ذلت و رسوائی ہی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو اللہ نے ابتدائی چند صدیوں میں ہر جگہ سرخرو کیا اور انہیں سرفرازیاں عطا کیں۔ کیونکہ وہ قرآن کے حامل اور عامل تھے اس پر عمل کی برکت سے وہ دین و دنیا کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن مسلمانوں نے جب سے قرآن کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کو اپنی زندگی سے خارج کردیا، تب ہی سے ان پر ذلت و رسوائی کا عذاب مسلط ہے۔ (کاش! مسلمان دوبارہ قرآن کریم سے اپنا رشتہ جوڑیں تاکہ ان کی عظمت رفتہ بحال ہوسکے۔)

رشک کرنا

"صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن عطا کیا۔ (اسے حفظ کرنے کی توفیق دی۔) چنانچہ وہ اس کے ساتھ رات اور دن کی گھڑیوں میں قیام کرتا ہے۔ (اللہ کی عبادت کرتا ہے۔) اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا' وہ اسے (اللہ کی راہ میں) رات اور دن کی گھڑیوں میں خرچ کرتا ہے۔"

سورہ کہف

"ایک شخص سورہ کہف پڑھ رہا تھا' اس کے پاس ہی ایک گھوڑا دو رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس شخص کو ایک بادل نے ڈھانپ لیا' وہ بادل اس کے قریب ہوتا تھا اور اس کا گھوڑا بادل کو دیکھ کر اچھلنے کودنے لگتا۔ جب صبح ہوئی تو وہ آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یہ سکینت تھی جو قرآن کی وجہ سے (تجھ پر) نازل ہوئی (اللہ کی خاص رحمت تیرے اطمینان قلب کے لیے نازل ہوئی۔)"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

تلاوت قرآن پر اس طرح بادل کی ظاہری صورت میں سکینت کا نزول ایک خرق عادت واقعہ (کرامت) ہے' جس میں کسی نیک بندے کے اپنے اختیار کا دخل نہیں ہے' بلکہ یہ اللہ کی مشیت پر منحصر ہے۔ اسی لیے یہ اصول مسلمہ ہے کہ معجزے یا کرامت سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا' نہ اس سے اس قسم کا کوئی استدلال کرنا ہی جائز ہے' جیسے اہل بدعت کرتے ہیں اور سادہ لوح عوام کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں۔

نیکیاں

"جس شخص نے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کا ایک حرف پڑھا' اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے۔ میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے' بلکہ الف ایک حرف ہے' لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔" (یہ تین حرفوں سے مرکب ہے اور دس ضرب تین' یعنی 30 نیکیاں پڑھنے والے کو ملیں گی۔) (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے' اس کی سند حسن صحیح ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر قرآن کا مفہوم نہیں سمجھتا لیکن تلاوت کرتا ہے تو ایسا شخص بھی ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ اور جو شخص تلاوت بھی نہیں کر سکتا اسے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔

☼ ☼ ☼

ویران گھر

"بے شک وہ شخص جس کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ (یاد) نہ ہو' ویران گھر کی طرح ہے۔"
(اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ اس کی سند حسن صحیح ہے۔)

بلند درجہ

"روز قیامت" صاحب قرآن (قرآن پڑھنے والے اور اسے حفظ کرنے والے) سے کہا جائے گا۔ (قرآن) پڑھتا جا اور (درجے) چڑھتا جا اور اس طرح آہستہ آہستہ تلاوت کر جیسے تو دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا' چنانچہ تیرا مقام وہ ہو گا جہاں تیری آخری آیت کی تلاوت ختم ہو گی۔)
(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں قرآن کریم کے حافظ اور کثرت سے تلاوت اور اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کی فضلیت کا ذکر ہے۔

2۔ چڑھنے سے مراد جنت کے درجوں پر چڑھنا ہے۔ یعنی جتنا قرآن یاد ہوگا اسی حساب سے وہ ترتیل سے پڑھتا جائے گا اور جنت کے درجات پر فائز ہوتا چلا جائے گا۔3۔ قرآن کی تلاوت اور اس کے حفظ کرنے کی ترغیب ہے تاکہ وہ جنت میں حفظ قرآن کی بدولت زیادہ سے زیادہ بلند درجات حاصل کرسکے۔

قرآن بھول جانا

"اس قرآن کی حفاظت (دیکھ بھال) کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! یہ (قرآن سینوں سے) نکل جانے میں اس اونٹ سے زیادہ تیز ہے جو رسی میں بندھا ہوا ہو (اور اسے کھول کر بھاگ نکلنے والا ہو۔)"

(بخاری و مسلم)

فائدہ

قرآن کریم کی حفاظت اور دیکھ بھال کا مطلب ہے کہ پابندی سے اس کی تلاوت کی جائے، ورنہ غفلت کی صورت میں انسان اسے اتنی تیزی سے بھولتا ہے کہ اتنی تیزی سے اونٹ بھی رسی تڑا کے نہیں بھاگتا۔ یہ تیزی سے بھول جانے کی تشبیہ ہے۔

حافظ قرآن

"حافظ قرآن کی مثال رسی سے بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے۔ اگر وہ اس اونٹ کا خیال رکھتا ہے تو وہ (اپنے کھونٹے سے) بندھا رہتا ہے اور اگر اسے کھول دے گا تو چلا جائے گا۔"

(بخاری و مسلم)

اس میں ان والدین کے لیے بھی سبق ہے، جو بچوں کو حفظ کروا کر اسکول میں داخل کروادیتے ہیں اور پھر وہ قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ اسی طرح منزل یاد کیے بغیر جلدی حفظ کرنے والے حضرات کے لیے بھی تنبیہ ہے۔

خوش الحانی سے پڑھنا

"اللہ تعالیٰ کسی چیز کے لیے اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح وہ اس خوش آواز پیغمبر کے لیے کان لگاتا ہے جو قرآن کو غنا کے ساتھ اونچی آواز سے پڑھتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اللہ تعالیٰ کان لگا کر توجہ سے سنتا ہے، یہ جہاں ایک طرف اس کی رضا اور قبولیت کی دلیل ہے، وہاں دوسری طرف اس کی ایک صفت (کان) اور اس سے سننے کا بیان ہے۔ جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ تاہم ہم اس کی کیفیت بیان کرسکتے ہیں، نہ اسے کسی کے ساتھ تشبیہ ہی دے سکتے ہیں۔ 2۔ غنا کے ساتھ پڑھنے کا مطلب گانے کی طرح تکلف اور تصنع سے پڑھنا نہیں ہے، جیسے آج کل کے بہت سے قاری بالخصوص مصر کے بعض قراء پڑھتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب تجوید و حسن صوت کے ساتھ ایسے سوز سے پڑھنا ہے جس سے رقت طاری ہو۔

اس میں خوش آوازی اور سوز سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ حرفوں کی ادائیگی اس طرح ہو کہ اس میں کمی یا بیشی نہ ہو۔

خوش آوازی

"تمہیں حضرت داؤد کے سروں میں سے ایک سر (خوش آوازی) دی گئی ہے۔"

(بخاری و مسلم)

"اگر تم مجھے دیکھ لیتے جبکہ گزشتہ رات میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ (تو یقیناً "تم خوش ہوتے۔")"

آل داؤد، میں آل کا لفظ زائد ہے، مراد خود حضرت داؤد علیہ السلام ہیں، کیونکہ حسن صوت حضرت داؤد علیہ السلام ہی کو عطا کیا گیا تھا، نہ کہ آپ کی آل کو یا ان

میں سے کسی کو۔ بہرحال حسن صوت بھی اللہ کا ایک انعام ہے جس کو چاہے وہ اس سے نواز دے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں یہ نعمت ملی اور وہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اللہ کا کلام سنا کر اللہ کے دین کی طرف بلاتے ہیں۔ خوش آوازی کو دنیا کمانے کے لیے بے حیائی پھیلانے کا ذریعہ نہیں بناتے، جس کا انجام نہایت برا ہے۔

حسن صوت

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں سورت پڑھتے ہوئے سنا، چنانچہ میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز والا کوئی نہیں سنا۔
(بخاری و مسلم)

خوش آوازی

حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو قرآن کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے، وہ ہم میں سے نہیں۔" (اسے ابو داؤد نے جید سند سے روایت کیا ہے۔)

ہم میں سے نہیں کا مطلب ہے، ہمارے طریقے اور سنت پر نہیں ہے۔ اس میں بھی خوش آوازی اور سوز و رقت سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے، کیونکہ اس سے قرآن کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن سننا

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(اے ابن مسعود!) مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔"

تو میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وہ اترا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اپنے علاوہ کسی اور سے سننا پسند کرتا ہوں۔"

چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورہ نساء کی تلاوت کی، یہاں تک کہ میں اس آیت تک پہنچ گیا۔

"چنانچہ اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب پر اے پیغمبر! تجھے گواہ بنائیں گے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اب تم بس کرو۔" جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
(بخاری و مسلم)

یہ روایت اس سے پہلے باب فضل البکاء من خشیتہ اللہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں اسے اس مقصد سے بیان کیا ہے کہ اس میں اہل علم و فضل کی توقیر و تعظیم کا پہلو ہے۔ نیز دوسروں سے قرآن کی تلاوت سننے اور اس پر تدبر کرنے کی بھی ضرورت ہے، جس طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا۔

مخصوص سورتیں اور آیتیں پڑھنا

حضرت ابو سعید رافع بن معلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"کیا میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی عظیم ترین سورت نہ سکھلاؤں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب ہم مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں تجھے قرآن کی عظیم ترین سورت سکھلاؤں گا؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" یہ سبع مثانی (بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

(بخاری)

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ش - م - الف.....شاہدرہ

س - شادی کب ہوئی؟

ج - میری شادی 2 فروری 1980ء کو ہوئی۔

س - شادی سے پہلے کے مشاغل؟

ج - شادی سے پہلے میں زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھی۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی جبکہ دونوں چھوٹی امی کے ساتھ سبزیاں چننے جاتی تھیں ہم لوگ بہت غریب تھے، والد صاحب مزدوری کرتے تھے، دو بھائی بہت چھوٹے تھے لہٰذا میں گھر کے سارے کام کاج کرتی اور سارا انتظام سنبھالتی تھی۔

س - رشتے میں مرضی؟

ج - یہ رشتہ میری خالہ (جو بعد میں ساس بنیں) نے بڑی منت سماجت سے لیا تھا۔ مگر قدر نہیں کی۔ سراسر میری خالہ اور امی کی رضامندی تھی، میرے والد بھی راضی نہ تھے اور میں تو بالکل بھی راضی نہ تھی کیونکہ میری خالہ تیز طرار تھیں اور میں چاہتی تھی کہ میری چھوٹی بہن کی شادی ادھر ہو جائے مگر قسمت.....

س - جیون ساتھی کے حوالے سے تصور.....؟

ج - اپنے جیسا۔ سیدھا سادا۔ محبت کرنے والا۔ مہربان، ساتھ دینے والا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ملا پڑھا لکھا تھا میٹرک، مگر جاہل بھی ایسے نہ ہوں گے جانوروں سے برا سلوک کیا۔

س - منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج - باقاعدہ کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی بس بزرگوں نے بیٹھ کر بات کی اور ہاں ہو گئی کوئی رسم نہیں ہوئی۔ کوئی انگوٹھی کوئی کپڑے لتے کچھ نہیں، تین ماہ کے بعد شادی طے کر دی۔

س - شادی کے لیے قربانی.....؟

ج - سب کچھ ہی قربان کر دیا۔ اپنے خواب۔ اپنی

آزادی اپنی عزت نفس سب کچھ مگر کوئی صلہ نہیں ملا۔

س ۔ رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا ہوا۔۔۔؟

ج ۔ میرے والد نے کچھ بھی لین دین نہیں کیا حتیٰ کہ نکاح نامے میں حق مہر بھی کچھ نہیں لکھوایا 32 روپے بھی نہیں۔ سوائے میرے نام کے کچھ بھی نہیں نکاح نامے میں۔۔۔

س ۔ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج ۔ گھر ہی نہیں آیا اس رات میرا شوہر (بقول ساس کے اسے شرم آتی ہے)

س ۔ شادی کے بعد خاص تبدیلی۔۔۔؟

ج ۔ شادی کے بعد زندگی مکمل تبدیل ہوگئی میرے گھر کے ماحول اور خالہ کے گھر کے ماحول میں بہت فرق تھا ہم غریب تھے مگر دل کے امیر تھے۔ یہاں سب نے دیسی گھی علیحدہ علیحدہ رکھا تھا وہ بھی چھپا کر۔ ساس سالن نکال کر علیحدہ رکھ لیتی۔ مجھے ہمیشہ ہانڈی کا پیندا ملتا یا بس سل بٹے پر سرخ مرچیں پیستی۔ اس میں تھوڑا سا نمک اور پانی مکس کر کے کھانا کھاتی۔ بیمار ہوتی تو رسک پانی میں ملا کر پیتی' میاں علیحدہ سے کوئی جیب خرچ نہیں دیتا تھا۔ ساری سیلری ماں کے ہاتھ رکھتے۔ ہم وہاں اکٹھے کھانا کھاتے مگر یہاں جو جیسے جیسے آتا کھانا کھاتا۔

س ۔ کتنے عرصے بعد کام سنبھالا۔۔۔؟

ج ۔ کتنے عرصے بعد۔۔۔ مجھے تو ولیمے والے دن ہی سلائی مشین دے کر بٹھا دیا کہ بھانجے کے کپڑے سی دو۔ درزی بیمار ہے۔ مجھے عجیب تو لگا مگر چپ رہی کہ میں اتنی فرینک نہ تھی۔ ہمارے گھر صرف خالہ ہی آتی تھیں کزنز وغیرہ کبھی بھی نہیں آتے تھے۔

س ۔ میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق۔۔۔؟

ج ۔ بہت فرق ہے۔ میری ساس تو کھانا بناتی نہیں تھیں۔ کیونکہ سسر (میرے خالو) بیس سال ہوگئے گھر چھوڑ گئے تھے۔ ایک دیور تھا میرے میاں اور ساس تو بازار سے ہی کھانا آتا تھا۔ مگر میں نے گھر پر ہی کھانا بنانا شروع کیا اور مختلف ڈشز بنا کر کھلائیں۔ کھانے کی تعریف تو سارے کرتے مگر میری حیثیت نہیں تسلیم کی۔۔۔

س ۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف یا تنقید ہوئی؟

ج ۔ سسرال میں تعریف تو ہوئی اور مانتے بھی ہیں کہ میں صلح جو ہوں۔ امن پسند ہوں۔ محبت کرنے والی۔ تنکا تنکا جوڑ کر گھر بنایا۔ کھانے پکانے۔ سینے پرونے میں ماہر ہوں۔ جب بھی کوئی مہمان آتا اسے کھلا پلا کر بھیجتی' پہلے میرے گھر آتے پھر دیور اور دوسرے جیٹھ کے گھروں میں جاتے مگر اس کے باوجود سب نے قطع تعلقی کر رکھی ہے جانے کیوں۔۔۔

س ۔ سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج ۔ سسرال سے تو کوئی توقعات ہی نہیں رکھی کہ وہ میرے کام آئیں۔ ہاں میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی۔ احترام کیا۔ ان کے دکھ سکھ میں کام آئی بلکہ میرے جیٹھ کی بیٹیوں کی شادی ہونے والی تھی تو میں نے دونوں کے جہیز کی چیزیں خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیں' بازاروں میں چکر لگائے بغیر کسی صلے کے۔ مگر جیسے جیسے یہ لوگ مطلب نکالتے گئے مجھ پر تہمت کی بارش کرتے گئے۔

س ۔ پہلے بچے کی پیدائش۔۔۔؟

ج ۔ پہلے بچے کی پیدائش میری والدہ کے ہاں ہوئی۔ کیونکہ گود بھرائی کے بعد وہ مجھے ساتویں مہینے پھر گھر لے گئی تھیں اور پہلا بیٹا ہوا تھا اور میرے میاں بیٹے کی پیدائش کے 6 دن بعد اپنی والدہ (میری خالہ) میری ساس کے ساتھ دیکھنے آئے تھے۔

س ۔ سسرال میں مقام۔۔۔؟

ج ۔ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی گلہ نہیں۔ مگر سب کو مجھ سے شکوے ہیں۔ میاں بیوی کا وہ رشتہ جسے ایک لباس کہا گیا۔ میرے میاں نے اپنے بہن بھائیوں کو پتا نہیں کیا کیا کہا ہے کہ میرے سسرال والے باہر سے میاں کو ملتے ہیں (فیکٹری میں جہاں

میاں کام کرتے ہیں) اور وہاں سے مل کر چلے جاتے ہیں۔ اب اگر کسی کو کسی فنکشن میں بلانا ہو۔ یا کسی کی فوتگی کی اطلاع، فیکٹری میں ہی دی جاتی ہے اور خود ہی نمٹا بھی لیتے ہیں۔ میں نے تو ساس ' نندوں ' دیور جیٹھ سب سے نباہ کرنے اور بنانے کی کوشش کی مگر

اتنی قربانیاں دے کر بھی میں تنہا ہوں بیٹی کماتی ہے اور میں کھاتی ہوں۔

س - میکے اور سسرال میں فرق....؟

ج - بہت زیادہ فرق ہے۔ سسرال سارا پڑھا لکھا۔ مگر جاہل جھگڑالو بدتمیز۔ چھوٹے بڑے آئے گئے کی کوئی عزت نہیں۔ خود غرض اور خوف خدا تک نہیں، آزادی اتنی کہ حد نہیں اور پابندی اتنی کہ بہوویں باہر جھانک بھی نہیں سکتیں۔ آزادی صرف بہنوں کو بھتیجوں کو اور بھانجیوں کو۔

میکہ غریب تھا اور کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ مگر ماں نے بڑوں کی عزت کرنا سکھائی بمہمان نوازی کا سبق پڑھایا۔ قربانی دینا۔ برداشت کرنا۔ صبر کرنا سکھایا۔ خوف خدا کا سبق دیا۔ صلح و امن کا درس دیا....

یہ فرق تھا حالانکہ سسرال خوش حال تھا۔

س - جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ....؟

ج - ہر انسان کی اپنی 'اپنی پسند ہوتی ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ شادی دو لوگوں کی نہیں دو خاندانوں کی ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر وہ ہوتا ہے جو آپ نہ چاہیں۔ مجھے بھرا پرا خاندان اچھا لگتا ہے مطلب جوائنٹ فیملی مگر اس نے ہمیشہ دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا 'دیور کھانا کھاتے وقت اور کپڑے دھلوانے اور استری کرواتے وقت مخاطب کرتا۔ نندیں آتی تو خوب مزے کرتیں۔ کھانے کھاتیں اور ماں کو لگائی بجھائی کر کے لوٹ جاتیں۔

ساس سارا دن گھر سے باہر گزارتی آخر میں ' اکیلی ہی رہ جاتی سارا دن 'پھر بچے اسکول جانے لگے ہم لوگوں کو دیور کی شادی کی وجہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ میں پھر سارا دن اکیلی رہتی۔ بچے بڑے ہوئے تو سوچا کہ

اب گھر میں رونق ہو گی۔ میرا اکیلا پن ختم ہو گا۔ مگر پہلی بہو تیسرے مہینے ہی میاں کو میکے لے گئی اور پھر دوسرے بیٹے کی شادی کر دی کہ پہلی بہو بیٹے کو ہی لے گئی تو چھوٹا بیٹا ہی وفا کرے گا (حالانکہ مجھے بیٹی کی شادی کرنی تھی مگر مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا) تو دوسرے بیٹے کی شادی کر دی اس بہو کے لاڈ پہلی سے

بھی زیادہ اٹھائے۔ مگر یہ پہلی سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔

میں غریب گھر کی بہو لے کر آئی کہ عزت کرے گی۔ خاندان کو باندھ کر رکھے گی۔ مگر ہم نے ساری رسمیں ادا کی۔ اور جہیز کے نام پر ایک پیالی بھی نہ لی۔

حالانکہ میری ساس سگی خالہ تھیں۔ مگر جب میں علیحدہ ہوئی تو اگر ان کی جھاڑو پکڑ کر اپنے کمرے کی صفائی کرتی تو وہ چھین لیتیں میرے ہاتھ سے۔ واش روم میں لوٹا استعمال کر کے اپنے کمرے میں رکھ لیتیں تاکہ مجھے پریشان کریں جب میں واش روم استعمال کروں نماز کے لیے جائے نماز بچھائی تو جائے نماز میرے نیچے سے کھینچ لیتی اور میں سجدے میں گر جاتی تب میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی بہوؤں کے ساتھ ایسا نہیں کروں گی ' ایک مرتبہ سردیوں میں 'میں حاملہ تھی مجھے سردی لگ رہی تھی (ہمت نہ ہوئی کہ ٹرنک سے اپنی رضائی نکال لوں)

میں ساس کی رکھی رضائیوں میں سے ایک لے کر لیٹ گئی تو باہر سے آتے ہی میری ساس نے میرے اوپر سے رضائی اتار لی تھی۔ میں نے تو اپنی بہوؤں کو بڑے لاڈ سے رکھا۔ چھوٹی کو پورے نو ماہ پلنگ سے اترنے نہیں دیا۔ پھر چھلہ بھی لاڈ سے پورا کروایا۔ مگر جب بیٹا بولا تو کفن پھاڑ کر بولا اور میرے منع کرنے کے باوجود علیحدہ ہو گیا۔

اب میری بیٹی کماتی ہے اور میں کھاتی ہوں۔ میاں بھی ساری تنخواہ بہو کو دیتا ہے۔ دعا کریں میری بیٹی کی اچھی جگہ شادی ہو اور اس کا شوہر اس کا قدر دان ہو۔

میں بہو تھی تب بھی اچھی نہ تھی اب ساس ہوں

تب بھی بری ہوں۔ میری تو آزمائش ہی ختم نہیں ہوئی۔ تینوں بیٹوں میں سے ایک بھی میری قدر کرنے والا نہیں۔ (میاں کرتا تو باقی بھی کرتے)

س ۔ شوہر سے تعلقات؟

ج ۔ پورے انٹرویو (تعارف) میں سب سے زیادہ تکلیف دہ سوال صرف یہی ہے۔ ایک لڑکی اپنے سارے رشتوں کو چھوڑ کر آتی ہے اگر اس کی قدر نہ ہو تو زندگی رائیگاں گئی۔

میں نے اپنے میاں کو سر کا تاج سمجھا۔ اس کے آرام کا خیال رکھا۔ آپ یقین کریں گے میرے میاں کی 33 سال بعد دس ہزار تنخواہ اب ہوئی ہے۔ میرے ہاتھ صرف ماہانہ خرچا رکھتے تھے۔ ایک پیسہ بھی اضافی نہیں دیتے تھے اگر مہینے میں ایک بار مہمان آجاتا تو سارا مہینہ گھٹ گھٹ کر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ (جب ساس کا وقت تھا تو ساری تنخواہ اسے دیتے مجھے جیب خرچ نہ دیتے)

اب یہ صورت حال تھی کہ میں تنگ دستی سے نجات پانے کے لیے سلائی مشین سنبھالی۔ ریڈی میڈ کپڑے سیے۔ لوگوں کے پراندے بنائے۔ کروشیے کا کام کیا۔ چارپائیاں بن کر دیں اس کے ساتھ ساتھ چاول جب خام شکل میں ہوتے تو دھوپ میں لگاتار صبح بکھیرے جاتے پھر رات کو سمیٹے جاتے ہیں پھر مشین پر چھڑوا کر چاول اور صاف ٹوٹا علیحدہ کر لیا جاتا ہے۔ میں نے یہ کام بھی کیا' میاں جی سارا منافع رکھ لیتے اور مجھے محنت کے بس چاول دیتے کہ مہینہ نکل جائے گا۔ یہ تمہارے بچوں کا اور تمہارا ہے۔ بندہ پوچھے بچے صرف میرے تھے۔

پھر بچے بڑے ہوئے شادیوں کی باری آئی تب بھی شوہر نے جدھر میں پسند نہیں کرتی تھی ادھر شادیاں طے کیں۔ اور خدا جانتا ہے میں نے ان شادیوں میں دل و جان سے حصہ لیا۔ ہر چیز اچھی اور اعلا معیار کی خریدی۔

سارے ارمان پورے کیے بیٹی کے لیے بنائے کڑھائی والے سوٹ بہو کو لگائے۔ دو' دو ماہ کام پر نہیں لگایا' سارا خرچا میرے شوہر اور بیٹی نے کیا۔ بیٹے کا ایک آنا بھی خرچ نہ کیا اور بہو بیگم تیسرے مہینے ہی میاں کو لے کر الگ ہو گئی' میکے چلی گئی۔ وہ بیٹا اب نہ کبھی عید پر گھر آتا ہے نہ شب برات پر' بلکہ پانچ سال ہو گئے شکل نہیں دکھاتا میاں سے باہر باہر ملتا ہے۔

میں ایسی بیمار ہوئی کہ ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔

میری بیٹی مجھے عمرہ کروانا چاہتی ہے مگر میری دعا ہے کہ اس کی شادی ہو جائے جلد از جلد' گھر کا سارا خرچا اس نے اٹھا رکھا ہے۔ میری ذاتی ضرورتیں وہ بغیر کہے پوری کرتی ہے۔ ہم بیٹے مانگتے ہیں اور بیٹیوں کو تیسرے درجے کی مخلوق' مگر ایسا نہیں ہوتا۔ میری بیٹی انمول ہے۔ میری دعا ہے میری بیٹی کا گھر جلد از جلد بس جائے۔ وہ سکون پائے۔ میرے آنسو صاف کرتی ہے مجھے دلاسا دیتی ہے۔

میری بہوویں پڑھی لکھی نہیں صرف آٹھ' آٹھ جماعتیں پاس ہیں۔ بیٹی سولہ پڑھی ہے۔ مگر سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہے' گھر کی ڈسٹنگ' کوکنگ' سلائی سب کچھ کر لیتی ہے۔

میں نے اسے سارا کچھ سکھایا۔

آج میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میری بیٹی کماتی ہے ورنہ میں کسی سڑک پر رل رہی ہوتی۔ یا لوگوں کے گھروں میں برتن صاف کر رہی ہوتی۔ بیٹے مجھے کیا دیں گے۔ میاں جس کا فرض ہے وہ ہی خرچا نہیں دیتا تو گلہ کس سے کروں؟ آج بہوویں راج کر رہی ہیں۔ میں پھر اکیلی کی اکیلی ہوں بیٹی صبح جاب پر جاتی ہے دوپہر تک میں اکیلی ہوتی ہوں' وہ آتی ہے تو گھر میں کچھ رونق آتی ہے۔ انسانوں کے رویوں کو ہم قسمت کا لکھا کہہ دیتے ہیں۔ مگر اللہ سب دیکھنے والا ہے وہ لمحے لمحے کا حساب کرنے والا ہے۔

عید سروے

کتنی ہی مہنگائی ہو جائے' کتنا ہی ہاتھ تنگ ہو جائے۔ افطار میں "فروٹ چاٹ" "چنے چاٹ" اور پکوڑوں کا اہتمام تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح چاہے سارا سال نئے کپڑے' نئے جوتے نئی جیولری استعمال کریں گے مگر پھر بھی عید کے تینوں دنوں کے لیے نئے کپڑوں اور دیگر نئی چیزوں کا اہتمام تو کرنا ہی ہو گا..... کیونکہ عید کے معنی "خوشی" کے ہیں اور خوشی کا اظہار تو لازمی کرنا پڑتا ہے.....

اور پھر عید اور رمضان کون سا بار بار آتے ہیں۔ سال میں ایک بار ہی تو آتے ہیں' بھلے روزے رکھیں نہ رکھیں مگر عید تو منانی ہے' آخر ہمارا مذہبی تہوار ہے۔

اس عید پر فنکاروں سے کیے گئے سوال۔

1۔ عید کی خریداری میں آپ کا بجٹ کتنا متاثر ہوتا ہے؟

2۔ عید کا دن کس طرح گزارتی/گزارتے ہیں' سو کر یا ٹی وی پر پروگرام دیکھ کر؟

مسکراہٹوں کا پیامبر عید

شاہین رشید

عاصم محمود (آرٹسٹ)

1۔ کافی متاثر ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف آپ اپنے لیے چیزیں خرید رہے ہوتے ہو بلکہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی خریدتے ہو۔ تو میں عید سے پہلے اس بات کے لیے ذہن کو تیار کر لیتا ہوں کہ کس طرح خرچ کرنا ہے کہ زیادہ خرچ بھی نہ ہو اور ضرورتیں بھی پوری ہو جائیں۔ سال میں دو بار ہی تو عید آتی ہے۔ بڑی عید اور چھوٹی عید..... تو بڑی عید کے بڑے خرچے اور چھوٹی عید کے چھوٹے خرچے..... تو جیب تو ڈھیلی رکھنی ہی پڑتی ہے۔

2۔ عید کے دن نہ ٹی وی دیکھتا ہوں اور نہ ہی سوتا ہوں..... گھومتا پھرتا ہوں۔ دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ اپنے پرستاروں سے ملتا ہوں۔ سیلفی بنواتا ہوں۔ تو بس اس طرح عید کے تینوں دن گزر جاتے ہیں۔

ناہید شبیر۔ (آرٹسٹ)

1۔ ایک تو رمضان پھر شوٹ۔ تو مصروفیات بے حد

ڈھیروں دیگر چیزیں۔۔۔۔ ہم ساری بہنیں سارا دن ہی کچن میں مصروف رہتی ہیں۔ اور تینوں دن مزے کرتے ہیں۔ بڑے بھائی کے گھر بھی جاتے ہیں۔ تو بس خوب انجوائے کرتے ہیں اور اپنی عید کو یادگار بناتے ہیں۔

ناجیہ بیگ۔۔(حسب حال فیم + آرٹسٹ)

1۔ عید کا بجٹ تو میرے خیال سے سب کا ہی متاثر ہوتا ہوگا۔ مگر پھر بھی جس کے پاس جتنی گنجائش ہوتی ہے' وہ اسی حساب سے خرچ کرتا ہے۔ اپنی جیب دیکھ کر اندازہ لگالیتے ہیں کہ ہم کتنا خرچ کرسکتے ہیں۔۔بے شک بجٹ متاثر ہوتا ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔

2۔ عید کا دن میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ جیسے چچا' پھپھیاں' خالائیں وغیرہ۔ ان سے جاکر ملاقات کرتے ہیں اور میں پہلے دن عید ملنے جاتی ہوں۔ اگلے دن جب مہمان آتے ہیں تو پھر کھانے وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ تو اس طرح عید کے تینوں دن گزر جاتے ہیں۔

محمد جنید۔(اینکر + نیوز کاسٹر)

1۔ بجٹ تو خواتین کا متاثر ہوتا ہے۔ میرے بجٹ زیادہ ہوتی ہیں۔ کوشش تو ہوتی ہے کہ زیادہ شوٹ نہ کروں۔ کیونکہ عید کو اچھی طرح سے سیلی بریٹ کرنے کا بہت شوق ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔ عید کے موقع پر خرچے تو ہوتے ہی ہیں اور مجھے خود بھی شوق ہے عید کی شاپنگ کا۔ اور پھر میرے گھر میں بھتیجے بھتیجیاں ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں سب کو گفٹ کروں۔۔۔۔ تہوار ہے اور وہ بھی عید کا تو بہنوں کو بھی بلکہ گھر کے ایک ایک فرد کو گفٹ دیتی ہوں۔ اور چونکہ سب کو میری شاپنگ پسند ہے تو سب کو انتظار ہوتا ہے کہ ناہید آئے تو اس کے ساتھ شاپنگ کریں۔ تو بس اس چکر میں میرا بڑا خرچا ہوجاتا ہے۔۔۔۔ مگر پھر سوچتی ہوں کہ موقع تو سال میں ایک ہی بار آتا ہے۔
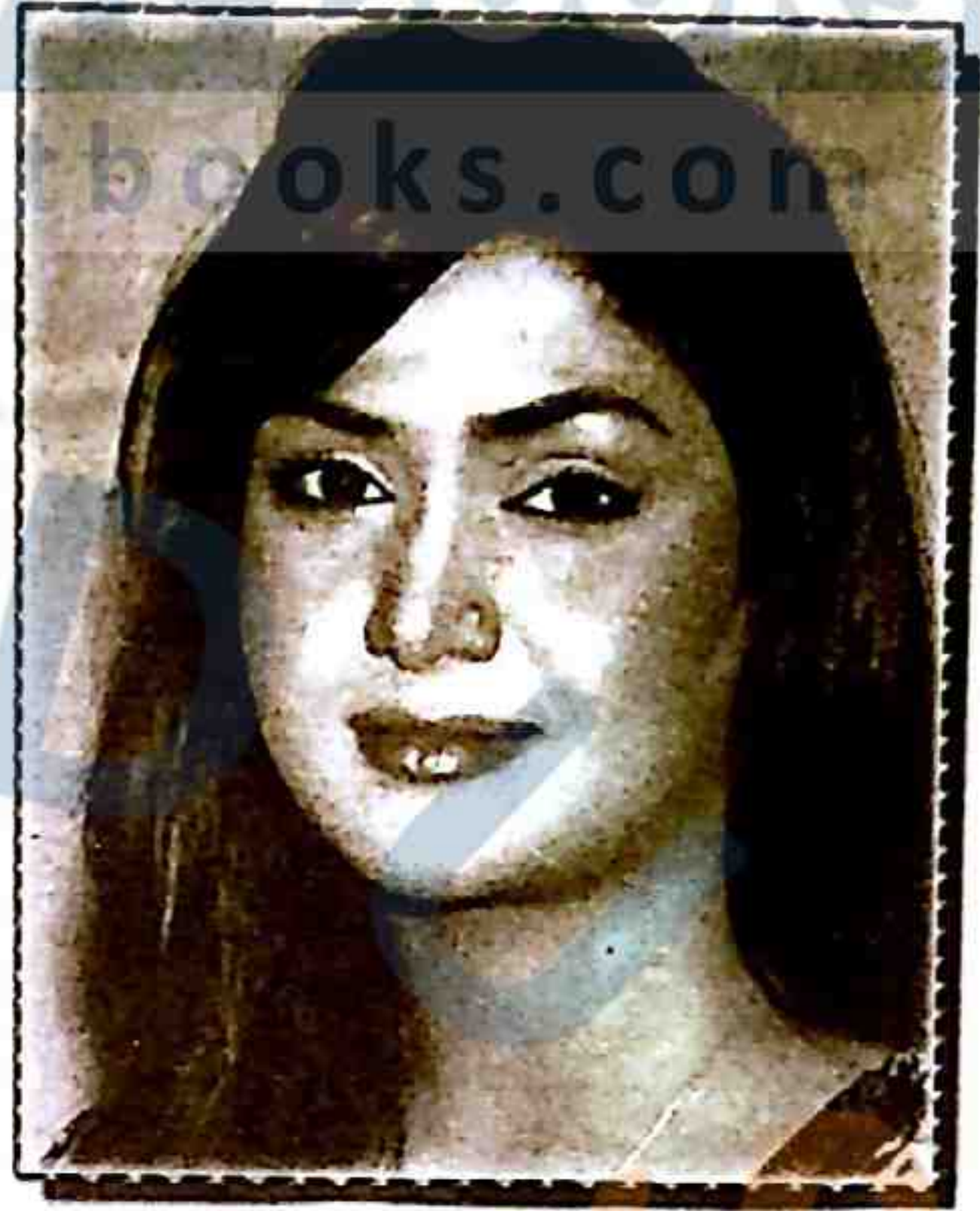
2۔ عید کا دن بہت اہتمام کے ساتھ مناتی ہوں۔ چاند رات سے ہی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ ہم سب بہنیں بہت تیاریاں کرتی ہیں اور پوری رات ہم سب گھر سے باہر ہوتی ہیں۔ مہندی' چوڑیاں' درزی کے چکر۔ کام اور شاپنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہوتی۔۔۔۔ عید کے دن ہمارے یہاں مہمانوں کا بہت آنا جانا رہتا ہے اور سب کی خاطر مدارت کے لیے خوب پکوان پکتے ہیں۔ شیر خرما' بریانی' کباب اور

پہ تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور مجھ پر ابھی اس کا اثر پڑ بھی نہیں سکتا کہ ابھی مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جیسے کہ شادی شدہ مردوں پر ہوتی ہے۔ مجھ پر اگر ذمہ داری ہے بھی تو بہت کم..... بس عید کی شاپنگ ایک مشکل کام ہے۔

2۔ بچپن سے لے کر آج تک عید کی ایک ہی روٹین رہی ہے کہ عید کی نماز پڑھ کر رشتے داروں سے ملنے جاتے ہیں۔ اس طرح عید کو سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ عید کے دن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے سو کر وقت گزارا ہو یا ٹی وی دیکھ کر۔

ماہا وارثی۔ (آرٹسٹ)

1۔ سچ پوچھیں تو میری جیب پر تو بالکل بھی اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ میرے امی ابو کو سلامت رکھے۔ وہ ہی سب کچھ کرتے ہیں۔ بچپن ہی سے وہ ہی میرے لیے اہتمام کرتے ہیں اور عیدی بھی ماشاءاللہ سے ملتی ہے۔ ہاں چھوٹا بھائی ہے اس پر خرچ کرنے کو میرا دل چاہتا ہے اور میں خرچ بھی کرتی ہوں۔ باقی چوڑیاں، مہندی یہ سب کچھ امی ابو ہی کرتے ہیں۔

2۔ عید کے دن نہ میں ٹی وی دیکھتی ہوں اور نہ ہی میں سوتی ہوں۔ ہم لوگ صبح ہی صبح اٹھتے ہیں۔ سویاں بناتے ہیں۔ سویاں کھاتے ہیں۔ اور جب نماز کے بعد سب گھر آتے ہیں تو ٹورنٹو میں جو ہمارے جاننے والے ہیں ان کے گھر جاتے ہیں..... پھر رات کو ڈنر پر چلے جاتے ہیں تو عید کے دن اچھے گزر جاتے ہیں۔ گزشتہ سال میں نے پاکستان میں عید منائی تھی تو مجھے وہاں بھی بہت مزہ آیا تھا۔

محمد اکبر خان (آرٹسٹ)

1۔ خرچ کے معاملے میں میرا ہاتھ بہت کھلا ہے اور میری بیگم بھی اس وجہ سے تھوڑی پریشان رہتی ہیں کہ آپ بچت نہیں کرتے۔ میں بجٹ نہیں دیکھتا، بس جو چیز پسند آ گئی وہ لینی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہیں سوچتا۔

2۔ عید کے روز نہ سوتا ہوں اور نہ ہی ٹی وی دیکھتا ہوں۔ بلکہ ادھر ادھر آنے جانے میں، ملنے ملانے میں ہی دن گزر جاتا ہے۔ اور عید کے تینوں دن اچھے گزرتے ہیں۔ باہر کھانے پینے بھی جاتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ بھی اچھا وقت گزرتا ہے۔

داروں کے یہاں جاتی تھی تو خوب خوب عیدیاں بٹورتی تھی اور جب شوبز میں قدم رکھا تو پھر ترجیحات تھوڑی بدل گئیں۔ کیونکہ تھوڑی کمیچور بھی ہوگئی۔

2۔ جب شوبز میں قدم رکھا تو کام کر کر کے اتنی تھکاوٹ ہو جاتی تھی کہ میں عید کا دن سو کر گزارتی تھی۔ اور دو سال ایسا ہوا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ گزشتہ سال کی عید میں خوب گھومنا پھرنا ہوا۔ بہت انجوائے کیا اور اب آنے والی عید کے لیے کوشش کروں گی کہ گھر والوں کے ساتھ وقت گزاروں اور گھر والوں کے ساتھ عید انجوائے کروں۔

اسد ملک۔(آرٹسٹ)

1۔ اگر آج سے پندرہ بیس سال پہلے کی بھی بات یاد کروں.... تو مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی عید کے لیے خاص طور پر شاپنگ کی ہو۔ عموماً" ایسا ہوتا ہے کہ عام دنوں میں شاپنگ کے لیے گئے' کچھ پسند آیا تو خرید لیا۔ جیسے کپڑے وغیرہ تو اکٹھے دو تین جوڑے خرید لیے۔ کہ کبھی اچانک کہیں ضروری جانا بھی پڑ جائے تو مشکل نہ ہو۔

2۔ عید کا دن اپنے رشتے داروں سے ملنے ملانے
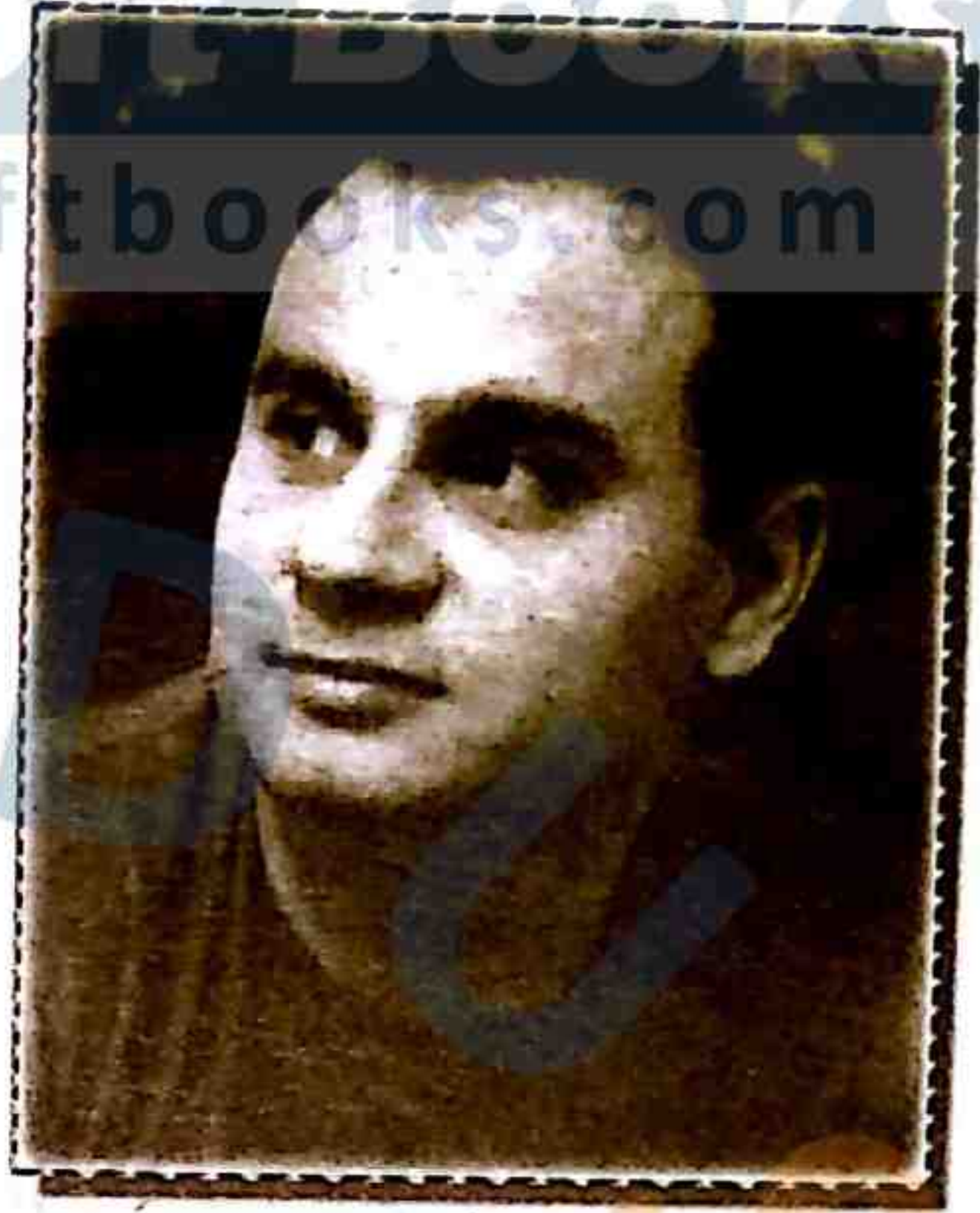
سارہ رضا خان۔(گلوکارہ+نعت خواں)

1۔ عید کی خریداری کی ساری ذمہ داری امی پر عائد ہوتی ہے۔ وہ ہی خرچ کرتی ہیں۔ مگر ہم سادگی کو مد نظر رکھتے ہوئے "لان" کا سوٹ بنا لیتے ہیں۔ عید کے دن نئے کپڑے پہننا سنت ہے۔ اس لیے لان کا سوٹ مما لے کر دیتی ہیں۔ ڈیزائنر کپڑے تو پھر میں اپنے شوز پر ہی پہنتی ہوں۔ اس لیے عید کا بجٹ متاثر نہیں ہوتا۔

2۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ عید کا دن سو کر تو بالکل بھی نہیں گزارنا چاہیے اور نہ ہی ٹی وی دیکھ کر وقت گزارنا چاہیے۔ کیونکہ عید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے اور ہمیں رسول کی سنت کے مطابق ہی چلنا چاہیے۔ عید کے دن عید کی نماز پڑھ کر مہمانوں کی آمد کا انتظار ہوتا ہے۔ اکثر آجاتے ہیں۔ یا پھر ہم چلے جاتے ہیں۔ اور عموماً" چاند رات یا عید کے دن شوز ہوتے ہیں تو زیادہ تر وقت پھر شوز میں گزر جاتا ہے۔

حنا الطاف۔(آرٹسٹ)

1۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی لیکن الحمد اللہ' میرا بجٹ بالکل بھی متاثر نہیں ہوتا۔ بالکل بھی نہیں ہوتا۔ شوبز میں آنے سے پہلے عید کے دن رشتے

بس سارا دن اسی طرح سے ملنے ملانے میں گزر جاتا ہے۔ آرام تو بالکل بھی نہیں ملتا۔ البتہ عید کے دوسرے دن آرام کرنے کا تھوڑا موقعہ مل جاتا ہے۔

ماورا حسین۔(آرٹسٹ)

1۔ اب عید کی ایکسائٹمنٹ بچپن والی نہیں رہی کہ مہندی لگانا، کپڑے خریدنے بازار جانا۔ چوڑیاں لینی۔ یہ ایکسائٹمنٹ ابھی بھی بچوں میں ہوگی۔ لیکن ہم اب بڑے ہوگئے ہیں اور پھر جس فیلڈ سے ہمارا تعلق ہے' وہاں تو روز نئے کپڑے بن رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے کیسا بجٹ اور کہاں کا بجٹ۔ سچ میں اللہ نے اتنا دیا ہے کہ اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کا دل چاہتا ہے۔

2۔ سوکر؟ ٹی وی دیکھ کر؟۔ نا' جی نا۔ عید کے دن تو اتنی زیادہ مصروفیات ہوتی ہیں کہ یہ دونوں عیاشی والے کام کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ عید کا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔

یاسر شورو۔(آرٹسٹ)

1۔ عید کے موقع پر عید کا بجٹ بہت زیادہ متاثر

میں گزرتا ہے۔ عید کا دن سو کر گزارنا یا ٹی وی دیکھ کر گزارنا میرے نزدیک کوئی عقلمندی والی بات نہیں ہے۔ پورا مہینہ اپنی نیچر سے ہٹ کر یعنی بھوکا رہ کر گزارتے ہیں اور مہینے کے بعد جب دوبارہ اپنی معمول کی زندگی پر آتے ہیں تو انجوائے منٹ کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کی شمولیت بھی ہوجائے تو ہر چیز کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور عید کی خوشیاں دوبالا ہوجاتی ہیں۔

علی رحمٰن.....(آرٹسٹ)

1۔ عید کے موقع پر زیادہ خرچا نہیں ہوتا۔ ہاتھ کھینچ کر ہی رکھتا ہوں۔ بس عید کے لیے ایک دو جوڑے بنالیتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں جوڑے تھوڑے اچھے والے ہوتے ہیں۔ کیونکہ عید کے دن سب سے ملنا جلنا ہوتا ہے۔

2۔ عید کا دن سوتے ہوئے نہیں گزرتا' کاش سوتے ہوئے گزرتا مگر سونے کے لیے ٹائم ہی کہاں ملتا ہے۔ والد صاحب کے ساتھ عید کی نماز کے لیے جاتا ہوں۔ نماز کے بعد گھر میں امی اور دیگر لوگوں سے عید ملتا ہوں اور پھر کہیں جانا ہو تو چلے جاتے ہیں۔ تو

نوشین شاہ۔ (آرٹسٹ)

1۔ یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ جتنا خرچ کریں گے اتنا بجٹ متاثر ہوگا۔ جب ہمیں معلوم ہے کہ رمضان میں مہنگائی اپنے عروج پر ہوتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے خریداری کرنے کی۔ افطاری اور سحری میں اہتمام کرنے کی۔ عید پر زیادہ سے زیادہ خریداری کرنے کی۔ عید کے دن صاف ستھرے دھلے ہوئے کپڑے پہننے کا حکم ہے۔ پھر کیوں نئے کپڑے بنا کر بجٹ کو متاثر کرتے ہیں۔ ویسے بھی تو اب آئے دن نئے کپڑے بن رہے ہوتے ہیں۔

2۔ عید کے دن بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں۔ رشتے داروں کے گھر جانا۔ مہمانوں کا گھر آنا تو سارا دن اس مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔ ویسے گھر میں رہنے کا موقع ملے تو پھر سونے کو ترجیح دوں گی۔ ٹی وی لگا بھی رہتا ہے تو دیکھنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔

مہوش حیات۔ (آرٹسٹ)

1۔ جی..... بجٹ متاثر ہوتا ہے۔ مگر بندہ کماتا کس لیے ہے۔ سال میں ایک بار روزے رکھنے کا انعام "عید" کا دن ہوتا ہے تو پھر کیوں نہ اہتمام کیا جائے۔ اس لیے عید کے موقع پر بجٹ تھوڑا آؤٹ بھی ہو جائے تو میں پرواہ نہیں کرتی۔ عید کی شاپنگ کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

2۔ ہم لڑکیاں بھلا کہاں سو کر یا ٹی وی دیکھ کر عید منا سکتی ہیں۔ عید کا دن تو مکمل طور پر فیملی ڈے اور مہمانوں کا دن ہوتا ہے۔ ہمارا دن نہیں ہوتا۔

☼

ہوتا ہے لیکن میں عید کی خوشیوں میں عید کے بجٹ کو نہیں دیکھتا اور کسی کو بھی عید کے موقع پر بجٹ کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ عید کی تیاری کا تو اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔

2۔ اور جناب عید کے دن نماز پڑھ کر گھر آتا ہوں۔ پھر رشتے داروں سے دوستوں سے ملاقات کرتا ہوں۔ جن سے فون پر بات کرنی ہوتی ہے ان سے فون پر بات کرتا ہوں۔ پھر گھر آکر سو جاتا ہوں۔ ٹی وی نہیں دیکھتا بس سونے کی عیاشی کرتا ہوں۔

اظفر رحمٰن۔ (آرٹسٹ)

1۔ جی بجٹ تو بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس قدر مہنگائی ہو گئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لگتا ہے کہ اب تو پیسے میں برکت ہی نہیں رہی۔ جتنا کماؤ اس سے کہیں زیادہ خرچ ہو جاتا ہے مگر اب میں تھوڑا سنبھل کر خرچ کرتا ہوں..... اور پہلے سے سوچ لیتا ہوں کہ کیا کیا خریدنا ہے۔

2۔ ہمیں گھر بیٹھنے اور ٹی وی دیکھنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے۔ اکثر تو ہم لائیو بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو پھر میں تو گھر میں رہنے اور سونے کو ہی ترجیح دوں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	صائمہ انصار اور عفرا خان
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا
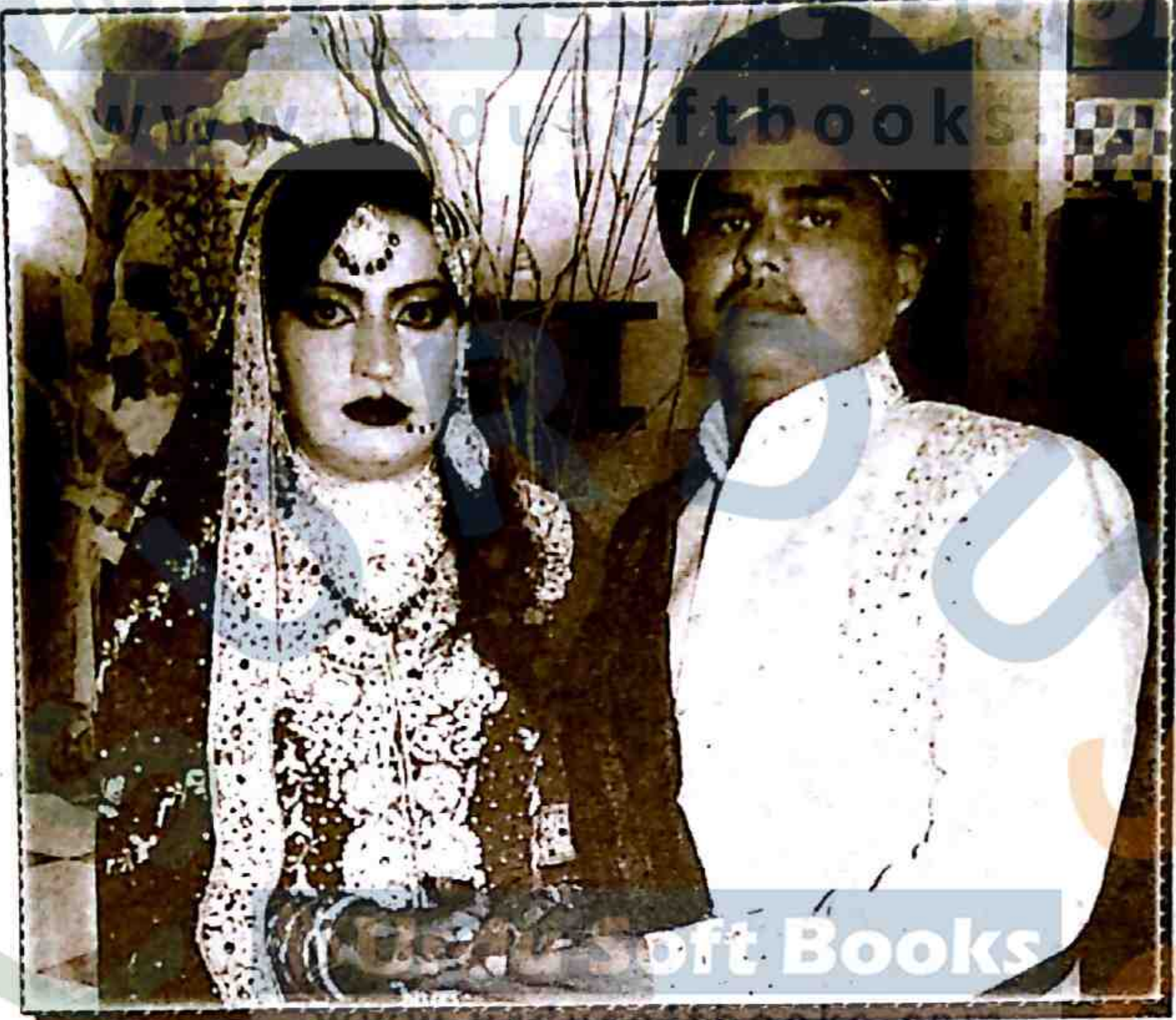
عائشہ کنول ہمراہ وسیم احمد

نعیمہ ناز سلطان

وسیم صاحب کی شادی کے احوال سے پہلے کچھ احوال اس سے پہلے کے مرحلے کا بیان کرنا چاہوں گی۔

کیوں؟

بس یونہی، آپ سب کی تفریح طبع کے لیے۔

لڑکیاں دیکھنے کے لیے گھر گھر جھانکنا، بہت سوں کی طرح ہمیں بھی معیوب لگتا ہے۔ لہٰذا کوشش کی کہ جان پہچان کے لوگوں میں ہی کوشش کی جائے بات بنانے کی، سو ایک جگہ دیکھی بھالی لڑکی کا رشتہ دیا، گھر کی خواتین راضی تھیں، مگر والد صاحب کی طرف سے انکار ہو گیا، وجہ؟

جس شعبے میں وہ کام کرتے تھے، اس کا ہی کوئی ہنرمند یا کاریگر داماد چاہیے تاکہ کل کلاں کو خدانخواستہ داماد بے روزگار ہو جائے تو اسے کام دلانے میں آسانی ہو، دور اندیش سوچ۔

ایک مہربان سہیلی نے ایک رشتے کے بارے میں بتایا، بہت شریف لوگ ہیں دین دار، پردے دار، مگر غریب ہیں۔ آٹھ بہنیں ہیں ایک بھائی وہ بھی شادی کر کے الگ ہو گیا ہے۔ ہماری تو ایک ہی شرط تھی، شرافت۔ سو ہمیں کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں بس ایک خواہش تھی ہماری کہ دونوں بھائیوں کے لیے کوئی دو بہنیں ہی مل جائیں۔ کیوں؟ کیوں کہ دونوں بہنیں ہوں گی تو مل جل کر رہ لیں گی۔ لڑائی جھگڑوں کے امکانات کم ہوں گے جیسا کہ عموماً" دیورانی جیٹھانی میں ہو جاتے ہیں، دیکھا، تھوڑی بہت دور اندیش سوچ

ہم بھی رکھتے ہیں۔

خیر' ہماری دوست نے اپنے گھر بلا کر اپنی اور بیٹیوں سے ہمیں ملوا دیا۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی۔ نمبر دو اور تین ہمیں دکھا دیں۔ سر تا پا حجاب میں ملبوس' بس چہرے نظر آ رہے تھے۔ ہمیں حوریں یا پریاں نہیں چاہیے تھیں۔ اچھے اخلاق اور عادات کے ساتھ ہی ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہ سکتا ہے۔

اپنی دوست کی تعریفوں کو غنیمت جان کر اور ان سے دو چار باتیں کر کے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ وہ آئیں' ہمارے دونوں بھائیوں سے ملیں اور فوراً" ہی اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

"بڑا والا (وسیم) تو کچھ زیادہ ہی سیدھا ہے۔ چھوٹے (عظمت) کو لڑکی دے دیں گے۔"

"ہائیں' تو کیا سیدھے سادے لڑکوں کی شادیاں نہیں ہوں گی۔"

پھر وسیم کے لیے ایک لڑکی اور بتائی گئی۔

"لڑکی پی کام کر رہی ہے۔"

"گڈ!"

"مگر... ذرا صحت مند ہے۔" ہچکچاتے ہوئے بتایا گیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارا بھائی بھی کافی صحت مند ہے۔ جوڑی اچھی بنے گی۔ ہم" (ہم سے مراد 'میں' اور میری بڑی بہن) اماں کی بیماری کے باعث ان معاملات کی روح رواں ہم دونوں ہی تھیں) نے حوصلہ افزا جواب دیا۔

"پھر اتوار کو لے آؤں انہیں لڑکا اور گھر دکھانے؟"

"چلو لے آؤ' ہم لڑکی سے بعد میں مل لیں گے۔"

ہم نے آمادگی ظاہر کر دی۔

آخر لڑکی والوں کو بھی حق ہونا چاہیے کہ پہلے وہ لڑکا دیکھ لیں' ہر بار پہل کا ٹھیکہ لڑکے والوں کے پاس تھوڑی ہے (ہم اور ہماری سوچ)

مہمان آئے بلکہ کہنا چاہیے کہ آنا شروع ہوئے۔

ایک' دو' تین' چار' پانچ... سولہ' سترہ' اٹھارہ۔ جی ہاں ڈیڑھ درجن سے زائد افراد تھے' چھوٹے بڑے سب ملا کر جو "لڑکا" دیکھنے آئے تھے۔ تعارف ہوا تو پتا چلا لڑکی جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہے' والدین کے ہمراہ دادی' پھوپھی' تین چچا بمعہ اہل و عیال سب ہی آئے تھے۔ بڑی اچھی اچھی باتیں ہوئیں اور ایک ہفتہ بعد جواب یہ دیا کہ

"لڑکا اور گھر بار سب کچھ اچھا ہے' مگر ابھی لڑکی پڑھ رہی ہے' اتنی جلدی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"ارادہ نہیں ہے تو جھٹ پٹ رشتہ دیکھنے کیسے آ گئے؟"

پتا چلا کہ جوائنٹ فیملی سسٹم کی پہلی بیٹی' پوتی اور بھتیجی تھی' پہلا رشتہ تھا' اس لیے مارے شوق کے سب ہی دیکھنے آ گئے۔

یہ احوال بتانے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔ قارئین! آپ کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اندازہ ہوا کہ مشکلات صرف لڑکیوں کی شادیوں میں ہی حائل نہیں بلکہ لڑکوں کے لیے بھی ہیں اور کیوں ہیں' اس کا اندازہ بھی بخوبی ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ لڑکی بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں' ہم وہیں پہنچ گئے جہاں اللہ تعالیٰ نے جوڑ لکھا تھا' یعنی اپنے سب سے بڑے پھوپھی زاد بھائی کے گھر' جن کی بیٹی عائشہ کنول سے 27 دسمبر 2014ء میں وسیم کا رشتہ طے ہوا اور ٹھیک ایک سال بعد 26 دسمبر 2015ء میں شادی۔ شادی کی شروعات حسب دستور بازاروں کے چکر سے شروع ہوئی اور جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے۔ لاکھ تیاریوں کے باوجود بھی ولیمہ کے دن بھی بازار کا منہ دیکھنا ہی پڑا اور ایک درزی صاحب ہمارے علاقے کے ہی تھے' حجاموں والی خصوصیات' بلا کے باتونی' آسمان سے باتیں کرتے سلائی کے دام کی شکایت کی تو اپنے ہنر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ وسیم کی شادی کا سن کر فرمانے لگے۔ "ابھی شادی کیوں کر رہی ہیں' چھوٹی

بہن کو نپٹا کر پھر یہ کارِ خیر انجام دیتیں۔ "اچھا بھئی' اب انہیں بھی سمجھاؤ کہ دوسرے کی مشکل آسان کرنے سے اپنی مشکلات بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

محترم کی کارکردگی یہ رہی کہ "درجنوں کے حساب سے جوڑے سیے" واقعی عمدہ تھے۔ درجنوں کے حساب سے یوں کہ ہم تین بہنیں' ہماری چار بھانجیاں اور دلہن کی بری کے جوڑے' سب مل ملا کر کئی درجن ہو گئے تھے' مگر چھوٹی بہن کا بارات کا سوٹ اور بری کا ایک جوڑا ولیمہ کے بعد سی کر دیا' اپنی پھرتی پر نازاں موصوف بارات سے دو دن پہلے صاحب فراش ہو گئے کہ بستر پکڑ لیا (بھلا کس نے کہا تھا عین وقت کے لیے کام اٹھا رکھنے کو؟)

شادی میں شرکت کے لیے دور کے مہمان پہلے آ گئے تھے۔ ہمارے پھوپھی زاد بھائی نمبر تین' حسن بھائی بمعہ اپنی بیگم' نیویارک سے عازم سفر ہوئے' ان کی بیگم یاسمین بھابھی بہت منکسر المزاج اور نفیس طبیعت کی مالک ہیں' بہت میٹھی زبان' ان کے ساتھ باتوں میں گھنٹوں گزر جائیں نہ وقت گزرنے کا پتا چلتا ہے نہ ہی دل بھرتا ہے۔ عائشہ کی بہن ان کی بہو ہیں۔ وہ پچھلے ہی سال اپنے بھائی عادل کی شادی میں پاکستان آئی تھیں' اس بار نہیں آ سکیں۔ دور دیس رہنے والوں کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ چاہنے کے باوجود بھی اپنے پیاروں کی خوشی' غمی میں شریک نہیں ہو پاتے۔

عائشہ کی ایک اور بہن ہمارے چچا کی بہو ہیں' ماہ دسمبر میں یہ لوگ بھی اپنے تین بچوں کے ہمراہ دبئی سے کراچی آ گئے۔

ہمارے چچا کی ایک بیٹی عائشہ کی چچی ہیں' ان کی تشریف آوری مسقط سے ہوئی۔ مسقط سے ہی عائشہ کی ماموں زاد صدف ناز زبیری اپنے اکلوتے سپوت اور اکلوتے میاں (اوہ! قلم پھسل گیا۔ میاں تو اکلوتے ہی ہوتے ہیں' یہ تو ہم عورتیں ہی ہیں جو پہلی اور دوسری کی لائن میں کھڑی ہوتی ہیں) کے ہمراہ اپنے میکے آ گئیں' یہ محترمہ ہماری سابقہ پڑوسن اور بچپن کی سہیلی ہیں۔ بڑا اچھا اور یادگار وقت ہم نے ایک ساتھ گزارا ہے۔ دورِ طالب علمی میں بڑے اچھے افسانے لکھے تھے' آج کل شاعری کے کوچے میں اپنی صلاحیت آزما رہی ہیں۔

دسمبر کا آخری عشرہ' سردی اتنی ہی پڑ رہی تھی جو ہم اہلیانِ کراچی کے لیے "بہت" ہوتی ہے۔ سب سے پہلے اور بڑی فکر چھوٹے بچوں کی ماؤں کو تھی جن میں میں بھی شامل تھی کہ بچوں کو بیمار ہونے سے بچانا ہے۔ بہت احتیاط کی اور شکر ہے کہ تمام دن خیریت سے گزر گئے۔ بچے ٹھیک رہے' مگر دولہا سمیت گھر کے سارے بڑے باری باری حسب توفیق ضرور بیمار پڑے سب سے بڑا ریکارڈ چھوٹی بہن کا تھا۔ دسمبر کے شروع دنوں میں جو بیمار پڑی تو ولیمہ کے بعد تک بھی ٹھیک سے' ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔

ویسے تو (کے۔ای) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے "سوئی سدرن گیس کمپنی" بھی حسب توفیق اپنے صارفین کو دق' زچ اور عاجز کرنے میں مہارت حاصل کرتی جا رہی ہے تو ہوا یہ کہ ملیر کھوکھراپار میں بھی گیس کی لوڈشیڈنگ جو روزانہ تین چار گھنٹوں تک تھی شادی کے ہفتے میں اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ گیس کی فراہمی میں نہیں تعطلی میں' پیر سے پورے پورے دن گیس یوں ناپید ہو گئی جیسے جیسے... کیا مثال دوں؟ جیسے ہماری پیاری اور پسندیدہ رائٹرز جو ٹی وی کو پیاری ہو جاتی ہیں اور ڈائجسٹ کے لیے ان کی تحریریں ناپید' تو "عادی اور صابر و شاکر" قوم نے ایک آدھ دن تو نکال لیا۔

تندور کی لمبی قطار میں کھڑے ہو کر روٹیاں آ گئیں' فریج میں رکھی چیزیں کام آئیں' انڈے سلائس' بازار سے چھولے' دہی بڑے کی چاٹ' حلیم' بریانی۔ رات بارہ بجے کے بعد چولہے کا رخِ روشن کچھ روشن ہوا تو حفظ ماتقدم کے تحت اگلے دن کے لیے سالن پکا لیا گیا' مگر ہائے وہ صبح کی چائے' وہ بھی سردیوں کی صبح کی تو علی الصبح چھ بجے چائے کا دیگچہ چڑھتا اور دوپہر بارہ ایک بجے

تک چائے تیار ہو ہی جاتی' گیس کا سلنڈر لا کر لگایا ۔جانے کیسے آگ بھڑک اٹھی۔ ڈر کے مارے اسے فوراً" ہٹوا دیا۔ سلنڈر پھٹنے کی پڑھی ہوئی اور سنی ہوئی خبریں دماغ میں گردش کرنے لگیں۔

بدھ کے دن عائشہ مایوں بیٹھی تھی' زرد رنگ کا خوب صورت لباس اور پھولوں کا زیور' وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ڈھولک پہ گائے جانے والے گیتوں نے سماں باندھ دیا تھا۔ گھر ہی کے لوگ تھے اور گھر میں ہی چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بار بی کیو' گلاب جامن اور بیسن کے لڈوؤں سے تواضع کی گئی۔

نکاح جمعہ کے دن رکھا گیا تھا جمعہ کی نماز پڑھ کر دولہا میاں اور مولوی صاحب اور ہم بہن بھائی' عازم سفر ہوئے۔ دولہا سمیت مرد حضرات مسجد چلے گئے' جہاں ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ ہم خواتین عائشہ کے گھر چلے گئے جو مسجد کے قریب ہی ہے۔ وہاں مہندی لگائی جا رہی تھی۔ پارلر سے دو لڑکیاں آئی ہوئی تھیں اور بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ اپنے ہنر کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ کچھ کے مہندی لگ چکی تھی اور بقایا فوج انتظار میں تھی۔

کچھ دیر بعد مولوی صاحب اور دیگر افراد کی آمد کا غلغلہ اٹھا' عائشہ کو گھونگھٹ ڈال دیا گیا۔ ایجاب و قبول کے مراحل طے ہوئے۔ ویسے تو پوری شادی میں ہر ہر مرحلے پر اپنے اماں' ابا کی یاد آئی مگر نکاح کے وقت ہم سب کی آنکھیں اور دل بھر آئے۔ اماں کو ہم سے جدا ہوئے چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ بیک وقت خوشی اور اداسی کے یہ لمحات بھی گزرے' مبارک باد و اور دعا کے بعد عائشہ کے مہندی لگنے لگی اور ہم سب ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ذرا سی دیر میں سہ پہر شام میں ڈھلنے لگی۔ نیچے سے بلاوا آیا نیچے وسیع دستر خوان بچھا تھا۔ عصرانے کا اہتمام تھا۔ کیک' سموسے' بسکٹ' رول' نمکو' مٹھائی اور چائے۔ دولہا صاحب بھی وہیں تشریف فرما تھے اور خصوصی پروٹوکول کا لطف اٹھا رہے تھے۔

گھر واپس آئے تو مغرب ہو رہی تھی۔ گیس کا وہی حال' ندارد ارے بھئی کیا کریں' کھانا کیسے پکے گا' پانی کیسے گرم ہو گا؟ چلو بھئی بہت ہو گئی۔ باہر نکلو' احتجاج کرو۔ صبر کے پیمانے لبریز ہو کر چھلک رہے تھے' مگر پھر احتجاج؟ کہاں' کیسے' کیونکر' امام کون بنے' مقتدی حیران پریشان اور پھر ہنس ہنس کر ہر ستم سہنے والی قوم غیبی مدد کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر گیس کی آمد' اتنی کم تھی جیسے ارکان پارلیمنٹ کی حاضریاں' گلگلوں کے بجائے میٹھی ٹکیاں بنانے کا پروگرام تھا۔ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔ بھانجیاں سراپا احتجاج' کبھی خالہ' کبھی ماموں کی دہائی۔

"کیا ہے بھئی یہ؟" اس سوال کے کئی جواب ملے مثلاً"

"کیا ہے بھئی یہ؟"

"یہ پاکستان ہے"

"کیا ہے بھئی یہ؟" یہ رت جگا ہے' یہ شادی ہے۔"

"یہ ہمارا صبر آزمانے کی ایک اور کوشش ہے۔"

وغیرہ وغیرہ۔

اگلی صبح' بارات کے دن کی صبح' وہی روایتی ہڑبونگ' افراتفری' استری کر کر کے کپڑے ہینگر کیے گئے۔ شام میں پارلر جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھے لوگ گھر میں' آدھے پارلر میں' پھر آدھے لوگ پارلر میں اور آدھے گھر میں' تینوں بچوں کو تیار کیا' عظمت صاحب پہلے سے الٹ پلٹ کمرے کو مزید الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

"کیا ہوا بھئی' کیا کھو گیا؟"

"نئی شرٹ نہیں مل رہی۔"

"کہاں رکھی تھی؟"

"یہیں تو رکھی تھی۔" وہ بے چارہ تن دہی سے اپنی شرٹ تلاش کر رہا تھا اور جیسا کہ آپ میں سے بہت سے لوگوں کو تجربہ ہوا ہو گا کہ گھر کی چھوٹی بڑی کوئی بھی تقریب ہو۔ کوئی نہ کوئی شے ایسے کھو جاتی ہے کہ سامنے رکھی ہو پھر بھی نظر نہیں آتی' بہرحال چونکہ امجد اسلام امجد نے بتایا ہوا ہے کہ "گمشدہ چیزیں جہاں

کھوئی جاتی ہیں وہیں سے مل بھی جاتی ہیں۔" تو وہ شرٹ بالآخر مل گئی۔

دولہا صاحب تیار تھے۔ سہرا نہیں باندھا تھا۔ گلے میں ہار ڈلوا کر تصویریں بنوالیں۔ خالی سرمے دانی سے سرمہ لگائی کی رسم بھی ہو گئی۔

"جلدی کرو، کب نکلو گے تم لوگ، جلدی کرو۔" اچانک بڑے بھائی صاحب نے جلدی جلدی کا شور مچا دیا۔

"تیار تو ہیں سب نکل رہے ہیں ابھی۔" بارات کی بس باراتیوں سے بھر چکی تھی۔ دولہا میاں اپنی کار میں بیٹھ گئے تھے، عظمت نے لائٹیں اور پنکھے بند کر کے کمروں میں لاک لگا دیا ہے۔ میرے میاں زینب اور صبا کو ساتھ لے کر باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کھڑے ہیں اور میں چھوٹی مریم کے ساتھ اپنی جوتیاں پہننے کے لیے کھڑی ہوں۔

"گڑیا! میرے شوز کون سے ہیں؟"

ہفتہ دس دن پہلے بڑی بہن اپنی ایک بیٹی کے ساتھ طارق روڈ گئیں اور پوری بھر کے سب کے جوتے لے آئیں۔ عائشہ کی بری میں رکھنے کے، اپنے، اپنی چار بیٹیوں کے، میرے اور گڑیا کے، اس سے پہلے اپنی بیٹیوں اور بہن کو ساتھ لے کر گئی تھیں، مگر ہمیشہ کا تجربہ یہی ہے کہ

"یہ لوگ شاپنگ کم کرتی ہیں، دماغ زیادہ خراب کرتی ہیں۔ اگلی بار میں اکیلی جاؤں گی۔"

"یہ ڈبے رکھے ہیں۔ ان میں ہی ہوں گی۔"

گڑیا کو بھائی مسلسل آوازیں لگا رہے تھے، وہ باہر بھاگی، میں ڈبے کھول کھول کر دیکھ رہی ہوں، کون سی تھیں؟ میں یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، خیر جو بھی ہو ان ہی میں سے کوئی سی بھی پہن لیتی ہوں۔ عظمت پورا گھر بند کر کے میرا منتظر کھڑا ہے۔ باہر سے بھائی کی آواز میں اب ڈانٹ بھرے جملے بھی شامل ہو گئے ہیں۔

"تم لوگوں کی تیاریاں، عین ٹائم تک ختم نہیں ہوتیں۔"

میں جوتیاں پہن پہن کر دیکھ رہی ہوں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک، تنگ۔

"ارے کیا لڑکیاں اپنی جوتیاں چھوڑ گئیں، میری پہن گئیں؟"

دراصل کچھ جوتیوں کے ڈیزائن ایک جیسے تھے اور ناپ الگ الگ، بہرحال جیسے تیسے جوتیاں پیروں میں پھنسائیں اور باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ میں عموماً "فلیٹ یا معمولی سی ہیل استعمال کرنے والی جانے کتنے عرصے بعد ہائی ہیل پہنی تھی، پیر بری طرح احتجاج کر رہے تھے۔

چلو جی ہم بارات لے کر پہنچ گئے۔ ماڈل موڑ ایرپورٹ کے سامنے "ڈیفوڈلز" میں، پھولوں کے ہار، ہاتھوں کے کنگن اور مسکراہٹوں اور گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہوا۔ عائشہ ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھیں اور ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ عائشہ کا عروسی لباس روایتی سرخ رنگ کا تھا وسیم کی آف وائٹ شیروانی اور میرون کلاہ تھی۔ دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ میزبانوں کی سب کی سج دھج قابل دید تھی۔ ہم بہنوں کی تعریف بھی سب نے کی، مگر ان الفاظ میں۔

"اچھی لگ رہی ہو، کہاں سے تیار ہوئی ہو؟" یا پھر۔

"میک اپ کہاں سے کروایا، بہت اچھا کیا ہے۔"

"اچھا جی، واقعی بات یہ ہے کہ سارا کمال ان رنگوں کا ہوتا ہے جو کوئی ہنرمند یا ماہر فن بڑی مشاقی اور مہارت سے آپ کے چہرے پہ پھیلا دے۔"

شادی میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملاقات ہو گئی جن سے ملے ہوئے سالوں ہو جاتے ہیں۔ بہت اچھا لگا سب سے مل کر۔ دولہا دلہن اسٹیج پر آئے تو عائشہ کی بھانجی زینب نے دودھ پلائی کی رسم کی اور نیگ لیا۔ روایتی مگر خوش گوار تکرار اور مکالموں کے ساتھ یہ معاملہ بھی انجام پذیر ہوا۔ فوٹو گرافر ہمارا سسرالی رشتے دار ہے، وہ بے چارہ بار بار مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"آپ کے رشتے دار کون کون سے ہیں، بتاتی رہیں تاکہ "فالتو لوگوں" (یہ الفاظ موصوف کے ہی ہیں) کی تصویریں نہ بنیں۔"

"جو بھی اسٹیج پر آئے، دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھے سب کی تصویریں بنالو سب رشتے دار ہی ہیں۔"

"سب؟"

"جی ہاں سب، دلہن کے اور ہمارے رشتے دار ایک ہی ہیں، محلے دار بھی ایک ہی ہیں، دلہن ہمارے خاندان کی ہیں۔ ان کی امی کا میکہ ہمارے پڑوس میں تھا اور چند سال قبل تک ان کی اپنی رہائش ہماری طرف ہی تھی، دو گلیاں چھوڑ کر۔"

میں نے اور بھی پتا نہیں کیا کیا تفصیل سے بتادیا۔

وہ بے چارہ منہ پھاڑے میری تقریر سنتا رہا۔ پھر مجھ سے کوئی سوال نہیں ہوا۔ ولیمہ کے اختتام تک ہاں بس تصویریں کھٹا کھٹ بنتی رہیں۔

پھر ایک اہم معرکہ، کھانا لگ گیا۔ بریانی، چکن کڑاہی، گاجر کا حلوہ، سلاد، رائتہ، شیرمال، نافتان۔ کھانا بہت ذائقے دار تھا۔

اس کے بعد رخصتی کا مرحلہ سب نے ہنسی خوشی وداع کیا۔ جی ہاں، رونے کی بھلا کیا بات تھی۔ خوشی کا موقع تھا۔ گھر آئے تو سب تھک کے چور، بچے نیند سے بے حال۔ آدھی رات ہوچکی ہے، سردی لگ رہی ہے، دلہن کے ساتھ کھانا آیا تھا، بھائی لوگ اسے بانٹنے اور ٹھکانے لگانے میں مصروف ہوگئے چونکہ پورا محلہ ہمارے ساتھ بارات میں گیا تھا اس لیے سب جاگ رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ اور قریبی کچھ رشتے دار ہمارے گھر پر تھے اور کھیر چٹائی کی رسم کا انتظار کیا جارہا تھا۔

"کھیر...؟ عظمت! کھیر لے آئے تھے حافظ (مٹھائی والا) سے؟" کوئی فریج میں جھانک رہا تھا۔

"مجھ سے کس نے کہا تھا؟"

ہم تینوں بہنیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں۔

"کس نے کہا تھا عظمت سے؟"

مختصر سی تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ تین ملاؤں میں مرغی حرام ہوگئی۔

"اب لے آؤ جاکر۔" مشورہ دیا گیا۔

"رات کے تین بج رہے ہیں، دن کے نہیں۔" جواب ملا۔

"مٹھائی سے کرلو، بسکٹ سے کرلو، ارے گاجر کا حلوہ ہوگا نا، اس سے رسم کرلو۔" بھانت بھانت کے مشورے مل رہے تھے۔ خیر اس مزے دار مرحلے سے بھی سرخ رو ہوئے۔ آدھی رات کو کسی نے بریکنگ نیوز سنائی "کل گیس کی بندش پہ احتجاج ہوگا۔"

ایک ہفتے بعد ہوش میں آئے عوام۔ "چلو شکر ہے۔"

اگلے روز ولیمہ تھا۔ گیس کا وہی عالم تھا، صبح کسی اللہ کے بندے نے بریانی کا پتیلا چولہے پر رکھ دیا تھا۔ ہلکی ہلکی آنچ پر وہ گرم ہوہی گیا جو اٹھتا گیا۔ اس سے استفادہ کرتا گیا۔ دوپہر میں عائشہ کی بڑی بہن اور بھابھیاں وغیرہ ناشتا لے کر آئیں۔ حلوہ پوری، کیک رس، رسک، ڈبل روٹی، انڈے، مکھن، جام اور مٹھائی پھر سے لمبا چوڑا دسترخوان بچھا۔

وہ لوگ ہمارے کھانے پر اصرار کرتی رہیں، ہم ان کی خاطر داری پر مصر، بڑی اچھی گپ شپ رہی ہم سب کی، پھر دستور کے مطابق دلہن ان کے ساتھ چلی گئی۔ شام میں دولہا میاں جاکر لے آئے۔ دلہن آتے ہی پارلر چلی گئی، وہاں سے دوبار فون آچکا تھا پھر سب کی وہی تیاریاں۔ ہم سب جلدی تیار ہوکر ہال میں چلے گئے کہ آج ہم میزبان تھے۔

عائشہ کا آج کا لباس کاہی رنگ کا تھا، وسیم صاحب تھری پیس میں ملبوس، دونوں آج بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ولیمہ کی مہمانوں کی آمد ہوئی، عائشہ کی بہنوں اور بھابھیوں نے ساڑھیاں باندھی تھیں۔

سب بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ (ہیں بھی پیاری) بہت اچھی گیدرنگ رہی۔ آج کھانے میں بریانی، چکن اچاری، چکن روسٹ، کولڈ ڈرنک، کھیر اور دوسرے لوازمات تھے۔ کھانا سب کو بہت پسند آیا۔ واقعی بہت ذائقے دار تھا۔ ہمارے بھائی نے باورچی بلا کر اور سامان منگوا کر کھانا اپنا پکوایا تھا۔ کھانے میں لذت بھی خوب تھی اور برکت بھی رہی، آج دلہن کو ہم سب گھر والوں نے منہ دکھائی دی۔ اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے اور ہاں ولیمہ کے اگلے روز احتجاج ہوا تھا اور شام میں گیس کی فراہمی ہوگئی تھی۔ ☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

سعدیہ خان

"کیا حال ہے؟"
"اللہ کا شکر ہے۔"
"رمضان المبارک کیسا گزرا؟"
"اللہ کا شکر ہے۔ ٹھیک ٹھاک"
"کافی ٹائم سے اسکرین پر نظر نہیں آئیں۔ وجہ؟"
"اب آپ مجھے بہت جلد اسکرین پہ دیکھیں گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک سریل "خدا اور محبت" کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ اب اس کا سیزن ٹو بن رہا ہے۔ جس کی ریکارڈنگ شروع ہو چکی ہے اور کافی کام ہو بھی چکا ہے۔"
"اچھا گڈ... اس سیریل کو ٹیلی کاسٹ ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ کیا اب لوگوں کو یاد ہوگا۔"
"جی... تقریباً" 5 سال ہو چکے ہیں اور لوگوں کو یہ سیریل بالکل یاد ہے۔ اور ویسے بھی جب اس کا سیزن ٹو ٹیلی کاسٹ ہوگا تو سیزن "ون" کے بارے میں ناظرین کو بریف کیا جائے گا۔"
"خدا اور محبت" اس نے شہرت دی۔ کیا یہی کافی ہے آپ کے لیے؟
"میں کچھ بھی کرلوں۔ لیکن میری پہچان یہ سیریل ہی رہے گا۔ ایسا نہیں کہ میں نے کچھ کیا نہیں ہے۔ ایک دو ڈرامے بھی کیے اور کمرشلز بھی مگر "خدا اور محبت" کے حصار سے لوگ باہر نہیں آئے۔"
"اور نہ آپ خود؟"
"میں نے اس شہرت کو پورے پانچ سال بہت انجوائے کیا اور اب جب لوگوں کو پتا چلا کہ اس کا سیزن ٹو آرہا ہے تو لوگ بہت خوش ہوئے اور شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔"

"فنکار کی زندگی میں کوئی کردار ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جو ساری زندگی کے لیے اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ تو کیا "ایمان" سیزن ٹو میں بھی اتنی ہی مقبولیت حاصل کرپائے گی۔"
"ان شاء اللہ آپ دیکھیے گا کہ میرا کردار پہلے سے زیادہ مقبول ہوگا اور اس کے مقبول ہونے کا تو مجھے اندازہ ہے۔ لیکن جب پہلی بار سیزن ون 'خدا اور محبت' میں کام کیا تو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھولوں گی۔ اس کردار کے لیے انجم شہزاد' سلمان شاہد اور عمران عباس نے بہت تعاون بھی کیا اور حوصلہ افزائی بھی کی۔"
"فیلڈ کی شروعات ہی اس سیریل سے ہوئی تھی؟"
"نہیں... شروعات تو ایک ٹیلی کام کمپنی کے

کمرشل سے ہوئی تھی۔ اور یہ کمرشل ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ پھر ڈراموں کی آفر آئی اور اس کے آگے کی کہانی تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

"سعدیہ آپ نے ایک فلم "دیور بھابھی" میں بھی کام کیا تھا۔ مزید آفرز نہیں آئیں کیا؟"

"ایسا نہیں ہے۔ آفرز آئیں مگر میں کر نہ سکی۔ "دیور بھابھی" کافی کامیاب رہی اور اس کے بعد "تیری میری لو اسٹوری" کے لیے جواد بشیر نے بہت کہا اور بقول ان کے کہ اس کردار کو لکھواتے وقت میں ہی ان کی نظروں میں تھی۔ مگر میں یہ فلم اس لیے نہ کر سکی کہ ان دنوں میں ایک بڑے برانڈ کے کمرشل میں مصروف تھی.... اور...."

"اچھا؟.... آپ کی جگہ پھر کس نے یہ کردار کیا؟"

"اشنا شاہ نے اس کردار کو کیا.... شاید اس کی قسمت میں یہ کام کرنا لکھا تھا۔ اس طرح "دانش تیمور" کے ساتھ ایک فلم میں مرکزی کردار کی پیشکش ہوئی۔ مگر وہ فلم اس لیے نہ کر سکی کہ "خدا اور محبت" کا سیزن ٹو شروع ہو چکا تھا.... اور اسے چھوڑنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...."

"خوش شکل باصلاحیت ہیں آپ، مگر اس فیلڈ کے لیے آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ورنہ لڑکیاں تو ایک کے بعد ایک پروجیکٹ کر رہی ہوتی ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اور اب میں واقعی بہت سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے اس فیلڈ کو سنجیدہ لینا چاہیے۔ کیونکہ کام میرے پیچھے پیچھے ہے اور میں اسے اہمیت نہیں دیتی۔ تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہی نہ ہو جائے۔"

"آپ نے بتایا کہ عمران عباس کے ساتھ آپ کی کیمسٹری ملتی ہے اور کس کے ساتھ کام کر کے اچھا محسوس کرتی ہیں آپ؟"

"جی، اور بھی لوگ بہت اچھے ہیں۔ عمران عباس کے بعد سمیع خان بھی بہت اچھے ہیں۔ اور ان کے ساتھ بھی میں نے تین چار پروجیکٹ کیے ہیں۔ ایک تو دیور بھابھی تھا۔ اور کچھ ہی عرصہ قبل ایک سیریل "شرک" کیا جو کہ ابھی آن ایئر نہیں ہوا ہے۔ اس میں میں نے ایک ہندو لڑکی کا کردار ادا کیا ہے۔ اور بہت اچھا اور منفرد رول ہے۔ اس کے علاوہ ایک ٹیلی فلم بھی کی ہے۔ اور ان شاء اللہ اب تواتر کے ساتھ کام کروں گی۔"

"سعدیہ آپ کو گلوکاری کا شوق تھا اور مجھے یاد ہے کہ آپ نے بتایا تھا کہ یہی شوق آپ کو اس فیلڈ میں لے کر آیا۔ پھر کیا ہوا؟"

"شوق تو مجھے ابھی بھی ہے۔ اور دو چار گانے میں نے گائے بھی مگر جب انہیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو پھر اداکاری اور ماڈلنگ کی فیلڈ میں اتنی زیادہ مصروفیت ہو گئی کہ گلوکاری کی طرف توجہ بھی نہیں دے سکی۔"

"روشن مستقبل کس میں نظر آ رہا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اداکاری میں ہمیں آگے تک جاؤں گی۔ کیونکہ مجھے خود بھی لگتا ہے کہ اداکاری کی صلاحیت ہے مجھ میں۔ پھر لوگ بھی تعریف کرتے ہیں اور میرا یہ ارادہ بھی ہے کہ اداکاری کی کلاسز بھی لوں گی تاکہ مزید اچھی اداکاری کر سکوں۔"

"کمرشل تک رسائی کیسے ہوئی۔"

"یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ شاید قدرت کو مجھے اس فیلڈ میں لانا تھا۔ میں تو گریجویشن کے بعد بھائی کے پاس ملک سے باہر چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو جمال شاہ کے "ہنر کدہ" میں داخلہ لے لیا کہ مجسمہ سازی سیکھوں گی اور ایک دن جب مٹی میں لتھڑے ہاتھوں سے کسی سے فون پر بات کر رہی تھی کہ کچھ لوگ آئے اور میری تصاویر لیں۔ میرا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا کہ یہ کس مقصد کے لیے میری تصاویر لے رہے ہیں مگر چند دن کے بعد جب میں نے اپنی وہی تصاویر بڑے بڑے ہورڈنگز میں لگی دیکھیں تو میں

بقیہ صفحہ نمبر 282

عفت سحر طاہر

خواب شیشے کا

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے' یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی' ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہرماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہرماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آفندی ہاؤس میں بے چینی سے فاران کا انتظار ہو رہا ہوتا ہے لیکن وہ نہیں پہنچ پاتے ان کا فون بھی بند ہوتا ہے۔ تیسرے دن مبین آفندی کا فاران آفندی کے فون پر رابطہ ہوتا ہے تو وہ آغا جان کو بتاتے ہیں کہ فاران آفندی اب اس دنیا

میں نہیں رہا ہے۔
آغا جان یہ خبر سن کر ٹوٹ گئے۔ فاران آفندی کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد پاکستان آگئے۔ مہر ماہ کی منگنی طلال سے طے ہو چکی ہے، جس پر تزئین حسد کرتی ہے۔ موحد اور ثمرہ آفندی ہاؤس آجاتے ہیں۔ موحد بہت ہینڈسم اور خوبرو ہے۔ آغا جان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن موحد کو ان سب سے نفرت ہے۔ زر گل بائی کو قیمت دے کر وقار آفندی نے زر نگار سے شادی کرلی تھی، لیکن اس شادی کو آغا جان نے قبول نہیں کیا۔ ہاں نے کہا کہ وہ زر نگار کو طلاق دے دے۔ انہوں نے دو بیٹا قدموں میں رکھ دیا۔ گھر کے دیگر افراد بھی مخالف تھے۔ صرف ثمرہ بھابھی جو فاران آفندی کی بیوی تھیں۔ وہ وقار کے ساتھ تھیں۔ وقار آفندی کا بیٹا نمیر آفندی سومیہ کا دوست ہے۔ سومیہ اسے پسند کرتی ہے۔ ثمرہ اچانک یہ کہہ کر دھماکا کردیتی ہیں کہ مہر ماہ اور موحد کا رشتہ آغا جان نے بچپن میں طے کر دیا تھا۔

چوتھی قسط

موحد کی بات سن کر مہر ماہ کا دماغ گھوم گیا۔
بدتمیز اور اکھڑ تو وہ پہلے بھی لگا تھا۔ مگر اب تو اس نے حد ہی کردی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ گاڑی واقعی کسی دور میں فاران صاحب کے زیر استعمال رہی تھی۔ مگر اسے اس قدر بہترین کنڈیشن میں رکھا گیا تھا کہ چودہ سال پرانی لگتی ہی نہ تھی۔ اب جب سے لڑکیوں نے کالج و یونیورسٹی جانا شروع کیا تب سے یہ گاڑی گویا اسی کام کے لیے مختص ہو گئی تھی۔
مگر اب یہ نیا دعوے دار.....؟
اس کے چہرے سے تپش کی لہریں لپٹیں۔ سن گلاسز آنکھوں پہ لگائے اسٹیئرنگ کو انگلیوں سے بجاتا وہ جیسے اپنی بات کی سنگینی سے واقف ہی نہ تھا۔
"تم..... تم یہاں قبضہ کرنے آئے ہو یا کوئی پرانا بدلہ لینے.....؟"
غصے کی شدید لہر نے مہر ماہ کو ساری اخلاقیات بھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر فوراً" ہی اپنی چیزیں سمیٹتی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور زوردار طریقے سے دروازہ بند کیا۔
"بی ہیو یور سیلف....." وہ ناگواری سے اونچی آواز میں بولا۔ "پرانے بدلے ہی رہنے دو۔ نئے کھاتے مت کھولو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔"
"ہنہ....." وہ تنفر سے اسے دیکھتی پاؤں پٹختی اندر کی طرف بڑھی۔
"کیا ہوا چھٹی ہے آج.....؟" تزئین نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے رک کر حیرت سے استفسار کیا۔
فرزین اور ملاحہ باتیں کرتی نکل گئی تھیں۔ مہر ماہ لحہ بھر کو رکی۔
"وہاں گاڑی میں گاڑی کا اصل حق دار آکر بیٹھا ہے۔" اس کے انداز میں برہمی تھی۔ تزئین محظوظ ہو کر مسکرائی۔
"اوہو..... موحد آفندی.....؟" اس نے فوراً" ہی بوجھ لیا تھا۔
"ہنہ..... بے چارے نے اپنی زندگی میں اتنی لگژریز (آسائشیں) دیکھی جو نہیں۔ آتے ہی قبضے کی فکریں لگ گئیں۔"
اونچی آواز میں پلٹ کر کہا جس کو سنانا مقصود تھا۔ اس نے چہرہ موڑ کر دیکھا مگر سن گلاسز نے آنکھوں کے

تاثرات مخفی رکھے۔

"کم آن مہو..." تزئین نے آواز ہلکی رکھی تھی۔
"آجاؤ مزہ رہے گا۔ ہم بھی تو دیکھیں 'موحد فاران آفندی چیز کیا ہے۔" اس کے لہجے میں دبادبا جوش تھا۔ مہماہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
"تم جاؤ۔ مگر مجھے ایسے کام کرنے کا کوئی شوق نہیں جس میں عزت نفس مجروح ہوتی ہو۔"
وہ تیکھے انداز میں کہتی اندر چلی گئی۔ یہ تو طے تھا کہ آج اس کی یونیورسٹی سے چھٹی تھی۔
"ہنہ... پتا نہیں اکڑتی کس بات پہ ہے۔" تزئین بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکتی گاڑی کی طرف بڑھی۔ جہاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ملاحہ اور فرزین بھی حیران سی تھیں۔ ان کے برعکس تزئین نے بڑے اعتماد کے ساتھ جا کے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔
"ویلکم کزن...!" تزئین کے انداز میں بہت خوش گواری تھی۔ ملاحہ اور فرزین ابھی ابھی مہماہ کے جملے سے مستفید ہو چکی تھیں جو وہ موحد آفندی کی شان میں بول کر گئی تھی۔ ان کی سانسیں تھمیں۔ مگر اگلا لمحہ حیران کن تھا۔ موحد آفندی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تھینکس..."
اس نے یونہی مسکراتے ہوئے تزئین کی طرف دیکھا اور جملے میں اضافہ کیا۔
"تھینک گاڈ... یہاں سب بدتمیز نہیں ہیں اور سڑیل بھی۔" تزئین نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر گویا اس کے فقرے کی داد دی۔

"جی نہیں۔ میری آپی نہ تو بدتمیز ہیں اور نہ ہی سڑیل۔" ملاحہ کو برا لگا تھا۔

"اوہ۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ہلکے سے ہنسا۔
"تمہاری آپی کا نام کس نے لیا... ؟ میں نے تو بدتمیز اور سڑیل کہا ہے۔"
فرزین نے ملاحہ کی پسلی میں کہنی چبھوئی تو وہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
تزئین منٹوں میں اس سے فری ہوئی تھی۔
"راستہ بتاتی جانا..." وہ کہہ رہا تھا۔
"اسی اسپیڈ میں چلے تو پھر دوسرے پیریڈ کی بیل بھی بج چکی ہوگی۔" فرزین بڑبڑائی۔
"رائٹ ہینڈ اسٹیئرنگ ہے، بس دعا کرو کہیں گاڑی نہ ٹھوک دوں۔" وہ اونچی آواز میں بولا تب ان تینوں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اتنے سالوں تک بائیں طرف ڈرائیونگ کرنے والا آج سیدھے ہاتھ پہ جانے کیا کمال دکھانے والا تھا۔ تزئین نے دہل کر اسے دیکھا۔ فرزین اور ملاحہ نے تو دل ہی دل میں باقاعدہ قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا تھا۔
فرزین اور ملاحہ کو کالج اتارنے کے بعد اس کا رخ اب تزئین کی یونی کی طرف تھا۔
"تمہیں برا لگا ہوگا مہماہ کا انداز... ؟" تزئین نے کچھ سوچ کر پوچھا۔
"کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے کون سا اچھا لگتا ہے میرا انداز۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔
"یہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے دوسروں کی نظر میں آنے کا۔ یو نو۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اسے عادت ہے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی۔"
وہ بظاہر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی۔ موحد نے اس کی یونی کے گیٹ کے سامنے گاڑی

رو کی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔
"مگر اسے شاید معلوم نہیں کہ "دشمن" کے سامنے خود کو "نمایاں" کرنا کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"
وہ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا مگر تزئین کئی ثانیوں تک اس کی بات کی "سنگینی" کو سمجھنے کی کوشش میں گاڑی کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
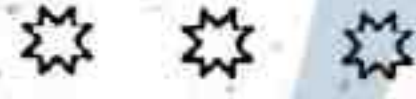
زرگل بائی کی اس قدر اخلاق باختہ گفتگو نے زرنگار کے تو حواس اُڑائے ہی تھے، وقار آفندی کا دماغ بھی گھما دیا۔
"کیا بکواس ہے یہ... ؟"
وہ تمام تر اخلاقیات بھول کر غرّایا۔ پٹھان خون تپا تو چہرے پر سرخی چھلکنے لگی، حواس کو قابو میں کرتی زرنگار پھرتی سے ساس اور داماد کے بیچ آکھڑی ہوئی۔
"آپ اندر کمرے میں چلیں وقار! میں بات کرتی ہوں اماں سے۔" ملتجیانہ انداز، آنکھوں سے چھلکتی ندامت دبے جا رہی۔
وقار نے لب بھینچ کر بہت کچھ اندر ہی روک لیا۔
"ارے تو کیا جھوٹ کہا میں نے؟" طوائف کے کوٹھے پر تھی تب دو کے بجائے چار وقت کھانے کو ملتا تھا۔ یہ اچھی عزت اور شرافت ہے جو پہلے تو کرائے کے مکان میں لائی اب کھانے کے بھی لالے پڑنے والے ہیں۔"
زرگل بائی کو مردوں کے تیوروں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔
ایک طوائف کو زندگی بھر ایک مرد کے تیوروں ہی سے تو واسطہ پڑتا ہے۔ وہ وقار کے انداز سے ڈری نہیں۔ تیز لہجے میں بولی تو زرنگار نے پلٹ کر دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔
"اللہ کا واسطہ ہے اماں۔ گھر بسا نہیں سکتیں میرا تو اجاڑو بھی نا۔" اس کے لب و لہجے میں محسوس کن سختی تھی۔
وقار غصے سے بھرا بیڈ روم میں چلا آیا۔ فل اسپیڈ پر پنکھا چلایا اور نیم اندھیرے کمرے میں ہی جوتے ادھر ادھر پھینک کر بستر پر دراز ہو گیا۔ زرگل بائی نے صحیح معنوں میں اس کی رگوں میں شرارے دوڑا دیے تھے۔ مگر آوازوں کا راستہ کون روک سکا ہے بھلا؟
"یہ شریف مرد ایسے ہی ہوتے ہیں زرنگار! چار دن کی چاندنی والا حساب ہوتا ہے ان کا۔ ابھی تو عشق کے خمار میں ہے۔ ذرا سا نشہ ہلکا ہونے دے، پھر دیکھنا واپس نہ لوٹا اپنے محل میں تو کہنا۔ خرید کے لانے والا بھلا کیا عزت کرے گا تیری۔"
زرگل بائی کے لب و لہجے میں وقار آفندی کے لیے نفرت حقارت سبھی کچھ تھا۔ انداز وقار آفندی کو سنانے والا...

"بس کرو اماں...!" زرنگار کے ضبط کی حد یہیں تک تھی۔ پھٹی پھٹی آواز میں چیخ کر بولی۔
"اور تم... اپنی شرافت کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ تم سے تو اچھا ہے ماں، جو مجھے برے ہاتھوں میں جانے سے پہلے خرید لایا۔ مگر "بیچنے والی" کے بارے میں تم کیا کہو گی اماں؟ مائیں بھی کبھی اپنی اولاد کو بیچا کرتی ہیں اماں؟" اس کا سوال بہت دکھ بھرا اور کرب ناک تھا۔

"طوائفوں کی اولادیں ہمیشہ سے بکتی آئی ہیں۔" زرگل بائی نے ڈھٹائی سے کہا تو زرنگار کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔

"طوائف تو ایک نام ہے اماں، محض ایک پیشہ.... "ماں تو ہر صورت ماں ہوتی ہے۔ ماؤں کی دعائیں تو اولاد کی قسمت بدل دیا کرتی ہیں۔ پھر تم نے کیوں میری قسمت میں "بکنا" ہی مانگا؟ نکاح کے چار بول پڑھا کے خالی ہاتھ دعاؤں کے سہارے ہی رخصت کر دیتیں۔ تو کسی کی مجال نہ تھی جو مجھے آج خریدنے یا بیچنے کا طعنہ دیتا۔"

وہ رونے لگی تھی۔ زرگل بائی خاموشی سے اسے روتا دیکھتی رہی۔ پھر اکتا کر بولی۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ جیسے تو راضی۔ میرا کیا ہے نوراں ہے، ریشم اور مسکان ہیں۔ تھیلے بھر بھر کے نوٹ لاتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کسی شے کی کمی نہیں۔ بس تیری طرف سے گرم ہوائیں جاتی ہیں مجھے۔ (گویا بڑی محبت ہو زرنگار سے۔)"

"عورت طوائف کے کوٹھے پہ پیدا ہو کر طوائف نہیں بنتی۔ آج یہ بات تو زرنگار نے ثابت کر دی ہے۔"

وقار آفندی اندر سے سرد لہجے میں بولتا باہر نکلا تھا۔ پھر اس نے انگشت شہادت سے زرگل بائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت اور تاسف سے کہا۔

"طوائف ہونا ایک سوچ اور احساس کا نام ہے۔ جو زری نے اپنے اندر پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ اور جو تم میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔"

"ہنہ....!" زرگل بائی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور چلنے کو تیار ہوئی۔ زپ کھول کر بیگ میں سے اچھی خاصی رقم نکال کر بنا گنے بیٹی کی طرف بڑھائی۔

"یہ لے پہلی بار تیرے گھر آئی ہوں۔"

"میرے کون سا باپ کی کمائی ہے، جو خوش ہو کے لے لوں اماں۔ جاؤ اور آئندہ کبھی مت آنا۔" زرنگار نے اپنے شانے کے گرد وقار کے مضبوط بازو کا سہارا محسوس کرتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا تو زرگل بائی نے خشونت بھری نگاہوں سے بیٹی کو گھورا۔

"اپنے شوہر کی زبان بولنے لگی ہے تو بھی۔"

"نکاح پڑھوایا ہے اس کے ساتھ اماں۔ پیسوں سے نہیں اپنے عمل سے خریدا ہے اس نے مجھے۔ ساری عمر غلامی کروں اس کی تو بھی کم ہو گی۔" زرنگار کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے بھئی ختم تیری میری، مر گئی تو نہ آئیو ان گلیوں میں۔ سمجھوں گی جنا ہی نہیں تھا میں نے تجھے۔"

وہ نوٹ بیگ میں ٹھونستی بڑبڑاتے ہوئے وقار اور زرنگار سے اعلان قطع تعلق کرتی چلی گئی، زرنگار نے آگے بڑھ کے جلدی سے دروازہ لاک کر دیا جیسے پھر سے زرگل بائی کے ___ آنے کا اندیشہ ہو۔

پھر پلٹ کر ڈرتے ڈرتے وقار کو دیکھا وہ صوفے میں دھنس گیا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ تھی۔ زرنگار کا دل ڈوب سا گیا۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی آکر صوفے کے بازو پر بیٹھی اور جھک کر وقار کے گلے میں دونوں بازو ڈال دیے۔ رخسار اس کے گال سے مس کیا۔

"سوری وقار! مجھے پتا ہوتا کہ اماں آپ سے اس برے طریقے سے بات کریں گی تو میں کبھی ان کے کہنے پر بھی انہیں اپنے گھر نہ لاتی۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی اور انداز میں پشیمانی تھی اور وہ جو سنجیدگی سے زرنگار کی کلاس لینے کا سوچ کر یہاں بیٹھا تھا اس کے معذرت کے اس قدر دلبرانہ انداز پر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

"ہوں...."

"ناراض تو نہیں ہیں مجھ سے؟" وہ اپنا شک دور کرنا چاہتی تھی۔
"اتنے پیارے انداز سے مناؤ گی تو کون کافر ناراض رہ سکتا ہے۔" اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اس کے قریب آنے کے انداز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو زرنگار نے مسکراتے ہوئے سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔
"کل ایک جگہ جاب کے لیے جانا ہے' دعا کرنا کام بن جائے' تنخواہ بھی بہت اچھی دے رہے ہیں۔" وقار نے مسکراتے ہوئے خوش خبری سنائی تو زرنگار کھل اٹھی اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔
"ان شاء اللہ ضرور ہو جائے گی نوکری۔"

☆ ☆ ☆

"ایک تو یہ آغا جان بھی نا.... انہیں کوئی بتاتا کیوں نہیں' ہر انسان اصولوں کے لیے نہیں بنا بلکہ اصول انسانوں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"
ثمرہ کو وقار اور اس کی خوب صورت بیوی کو گھر سے بے گھر کرنے کا سخت دکھ اور افسوس تھا۔ مگر نرے دکھ اور افسوس سے بات نہیں بنا کرتی اس لیے فاران خاموشی سے فیکٹری سے لائی فائل چیک کرتے رہے۔
"آپ ہی کچھ ہمت دکھا دیتے۔" ثمرہ کو ان کی خاموشی سے بھی چڑ ہوئی۔
"سمجھانے کی کوشش تو کی تھی آغا جان کو۔ مگر.... تم جانتی تو ہو۔ اب تو تمہیں بھی ان کی نیچر کا پتا چل چکا ہے۔"
وہ قلم سے ہندسوں کو درست کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اس کی تشفی کے لیے بولے۔ تو وہ مزید کڑھی۔
"ہنہ.... بڑا اچھا سمجھایا.... اور مجھے تو ماں جی پر حیرت ہو رہی ہے۔ مائیں تو بچوں کی نظر کا اشارہ تک سمجھ لیتی ہیں۔ مگر انہوں نے تو آغا جان کے ساتھ مل کے اپنے بیٹے کا دل ہی دکھا دیا۔"
فاران آفندی کو محسوس ہوا ثمرہ واقعی ڈسٹربنس کا شکار تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کی تسلی کے لیے کچھ کہتے' دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر چونک گئے۔
"آجائیں....." ثمرہ نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کھلتے دروازے سے ماں جی کو اندر آتے دیکھ کر ثمرہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ آگے بڑھ کر احتراماً ان کا ہاتھ تھام کر اپنے بستر پر لا بٹھایا۔
وہ آزردہ دکھائی دیتی تھیں۔ فاران نے بھی فائل سمیٹ دی اور اٹھ کر ماں جی کی طرف آگئے۔
وہ پہلے بھی ان کے کمرے میں کبھی کبھار ہی آتی تھیں اور ان چند ماہ میں تو وہ بھی بند کر دیا جب سے فاران کی شادی ہو گئی تھی۔
"خیریت تو ہے ماں جی.....؟" انہوں نے پر تشویش انداز میں استفسار کیا تو ماں جی کی آنکھیں بھر آئیں۔
"جس ماں کا لاڈلا' جگر کا ٹکڑا کاٹ کے بے دردی سے پھینک دیا گیا ہو اس کی زندگی میں اب خیریت کہاں رہی۔"
وہ آہ بھر کے بولیں۔ پھر دوپٹے کے پلو سے بہتی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ ثمرہ نے جتانے والے انداز میں شوہر کو دیکھا۔
"آپ آغا جان سے بات کریں نا۔ ہماری تو انہوں نے ایک نہیں سنی۔" فاران آفندی بے بسی سے بولے۔
"تو وقار کو سمجھا۔ اس دو کوڑی کی عورت کی خاطر ہم سب کو چھوڑ گیا ہے وہ۔" انہوں نے شکوہ کیا۔
"اگر وہ دو کوڑی کی عورت ہے تو پڑا رہنے دیتے اس گھر کے کسی کونے میں اس کی خاطر کیوں گھر سے نکال دیا آغا جان نے اپنے بیٹے کو۔" فاران کو ماں جی کے الفاظ پر سخت اعتراض ہوا تھا انہوں نے ناپسندیدگی سے کہا۔

"انسان کو اپنے جسم سے بہت محبت ہوتی ہے مگر کسی عضو کو جب کینسر ہو جائے تو اسے کاٹ کر الگ کرنا ہی پڑتا ہے وہ بھی تو طوائف کو اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔"

ہاں جی کا اپنا فلسفہ تھا۔ آخر میں شکایتی انداز میں بولیں تو فاران کو تاسف ہوا۔

ثمو کا دل تو بہت چاہ رہا تھا تقریر جھاڑنے کو مگر یہاں چھوٹوں اور خصوصاً" بہوؤں کا بیچ میں بولنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ (اور چند ماہ پرانی بہو تو واجب القتل قرار پاتی شاید)۔" ہو گی وہ طوائف ماں جی۔ مگر وقار سے شادی کرنے سے پہلے تک نا۔۔۔ اس گھر میں تو وقار آفندی کی بیوی کی حیثیت سے آئی تھی وہ۔ آغا ذوالفقار آفندی کی بہو بن کر۔"

فاران جذباتی ہونے لگے۔ اور ماں جی لاجواب۔ مگر آغا جان کے بنائے اصولوں میں زندگی گزار گزار کر اب تو غلط فیصلہ بھی غلط نہیں لگتا تھا۔ بس جو آغا جان نے کہا وہ ہو جانا چاہیے آفندی ہاؤس میں۔ ورنہ کوئی چھوٹی موٹی قیامت تو آ ہی جائے گی۔

"تو اس سے بات کر فاران۔ میں خود۔۔۔ بڑی اچھی اور اصیل ذات کی لڑکی سے کرواؤں گی اس کی شادی۔ سب سے خوب صورت لڑکی ڈھونڈوں گی اپنے لاڈلے کے لیے۔"

ماں جی نے فوراً" ہی جوڑ توڑ کر لیا۔ بچے کو مہنگے سے ۔۔۔ مہنگا کھلونا لے کر دینے کا وعدہ۔ فاران اور ثمو نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"ماں جی۔۔۔ اس لڑکی کے لیے وہ ہم سب کو چھوڑ گیا ہے۔"

"ہم سب کو۔" اور آپ کا خیال ہے کہ اس نے ہماری خاطر اپنی بیوی کو نہیں چھوڑا تو کسی خوب صورت لڑکی کی خاطر تو ضرور ہی چھوڑ دے گا۔۔۔ واہ۔"

فاران کے لب و لہجے میں ناراضی اتر آئی تھی۔ ماں جی بات کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ گئیں تو آہ بھر کے رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

تھوڑی دیر تک تو وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر غصہ کم کرتی رہی پھر وہ تنتناتی ہوئی سیدھی آغا جان کے پاس آئی۔ وہ یقیناً" اخبار کے مطالعے کے لیے اسٹڈی میں جانے ہی والے تھے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نظر ڈالی۔

"یونیورسٹی نہیں گئیں تم۔۔۔؟"

"جانا تو تھا مگر آپ کے پوتے نے ہماری گاڑی پر قبضہ کر لیا ہے۔" مہپارہ کو بڑی ہتک محسوس ہو رہی تھی سلگ کر گویا شکایت لگائی آغا جان نے اس باغی پوتی کو ہلکا سا گھور کے دیکھا اور جتاتے ہوئے کہا۔

"قبضہ کرنے کی کیا بات ہے۔ اس کے باپ کی گاڑی میں جاتی تھیں تم سب۔"

"وہ نئی گاڑی بھی لے سکتا تھا آغا جان۔ ضروری تھا کہ میری انسلٹ کرتا یوں جتا کر کہ جس نے نہیں جانا وہ نہ جائے۔" بس پاؤں پٹخنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ مہپارہ کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

"ایک تو تم لوگوں کی "انسلٹ" بھی فوراً" ہی ہو جاتی ہے۔ باقی سب یقیناً" اسی گاڑی میں گئی ہوں گی؟" آغا جان نے تیقن سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" (ان سے اس کی دشمنی تھوڑی ہے) مہپارہ نے سر جھٹکا۔

"بس ایک تم ہی ڈھیٹ ہو۔ باقی کسی نے انسلٹ محسوس نہیں کی بس تمہاری انا کے جھنڈے سب سے بلند

ہیں۔ بڑا ہے تم سے۔ کچھ کہہ بھی دیا تو برداشت کرنا سیکھو۔"

آغا جان نے اسے بری طرح جھاڑ دیا تھا۔ مہماہ کی آنکھیں بھر آئیں غم و غصہ اس قدر شدید تھا کہ حد نہیں۔ یعنی اس گھر کا "اصل وارث" آ چکا تھا۔

"تو وہ کیا تھیں.... محض لڑکیاں....؟ بلکہ ان چاہی اولاد... بیٹیاں....؟"

اس کے لب کچھ کہنے کو پھڑپھڑائے مگر پورا یقین تھا کہ ساتھ ہی آنسو بہہ نکلیں گے تو لب کاٹ کے رہ گئی۔

"دیکھو مہو.... اچھا ہوا، ابھی یہ بات ہو گئی.... دو بیٹے کھوئے ہیں میں نے۔ تب جا کے اس گھر کا وارث ملا ہے مجھے اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی خرابی کا باعث بنو۔"

ان کا لب و لہجہ دبنگ تھا۔ جتاتا ہوا۔ اس کی اوقات بتاتا ہوا۔

جب موحد نے شروع میں آغا جان کا دل دکھایا تب مہو نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ موحد کو آغا جان کے قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ مگر یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔

وہ تیزی سے ان کے کمرے سے باہر نکلی اور باہر نکلتے ہی آنسو نکل آئے۔ (اب کون سا کوئی دیکھ رہا ہے) اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ مگر ساتھ ہی کسی کے کھنکھارنے کی آواز پر وہ بے ساختہ ہی بدک اٹھی۔ فوراً ہی ہاتھوں سے چہرہ پونچھنے کی سعی کی۔ مگر ہاتھ ہٹاتے ہی موحد کو سامنے دیکھ کر اس کے اندر تک کڑواہٹ اتر گئی۔ چہرے پر چھائے شکست و ریخت کے نشان اسی ایک دشمن سے تو مخفی رکھنے تھے اور وہی کمبخت سامنے آ گیا۔

"آغا جان سے شکایت کرنے گئی ہو گی میری....؟"

وہ پوچھ رہا تھا اور گویا بوجھ چکا تھا۔ انداز اس قدر لطف لینے والا تھا کہ مہماہ کو وہ دنیا کا عیار اور بد تمیز ترین انسان لگا۔

"شٹ اپ...." مہماہ پھٹ پڑی "وارث ہو گے۔ تم گاڑی اور اس گھر کے۔ میرے نہیں ہو۔ مجھ سے میری اجازت کے بغیر کبھی بات بھی مت کرنا۔"

وہ زہر خند لہجے میں کہتی ہوئی اس کے قریب سے طوفان کی طرح گزر گئی تھی۔ موحد نے ہونٹ سکیڑ کر اسے

سب سے کٹ کر ایک طرف ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔ فنکشن اپنے عروج پر تھا۔ ہنسی مذاق قہقہے۔
ایسے میں دل ہواؤں میں اڑ رہا تھا تو مہماہ آفندی اور طلال کا۔
کسی کا دل جل جل کر سلگ رہا تھا تو تزئین آفندی کا۔ اور کوئی اس شور ہنگامے اور رونقوں سے ٹینشن کا شکار ہو رہا تھا تو موحد آفندی تھا۔

وہ ان سب کے ہنستے چہروں سے ہنسی نوچ لینا چاہتا تھا۔ وہ ثمرہ کو تلاشتا ہوا بالآخر ان تک پہنچ ہی گیا۔
"اکیلی کیوں بیٹھی ہیں ماما؟" وہ تشویش زدہ سا ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔
"دیکھ رہی ہوں۔ ہمیں اکیلا کر دینے والے اپنی خوشیوں میں مگن ہیں۔" انہوں نے آہ بھری۔ تو موحد نے ان کی آزردگی کو پوری طرح محسوس کیا۔ تب ہی ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تیقن سے بولا۔
"مگر یہ لوگ نہیں جانتے کہ اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔"
ثمرہ نے نم آلود ہنسی کے ساتھ موحد کو دیکھا اور غم سے چور لہجے میں بولیں۔
"ہاں اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔"
موحد نے چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھا پھر لب بھینچتے ہوئے اسٹیج پر مچے ہنگامے پر نظریں گاڑ دیں۔
"ہمیں کبھی پوری خوشیاں نہیں ملیں۔ ان پر خدا بہت مہربان ہے موحد۔" ثمرہ کے لب و لہجے میں کسک سی تھی۔ ایک خلا تھا جو پر ہونے میں نہ آتا تھا ایک کمی سی تھی.... جو کسی طور مکمل ہوتی ہی نہ تھی۔
مانو، پزل کا ایک ٹکڑا بیچ میں سے غائب ہو گیا ہو اور سارے ٹکڑے جوڑ لینے پر بھی تصویر سمجھ میں نہ آتی ہو۔ محض اس ٹکڑے کی غیر موجودگی کی وجہ سے....

تو کیا ان کی پوری تصویر ہی اس ٹکڑے میں تھی؟ وہ گمشدہ ٹکڑا.... ان کے وجود کا حصہ....
"ان میں سے بھی کوئی اپنی مکمل خوشی نہیں پا سکے گا ماما۔ تب ان کو اندازہ ہو گا کہ اللہ کیسے نامہربان ہوتا ہے۔"
موحد کی سلگتی نگاہیں آج محفل کی جان بنے طلال اور مہماہ کے مسکراتے چہروں پر تھیں اور ہاتھ ثمرہ کے ہاتھ پر۔

☼ ☼ ☼

زرنگار نے دروازہ کھولا تو اس کے وہم و گمان میں بھی وہ ہستی نہ تھی جو اس کی چوکھٹ کے باہر کھڑی تھی۔
"آ.... آپ...." وہ بحر حیرت و بے یقینی میں غوطہ کھا گئی۔
"بہت سے کام انسان کو اپنی دلی رضا کے بنا بھی کرنا پڑتے ہیں۔ وہ کام جو ان کے پیاروں کی محبت ان سے کرواتی ہے۔"
ماں جی مدبرانہ مگر زخمی لہجے میں کہتیں، زرنگار کی تقلید میں فلیٹ میں داخل ہوئیں تو زرنگار نے ان کے پیچھے اضطراری نگاہ ڈالی۔
"اکیلی آئی ہوں۔ ڈرائیور کچھ دیر بعد لے جائے گا آکر۔ کوئی طوائف کے گھر آنے کو تیار ہی نہ تھا۔"
ماں جی نے بڑے رسان سے کہا اور پھر زرنگار کی اڑی رنگت دیکھی۔ مگر اس کا حوصلہ بھی کمال تھا۔ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔
"طوائف تو اپنا گھر چھوڑ آئی ماں جی.... میں تو خود آپ کے بیٹے کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر آئیں۔"
"ہنہ...." وہ ہنکارا بھرتی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ بہت تکلف سے۔ جیسے چھوٹتے ہی بھاگ نکلنے کا پروگرام ہو۔

"وقار کہاں ہے؟" وہ بڑے رعب ودبدبے سے بات کرتی تھیں۔ انداز ایسا ہی تھا گویا زرنگار سے مخاطب ہونا ان کی شان کے خلاف ہو مگر بات کرنا مجبوری ٹھہری۔
"انہیں کہیں نوکری مل گئی ہے۔ وہیں جاتے ہیں اب۔ شام کو واپسی ہو گی۔"
زرنگار نے ہاتھ مسلے۔ شرمندگی ندامت حد سے سوا ایک ماں کالاڈلا بیٹا اس کے عشق میں رُل گیا تھا۔
ماں جی بھی سن کر تڑپیں۔
"تیرا بیڑا غرق ہو..... اس نے تو ساری عمر کما کے نہ کھایا۔ کہاں رول رہی ہے میرے ہیرے کو۔"
زرنگار کی پیشانی چمک اٹھی۔
"اتنا بڑا آفس بنا کے دیا ہوا ہے اس کے باپ نے اسے۔ وہاں بیٹھ کے گھر آجاتا تھا بس وہ ہر ماہ نوٹوں سے جیب بھری ہوتی تھی میرے لاڈلے کی۔" ان کے تو کلیجے پر ہی ہاتھ پڑ گیا تھا۔
"اچھی نوکری ہے ماں جی! وہ خوش ہیں۔" زرنگار نے ہمت کی۔
"خاک اچھی ہو گی۔" انہوں نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی "مہینے بعد پانچ چھ ہزار لاتا ہو گا۔ اتنا تو وہ یار دوستوں پہ لٹا دیا کرتا تھا۔" جتایا۔
"میں آپ کے لیے ٹھنڈا لاتی ہوں۔" زرنگار ان کی تلخی سے گھبرا گئی۔
"رہنے دو... پی کر آئی ہوں میں۔" انہوں نے ایسے منع کیا جیسے وہ زبردستی ہی پلا دے گی۔

"پتا نہیں طوائف کے برتن میں کھانا پینا حلال بھی ہے یا نہیں۔" انہیں اپنے لاڈلے کی قسمت پر رونا آنے لگا۔
"منہ مارا بھی تو گند پر۔" گھبرائی ہوئی سی زرنگار ان کے سامنے والے ..... صوفے پر ٹک گئی۔
"اگر میں ڈھیر سارا روپیہ دے کر تیری زندگی بنا دوں تو کیا تو میرے بیٹے کو چھوڑ دے گی؟"
ماں جی سودا کرنے آئی تھیں۔ زرنگار کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔
"ایک زندگی کو چھوڑ کر تو اسے پایا ہے ماں جی۔ اب پھر سے زندگی پانے کے لیے اسے چھوڑ دوں؟" زرنگار نے بڑے حوصلے سے پوچھا۔
"میرے ساتھ کتابی باتیں مت کر..." انہیں غصہ آیا۔
"طوائف زادی ہے۔ کھلے ہاتھوں روپیہ خرچ کرتی ہو گی۔ وقار کو تو باپ نے عاق کر دیا۔ تجھے اللّے تللّے نہیں کروا سکتا اب۔ اس کی جان چھوڑ دے۔ بدلے میں جو مانگے گی دوں گی روپیہ سونا زمین..."
"نہ ماں جی...!" وہ تڑپی۔ "بڑی مشکل سے طوائف کے کوٹھے کا لیبل اتارنے کا موقع ملا ہے۔ روپے پیسے کے بدلے شوہر دے دوں گی تو پھر سے طوائف ہی کہلواؤں گی۔"
"وقار کی آنکھوں پہ ایسی جذباتی باتوں کی پٹی باندھی ہو گی تم نے۔ مگر یہ دیکھو..." انہوں نے حقارت سے کہتے ہوئے اپنا بڑا سا پرس کھولا تو اس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔
"ایسی ہی کئی گڈیاں اور دوں گی..... اور پھر دیتی رہوں گی بس ایک بار میرے وقار کو چھوڑ دے۔"
وہ اسے للچا رہی تھیں۔ زرنگار پھیکے انداز میں مسکرائی۔
"یوں کہیں نا کہ جینا چھوڑ دوں۔"
"بکواس بند کر یہ شکار پھانسنے والی باتیں میرے دل پہ اثر نہیں کریں گی۔" وہ آگ بگولہ ہونے لگیں مگر پھر کچھ خیال آیا تو دھیمی پڑ گئیں۔
"اس پہ رحم کر وہ کہاں عادی ہے اس مزدوروں والی زندگی کا۔ اس سے محبت کے دعوے کرتی ہے تو اسے آرام و

سکون کی زندگی جینے کیوں نہیں دیتی۔ تو اسے چھوڑے گی تو پھر وہ میری طرف پلٹ آئے گا۔"

اب وہ اسے جذباتی طور پر کمزور کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ماں جی!" کھلے دروازے سے وقار اندر آیا تو لب و لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

پتا نہیں ماں کی بات سن کر یہ بے یقینی لب و لہجے میں در آئی تھی یا ماں کو وہاں موجود پا کر۔

وہ بے قرار ہو کر اسے بانہوں میں بھرنے کو اٹھیں۔

"اسے کہہ، تجھے چھوڑ دے وقار.... اسے روپوں میں تول دوں گی میں۔ بس یہ چھوڑ دے تجھے۔"

بچوں کی سی ضد... وقار نے تسلی آمیز ایک نگاہ زرنگار پر ڈالی جو زرد رنگت لیے کھڑی تھی۔

"یہ چھوڑ بھی دے ماں جی... مگر میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔" وقار مسکرایا تو اس مسکراہٹ میں طمانیت کے سارے رنگ تھے۔

"اور پتا ہے۔ ایک خوشخبری بھی ہے..." وہ شوخ ہوا ماں کو ساتھ لیے صوفے میں دھنستے ہوئے بولا۔ وہ چونکیں۔

وقار آفندی نے اپنے مخصوص لاڈلے انداز میں ان کے شانے پر سر رکھا اور ان کے کان سے منہ لگایا۔

"آپ دادی بننے والی ہیں۔" ایک کرنٹ سا ماں جی کے پورے وجود میں دوڑ اٹھا تھا۔ اف... انہیں ناپاکی کا شدید احساس ہوا۔ انہوں نے بے اختیار وقار کو زور سے پرے دھکیلا۔

"خبردار! خبردار جو اس پلید عورت کی اولاد کو ہمارا وارث کہا ہو تو۔" وہ غصے و نفرت سے چیخی تھیں۔ وقار نے

حیرت و بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"وہ میری اولاد ہو گی ماں جی..."

"ہنہ... جیسی ماں ویسی اولاد۔" ان کی تو بس تھوکنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

وقار آفندی بلند قامت اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے بھی تو ایک طوائف سے شادی کی ہے ماں جی میں کس پہ پڑا ہوں...؟" صدمے سے چور وقار آفندی کا سوال بہت کڑا تھا اور دکھ سے بھرا۔ ماں جی لاجواب ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی لائف ختم ہو گئی تھی۔ طلال سے ملنا باتیں کرنا ایک خواب سا لگنے لگا۔ ملائکہ اس کی منگنی کے بعد واپس جا چکی تھی۔

"خوامخواہ ثمرہ چچی اور موحد سے مت الجھنا۔" وہ جانے سے پہلے مہپاہ کو نصیحت کر کے گئی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے..."

ان دنوں تو یوں بھی وہ نئی زندگی کے نئے سپنوں میں گم تھی۔ بات کو یونہی اڑا دیا۔

طلال کئی روز سے ملنے کا کہہ رہا تھا۔

"منگنی والے دن اچھا موقع تھا لانگ ڈرائیو کا تم مانی ہی نہیں۔" مہپاہ ہنسی۔

"واہ! منگنی والے دن لانگ ڈرائیو... بھلا کپل ہوتے ہم دونوں۔"

"اچھا! آج تو آجاؤ۔ آئس کریم ہی کھالیں۔"

"وہ تو ہم اپنے اپنے گھروں میں بھی کھا سکتے ہیں۔" مہپاہ نے ہنسی دبائی۔

"اوفوہ یار! تم آئس کریم کھالینا۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا بس۔" وہ بے تاب و بے قرار تھا۔
مہرماہ کا دل معصوم سے تفاخر سے بھرنے لگا۔
چاہے جانے کا احساس ایسا ہی ہوا کرتا ہے..... ہواؤں میں اڑانے والا۔
"کل شاپنگ کے لیے جانا تو ہے میں نے....." وہ کہتے ہوئے رکی تو وہ تیزی سے بولا۔
"بس پھر ڈن ہو گیا..... شاپنگ مال میں ہی مل لیں گے ہم۔ اور وہیں آئس کریم بھی کھالیں گے۔"
"آغا جان یہ سب پسند نہیں کرتے طلال۔" مہرماہ نے اسے احساس دلایا۔
"اسی لیے تو انہیں انوائیٹ نہیں کیا۔" وہ اس قدر اطمینان سے بولا تو مہرماہ کو ہنسی آ گئی۔ جسے روکتے ہوئے وہ بولی۔
"چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ پہلی اور آخری بار ہو گا طلال۔ میں خود بھی اس طرح پبلک پلیس پہ منگیتر سے ملنے کی قائل نہیں۔"
"اوکے..... اوکے ابھی تو شکل اچھی بنا کے آنا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"
وہ جیسے ٹالنے کو بولا تھا۔ ہنستے ہوئے موبائل آف کرتی پلٹی تو اپنے پیچھے لان میں ٹہلتی تزئین کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ جانے وہ کب چہل قدمی کے لیے آئی تھی۔ مہرماہ کو دیکھ کر مسکرائی تو اسے بھی جواباً لب پھیلانے پڑے۔
"طلال کا فون تھا.....؟"
اس نے تیقن سے پوچھا تو مہرماہ نے بے اختیار گہری سانس لی۔ وہ اس کی باتیں سن چکی تھی۔
"ہوں۔" اس نے محض سر ہی ہلایا۔ وہ منتظر رہی کہ شاید تزئین اس بارے میں اس سے مزید پوچھے مگر وہ ٹہلتی ہوئی لان کے دوسرے سرے تک چلی گئی تو سر جھٹک کر مہرماہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ ابھی ابھی اسی خواب سے اٹھا تھا۔
پسینے میں شرابور..... تیز ہوتی دھڑکن لیے۔ اور وحشت تھی کہ جاگ جانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تھی۔
طوائف کا بیٹا..... ناجائز اولاد کا ٹھپہ..... اور وہ برستی بارش والی طویل سیاہ رات۔
جس نے نمیر وقار آفندی کی قسمت کا سارا کھیل ہی بدل دیا تھا اس نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور غٹاغٹ ــــ پانی پی گیا۔
وہ اٹھ کر چلتا ہوا ننگے پاؤں ہی کھڑکی تک آیا اور پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ سورج نکل رہا تھا۔ مگر نسیم سحر میں ابھی نرمی اور کیف باقی تھا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لے کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھرتے ہوئے گویا اندر کی کثافت کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر اندر جلتا بھانبھڑ کسی طور سرد ہی نہ پڑتا تھا۔
ہاہ..... جو آگ چودہ سالوں سے نہ بجھی وہ اب کیا بجھے گی۔ وہ خود پہ استہزاء سے مسکرایا۔
اس کے ہر ہر انداز سے اذیت جھلکتی تھی۔ وہ زندگی جینے کی کوشش کرتا تھا مگر یہ خواب اور خود سے کیے گئے عہد اُسے دوبارہ سے اسی دور میں پٹخ دیتے تھے۔
وہ چونکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ تکیے کے پاس رکھا اس کا موبائل تھرتھرا رہا تھا۔ استعجاب سے بھنویں اچکاتا وہ بستر کی طرف بڑھا۔ اسے بھلا اتنی صبح فون کرنے والا کون تھا۔
مگر پھر سومیہ کے نام پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پہلے فون کاٹنے کا سوچا پھر ایسے ہی فون اٹھالیا۔
"السلام علیکم نمیر وقار آفندی..... کیسے ہو؟" دوسری طرف اس کا مخصوص ہشاش بشاش انداز تھا۔
"وعلیکم..... اور تمہیں میں نے کب کہا کہ فجر کے ٹائم اٹھانا مجھے؟" تیوری چڑھا کر پوچھتے ہوئے وہ بستر پر ٹک

گیا۔

"ہاہ..." وہ طنزیہ ہنسی۔ "ذرا اپنی کھڑکی سے جھانکو مسٹر لسورج چاچو سر پہ کھڑے ہیں آکے۔"

"پھر بھی یہ فرض تمہیں تفویض نہیں کیا تھا میں نے۔" وہ اسی ـــــ انداز میں بولا۔

"تم چپ رہو۔ تم سے کسی نے مشورہ نہیں مانگا۔" وہ اسے باقاعدہ ڈپٹ کر بولی تو وہ اکتایا۔

"صبح صبح یہی بکواس کرنے کے لیے فون کیا ہے؟"

"نہیں... ایک اور خوشی کی خبر سنانے کے لیے۔"

وہ جیسے خود ہی محظوظ ہوئی۔ اس کی خوشی ایسی ہی تھی۔ بچوں جیسی بے ساختہ۔ مگر نمیر ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔

"سنائے بغیر تمہیں چین تو آئے گا نہیں' اس لیے جلدی سے بتا دو۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"

بڑے اکھڑ اور بدتہذیب لہجے میں بولا تو دوسری طرف لمحہ بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر سرپرائز ہی سہی۔" قدرے توقف کے بعد وہ پھیکے لہجے میں بولی تو نمیر آفندی کو جی بھر کے غصہ آیا۔ ایک تو پہلے ہی وہ اس خواب کے زیر اثر بھرا بیٹھا تھا۔ اوپر سے سومیہ کے یہ ڈرامے۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا... صبح صبح یہ ڈرامے دکھانے کے لیے کال کی ہے تم نے؟ بے وقوف سمجھا ہوا ہے مجھے یا پھر بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہو؟"

"نمیر..." وہ دنگ رہ گئی۔

اس سے پہلے بھی وہ لڑتا الجھتا تھا... مگر اس قدر بدتمیزی اور بدمزاجی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"شٹ اپ سومیہ...! اور ایک بات لکھ کے رکھ لو' جو تم چاہتی ہو وہ میں کبھی نہیں بن سکتا... کبھی بھی نہیں۔ انڈراسٹینڈ؟" وہ بری طرح چلایا۔

دوسری طرف وہ آنکھوں میں آنسو لیے گنگ تھی۔ لائن کاٹ دی گئی... سومیہ کا گویا "دنیا" سے رابطہ منقطع ہوا تھا۔ اس کا معصوم سادل' بہت بری طرح ٹوٹا۔

☆ ☆ ☆

مبین آفندی کو قدرت نے شادی کے تین سال بعد بھی اولاد کی خوشی سے محروم رکھا تھا۔ ایسے میں ثمرہ کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر نے آفندی ہاؤس میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ماں جی روتی جاتیں' جب ثمرہ پر سے صدقے کے روپے وار کے کام والیوں کو دیتیں۔

اپنا سر پھرا لاڈلا بیٹا یاد آتا... اس نے بھی تو انہیں خوش خبری دی تھی۔ سب ان آنسوؤں کو خوشی کے آنسو سمجھے۔ نادان دنیا والے۔

غم اور خوشی کے آنسو میں فرق کرنے کے لیے دل کی آنکھ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ رنگ اور ذائقے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں میں ایک سی شفافیت اور ایک سی نمکینی ہوتی ہے۔

صدیقہ بھابی کے تو مانو سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ چند ماہ پہلے آئی ثمرہ ان سے بازی لے گئی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹروں کے علاوہ پیروں فقیروں کے آستانوں کے بھی چکر لگانے شروع کر دیے۔

دوسروں کی خوشی سے حسد کرنے والے درحقیقت اللہ کی تقسیم کی نفی کر رہے ہوتے ہیں ورنہ جو چیز اللہ نے

کسی کو دی ہو اس سے جلنا کیسا؟ جبکہ ہر کسی کو قسمت کے مطابق ملنے کا وعدہ ہے۔
صدیقہ بھابھی کو اندر ہی اندر ثمرہ سے حسد پیدا ہو گیا۔ ان کے خیال میں ثمرہ نے یہ خوشخبری سنا کر ان کی حیثیت گھٹادی تھی۔
اور اللہ بہتر جاننے اور فیصلے کرنے والا ہے۔ تو ہے کسی کی مجال کہ اس کے کیے کے خلاف جائے؟ وہاں تو دم مارنے کی بھی جگہ نہیں۔
صدیقہ بھابی بھی جلتی، تڑپتی، سلگتی، ثمرہ سے نفرت کرتیں مگر وہ اس کا نصیب بدل نہیں سکتی تھیں۔ صد شکر پروردگار کا کہ... اس نے "کچھ" کا اختیار انسان کو دے کر مکمل کا اختیار اپنے پاس ہی رکھا ورنہ انسان نہ تو کسی کو روزی دیتا اور نہ ہی اچھی قسمت۔
اور اللہ ہی بہترین جاننے اور سمجھنے والا ہے۔ بے شک۔

☆ ☆ ☆

ملاحہ اور فرزین کے ساتھ وہ شاپنگ مال آئی تو چند ایک چیزیں ہی خریدی تھیں کہ طے شدہ پلان کے مطابق طلال صاحب تشریف لے آئے۔ مسکراتی نظروں سے وہ بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرتی مہپاہ کو دیکھتا ملاحہ اور فرزین سے ہیلو ہائے کر رہا تھا۔
"واؤ! کیسا سرپرائز ہے..." وہ خوش ہو رہی تھیں۔
"ہو گئی شاپنگ تم لوگوں کی...؟" طلال کا روئے سخن ملاحہ اور فرزین کی طرف تھا۔
"ابھی تو صرف آپی نے اپنی چیزیں لی ہیں۔ میں اور ملاحہ تو رہتے ہیں باقی۔" فرزین نے منہ لٹکایا۔
"اف... اتنی گرمی میں اپنی آپی کو لے کے پھر رہی ہو جبکہ یہ اپنی شاپنگ بھی کر چکی ہے۔ اب تم لوگ اپنی شاپنگ مکمل کر کے آؤ میں اتنی دیر میں فرسٹ فلور پر موجود آئسکریم پارلر کا چکر لگواتا ہوں تمہاری آپی کو۔" مسکراتے ہوئے طلال نے کہا تو مہپاہ کا چہرہ جگمگانے لگا۔
"اور ہم..." وہ دونوں احتجاجاً چلائیں۔
"بھئی، ہم کون سا آئس کریم کھا کر وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ تم دونوں اپنی شاپنگ مکمل کر کے ہمیں وہیں جوائن کر لو۔ ایک آئس کریم تم لوگوں کے ساتھ بھی ہو جائے گی۔" طلال نے فوراً دوستانہ انداز میں حل پیش کیا تو پھر کہیں جا کے ان دونوں کو سکون آیا۔
ان دونوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد طلال نے مسکراتے ہوئے خود سے کترائی کھڑی مہپاہ کو دیکھا۔
"ہاں جی۔ چلیں پھر...؟"
وہ بے ساختہ ہلکے سے ہنس دی۔ "جو کر..." وہ دونوں چلتے ہوئے خود کار سیڑھیوں تک آئے تو ادھر ادھر کی باتوں میں مگن، خود سے کچھ فاصلے پر ان کے تعاقب میں آتے شخص پر ان دونوں میں سے کسی کا بھی دھیان نہ تھا۔
ان دونوں نے خود کار سیڑھیوں پر نیچے جانے کے لیے قدم رکھے... اور ان سے ٹھیک چار سیڑھیاں اوپر ان کے پیچھے آتے شخص نے بھی۔

☆ ☆ ☆

وہ نیند کے جھونکوں کی زد میں تھا۔
"وقار..." زرنگار نے اسے ہولے سے پکارا۔

"ہوں۔۔۔" وہ چونکا۔ نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں پل بھر کو گلابی جھلک دکھا کر پھر بند ہو گئیں۔
زرنگار کو اس پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ اور سب سے زیادہ فخر محسوس ہوا۔
یہ وہ مرد تھا جو اس کے لیے اپنی سلطنت ٹھکرا آیا تھا۔
"وقار۔۔۔ بات تو سنیں۔" اس نے احتجاج کیا۔ ابھی اس نے کمرے کی لائٹ بند بھی نہیں کی تھی اور وہ نیند میں جھومنے لگا تھا۔

"سن رہا ہوں۔۔۔" وہی غنودگی میں ڈوبا لہجہ۔
"آنکھیں تو بند ہیں آپ کی۔۔۔" زرنگار نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
"تمہیں کس گدھے نے کہا کہ میں آنکھوں سے سنتا ہوں۔ کان کھلے ہیں میرے، تم بات کرو۔" بڑے ٹھنڈے طنز سے اب کی بار اس نے تفصیلی "تسلی" کرائی تو زرنگار اسے گھورنے لگی۔ مگر ایک نیند میں جھومتے جھامتے شخص پر یہ گھوریاں کلاشنکوف کے برسٹ سا تو اثر نہیں کر سکتیں ناں۔
"میں سوچ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کیا دے گا؟" دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"تم کو میں اور مجھے تم مل گئیں۔ اب اور کیا چاہیے ہمیں۔" وہ مطمئن تھا۔ سرشار۔
"اونہوں۔۔۔ اولاد کی بات کر رہی ہوں۔" زرنگار نے ٹوکا۔
"وہ بھی اللہ بہتر ہی کرے گا۔" وہ قانع تھا۔ اللہ نے اسے زرنگار دے دی۔۔۔ آگے بھی وہ بہترین ہی دے گا۔
"اور اگر۔۔۔" وہ کہنے لگی مگر شدید جذبات نے کچھ ایسا غلبہ پایا کہ فی الفور گلا رندھ گیا۔ وقار کی آنکھیں پٹ سے کھلیں۔
"اگر۔۔۔ کیا؟" حیرت سے اسے دیکھا۔

"اگر۔۔۔ بیٹی۔۔۔ دے دی تو۔۔۔؟" وہ اٹکی۔ وقار فی الفور اس کی بات کی گہرائی تک پہنچا۔ خشمگیں انداز میں اسے دیکھا اور دانت پیس کر بولا۔
"تو پھر۔۔۔ میں تمہیں ایک زوردار تھپڑ دے ماروں گا۔"
وہ بے اختیار تھوڑا سا پیچھے ہٹی۔ خوف زدہ ہو گئی۔ وقار تھکاوٹ پرے دھکیلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔
"بے وقوف! یہ کیسا سوال ہے؟ زر گل بائی کی بیٹی کو سینے سے لگا کے لے آیا تو کیا اپنی بیٹی کو نہیں اپناؤں گا؟" وہ فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے جواب نے زرنگار کو تشکر کے جذبات میں بھگو ڈالا۔
"اف۔۔۔" اس نے بے اختیار آگے بڑھ کے وقار کے شانے پر سر رکھا۔
"ڈرا دیا تھا آپ نے مجھے۔۔۔"
"اپنی باتیں بھی تو دیکھو۔۔۔ مجھے پتا چل گیا ہے، جو تم پوچھنا چاہ رہی ہو زری۔۔۔ میں اللہ سے بیٹا مانگتا ہوں، اس کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اس سے ہمیشہ بہترین چیز مانگنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ بیٹی دے گا تو شکر الحمدللہ۔ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہو گی۔ بے نام و نشان نہیں۔"
وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ زرنگار کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں خوش گپیوں میں مصروف یونیورسٹی کی شرارتوں اور یادوں کو دہراتے آئسکریم کے پیالے سامنے رکھے اس کے پگھلنے کی فکر کیے بنا باتوں میں مصروف تھے۔
"خبردار جو آئندہ سے تم نے اس طرح ملنے کی فرمائش کی تو، مجھے اتنا برا لگا۔" مہ ماہ اسے آئندہ کے لیے تنبیہہ

کر رہی تھی۔
"اونہوں جھوٹی۔" طلال اس کی شکل دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔ "اچھی بھلی خوش ہوا س ڈیٹ سے۔"
"اُفوہ۔ ملتی تو یونیورسٹی میں بھی تھی تم سے۔ مگر اب یوں پبلک پلیس پہ اسپیشلی آکے.... وہ بھی آغا جان کے خطرے کی تلوار کے سائے میں.... سمجھا کرو نا۔" وہ گھبرانے لگی۔
"حالانکہ اب تو پروموشن ہو گئی ہے۔ فرینڈ سے منگیتر کے عہدے پہ فائز ہو گیا ہوں میں۔ اب تو اس طرح کی حدود وقیود مت لگاؤ۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔
مہراہ کی کھلکھلاتی ہنسی بے ساختہ تھی۔
اسی وقت کسی نے آکران کے ٹیبل کی سطح پر اپنے دونوں ہاتھ جمائے اور جھک کر مہراہ کو دیکھا۔
اس کی ہنسی کو ایک دم بریک لگا۔
"تم...." وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا سی گئی۔ وہ موحد آفندی تھا۔
"ہاں... میں۔" وہ چبا کر بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ طلال کی موجودگی کو قطعی نظرانداز کیے ہوئے مہراہ سے پوچھ رہا تھا۔
"وہ... میں...." مہراہ کی پیشانی چمکی۔
"ایکسکیوزمی! یہ میرے ساتھ ہے۔" طلال نے گویا اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہی۔ موحد سیدھا ہوتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا تو پیشانی پر ناگواری بل پڑے ہوئے تھے۔
"کیوں، مسٹر کس رشتے سے؟"
مہراہ بھک سے اڑی طلال نے بھی بمشکل ضبط کیا۔

"منگیتر ہے یہ میری۔"
"منگیتر ہو شوہر نہیں جو یوں کھلے عام لے کے پھر رہے ہو۔" وہ بھگو کے مارتے ہوئے بولا تو مہراہ تلملا اٹھی۔
"موحد... بی ہیو...." دانت پیس کر بھرپور غصے سے کہا تو موحد نے اسے گھورا اور چبا چبا کر بولا۔
"یہ بات تم ذرا چل کے باہر آغا جان کو بتا دو۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔"
مہراہ کے قدموں تلے سے صحیح معنوں میں زمین سرکی تھی۔
"ڈونٹ وری مہو۔ میں بات کر لیتا ہوں ان سے۔" طلال نے خوامخواہ کی سنسنی پھیلانے والے موحد آفندی پر ایک کڑی نظر ڈالتے ہوئے مہراہ کو تسلی دی تھی۔
"تم نے جتنی باتیں کرنی تھیں کر لیں مسٹر طلال آگے ہمارا گھریلو معاملہ ہے.... اٹھو تم۔" موحد نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے طلال پر گویا اس کی حیثیت واضح کی تھی۔
"ملاحہ اور فرزین ساتھ ہیں میرے۔" مہراہ کو ذرا حوصلہ ہوا۔
"ہاں۔ وہ تو مجھے نظر آ ہی رہی ہیں۔" موحد کا طنز کمال کا تھا۔ مہراہ کو اس کا جتانے والا انداز سلگا گیا۔ مگر غلطی تو بہرحال اس کی اپنی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور طلال کو دیکھا۔
"میں چلتی ہوں۔ فون پہ بات کروں گی۔"
اندر سے خوف زدہ سہی مگر وہ کم از کم طلال کے سامنے یہ کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر موحد کو دیکھا۔
"فرزین اور ملاحہ اندر ہیں۔ مال میں۔"
"میں کال کر لیتا ہوں۔ موبائل تو ہو گا ان کے پاس۔" وہ اسے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ اثبات

میں سرہلاتی چل پڑی۔ موحد نے چلتے ہوئے اچٹتی مگر ایک گہری جتاتی نگاہ طلال پر ڈالی تو وہ اس عجیب سی نگاہ کے معنوں میں الجھا مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا اور ادھر باہر کی طرف قدم بڑھاتی مہواہ کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔۔۔ آغا جان۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ لگی گھنٹی کی آواز تو سب ہی نے سنی۔ مگر چونکہ چوکیدار ہر وقت گیٹ پہ موجود ہوتا تھا سو امید واثق تھی کہ مہمان ہوا تو سیدھا اندر ہی آئے گا۔

تائی جان اور سائرہ چچی ٹیبل پہ رکھی سبزی بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کسی نہ کسی بات کا ذکر چل نکلتا۔ جبکہ ثمرہ نازک سے فریم کی، نظر کی عینک لگائے اخبار پڑھ رہی تھیں۔ جب ٹی وی لاؤنج میں کوئی داخل ہوا۔

"السلام علیکم پھپھو۔۔۔" جوشیلا نسوانی لب و لہجہ۔

ثمرہ نے جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان کے ہونٹ بے اختیار کھلے۔ اخبار رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"گڑیا۔۔۔" وہ بھاگ کر نم آنکھوں کے ساتھ ان سے آلپٹی۔

تائی جان اور سائرہ چچی ہاتھ روکے ان دونوں پھوپھی، بھتیجی کو ملتے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو بھی سلام کیا۔

بھولی سی صورت والی بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ جب پاکستان میں تھے یہ لوگ تو یہ بچی تقریباً" ہر ہفتے ہی آفندی ہاؤس آتی تھی۔ موحد کی ماموں زاد تو تھی ہی۔ دوست بھی ٹھہری۔

سائرہ چچی کی یادداشت کمال کی تھی۔ ذہن میں ہی منٹوں میں جوڑ توڑ کر لیا۔

"کیا بھلا سا نام تھا بھلا اس کا۔" انہوں نے چودہ سال پرانی یادیں کھنگالیں۔

"ہاں۔۔۔ سومی۔۔۔ سومیہ نام تھا اس کا۔ جسے پیار سے سب گڑیا کہتے تھے۔"

وقت کس پل کیا چال چلنے والا ہے اور قسمت کیا کھیل دکھانے والی ہے۔۔۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ سومیہ اپنی پھپھو کے گلے میں بانہیں ڈال کے بیٹھی تھی۔

اور اب اسے انتظار تھا۔ اپنے بچپن کے دوست موحد آفندی کا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عطیہ خالد

خوب صورت اور زندگی

"شمائلہ جواد" میں اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام ایسے لکھتی ہوں جیسے کہ یہ میرا حق ہے اور یہ حق میرے سوا کسی کا نہیں۔ میرا یہ یقین بنا کہے' بنا پرکھے کامل ہے بالکل اسی طرح جیسے سورج نکلنے پر صبح کا ہونا یقینی ہوتا ہے' بھلے سے دھوپ نہ نکلے' بارش برسے' دھند چھائے یا برف گرے' صبح ہو جاتی ہے۔

میری آنکھیں گھور سیاہ ہیں اماوس کی طرح' لمبے بال اور رنگ میدے جیسا۔ میں خوب صورت ہوں۔ اتنا جانتی ہوں اور میرا خوب صوت ہونا کافی ہے تم کو اپنا بنانے کے لیے۔ مزید سوچ بچار وہ کریں جن کے نہ بال اماوس جیسے نہ رنگ میدے جیسا.....

بڑی نخوت سے سوچتی اور سر جھٹک' پیر پٹخ کر بنا کہے جتاتی ہوں یہاں وہاں..... کیوں نہ کروں بھئی' ہر خوش قسمت لڑکی کی طرح میرا بھی ایک عدد خوب صورت منگیتر ہے..... اس کے سوا میرا مدعا نہ کوئی ہے نہ ہی میرے پرورش کرنے والوں نے مجھے سمجھایا۔ میرا کمال دیکھیے! علاوہ خوب صورتی کے..... ایف اے پاس ہوں۔ سہیلیاں کون سا چھپتی ہیں شکل پر..... ابا کا سپر اسٹور ہے اور بھائیوں کی موبائلوں کی دکان' اور بہن بھی میں تینوں کی اکلوتی.....

تو بھئی اترانا میری مجبوری ہے۔ بڑا سڑتی ہے میرے نصیب سے' مرن جوگی امینہ۔ ڈر کے آہستہ نہیں بولتی۔ ڈرے میری جوتی۔ وہ تو اماں کہتی ہیں نہ بتایا کر سب کو نظر لگا دیں گی نامراد۔ تو کروالینی تھی نا بات پکی جواد سے..... میرے منہ میں خاک..... میرا مطلب جب بھا گیا میرا حسن مامی کو تو..... میں تو بھولی بھالی معصوم۔ کوئی زیادتی تو نہیں کی نا بھئی۔ نہ آگے بڑھ بڑھ کے چاپلوسیاں کیں مامی کی اور مامی کہتی ہیں جواد تو کہتا ہے کہ بس گھور کالی آنکھیں ہوں اور اماوس جیسے بال۔ آگے مامی بھی سمجھ دار اور شمائلہ بھی.....

"شمائلہ جواد" ہی سمجھیں آپ۔ ہم رہتے ہیں جعفری ہاؤس کے پہلے پورشن میں' درمیان والے میں تایا صدیق جعفری' تائی صدیقہ اور اکلوتی مرن جوگی امینہ جعفری اور آخری پورشن میں چچا سلیم جعفری'

چچی عاصمہ' صوفیہ' تبسم اور ارسلان' ان کا نک چڑھا لم ڈھینگ' میرا کلاس فیلو تھا میٹرک تک' وہ تو شکر سہلیوں کی مہربانیوں سے آگے نکل گیا مجھ سے ورنہ وہ فرسٹ آکر سمجھتا تھا متاثر کرلے گا مجھے۔

خیر ہو ہی گیا نا میرا بھی ایف اے۔ اب اگر امینہ' صوفیہ' تبسم میری کزنیں جل مرتی ہیں تو جل مریں۔ امینہ اگر اپنی سانولی رنگت پر محنت کرے تھوڑی تو کچھ فائدہ بھی ہو۔ مگر نہ جی لگی ہیں ایم اے انگلش کی تیاری میں' یونیورسٹی جاتی ہیں۔ وزیر اعظم لگے گی جیسے۔ ہنہ..... صوفیہ اور تبسم کا تو خیر مقابلہ ہی مجھ سے کوئی نہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ اتنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ان کو کیا دکھتا ہو گا بھلا۔ بس یہی بات ایک بار میں نے ان سے پوچھ لی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے میں ہوں ہی سادہ اور معصوم۔ خیر تو جی غصہ آگیا۔ ان کی والدہ کو' کہنے لگیں۔

"شمائلہ بیٹا ہر آنکھ کی اپنی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اور اپنے معیار کے مطابق وہ دیکھتی ہے اور تسکین پاتی ہے۔"

مجھے تو اتنی ہنسی آئی کہ لو بھلا... ایک ذرا سی بات پوچھی تھی۔ وہ تو کتاب سنانے بیٹھ گئیں۔

"پتا ہے بھئی! خاندان کی پہلی ایم اے ہیں۔ اب بیٹیاں بھی پڑھائی میں تمغے لے رہی ہیں۔ جہالت تو ان پر ختم ہے بھئی۔" اماں نے تو مامی کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھ کر مجھے ایف اے کے بعد کالج نہ جانے دیا۔

ویسے مجھ سے بھی نہیں پڑھی جاتیں یہ بور کتابیں۔ اماں نے سمجھایا تھا کہ کم صورت ہوں یا غریب غربا مجبوری میں پڑھاتے ہیں لڑکیوں کو کہ کل کلاں کو کوئی رشتہ جڑ جائے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے یہ مصیبت پالنے کی۔ چلو پھر تھوڑا بہت تک تو ٹھیک ہے' لیکن یہ کیا کہ پڑھ پڑھ کے بڈھے ہی ہو جاؤ' آنکھیں باہر نکل آئیں' رنگ روپ جل جائے۔

شکر ہے کہ ایف اے کا رزلٹ آیا تو کل پھر بلایا تھا میں نے مامی کو اور جواد کو چائے پر۔ اف آتے ہی پوچھنے لگے۔

"کیا کرتی ہو آج کل؟"

میں تو شرما گئی' ان کو سوچنے سے زیادہ اہم اور ضروری اور کیا کام ہوگا مجھے بھلا۔ پھر کہنے لگے آگے ایڈمیشن لے لو۔

ابھی جواب بھی نہ سوچا تھا کہ امینہ بیگم ڈونگا پکڑے تشریف لے آئیں کہ...

"حلیم بنائی تھی سوچا چچی کو دے آؤں۔"

(سب سمجھتی ہوں میں تمہارے بہانے۔ ضرور گاڑی دیکھ لی ہوگی جواد کی باہر) اور مامی کو تو دیکھو جھٹ ہاتھ پکڑ کر ساتھ بٹھالیا محترمہ کو کہ چائے پی کر جانا... کوئلہ ہو گیا میرا دل۔

"امینہ یہ تمہارے چہرے پر کیا ہوا؟" (میں نے بھی ڈھونڈ ہی لیا ایک داغ)۔

"بگھار کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔" دوپٹے سے فوراً چھپالیا۔ جواد کی ہمدردی بھری نظروں کو تو میں نے رس گلوں سے اپنی طرف پھیرا۔

"یہ لیں نا جواد آپ کے فیوٹ رس گلے۔" (بھائی نہیں لگایا جاتا اب ان کے نام کے ساتھ)

وہ بھی فوراً" مسکرا کر بولے۔ "فیوٹ نہیں فیورٹ۔"

"ہاہاہا... اماں کا اور میرا تو خوشی کے مارے قہقہہ نکل گیا۔ کتنی فکر تھی جواد کو میرے صحیح بولنے کی۔ ہائے میرا معصوم دل۔ چائے پی کر جواد اور مامی تو چلے گئے اور میں لیٹ گئی ان کو سوچنے کے لیے اور امینہ

بیگم جلدی جلدی چائے کا سامان اماں کی زیرہدایت ٹھکانے لگانے لگی۔۔۔ ہنہ چاپلوس۔۔۔ تین تین بھائی ہیں میرے۔۔۔مذاق ہے کیا۔۔۔"

☆ ☆ ☆

میں سمجھتی ہوں جواد کی آنکھوں کے واضح پیغام کو مگر میری نگاہوں پر تربیت کا ایسا عمدہ پہرہ ہے جو باآسانی اس پیغام پر ردعمل کو دل کے نہاں خانوں میں روک لیتا ہے۔ یوں بھی میری دلچسپی کے سامان بہت ہیں۔ بہت کچھ سیکھنا ہے مجھے اور وقت کم ہے۔ اس لیے رات گئے تک میری کتابیں میرے ساتھ جاگتی ہیں۔ ایک لڑکی ہوں تو چولہے چوکی کا شوق اماں نے لازم کردیا ہے۔ کمپیوٹر کا دور ہے تو اس میدان میں حسب ضرورت ہر طرح کی آگاہی ہے مجھے۔ یونیورسٹی کی سرگرمیاں مجھے مزید آگے بڑھنے کی لگن دیتی ہیں۔ سو رات کو بستر پر لیٹتے ہی نیند آلیتی ہے اور سحر خیزی تو یقیناً "میری درس گاہ کا اولین درس ہے۔

سو جواد کا پیغام جب آنکھوں کے بجائے درست سمت طے کرکے آئے گا تو ضرور استقبال کروں گی میں۔ ورنہ میرا ایمان ہے کہ میرا جوڑ مجھے اپنے وقت پر مل جائے گا۔ اس نیک جوڑ کے لیے میں عرض کرتی ہوں اس کے حضور جو سمیع بھی ہے اور علیم بھی اور اس کی لازوال مہربانیوں پر مجھے ایمان ہے۔

☆ ☆ ☆

امینہ باجی اور تائی اماں جیسا پیارا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اماں سے کم خیر خواہ نہیں ہیں ہماری۔ اپنی کم صورتی کے ہاتھوں ہلاک ہوجائیں ہماری خوب صورت روحیں، کچلے جائیں دل کہ ہمارے معاشرے میں رنگ و روپ کی بہت مانگ ہے۔ تائی اماں ہی تو ہیں جو ہم کو سینے سے لگائے کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ جب شمائلہ باجی اور ان جیسے مذاق اڑاتے ہیں۔ تب تائی اماں کہتی ہیں کہ صوفیہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے، ٹیچر بنے گی۔ بچوں کی تعمیر میں حصہ ڈالے گی۔ میرا سر فخر سے اونچا کرے گی اور تبسم فائن آرٹس میں میرے خواب پورے کرے گی۔ ایسے ایسے لینڈ اسکیپ بنایا کرے گی کہ بس۔۔۔

بس یہ دھن ہمارے اندر جگادی ہے انہوں نے۔ اب ہم ہیں اور ہمارے خواب۔۔۔ مثبت اور تعمیری۔۔۔ نہ فارغ ہیں ہم نہ ہماری سوچیں کہ سرگرداں ہوں یہاں وہاں۔ البتہ اماں افسردہ ہوجاتی ہیں۔

کبھی کبھی کہہ بھی دیتی ہیں کہ "کون بیاہے گا میری بچیوں کو، ہمارے پاس تو دینے کو بہت سازو سامان بھی نہیں۔" ایسے وقت میں اماں کا ایم اے بھی سوجاتا ہے کہیں دور جاکر۔

"ہٹو عاصمہ! خود بھی ناشکری کرتی ہو اور بچیوں کو بھی الجھاتی ہو۔ خبردار جو ایک لفظ بھی ان کی صورت کے متعلق بولیں۔"

تائی اماں نے ڈانٹ دیا اماں کو، پھر نرمی سے ان کا ہاتھ دبا کر سمجھانے لگیں "ان کی سیرتیں نکھار دو عاصمہ، مقدور بھر، تمہارا یہ عمل کسی بہت بڑی نیکی سے کم نہیں۔ ان کے ذہنوں پر امید بن کر نقش ہوجاؤ۔ ان کے معصوم چہروں کو یقین کی روشنی، علم کے نور سے بھر دو کہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ باقی دعا کرو، دیکھو کیسی صورتیں اتر گئی ہیں دونوں کی، چلو پیار کرو ان کو، دیکھو تو مغرب کی اذان کا وقت ہوگیا۔ وضو کرو سب مل کر نماز پڑھیں۔"

پس شب و روز گزرنے لگے اسی ڈھب سے۔ امینہ باجی اور ہم مل جل کر پڑھتے۔ کبھی بیڈمنٹن کھیلتے، کبھی کمپیوٹر گیمز، کبھی کچھ پکاتے، کبھی سلائی کی دھن سما جاتی۔ کبھی صفائی کی اور کبھی گانے گا گاکر تان سین کے سکون کو اجاڑتے۔ سکھ چین کی بانسری زندگی کی امنگوں کے ساتھ بجاتے۔

یہ بانسری اس دن ذرا عجیب دھن میں بجی جس دن جواد بھائی کی امی اور ابا آئے۔ ہم تینوں لاؤنج میں کیرم کھیل رہے تھے کہ السلام علیکم کی آواز سے چونکے۔ وعلیکم السلام تو ہم تینوں نے اتنی حیرت سے کہا کہ ہماری حیرت بھانپ کر ہنستے ہوئے جواد بھائی کے ابو بولے۔

"کیوں بھئی واپس چلے جائیں۔" بڑھ کر ہمارے سروں پر ہاتھ بھی رکھا۔
امینہ باجی مسکرا کر بولیں۔ "آئیے آئیے" اور ان کو لے کر بیٹھک کی طرف بڑھ گئیں اور ہم فوراً "پہنچے اندر۔۔۔"

تائی اماں کو بتا کر ان کو بھی بیٹھک کی طرف روانہ کیا اور کچن میں گھس کر سوچنے لگے کہ مہمانوں کی تواضع کیسے کی جائے۔ اس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ امینہ باجی بھی مہمانوں کو بٹھا کر کچن میں چلی آئیں اور بولیں۔

"صوفیہ! تم ذرا مہمان داری والی کیبنٹ تو کھولو۔" اسے کھول کر جھانکا تو اس میں تو صرف بسکٹ اور نمکو پڑے تھے۔

"ہمارے گھر رات کے کھانے کے لیے کچھ شامی کباب رکھے ہیں۔"

میں امینہ باجی کا جواب سنے بغیر اپنے پورشن کی طرف بھاگی اور اماں کو ساری بات بتا کر ان کو ان کی حیرانی کے ساتھ چھوڑا اور شامی کباب کا ڈبہ اٹھا کر واپس دوڑ لگائی۔ تو امینہ باجی کو پکوڑوں کے لیے آلو پیاز کاٹتے پایا جبکہ تبسم کڑاہی میں تیل ڈال رہی تھی۔ پکوڑے اور کباب تلنے اور چائے بننے تک ہم تینوں اپنی اپنی جگہ ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ امینہ باجی اور جواد بھائی۔۔۔

جیسے ہی امینہ باجی ٹرے لے کر اندر گئیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔۔۔

"بھئی آپا! جب جواد نے خود امینہ کا نام لیا تو بس ہم۔۔۔"

"آؤ۔۔۔ آؤ بیٹا!" امینہ باجی پر نظر پڑتے ہی انکل نے بات کا رخ موڑ دیا۔

"بیٹا! کیسے پیپرز ہوئے تمہارے؟"

"جی الحمدللہ! امید ہے کہ پاس ہو جاؤں گی۔"

"ہمارا بیٹا صرف پاس تو نہیں ہوتا۔۔۔ پوزیشن لیتا ہے۔" انکل مسکرانے لگے۔

امینہ باجی نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے اور گفتگو کا موضوع بھانپتی ہوئی ہمارے پاس باہر چلی آئیں۔ ان کو ٹوہ لینے کی عادت تھی نہ ضرورت۔ رات اماں نے بابا کو انکل اور آنٹی کے آنے کے بارے میں بتایا کہ "امینہ کے لیے جواد کا پیغام لے کر آئے تھے۔"

"جواد کے لیے۔۔۔؟" بابا حیرت سے بولے۔۔۔

"اس کا رشتہ تو۔۔۔"

"جی ہاں! میں نے بھی ان سے یہی بات کہی۔" اماں کہنے لگیں "کہ جواد کا رشتہ تو شمائلہ سے طے ہے۔ تو دونوں حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ کہنے لگے۔ آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو امینہ بیٹی کے امتحان ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور یہ کہ ہمارا تو شروع سے ہی یہ ارادہ تھا اور جواد سے پوچھا تو اس نے بھی "امینہ" کا ہی نام لیا۔"

اماں کا انداز اور لہجہ بڑا متوازن اور فطری تھا۔

"شمائلہ کی بات پر تو وہ تشویش کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم نے تو کبھی شمائلہ کے لیے پیام ہی نہیں دیا کجا بات پکی کرنا۔"

بابا نے بڑے تحمل سے بات سنی اور کہا کہ "بہر حال شمائلہ بھی ہماری بیٹی ہے۔ میں اپنے طور پر شفیق سے پوچھتا ہوں۔"

اگلے روز اماں نے عاصمہ چچی کو ساری بات بتائی اور پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ خیر سے پہلا رشتہ تھا وہ بھی اپنی اچھی جگہ سے۔ اماں مضبوط عقیدے کی مالک تھیں اس لیے عاصمہ چچی کو بھی دعا کی غرض سے ہی بتایا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ دو چار روز میں ہی ابا نے شفیق چچا سے پوچھ لیا کہ شمائلہ کے لیے جواد کا پیام کس ذریعے سے آیا تھا۔ چچا نے بتایا کہ ان کو تو بس سارہ (چچی) نے بتایا کہ جواد کی والدہ کا شمائلہ کے لیے پیام ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ کیونکہ سارہ کے بھائی بھابھی کی ہی تو بات تھی۔

✲ ✲ ✲

"اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے کون چیخ رہا ہے۔" میں یونیورسٹی سے ذرا آکر لیٹی تھی۔ دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ شمائلہ اور سارہ چچی کی آواز پہچان لی اور صد شکر کہ باہر نہیں نکلی کیونکہ ان کے عزائم بڑے جارحانہ تھے... اور زبان... اف... کہ کیسے ان کی معصوم بیٹی کے حق پر ڈاکا ڈالا اور یونیورسٹی میں ہی جواد کو پھانس لیا اور وہ مغلظات خدا کی پناہ...

مجھے اماں کے خیال سے سخت خفت ہوئی اور ان کی فکر بھی۔ جھری سی بنا کر جھانکا تو دیکھا اماں خاموش تخت پر بیٹھی تھیں اور دونوں ماں بیٹی خود ہی چلا چلا کر دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور غالباً "مجھے نہ پاکر واپس جا رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کا اطمینان کر کے میں کمرے سے نکلی اور اماں سے لپٹ گئی۔

"اماں پیاری اماں! مجھے کسی جواد سے شادی نہیں کرنی۔" میں رو پڑی تھی۔ اماں مجھے لپٹا کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"میری بیٹی ذرہ برابر بھی فکر نہ کرے۔"

رات ہی اماں نے بابا سے بات کر کے طریقے سے جواد کے گھر انکار کہلا دیا کہ شمائلہ بھی ہماری ہی بیٹی ہے۔ بے شک کسی غلط فہمی کی بنا پر وہ اس مغالطے میں مبتلا رہی، ہم اس کی دل آزاری کر کے اپنی بچی کی خوشی نہیں کر سکتے۔ اماں بابا کے اس فیصلے سے "میں" مطمئن تھی مگر ایک اداسی سی در و دیوار پر اترائی تھی...... دن خاموش اور راتیں اداس...... کچھ کھونے کا احساس سا تھا۔ ایسے اداس موسم میں رمضان المبارک شروع ہو گیا۔ میں اپنے دل کی تمام تڑپ کلی خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرنے لگی۔

اماں تو شوگر کی زیادتی کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتی تھیں۔ مگر باقی سب کو یہ توفیق مل رہی تھی۔ بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح سحری چچی اور تبسم تیار کرتیں۔ ہلکے روغن کے پراٹھے، دہی اور سالن۔ اور افطار کے لیے میں اور صوفیہ تیاری کر لیتے۔ ہمارے گھروں میں سادہ کھانے کا رواج تھا اور رمضان میں یہ سادگی مزید بڑھ جاتی۔ فروٹ چاٹ، دہی بھلے، سکنجبین اور کھجور اور بس افطاری کی میز سج جاتی۔ رات کے کھانے میں سالن، چپاتیاں اور خشک چاول۔ میں سالن بنا لیتی کہ صبح سحری میں بھی کام آجاتا تھا۔ دونوں گھر مل کر یہ کام کر لیتے تو عبادت کا موقع مل جاتا تھا۔

اماں نے گھر میں دو ڈبے بنائے ہوئے تھے۔ ایک ڈبے پر لکھا ہوا تھا "اللہ کی رضا۔ دوسرے پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ جب بھی کسی کو کسی بھی ذریعے سے آمدنی ہوتی وہ خاموشی سے اماں کے کمرے میں جاتا اور ان ڈبوں میں رقم ڈال دیتا۔ مجھے، امینہ اور صوفیہ کو بچپن میں ان ڈبوں میں ڈالنے کے لیے اضافی جیب خرچ بھی ملتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم اس کے عادی ہو گئے۔ ہم نے اس کا مصرف جان لیا تھا۔ اللہ کی رضا والے ڈبے کی رقم دوسرے ڈبے سے کئی گنا زائد ہوتی تھی۔ رمضان سے قبل اماں اس رقم سے راشن اور کپڑے منگواتیں۔ سادہ مگر خوب صورت پیکنگ میں ہم پیکٹ تیار کرتے۔ جو رمضان سے قبل غریب رشتہ داروں اور دوسرے غربا کو دے دیے جاتے۔ دوسرے ڈبے کی رقم سے ہمارے عید کے کپڑے بنتے۔ اماں اور چچی مل جل کر کپڑوں کی سلائی بھی رمضان سے پہلے ختم کر لیتی تھیں۔ اب کے تو میں نے بھی خوب سلائی کی۔ اپنے لیے بے بی پنک کاٹن کی کلیوں والی فراک اور سبز کرتا پاجامہ سلائی کیا۔ وہ اتنا اچھا سلا کہ چچی نے انعام میں لان کا امبرائیڈڈ سوٹ دیا۔ دو دن میں وہ بھی سل گیا۔

صوفیہ کی کلاسز بھی چل رہی تھیں۔ میں دوپہر میں ایک گھنٹہ تلاوت کرتی اس کے بعد فارغ ہو کر تبسم کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اس وقت لینڈ اسکیپ بناتی تھی۔ میں اس کو رنگوں سے کھیلتا دیکھتی۔ اور اس کے اصرار پر ایک دن میں نے بھی برش تھام لیا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ قدرت نے مجھے بھی اس صلاحیت سے نوازا ہوا ہے۔ بہت مزہ آنے لگا تھا مجھے ان رنگوں کی دنیا میں۔ اماں مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتیں......

✲ ✲ ✲

میں عادل مصطفیٰ ہوں۔ ابا کا لاڈلا اکلوتا بیٹا۔ میری پرورش والد کے ہاتھوں لندن میں ہوئی تھی مگر انہوں نے میرے اندر ان دیکھے مشرق کی جستجو محبت اور اقدار کو جلا رکھا تھا ابا نے۔ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کی محبت کو میرے وجود کے اندر گہرا پیوست کر دیا تھا۔

میں لندن یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر پڑھا رہا تھا۔ ابھی نئی نئی تقرری ہوئی تھی۔ اپنی درس گاہ سے پڑھ کر وہاں پڑھانا بڑا کیف آگیں تھا۔ کلاسیکل انگلش لٹریچر میں کھو کر جو خواب بنتا ان کی تعبیر مجھے اپنے اردگرد کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی تو الجھ پڑتا۔ ابا سے روٹھ جاتا کہ انہوں نے میرے ساتھ سوتیلی ماؤں والا سلوک کیا ہے۔ بابا کب چھوڑنا چاہتے تھے اپنے پیارے لاہور کو وہ تو ماما کے علاج کے لیے آئے تھے' اپنے پہلے عشق "لاہور" کو چھوڑ کر اور پھر ماما کو یہاں کی مٹی کے سپرد کیا تو واپسی کا حوصلہ نہیں ہوا۔ سو انہوں نے اپنے پیار' اپنے عشق کا پیوند میرے وجود میں لگا دیا۔ اور اب ان ہی کے کہنے پر میں "لاہور" جا رہا تھا اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے۔ یوں تو لاہور میں ہمارے رشتہ دار بھی تھے مگر ابا مجھے اپنے دوست کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ ان کو خط لکھ دیا تھا۔ اب میں ان کے گھر میں تھا۔ پہلی بار ان سے ملا تھا۔ بابا کے اطمینان دلانے کے باوجود فکر مند تھا۔ مگر جب چاچا صدیق نے سینے سے لگایا' چچی صدیقہ نے سر پر پیار دیا تو کچھ تسلی ہوئی۔ افطار کی میز پر برتن لگاتی بڑے سے فاکسی رنگ کے دوپٹے میں چھپی' ایک سلونی سی لڑکی نظر آئی' گھور سیاہ آنکھیں' صبیح اور ملیح روشن چہرہ۔ میرے دل نے تو دیکھتے ہی اچھل کود شروع کر دی۔ بابا نے صدیق چاچا اور چاچی کی فیملی کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں جو پہلے تھوڑا بہت قائل تھا امینہ کو دیکھتے ہی پورا قائل ہو گیا۔

مزید چند روز اور اس فیملی کے ساتھ رہا تو ان کے سادہ اور شائستہ اطوار کا گرویدہ ہو گیا۔ رمضان میں عبادت کا ایسا اہتمام اور سحر اور افطار کی سادگی نے مجھے اس طرح مجبور کیا کہ مزید صبر نہ رہا اور ابا کو فون کر دیا کہ آکر امینہ کا ہاتھ مانگ لیں۔ میرے پیارے تابعدار ابا تین دن بعد لاہور میں تھے۔

☼ ☼ ☼

اللہ نے میرے والدین کے اخلاص کی قدر کی اور گھر بیٹھے میرا جوڑا بھیج دیا۔ وہ جو رحمن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ ان ہی دنوں خبر ملی کہ جواد صاحب نے اپنی کسی کولیگ کو پسند کر کے کورٹ میرج کر لی اور گھر لے آئے۔ شمائلہ جعفری کی بے وقوفی سے فائدہ اٹھا کر اتنی دعوتیں کھانے والی مامی کی اتنی کلاس تو بنتی تھی.....!

کیسی خوب صورت عید آئی ہے اس بار۔ دھنک رنگوں سے سجی۔ آج مغرب کے بعد میرا اور عادل کا نکاح ہوا ہے۔ اور صبح شادی کی تقریب ہے۔

عادل کے کہنے پر اماں نے میرے لیے ایپل گرین پشواز بنوائی ہے۔ اب دلہن بنی بیٹھی میں ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ بال بال موتی پروئے ہوئے میں نے مغل شہزادی کا روپ دھارا ہے۔ دل ایک نئی لے میں دھڑک رہا ہے۔ فضا معطر ہے۔ موتیے اور گلاب کے پھولوں نے تمام فرش کو ڈھانپ رکھا ہے۔ بیلے کے گجرے بہار دے رہے ہیں۔ عادل نے مسکراتے ہوئے مجھے بے حد خوب صورت انگوٹھی پہنائی اور بولے.....

"شیلے اور کیٹس کو پڑھ کر جو خواب صورت دل میں بسائی تھی۔ وہ مجسم تم ہو۔ گھور سیاہ آہو چشم اور سیاہ لمبے بال۔ مجھ پر ہر لمحہ رب رحیم کا شکر واجب ہے۔"

"مجھ پر بھی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

عادل کا دل چاہتا ہے کہ ہر رات میں بال کھلے رکھوں اور ساڑھیاں پہنوں..... یا پھر چوڑی دار اور لمبی قمیص..... وہ کہتے ہیں ہم ہر سال رمضان پاکستان میں گزاریں گے۔ ان شاء اللہ..... رب رحیم کی لازوال مہربانیوں پر میں قربان' جو یقیناً "میری دلی آرزوؤں کو مجھ سے بڑھ کر جانتا ہے اور کمال شفقت سے پورا کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

میں نے عادل بھائی کے مشورے پر لینڈ اسکیپ بنا کر اپ لوڈ کرنے شروع کردیے ہیں۔ اور یہ کام اب آمدنی دینے لگا ہے۔ وہ لندن جاکر کچھ عرصہ تک میرا فائن آرٹس گریجویشن میں داخلہ کروادیں گے.... گھر میں خوش حالی نے چپکے سے قدم رکھ دیے ہیں۔ صوفیہ

کے لیے اس کی ٹیچر نے اپنے بھائی کا پیام بھجوایا ہے۔ ان کی بھابھی دو سالہ بچی چھوڑ کر فوت ہوگئی تھیں۔ صوفیہ اور اماں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ لوگ بے حد خوشحال ہیں۔ انہیں صوفیہ کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ اماں بہت خوش ہیں۔ خدا نے ان کی دعائیں سن لی ہیں....

ارسلان کا ایم بی بی ایس ہونے میں ایک سال ہے مگر اس نے بڑی چاہت سے شمائلہ کا ہاتھ مانگا ہے۔ عاصمہ چچی تو صوفیہ کی شادی طے کرکے اتنی شکر گزار ہیں کہ شمائلہ اور سارہ چچی کی ہر بات بھلائے ہوئے ہیں اور ارسلان بھی اب تم ڈھینگ نہیں رہا۔ شمائلہ کو "ایک" حادثے نے بالکل درست کردیا ہے۔ بڑی بی بی بن کر اس نے ارسلان کے نام کی انگوٹھی پہن لی ہے۔ ہم نے "صوفیہ" کی شادی کے فنکشن کے ساتھ ارسلان اور شمائلہ کے نکاح کا فنکشن رکھ لیا ہے۔ کیونکہ عادل کے پاس وقت کم ہے۔ اور وہ شادی انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔

میں، عادل، تبسم اور عاصمہ چچی خوش دلی سے بازاروں کے چکر لگا رہے ہیں۔ اماں کا سلیقہ ہے کہ ہر کام وقت مقررہ پر تیار ہے۔ شمائلہ ٹی پنک اور سلور کرتے پاجامے میں پری لگ رہی ہے اور صوفیہ لائٹ گرین غرارے میں سج رہی ہے۔ ارسلان پر تو دلہنوں سے زیادہ روپ آیا ہے۔ نصیر، صوفیہ کے دولہا بھی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ عاصمہ چچی تو اپنے بیٹے کی خوشی میں اس قدر خوش ہیں کہ آتے جاتے شمائلہ کو پیار کررہی ہیں۔

جواد صاحب مع اپنی بیگم کے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ مامی بھی موجود ہیں شرمندہ، شرمندہ سی۔ صاف نظر آرہا ہے کہ بیٹا بہو ان کو کتنی اہمیت دے رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"شمائلہ ارسلان، جی ہاں! کتنا سجتا ہے میرے نام کے ساتھ ارسلان کا نام۔ یہ صوفیہ، تبسم، امینہ جانے

کس مٹی کی بنی ہیں۔ مجال ہے جو کسی نے ایک لفظ بھی کڑوا کہا ہو۔ جب مجھے پتا چلا کہ تائی اماں نے جواد کو صرف اس لیے انکار کہلا بھیجا کہ وہ میرا دل نہیں دکھانا چاہتیں تو مجھے تو جیسے کسی نے شرمندگی کے دریا میں پھینک دیا۔ زندگی اگر کوئی فلم نہیں ہے تو یہ کوئی ایسا لمبا ڈرامہ بھی نہیں ہے، جس میں ہمارے قریبی رشتے دار ہمارے خلاف پلاننگ کررہے ہیں۔ مجھے آخر کیوں یہ لگتا رہا تھا کہ جواد ایک ایسا ہیرا ہے جسے سب خریدنے کے چکروں میں ہیں۔

میں تو فوراً" اماں کو لے کر تائی اماں کے پاس پہنچی اور ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ تائی اماں نے تو اسی وقت مجھے سینے سے لگالیا اور ہم کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کاش میں بھی امینہ، صوفیہ اور تبسم جتنا پڑھ لیتی تو مجھے بھی معلوم ہوجاتا کہ انسان ایک ایسا کھوٹا سکہ ہے جو تربیت، اخلاق، انسانیت اور علم سے کھرا بنتا ہے۔

بس اب تو خرید لیا ہے مجھے تائی اماں نے.... تائی اماں مجھے آپ جیسا بننا ہے.... امینہ جیسا، صوفیہ اور تبسم جیسا میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ ابھی تو میں نے نیت ہی کی ہے کہ پھل لگ بھی گیا۔ عاصمہ چچی، تائی اماں کے ساتھ رشتہ لے کر آگئیں ارسلان کا۔ ہائے کتنا خوب صورت ہے ارسلان، بڑا سجے گا میرے ساتھ.... میں بھلا کب اس قابل تھی.... مگر اب ضرور ہوجاؤں گی۔ ان شاء اللہ ان سب کے ایثار، برداشت اور صبر نے مجھے اتنا سبق ضرور سکھادیا ہے۔

☆

شازیہ الطاف ہاشمی

محلوں کی رانی

اسکول سے چھٹی ہوئی۔ اس نے چاک واپس میز پہ رکھی، اپنی کتابیں سمیٹیں اور واپسی کے راستے پر قدم دھر دیے۔ یہ گاؤں کا اکلوتا پرائمری اسکول تھا جو سبزے اور فصلوں سے گھرا ہوا تھا، جس کے لان میں لمبے سفیدے کے درخت اور سرخ سرخ پھولوں والی بوٹی اگی ہوئی تھی اس نشیبی سے لان میں جب پانی بھرتا تھا برسات کے دنوں میں تو وہ کاغذ کی کشتیاں تیرایا کرتی تھی اور اس تالاب میں چھلانگیں لگاتے مینڈکوں کو دیکھتی رہتی تھی اور اس لان میں نتیجے کا اعلان ہوا کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ پہلے نمبر پر آتی تھی اور تعریفیں سمیٹ کر اور انعام کی کاپی لیے گھر روانہ ہوتی تھی۔ وہ ذہین ترین ہونے کے ساتھ سب سے غریب گھر سے بھی تھی۔ باپ راج مزدور اور ماں کھیتوں میں مزدوری کرتی تھی۔ وہ اور یاسمین دونوں گھروں کی طرف چل دی تھیں۔

یاسمین کی امی نے اس کا استقبال کیا اور فوراً" نلکے سے ٹھنڈا پانی لا کر لال شربت بنانے لگیں۔ اس کے گھر میں ہمیشہ کی طرح ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گھر میں کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ گندم کی ستوں سے صحن اٹا پڑا تھا جو دھوپ لگنے کو ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور خالی برتن منہ کھولے پڑے تھے۔

اس نے بستہ رکھا، بھاری بستے کی وجہ سے کندھے تھک چکے تھے، مگر ابھی گھر کا سارا کام نبٹانا باقی تھا۔ اس نے کونے میں پڑی جھاڑو اٹھائی اور کچے صحن میں گرد کا طوفان اڑنے لگا۔ گندم کے سارے ستوں کو اکٹھا کیا۔ سارے گھر میں جھاڑو دی پھر برتن اکٹھے کرلیے۔ اس گھر میں غربت کا یہ عالم تھا کہ پانی بھی نہیں تھا۔ نلکا کب سے خراب تھا، مگر بنانے والے پیسے مانگتے ہیں اور پیسے ابھی تھے ہی نہیں۔

اس نے برتنوں کا ڈھیر سر پر اٹھایا اور قریب کے ٹیوب ویل پر چلی گئی۔ سرف سے برتن چمکانا اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ نجانے کب سے سیکھے ہوئے تھے۔ برتن لا کر چولہے پہ رکھے اور ستوں کے نیچے سے گری، بھری ہوئی گندم کے دانے چھان پھٹک کر دوپٹے میں ڈالے اور دکان کا رخ کیا۔ دانے پندرہ روپے کے ہوئے تھے۔ چھ روپے کے آلو پیاز اور پانچ روپے کا دستہ، ایک روپے کا قلم، تین روپے واپس لا کر اندر کمرے میں رکھ آئی۔ آلو کاٹ کے چولہے پہ رکھے اور خود ہوم ورک کرنے لگی۔

سارے بہن بھائی چھوٹے تھے، وہ بھی چھوٹی تھی، مگر سارا گھر اسی نے سنبھال رکھا تھا کیوں امی امرود، بیر وغیرہ ٹوکریوں میں بھرنے کا کام کرتی تھیں۔ اور باقی بچوں کو ساتھ ہی لے جاتی تھیں اور شام کو واپس آتیں تو اسے غصہ بھی بہت آتا تھا، اس لیے وہ سارے کام خود ہی کرتی تھی۔ اب گاؤں کے اسکول سے نکل کر وہ سرکار کے کالج میں پہنچ گئی تھی۔

سادہ سی وردی، سیدھی مانگ اور ناکافی دستے قلم، مگر وہ محنت کرتی تھی اور آگے نکل جاتی تھی۔ نہیں نکلی تو اس گھر سے غربت نہیں نکلی۔ باقی سب بہن بھائیوں کے قد بہت نکل آئے تھے۔

ابو کے بھائی، فضل حیات سرکاری ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور خوب پیسے والے تھے۔ کبھی کبھی آ بھی جاتے تھے اور تھوڑی بہت مدد بھی کردیتے تھے مگر کسی

کی امداد سے بھی بھلا کبھی پیٹ بھرتے ہیں۔ پیٹ تو تب بھرتے ہیں جب بھرنے والا جھولیاں بھرے صندوق، بکسے سب۔ امی کے بھائی کا بیٹا، امی کا اکلوتا بھتیجا، جو ہنستا بہت تھا اور یہ ہنسی مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، اس کی آنکھیں فریب سے پُر تھیں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف یہاں ان کا مذاق اڑانے آتے ہوں محظوظ ہونے کے لیے آتے ہوں۔

وہ ہر دفعہ اپنی بہنوں کے مہنگے بستے اور کپڑے انہیں دکھاتے تھے اور پھر آنکھوں میں جھانک کے کہتے "تم بھی لوگی؟" وہ مزے سے پوچھتے۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں، وہ بھی مہوز بھائی کو کہہ دیتی کہ ہاں اسے بھی چاہیے مگر جب پھر وہ لوٹتا تو وہ بس خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی اور وہ پھر سے میدان سجا کر بیٹھ جاتے۔

"گھڑی لوگی۔ بستہ لوگی۔ یہ کتاب، وہ تمہارے پاس نہیں، وہ لا دوں۔" اور وہ کبھی بھی نہیں لاتے تھے۔

امی کو بھتیجے سے پیار تھا۔ اس کی لچھے دار باتیں پسند

تھیں۔

ستائیس اٹھائیس سال کے معوز بھائی انتہائی شاطر آدمی تھے ان کی بہنیں انتہائی کند ذہن تھیں۔ کوئی پوزیشن تو کیا پاس بھی مشکل سے ہوتیں مگر یہ اور بات تھی کہ سوتیلیں ان کے پاس ہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے بچپن کی دہلیز پار کر گئی مگر معوز بھائی کی کی ہوئی تذلیل بھول نہ سکی۔

اس نے اب اپنے کپڑے کے بستے کو اور مضبوطی سے تھام لیا تھا اور معوز بھائی کو سختی سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ جواب میں وہ اور ہنستے جاتے اور باتیں کیے جاتے' جیسے کچھ برا سننا چاہتے ہوں' کچھ غلط کروانا چاہتے ہوں ان کی باتیں اکسائی ہوئی تھیں جیسے وہ کہے کہ وہ غریب ہے اسے غریب' کمزور ہونا اچھا نہیں لگتا' اسے اپنی ماں کا دوسروں کے کھیتوں میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا مگر اب وہ بچی نہیں رہی تھی۔ وہ سب سمجھنے لگی تھی ان کی شاطر مسکراہٹ کو سنجیدگی سے لینے لگی تھی۔ وہ بس غور سے انہیں دیکھتی رہتی تھی۔

اس سوال کا جواب بھی اسے جلد ہی مل گیا تھا۔ معوز بھائی ان کے گھر آئے تھے اور ان کے ساتھ صاف ستھرے لباس والے ندیم بھائی بھی تھے جو فضل چاچو کے بیٹے تھے اور یہ اس کے منگیتر بھی تھے۔ اس نے بچپن سے معوز بھائی کو اپنا مذاق اڑاتے ہوئے دیکھا تھا بلکہ وہ سب گھر والوں کی برائیاں' ہنسی ہنسی میں کرتے تھے۔ ہمدردی میں ان کی تنگدستی کا کچھ ایسے مزاحیہ انداز میں نقشہ کھینچتے کہ وہ کلس کر رہ جاتی مگر ندیم بھائی کے ساتھ ان کی یاری دوستی بڑی پکی لگتی تھی۔

ندیم بھائی کسی سرکاری اسکول میں ٹیچر تھے مگر انہوں نے کبھی علینہ کو منگیتر نہیں سمجھا بلکہ دوسروں کی طرح ہی ملتے تھے جیسے فیروزہ چاچی' جیسے فضل چاچو مگر اب اس نے اڑتی اڑتی سنی تھی کہ وہ اس کے منگیتر ہیں۔

"پہلے اسے چپل تو لے دو دیکھو کیسے پھٹی ایڑیاں لیے پھرتی ہے۔" وہ ندیم بھائی کی گردن دبوچے اسے احساس دلا رہے تھے کہ اس کے پاس تو پہننے کو جوتے بھی نہیں۔ اسے بے حد دکھ ہوا مگر وہ ٹوٹے سلیپر گھسیٹتی اندر چلی گئی۔

بہت دنوں بعد اس نے ندیم کو مہرین کے ساتھ دیکھا تھا اور معوز بھائی' مہرین اور ندیم کو سیر کراتے پھر رہے تھے۔ مہرین کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا۔ معوز بھائی' ندیم اور مہرین کو آئس کریم کے کپ دے کر خود تھوڑی دور کھڑے ہو کر ان کے آئس کریم ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ کالج سے واپس آ رہی تھی۔ سڑک کے ساتھ وہ کھڑے تھے۔ "آئس کریم کھاؤ گی علینہ؟" اور اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد وہ ندیم بھائی کو علینہ کی بدتمیزی کی بابت بتا چکے تھے۔ مہرین اور ندیم کی ہنسی میں جاندار ہنسی مہرین کی تھی۔

ندیم بھائی اب اکثر ہی معوز بھائی کے گھر آ جاتے تھے۔ گاجر کے حلوے' چاولوں کی کھیر' خالص کھوئے کی مٹھائی سے تواضع ہوتی۔ اتفاق سے معوز بھائی کی منگنی بھی ندیم کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔ تو اصولاً تو مہرین جاتی اور افصی آتی مگر یہ رشتہ ذرا مختلف تھا۔

ندیم اور مہرین کا رشتہ ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ ان کی بڑی بہن' افروز بھائی کی بیوی تھی اور افروز سے چھوٹا ندیم۔ وہ دونوں بہن بھائی اب مہرین کو بھی وہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ الماس' افروز کو بھڑکاتی تھی اور معوز اور مہرین ندیم کو۔ اور یہ رشتہ ختم کر دیتے۔ وہ حلوے پکوڑے' کھیر' پیڑے' برفیاں اور خوشبو اڑاتے پلاؤ مگر ان ہی دنوں ندیم سے چھوٹی ثمینہ کا رشتہ ابو نے کروا دیا۔ دونوں گھروں کے رشتے پہلے سے بھی مضبوط ہو گئے۔ چاچو نے فوراً" ہی ثمینہ کو رخصت کیا اور علینہ کو ندیم سے بیاہ لائے۔ معوز بھائی کا چہرہ ابلیس جیسا ہو گیا تھا اور مہرین غصے میں آگ بگولہ ہو گئی اور خود ماموں کا چہرہ کرخت جھریوں سے اٹ گیا انہوں نے اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کیا تھا جب بڑی گئی تھی تو چھوٹی کیوں نہیں۔

آخر کیا تھا علینہ میں، جو مہرین میں نہیں تھا۔ ان کی نازوں پلی بیٹی ندیم کے ساتھ ہی رخصت ہوتی اور ماسٹرنی کہلائی مگر ثمینہ کے کروائے گئے رشتے نے سب کچھ ملیامیٹ کر دیا تھا۔ ندیم کو کبھی بھی مہرین میں دل چسپی نہیں تھی۔ اس نے بحیثیت بیوی سمجھ بھی لیا تھا اور جان بھی لیا تھا۔ اب مہوز اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ نہ بستے دکھانے کو نہ کپڑے لتے دکھا کر پوچھنے کو۔ وہ اب ان سے اچھا پہن اوڑھ رہی تھی۔ ہر طرف خوشیاں تھیں مگر پھر خوشی کے دن ختم ہوئے۔

ثمینہ کا شوہر نشئی اور شرابی نکلا، ثمینہ خوش نہیں تھی تو علینہ کو کون خوش رہنے دیتا۔ مہوز ایک بار پھر سرگرم ہو گیا تھا۔ آخر وہ ندیم کا بہنوئی بھی تھا اور بیوی کے ذریعے جو چاہتا کہلوا سکتا تھا، کروا سکتا تھا۔ اب کے اس کی بیوی کا غصہ بھی سوا نیزے پر تھا۔ مہوز بہن اور بیوی کا استعمال اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ یہ کام پس پردہ کر رہا تھا مگر وہ اس جیسے شیطان کو سو پردوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

اس نے اس شخص کو اس وقت پہچانا تھا جب بچے صرف ٹافیوں اور گولیوں کو جانتے تھے بس۔ تو وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ یہ میدان، ہتھیاروں سے لیس شکاریوں کا تھا اور وہ اکیلی تھی۔

چاچی کے بقول ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور دھوکا علینہ کے باپ نے دیا تھا اور علینہ ان کے سامنے تھی۔ مہوز، افروز، اقصیٰ، مہرین، چاچی چاچو سب نے اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ اسے ستا ستا کر ذہنی طور پر تھکا ڈالا اور اس سب میں ندیم کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا تھا اور یہ ہتھیار ایسا موثر اور پکا ثابت ہوا تھا کہ علینہ کے لیے سانس لینا بھی مشکل تھا۔

ادھر ثمینہ تنگ ہوئی اور یہاں اس پر زمین تنگ ہوئی۔ شیطان نے اپنا جال بچھانا شروع کیا اور وہ؟ اس جال کو توڑنے میں ناکام تھی امی ابو ایسی ذہنی اذیت میں گرفتار ہوئے تھے کہ نہ جی سکتے تھے نہ مر سکتے تھے۔ کس سے گلہ کرتے، ان کی بیٹی ڈوبی تھی۔ کس نے سنی تھی، ان کی بیٹی پریشان تھی تو علینہ کا بھی پریشان رہنا حق تھا۔

اس میں سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ کسی نے بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ طعنے نہیں دیے تھے کہ ثمینہ کو ڈبویا گیا ہے، ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے بلکہ ان سب بہن بھائیوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مہوز نے بیوی کے ذریعے تمام راستے زہر آلود کر دیے تھے اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیوں اور کس لیے کیا جا رہا ہے۔ سب ایک منصوبے کے تحت کام کر رہے تھے۔

ندیم کا غصہ بجا تھا۔ زیادتی ہوئی تھی مگر غصے میں اپنی جگہ صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غلط طریقے سے استعمال بھی کیا جا رہا تھا اور اسے علم بھی نہیں تھا۔

اپنی طرف سے وہ صحیح طریقے، سیدھی راہ پر گامزن تھا مگر یہ اس کی بھول تھی۔ سب مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے اور نہ علینہ کو پتا تھا نہ ندیم کو۔ وہ حیران ہوتی تھی کہ انہوں نے تو اچھائی کی تھی اور جواب برائی سے مل رہا ہے۔ وہ گھر جو تنکا تنکا جوڑا تھا، اب اس میں چنگاری رکھنے کی تیاری تھی۔

وہ غریب گھر سے آئی تھی، قدم قدم پر اس کا احساس دلایا جاتا۔ اس کی کم حیثیتی کا۔ وہ ذہانت سے بھری ہوئی لڑکی یہاں عملی طور پر فیل ہو گئی تھی۔ یہ گھر چاچی کا تھا اور چاچی ثمینہ کی ماں تھیں اور وہ بہو تھی اور باقی سارے آگے پیچھے والے مقابل۔

احسان ہے بے سود گلہ ان کی جفا کا
چاہا تھا انہیں ہم نے خطا وار ہم ہی تھے

٭ ٭ ٭

وہ احسان کے بدلے احسان میں آئی تھی اور احسان اکارت ہو گیا تھا۔ ثمینہ نے آ کر ماں کے سامنے دکھڑے روئے تھے اس کے پوچھنے پر بلا ارادہ ہی پھٹ پڑی تھی اور وہ حیران رہ گئی تھی یہ بات جان کر کہ اس کے ستائے جانے کی وجہ یہ تھی اور اس میں ایک عالم نے اس سے بدلے لیے تھے۔ کسی نے حسد کی آگ میں

جلایا تھا تو کسی نے انتقام کی بھٹی میں جھونکا تھا اور مہرین اس جنگ میں ہراول دستے کا کردار ادا کر رہی تھی۔ یہ رشتہ تو افروز' ان کے اپنے بڑے بھائی نے اوکے کیا تھا۔ بھلا وہ کیسے قصور وار ہو گئے' انہوں نے تو بتایا تھا بس۔ باقی کام تو خود اپنی مرضی سے ہوا تھا۔ شادی تو کنویں کی چھلانگ ہے' ڈوبنا ہے یا تیرنا ہے یہ تو کودنے والے کے مقدر کی بات ہے مگر انہیں یہ بات کون سمجھا سکتا تھا بھلا۔ سب جی بھر کر اپنا غصہ نکال رہے تھے۔ کاش انہوں نے شادی تھوڑے عرصے بعد کی ہوتی یا نہ کی ہوتی۔

مہروز کے اندر انتقام کی آگ روز بروز بڑھ رہی تھی۔ وہ بہن کو تحفے تحائف فضول سی چیزیں اسے دکھا دکھا کے دیتا تھا گو کہ علینہ اب ان چیزوں کی محتاج نہیں رہی تھی مگر یہ اس شخص کی کمینگی تھی جو کھل کر سامنے آئی تھی۔ اس کی نفرت آج تک جوان تھی اور ندیم اسے ثمینہ کا اور اپنا ہمدرد سمجھتا تھا مگر علینہ اب چھوٹی علینہ نہیں تھی۔ وہ اس دوغلے کمینے شخص سے نفرت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ یہ جال مہروز کا بچھایا ہوا ہے۔ ان کی ہمدردی میں اپنا انتقام لے رہا ہے مگر یہ بات ندیم کو کون سمجھا سکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مہروز اس کا سب سے اچھا دوست ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ مہروز اور مہرین نت نئے ہتھکنڈے اپناتے رہے۔ وہ کبھی بہن کو ندیم کے قریب کر کے اسے اذیت پہنچاتا' کبھی اسے سنا سنا کر باتیں کرتا۔ کبھی ٹوٹی چپل یاد دلاتا' کبھی بہن کو تحفے دے کر دکھاتا مگر وہ کسی چیز سے نہیں گھبرائی بلکہ اپنے عمل اور اچھے سلوک' نیکی اور انصاف سے ثابت کرتی رہی کہ وہ سب غلط تھے۔

جب اس کا بیٹا عبداللہ دنیا میں آیا تو اس کے قدم تھوڑے مضبوط ہوئے مگر حالات جوں کے توں رہے۔ مہروز کسی کو سیدھا نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ بھی ایک گرم ترین دوپہر تھی۔ سب اپنے کمروں میں گھسے ہوئے تھے۔ مہروز' بہن کے کمرے میں تھا۔ وہ کل سے یہیں تھا۔ ندیم نے واپس آتے ہوئے بہت سے پھل خریدے اور سیدھا ان ہی کے پاس جا رہا تھا۔

"اس ندیم بے غیرت کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا ناں کہ یاد ہی رکھے گا کمینہ' میری بہن کوئی مذاق نہیں۔"

اس کے قدم تھم گئے۔ وہ الٹے قدموں واپس آیا تھا جیسے لمبے سفر سے واپس آیا ہو۔ پھلوں کے شاپر خلاف توقع علینہ کو پکڑا دیے خود اندر چلا گیا اور اس نے پھل کاٹ کر مہروز کو دینے کا بھی نہیں کہا۔

"اور ندیم یار! کدھر ہے تو۔" وہ دور سے کھوکھلے قہقہے لگاتا ہوا آ رہا تھا۔

"ندیم سو رہے ہیں۔" علینہ نے دھیرے سے جواب دیا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔

وہ حیرت زدہ تھی کہ ندیم باہر کیوں نہیں آیا۔ وہ تو باتھ روم سے ہی بول پڑتا تھا "جی آیا۔" مگر اب؟ چپکے سے اندر آئی' وہ بیٹھا تھا۔

"ذرا تربوز کاٹ لاؤ۔" وہ دونوں کالا نمک ڈالے تربوز کھانے میں مگن تھے کہ شیطان پھر آ گیا۔

"او ذرا تمہارے ساتھ باہر جانا ہے۔"

"مہروز بھائی! میں آج عبداللہ اور علینہ کے ساتھ باہر جاؤں گا۔ بڑے دن ہو گئے ہیں۔ اسے کہیں لے کر نہیں گیا" وہ عبداللہ کو اوپر نیچے اچھال رہا تھا۔ مہروز کا منہ یہ بات سن کر بگڑ گیا تھا اور علینہ خوش ہو گئی تھی۔

اللہ یوں بھی راستے سیدھے کر دیتا ہے۔ جہاں سے امید بھی نہیں تھی' وہیں سے کشتی پار لگ چکی تھی۔ اب وہ اپنے گھر اور شوہر دونوں کی رانی تھی۔ عبداللہ کے قہقہے چھت پھاڑ تھے۔ اسے بھی شاید پتا چل گیا تھا وہ جلدی جلدی تیار ہونے چل دی۔

آج اسے اپنے شریک سفر کے ساتھ اک نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔

صدف آصف

مُسکراہٹیں

ناولٹ

انصر الیاس لفٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ ڈریس پینٹ کی سائیڈ پاکٹ میں رکھا سیل فون بجنے لگا' اس کا لفٹ کا بٹن پریس کرتا ہاتھ فضا میں ہی تھم کر رہ گیا' اس نے بے زار منہ بنا کر موبائل نکالا تو اسکرین پر چمکتے "نوشی آپی" کے نام پر نگاہیں جم گئیں۔

"میں اگر۔ آپی سے باتوں میں لگ گیا تو پھر ہو چکی میٹنگ کی تیاری۔ پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔" انصر نے لحہ بھر کو ہونٹ سیکڑتے ہوئے سوچا پھر ففتھ فلور کا نمبر پریس کیا' لفٹ بڑی سرعت سے اوپری منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ موبائل کی بیل تھوڑی دیر بج بج کر خود ہی خاموش ہو گئی۔ اس نے شکر ادا کیا۔ دس بج چکے تھے' آج اس کی بارہ بجے اپنے جی ایم کے ساتھ ماہانہ میٹنگ طے تھی۔ ابھی انصر کو وہاں ڈسکس کیے جانے والے پوائنٹ بھی تیار کرنے تھے۔ انصر سوچ میں گم کشادہ لالی پار کرتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اچانک سیل فون دوبارہ بجا اس نے کوفت سے سر ہلایا۔

"آپی..... بھی..... اپنے نام کی ایک ہی ہیں۔ جب تک ان کی بات نہیں..... سنوں گا۔ مجھے سکون سے کام تھوڑی کرنے دیں گی۔" اس نے خالی کمرے میں با آواز بلند اپنے جذبات کا اظہار کیا' ایک طویل سانس لیتے ہوئے "ڈلیس" کا بٹن دبایا۔

"بھائی..... میرا..... ایک کام کرنا..... تمہارا آفس سلمٰی باجی کے راستے میں پڑتا ہے..... تو۔" نوشین نے انصر کی ہیلو سنتے ہی سلام دعا کے فوراً" بعد مدعا پیش کیا۔

"آپی پلیز! میں آج وہاں نہیں جانے والا۔ سچ میں بہت بزی ہوں۔" انصر نے کرسی پر بیٹھ کر اپنا سسٹم آن کرتے ہوئے کہا۔

"کیا..... مطلب..... کیوں نہیں جاؤ گے؟ ارے بہت ضروری کام ہے۔ تمہارے بھائی جان کو آج بہت دیر ہو جائے گی۔ ورنہ مجھے بھی تمہارا احسان لینے کی کیا ضرورت تھی؟" نوشین بھائی کے انکار پر الٹ پڑی۔

"آپی..... جی..... احسان کی بات نہیں..... ہے۔ آپ اپنی نند کے گھرانے کے معاملے میں۔ کتنی شکی ہیں؟ ثمرہ میرے لیے چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔ پھر بھی بلاوجہ الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہیں۔" انصر نے ماؤس سے کھیلتے ہوئے منہ بنا کر اصل بات بتائی۔

"وہ الگ مسئلہ ہے..... مگر..... اس وقت یہ مجبوری آن پڑی ہے..... کل تمہاری بھانجی کو ٹیچر کے پاس پریکٹیکل جرنل جمع کرانا ہے۔ ثمرہ کی ڈرائنگ اچھی ہے اس لیے آئمہ نے اس سے ہیلپ لی ہے۔ وہ روزانہ تمہارے بہنوئی کو یاد دلاتی رہی کہ پھوپھو کے یہاں سے میرا جرنل لیتے آئیے گا' مگر وہ ایک بھلکڑ لانا بھول جاتے ہیں۔ اب ٹائم نہیں ہے۔ کل لازمی لے کر جانا ہے۔" نوشین نے جلدی جلدی بات مکمل

کر کے سکون کی سانس لی گویا اپنا بوجھ اتار کر اس کے کاندھے پر رکھا۔

"نہیں۔ وہاں۔ نہیں جانے والا بس۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"ہاں۔۔۔ بھئی۔۔۔ آج کل تو بھائیوں کا بھی خون سفید ہو گیا ہے۔ ادھر۔ تم نخرے دکھا رہے ہو۔۔۔ ادھر۔ آئمہ نے الگ رونا ڈالا ہوا ہے۔۔۔ خیر میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔" نوشین نے ہمیشہ کی طرح جذباتی بلیک میلنگ شروع کر دی۔ وہ ڈھے گیا۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اسے چپ کروائیں بولیں، چھوٹے ماموں لیتے آئیں گے۔" انصر نے مرے مرے لہجے میں ہامی بھری، آئمہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا بہت مشکل تھا۔

وہ اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنا فولڈر کھولنے لگا، اس نے بات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی نبٹانا شروع کر دیا۔

"اوکے۔۔۔ بائی۔۔۔" دوسری طرف طویل خاموشی چھائی تو انصر نے ڈیسک ٹاپ پر ماؤس سے نئی فائل پر کلک کرتے ہوئے بہن سے اجازت طلب کی۔

"وہ۔۔۔ ایک منٹ ذرا سننا۔۔۔" نوشین نے عجلت میں اسے لائن کاٹنے سے روکا۔

"آپی۔ پلیز۔ جلدی بتائیں۔۔۔ میں آفس میں بیٹھا ہوں گھر پر نہیں؟" انصر جھلا اٹھا۔ وہ سمجھ گیا آپی کی نصیحتیں شروع ہونے والی ہیں۔

"میں۔۔۔ یہ کہہ رہی تھی کہ سلمیٰ باجی کے یہاں اندر نہیں جانا، کوئی بہانہ بنا دینا۔۔۔ میں وہاں کال کر دوں گی۔ ثمرہ دروازے پر ہی جرنل دے جائے گی۔" نوشین نے جھجکتے ہوئے بات پوری کی تو انصر نے اپنے کان خود ہی پکڑ کر نفی میں سر ہلانا شروع کر دیا۔

"آپ نے وہ ہی بات کی نا۔۔۔ جس کا مجھے ڈر تھا۔۔۔ اب۔۔۔ میں نہیں جاتا۔۔۔ رات میں جب بھائی جان آئیں تو ان سے ہی منگوا لیجیے گا۔" انصر نے ضدی لہجے میں فیصلہ سنا دیا

"اچھا۔ اچھا۔۔۔ ناراض نہیں ہوتے۔۔۔ آئمہ کی پڑھائی کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں تمہیں اکیلے بھیجنے کا رسک کبھی نہیں لیتی۔ خیر جاؤ۔۔۔ زیادہ نخرے نہ دکھاؤ۔" نوشین نے پہلے لجاجت سے اور آخر میں بڑی بہن بن کر حکم نامہ جاری کیا۔ انصر نے بغیر اجازت طلب کیے لائن کاٹ دی۔

"آپی۔۔۔ پتا نہیں کیا کیا سوچتی ہیں۔۔۔ ثمو کوئی میرے ٹائپ کی لڑکی تھوڑی ہے۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا، ایک دم میٹنگ کا خیال آیا تو اس کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے تھرکنے لگیں۔

آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے اعزاز محمد پر بوریت کا شدید دورہ پڑا تھا۔ گھر میں پھیلے ہوئے سکون پر تھوڑا تعجب ہوا، گردن موڑ کر ادھر ادھر تاک جھانک کی، اتنی دیر گزر جانے کے باوجود کہیں سے بھی نصف بہتر جو کہ مکمل طور پر حاوی تھی، کی آواز سنائی نہ دی۔

"آج تو کمال ہی ہو گیا ہے۔ نہ کوئی شور شرابا، نہ ہی ماسی سے چخ چخ، کچھ تو گڑبڑ ہے۔۔۔ ایزی۔۔۔ میاں کچھ تو گڑبڑ ہے۔" اعزاز محمد نے سوچتے ہوئے جمائی لینے کے ارادے سے منہ پھاڑا۔ قدموں کی مخصوص چاپ اسٹور روم کی طرف جاتی سنائی دی تو ان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سمجھ گیا۔۔۔ نوشی کسی خاص مشن پر ہے جب ہی چپکے سے "ہوم شاپ" کا دورہ کیا جا رہا ہے۔" وہ شرارتی انداز میں کرسی سے اتر کر دھیرے سے، بنا کوئی آہٹ کیے اسٹور روم میں اس کے پیچھے داخل ہوئے۔

"کیا۔ کر رہی ہو۔۔۔ جان؟" اعزاز محمد نے بیوی کو لکڑی کی الماری میں غرق پایا تو کان کے پاس جا کر شرارتی انداز میں زور سے چیخے، وہ ایک دم گھبرا کر اچھل پڑی۔ ہاتھ میں تھاما سنہری پین سیٹ کا ڈبہ نیچے گر گیا، جو اس کی ایک کزن نے آئمہ کو کلاس سیون میں پاس ہونے پر دیا تھا، پین کی نب نوشی کی طرح تھوڑی سی ٹیڑھی نکلی تھی۔ آئمہ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس لیے یہاں لا کر رکھ دیا گیا۔

”توبہ ہے۔۔۔ ڈرا کر رکھ دیا۔ آخر۔ آپ۔۔۔ کب بڑے ہوں گے؟“ نوشین ایک دم جھنجلا کر پیچھے ہوئیں۔ نظر بچا کر ڈبہ اٹھایا‘ سرعت سے واپس الماری میں رکھ کر پٹ بند کیے۔

”ویسے اس گرمی میں آپ یہاں کر۔۔۔ کیا رہی ہیں؟“ اعزاز نے کریدا۔

”کچھ خاص نہیں۔۔۔ آپ جائیے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ نوشی نے ٹالا۔

وہ کیسے بتاتی کہ تحفے کی تلاش میں ہوم شاپ میں گھسی ہے۔ محلے میں دو گھر چھوڑ کر سرمئی مکان والے صدیقی صاحب کے پوتے نے فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ اس خوشی کے موقع پر وہاں بچوں کی ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی گئی تھی‘ جس میں آئمہ کو بھی شرکت کرنی تھی۔ اس لیے گفٹ کی تلاش جاری تھی۔

”ماسی اور آپ کے بیچ بہت دیر سے پانی پت کی کوئی جنگ نہیں چھڑی۔ تو ہم نے سوچا جا کر چیک کیا جائے۔۔۔ مزاج جاناں تو ٹھیک ہے۔“ اعزاز نے بیوی کو خیالوں میں کھویا ہوا دیکھا تو بلاوجہ چھیڑا۔ وہ جانتے تھے کہ نوشین کو صفائی کا خبط ہے۔

”میں خوب سمجھتی ہوں‘ وکیل صاحب۔۔۔ آپ تو چاہتے ہیں کہ میں منہ بند کر کے ماسی کو گندا سندا کام کرتے دیکھتی رہوں۔۔۔ پورا گھر کام والی پر چھوڑ دوں تو کھڑکیوں کی جالیاں گرد سے اٹ جائیں۔۔۔ دیواروں پر جالے لگ جائیں گے اور کچن وہاں۔۔۔ سے تو ایسی سڑاند آئے کہ لوگ ہمارے یہاں کھانا کھانا چھوڑ دیں۔“ نوشین کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا۔ وہ چیخ اٹھی۔

”چلو۔۔۔ یار۔ سب کام چھوڑ کر باہر آؤ۔۔۔ واک پر چلتے ہیں۔“ اعزاز نے بیوی کو ناراض دیکھا تو منانے کی کوشش میں لگ گئے۔ وہ دونوں باقاعدگی سے شام کو قریبی پارک میں چہل قدمی کرنے جاتے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ آپ تیاری پکڑیں۔۔۔ میں۔۔۔ بس پانچ منٹ میں آئی۔“ نوشین نے شوہر کو بڑی مشکل سے پشت سے دھکیلا اور باہر نکالا۔

”جان۔ آج کس کا برا وقت آیا ہے؟ جو آپ نے اس الماری کو کھولا ہے۔“ اعزاز نے جاتے ہوئے مڑ کر ہنستے ہوئے اشارہ کیا۔

نوشی نے شکر ادا کیا اور اسٹور کا دروازہ بند کرنے سے پہلے پین والا ڈبہ اٹھایا۔

☼ ☼ ☼

ان کے حالات خاصے اچھے تھے‘ وہ سرکاری وکیل تھے۔ روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی‘ اس کے باوجود اعزاز محمد اس وقت کوفت کا شکار ہو جاتے جب بیوی کسی کو دینے لینے کے معاملے میں کنجوسی برتتی‘ نوشین کی ہزار خوبیوں پر یہ ایک برائی بھاری پڑتی۔

اسے پیسے دولت کی پریشانی نہیں تھی‘ بس اس کا دوسروں پر خرچ کرنے کا دل نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک مہنگی اشیاء کی خریداری کرتی‘ آئمہ کے لیے بھی مشہور ڈیزائنر کے کپڑے اور مہنگے برانڈ کا‘ جوتا یا چپل خریدتی‘ لیکن جہاں بات دینے دلانے کی آجائے‘ اس کا بس نہیں چلتا کہ فٹ پاتھ سے خرید کر تحائف پکڑا دے۔ خاص کر سسرالی رشتے داروں کی تقریبات میں جانے سے قبل تو وہ مارکیٹ جانے کا اہتمام بھی نہیں کرتی۔ بس اسٹور میں چلی جاتی جہاں اس کی ”ہوم شاپ“ تھی۔

اس ہوم شاپ کا بھی بڑا دلچسپ قصہ تھا۔ نوشین کے جہیز میں ملنے والی لکڑی کی الماری آوٹ آف فیشن ہو گئی تو اعزاز نے کمرے میں نیا فرنیچر ڈلوا دیا۔ باقی سامان چھت پر بنے گیسٹ روم میں سیٹ کر دیا گیا۔ بس ایک الماری کو اٹھا کر اسٹور میں رکھوا دیا گیا تاکہ

اس میں بستر لحاف گدے وغیرہ رکھ دیے جائیں۔ نوشین نے الماری کے دو خانوں میں ان تمام ناپسندیدہ اشیاء کا ڈھیر لگانا شروع کر دیا۔ جو ان ماں بیٹی کے دل سے اتر جاتیں۔ اکثر لوگوں کے مختلف مواقعوں پر دیے گئے وہ تحفے تحائف جو انہیں اپنے اسٹینڈرڈ سے کم لگتے۔ اسی الماری میں رکھ دیے جاتے یا وہ اشیاء

جن میں خریداری کے بعد ذرا سا بھی نقص نکل آتا، یہاں کی زینت بنتی، ایمرجنسی میں بھی لوگوں کو دینے کے لیے گفٹ اسی ہوم شاپ سے برآمد ہوتے۔

"جان۔۔۔ جو چیز اپنے لیے پسند کرو۔۔۔ وہ ہی دوسروں کے لیے بھی لو۔" اعزاز بیوی کو سمجھاتے، مگر نوشی اس معاملے میں اپنے من کی کرتی۔۔۔ وہ اس بات سے بہت چڑنے لگے تھے۔ اعزاز نے ایک دن جل کر الماری کا نام ہی "ہوم شاپ" رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

"ارے واہ کھل جا سم سم۔۔۔ کہنے سے پہلے ہی گیٹ کھل گیا۔" انصر نے سلمیٰ کے گھر کے سامنے اپنی سلور گرے سوک لے جا کر روکی۔۔۔ ابھی تذبذب میں تھا کہ دروازہ بجائے یا آپی کو کال کرے۔ اچانک کالا گیٹ چوں چوں کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

"آپی کی بڑی کوئیک سروس ہے۔ میڈم نے۔۔۔ سب پر دہشت قائم کی ہوئی ہے۔" انصر پہلے چونکا پھر ہنستا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"نمی اماں نے کیری کی میٹھی چٹنی میں تمہارا حصہ بھی رکھا ہے۔" ثمرہ کے ساتھ ایک لڑکی کھلکھلاتی ہوئی دروازے سے باہر نکلی۔ انصر کے کانوں میں سریلا نغمہ سا بجا۔ اس نے نگاہ اٹھائی اور جہاں کا تہاں رہ گیا۔

"اف۔۔۔ کیری کی چٹنی۔ مزہ۔۔۔ آگیا۔ میں رات کو کھانے اور آنٹی کا شکریہ ادا کرنے آؤں گی۔" ثمرہ نے چٹخارا بھرا، وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ انصر الیاس پر نگاہ ہی نہیں پڑ سکی۔ انصر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کرے۔

"اچھا۔۔۔ دعا۔۔۔ کل صبح جلدی نکلیں؟ تاکہ کالج جا کر ٹیسٹ کی تیاری کر سکیں۔" ثمرہ نے لڑکی کو مخاطب کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دعا۔" انصر نے زیر لب دہرایا۔ اس لمحے سب بھول گیا کہ کہاں کھڑا ہے اور کس کام سے آیا تھا؟ بس اس کے جادو سے زیر ہو گیا، بوٹا سا قد، سنہری رنگت، جادوئی آنکھیں، ستواں ناک، پنکھڑی سے ہونٹ، بالوں کا اندازہ نہ لگا سکا کیوں کہ وہ اسکارف میں مقید تھے پھر بھی ایک آدھ سنہری لٹ اٹھکیلیاں کرتی دکھائی دی۔ انصر کو زندگی میں پہلی بار اسکارف پہنی کوئی لڑکی اتنی پیاری لگی۔

"السلام علیکم۔ انصر بھائی۔ ایک منٹ آئی۔" ثمرہ سلام دعا کے بعد فوراً اندر جرنل لینے چلی گئی، نوشین کی کال آچکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مامی کے خدشات کو ہوا ملے۔

"راستہ دیں گے؟" دعا نے پہلے اس کے ہٹنے کا انتظار کیا، مگر وہ دروازے پر ایستادہ اسے تکے جا رہا تھا تو ناگواری سے گویا ہوئی۔

"اوہ۔ سوری۔" انصر ایک دم ہوش میں آکر پیچھے ہٹا تو وہ کنی کترا کر نکل گئی، دوبارہ نگاہ غلط انداز بھی اس پر نہ ڈالی۔ جس کا وہ ہمیشہ سے عادی تھا۔ دعا کے چہرے پر پھیلی شرافت، سادگی اور بھول پن نے انصر کے دل کو ایک دم مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

"انصر بھائی! یہ لیجیے۔ ویسے ایک بات کہوں، وہ جا چکی ہے۔" ثمرہ ہاتھ میں جرنل تھامے کھڑی تھی، شرارتاً بولی۔ وہ جھینپ اٹھا۔ انصر نے ثمرہ کے سر پر چپت لگائی اور واپسی کی راہ لی۔ گلی کا موڑ کاٹنے سے قبل ویو مرر میں سبز مکان کو دیکھا، جہاں دعا داخل ہوئی تھی، دل نے کہا یہ ہی اس کی منزل ہے۔

☆ ☆ ☆

انصر کی یونیورسٹی لائف بہت بڑی اور رنگین گزری، کیوں نہ گزرتی وہ تھا ہی اتنی پُراثر شخصیت کا مالک، دیکھنے والا بے اختیار اس کی جانب کھنچتا۔ سیاہ گھنے بال، سرمئی آنکھیں، چہرے پر عجیب سی کشش، بھاری مردانہ آواز، لمبا قد اور مضبوط جسم، جب وہ پوری تیاری کے ساتھ شہزادوں کی طرح اپنی فیکلٹی میں داخل ہوتا، تو صنف نازک کی نگاہیں اس کا دور تک پیچھا کرتیں، بہت ساری لڑکیوں نے اس سے مرعوب ہو کر سلام دعا بڑھائی، کچھ نے سچی دوستی کے

دعوے کیے اور ایک دو پر وہ خود بھی مر مٹا، مگر تعلیمی دور کے خاتمے کے ساتھ ہی تمام فرینڈ شپ اختتام پذیر ہو گئیں، ساری محبتیں پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہو گئیں۔ اسے ساری باتیں بچپنے کا حصہ محسوس ہوئیں۔

وہ اپنے والد الیاس اکبر کے سمجھانے پر سنجیدگی سے کیریر کی طرف متوجہ ہو گیا، اور جلد ہی اپنی قابلیت و ذہانت کی وجہ سے ترقی کی منازل طے کر گیا۔ پورے گھرانے نے "منڈے کے سدھرنے" پر شکرانہ ادا کیا، ورنہ اس کا ہر وقت فون سے چپکے رہنا، راتوں کو ٹیرس پر ٹہل ٹہل کر باتیں کرنا، سر شام گاڑی لے کر نکل جانا۔ رات گئے لوٹنا۔ سب سے زیادہ ماں باپ کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔

آج طویل عرصے بعد وہ کسی لڑکی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کے سحر سے آزادی ہی نہیں مل پا رہی تھی، دعا کی ہنسی کی کھنک ابھی بھی انفر کے کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی، دماغ میں وہ منظر بس گیا۔

ہر بار "دعا" کا نام لب پر آتے ہی پورے وجود میں مٹھاس سی گھل جاتی، آخر کار وہ ہار گیا۔ اپنے دل کی مرضی جان لینے کے بعد وہ میدان عمل میں کود پڑا۔ دعا کو اس کی اولین چاہت ہونے کا دعویٰ تو نہیں تھا، مگر انفر نے اسے پہلی محبت سے بڑھ کر چاہا۔ کوئی اس بات کا اقرار کرے یا نہ کرے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت ایک ایسا حادثہ ہے جو ہر ایک کی زندگی میں کم از کم ایک بار تو ضرور وقوع پذیر ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

انفر نے ڈرتے ڈرتے پہلے ماں اور پھر دونوں بھابھیوں کے کان میں دعا سے شادی کی بات ڈالی دی، جو توقع کے عین مطابق بڑی سرعت سے ابا تک جا پہنچی، میاں بیوی خوشگوار ازدواجی زندگی کے پس منظر میں یہ بات اٹل تھی کہ صالحہ بیگم شوہر سے بچوں کی باتیں کبھی نہیں چھپاتیں۔ اس طرح بچوں کی تربیت بہتر انداز میں ہوئی۔ الیاس اکبر نے بیٹے کا انٹرویو کرنے کے بعد لڑکی والوں سے ملنے کا عندیہ دے دیا، وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ اور دعا کے گھر جلدی جانے کے لیے بھابیوں کے ہاتھ پیر دھو کر نہیں بلکہ نہا کر پیچھے پڑ گیا۔ صالحہ بیگم نے فون پر اکلوتی بیٹی کو بھی یہ خوش خبری سنادی، ساری کتھا سننے کے بعد نوشین کو لگا جیسے اس کے کانوں میں دھماکے ہونے شروع ہو گئے ہوں۔ بلکہ دونوں ہاتھوں کے توتے اڑ گئے، اس نے سب سے پہلے خود کو کوسا جب مجبوری کے تحت بھائی کو نند کے گھر بھیجا۔ پھر لشتم پشتم میکے روانہ ہوئی۔ وہ تو انفر کو ثمو جیسی دلکش لڑکی کے سائے سے بھی بچا کر رکھنا چاہتی تھی مگر یہاں تو کہانی ہی کچھ اور ہو گئی۔

"یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" نوشین نے ولن والی بڑھک مارتے ہوئے دروازہ پار کیا۔ سامنا ایک دم ابا سے ہوا جو لان میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہیں آواز دب گئی۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کیوں۔ منع کیا جا رہا ہے، آپ نے لڑکی میں ایسی کیا برائی دیکھی؟ شریف گھرانہ ہے۔ بچی ماشاء اللہ صوم صلوۃ کی پابند ہے۔ اور کیا چاہیے؟"

نوشین کو ابا نے گھور کر دیکھا۔ وہ غصے میں کچھ زیادہ ہی تمیز سے بات کرنے لگتے۔ صالحہ جو بیٹی کی آواز پر پسینہ پونچھتی باہر آئیں، شوہر کے کاندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بیاہتا بیٹی سے نرمی سے بات کی جائے، الیاس اکبر نے پلٹ کر بیوی کو بھی آنکھ دکھائی۔ وہ غلط بات پر کسی کی نہیں سنتے تھے۔ "ابا اور لڑکیاں بھی دیکھ لیتے۔ میرا مطلب ہے۔" اس نے باپ کے چہرے پر ابھرتی غصے کی لہر دیکھی تو تھوڑا ہکلا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا دیکھنا دکھانا؟ لڑکیاں ہیں یا بکریاں، عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔" وہ شیر کی طرح دھاڑے۔ تو نوشین منمناتی ہوئی ماں کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ بھابھیوں کو بھی بھڑکانا چاہا، مگر دونوں نے لاڈلے دیور کا ساتھ دیا، الٹا نند کو سمجھانے بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

نوشین نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی' مگر پس پردہ اس شادی کی مخالفت میں لگی رہی۔ بس اس معاملے کی شوہر کو ہوا نہیں لگنے دی' ورنہ انصر کا ایک اور حمایتی کھڑا ہو جاتا۔

"ثمرہ اور دعا سمیر کی بہت دوستی ہے۔ اگر یہ شادی ہو گئی تو میرا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" نوشین سر پکڑ کر بیٹھ گئی' وہ جب بھی سلمیٰ کی طرف جاتی' اکثر دعا سے ملاقات ہوتی' اسے کیا خبر تھی کہ وہ لڑکی انصر کی پسند بلکہ ضد بن جائے گی اس مخاصمت کے پیچھے ایک یہ ہی وجہ تھی ورنہ اسے کوئی ایسی ذاتی پرخاش نہ تھی۔

"اب تو میرے میکے کی باتوں کا پورے سسرال میں ڈنکا بجے گا۔" نوشین کے دماغ میں ایک ساتھ کئی فتور پلنے لگے۔

اسے بس یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اس کے بھائی کی زندگی میں آنے والی لڑکی کی ہمدردیاں اس کے سسرال کے کسی بھی فرد کے ساتھ ہوں۔

"آپ لوگ دعا کا رشتہ لے کر خود ہی چلے جائیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" نوشین نے کافی سوچ بچار کے بعد اماں کو ٹکا سا جواب دیا' یہ سنتے ہی پورے گھر میں ہلچل مچ گئی' سب کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ ابا سے بیٹی کے فرمودات چھپائے گئے۔ بھابھیاں بھی اکلوتی نند کے بغیر سلسلہ جنبانی آگے بڑھانے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔ انصر کو احساس ہوا کہ اگر وہ بہن کو ناراض کر کے اپنے دامن میں گلاب لمحے بھر بھی لے گا تو خوشیوں کا رنگ جلد ہی پھیکا پڑ جائے گا۔ اس نے بہن سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔

☆ ☆ ☆

"آپی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ دعا' سلمیٰ باجی کے پڑوس میں رہتی ہے یا اس کی ثمرہ سے دوستی ہو۔ اتنی معمولی باتوں کی وجہ سے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔" انصر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی نگاہیں نوشین کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں' جیسے وہ اس کے دل کی بات جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میرے بھیا مان جاؤ' دعا کے علاوہ تم کالے چور کی بیٹی کے یہاں بھی رشتہ لے جانے کو کہو گے تو میں چاروں ہاتھ پیروں سے راضی ہوں۔" نوشین نے چھوٹے بھائی کو ٹھوڑیوں میں ہاتھ دے کر اسے منانا چاہا۔

"واہ آپی واہ آپ نے بھی خوب ___ کہی یعنی ایک دیکھی بھالی شریف فیملی کی لڑکی کی جگہ کالے چور کے خاندان سے رشتہ جوڑنے پر تیار بیٹھی ہیں۔ حد ہوتی ہے۔" انصر نے سر پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا' تو برابر میں بیٹھی آئمہ بھی چھوٹے ماموں کے انداز پر ہنس دی۔

"میرے بھیا یہ تو ایک مثال دی ہے' ورنہ تو تمہارے لیے ایک امیر گھرانے کی چاند سی لڑکی ڈھونڈ نکالوں گی۔" نوشین نے بھائی کو پھر موم کرنا چاہا۔

"نہ بابا نہ مجھے چاند واند کی خواہش نہیں' میں تو اس چمکتے تارے کو ہی اپنا کر قسمت کا ستارہ بنا کر خوش ہو جاؤں گا۔" انصر نے بہن کو ہری جھنڈی دکھائی اور وہاں سے اٹھ گیا۔

"سالے صاحب۔ کہاں چلے؟ کبھی ہمیں بھی اپنا قیمتی وقت دے دیا کرو۔" اعزاز محمد جو محلے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے' انصر کو جاتا دیکھ کر پیچھے سے آواز لگائی' زور "سالے" پر تھا۔

"بھائی جان ایک ضروری کام سے جانا ہے بعد میں ملتا ہوں۔" انصر بہن کی باتوں سے اتنا مایوس ہوا کہ اخلاقاً بھی نہیں رک سکا ہاتھ ہلاتا چلا گیا۔

دعا سمیر کے لیے انصر کے جذبات سچے تھے یا یہ آسمانوں پر کیا جانے والا فیصلہ اٹل' یوں زمین پر رہنے والوں کی مخالفت دھری کی دھری رہ گئی اور دعا انصر کی زندگی میں بہار بن کر اتری۔

"تم نے میری زندگی میں آکر مجھے مکمل کر دیا ہے۔"

انصر نے دعا کو اپنے سامنے پا کر زبان سے محبت کا پہلا اقرار کیا۔ اصلی گلاب کے پھول پتیوں سے سجے حجلۂ عروسی میں ریڈ اور بلو شرارے میں ملبوس خوشبوؤں سے مہکتی دلہن کو پا کر وہ خوشی سے پھولے نہیں

سمارہا تھا۔ دعا شرم کے مارے جھکی جارہی تھی۔ ماتھے پر سجی بندیا گورے ہاتھوں پر رچی مہندی۔ آنکھوں میں سجا کجرا اور۔ بالوں میں ٹکایا ہوا گجرا وہ کتنی دیر اسے نگاہوں میں جذب کرتا رہا۔ پھر بیڈ پر قریب جاکر بیٹھ گیا۔ وہ گھبرا کر تھوڑا سا پیچھے سرک گئی' انصر کا دلکش مردانہ قہقہہ بے ساختہ کمرے میں گونجا' دعا ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں شرارت سمائی۔

"اوہ مائی گاڈ میری شیروانی پر یہ کیا چل رہا ہے؟" انصر نے اپنے لہجے میں مصنوعی تشویش پیدا کی۔ دعا کی حیا سے جھکی آنکھوں میں جنبش ہوئی' پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا' وہ فان کلر کی شیروانی میں کسی اور دیس سے آیا شہزادہ لگ رہا تھا۔ بغور دیکھا تو کہیں کوئی کیڑا چلتا دکھائی نہیں دیا۔ دل میں گدگدی ہوئی۔ آنکھیں اس کی شرارت پر مسکرائیں۔

"سنو جی۔ مکمل معائنہ ہوگیا ہو تو ماشاء اللہ بول دو۔" انصر نے اس کے گال کے ڈمپل پر انگلی رکھ کر دھیرے سے کہا' دعا کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا' فوراً نگاہیں جھکائیں۔ چہرے پر شرم کی لالی بکھر کر اس کے حسن کو چار چاند لگانے لگی۔ انصر نے اپنی دلہن کی شرم کو انجوائے کرتے ہوئے' منہ دکھائی کی رسم ادا کی۔

"کیسی پیاری بات کی گئی ہے کہ محبت جیت ہوتی ہے' محبت ہار ہوتی ہے۔ محبت ذات ہوتی ہے اور محبت سے ہی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔" دیدہ زیب جڑاؤ کنگن اس کی نازک کلائیوں میں پہنا کر ان سے کھیلتے ہوئے انصر نے اپنے جذبات لفظوں میں پروئے۔ وہ مسکائی۔

"ایسا لگتا ہے جیسے آج ہماری زندگی کی تکمیل ہوگئی ہے۔" انصر نے دعا کا حنائی ہاتھ بڑے استحقاق سے تھام کر نرمی سے کہا تو اس کی پلکیں لرز اٹھیں۔

☆ ☆ ☆

نوشین تحفہ ڈھونڈنے کے مشن پر دوبارہ اسٹور میں چلی آئی۔ نمرہ کی دو دن بعد سالگرہ تھی۔ پوری ہوم شاپ چھان مارنے کے بعد فاطمہ خالہ کے دیے ہوئے لان کے سوٹ پر نگاہ انتخاب جا ٹھہری۔ فاطمہ نوشین کی سگی خالہ تھیں۔ آئمہ کے پاس ہونے پر انہوں نے ایسا سوٹ گفٹ کیا' جسے دیکھتے ہی اس کا منہ بن گیا۔ سوٹ کا کپڑا نہ صرف ہلکا سا' رنگ بھی بوڑھوں والا تھا' شاید خالہ کو کسی نے دیا ہوگا' اور انہوں نے آگے ٹکا دیا۔

"مما۔ نانی کو پتا ہے کہ میں ایسے کپڑے نہیں پہنتی پھر بھی ایسا بے کار سوٹ دیا ہے۔" آئمہ نے فاختہ رنگ کی بڑے پھولوں کے پرنٹ والی لان ہاتھ میں لیتے ہی مسترد کردی۔ نوشین کو بھی اچھا نہیں لگا۔

"پتا نہیں لوگ ایسے تحفے کیوں دیتے ہیں' جو خود استعمال نہیں کرتے۔" نوشین نے بیٹی کی تائید کی مگر یہ بھول گئی کہ وہ خود بھی اس کام میں ماسٹر تھی۔

"میں یہ نہیں سلواؤں گی۔ آپ ماسی کی بیٹی کو دے دیجیے گا۔" آئمہ نے فیصلہ سنایا۔

"اسے کیوں دوں؟ آئے دن بلاوے آتے رہتے ہیں۔ رکھ لیتے ہیں۔ کہیں اور چلا دوں گی۔" نوشین نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھا کر اسٹور میں رکھ آئی۔ اب وہی سوٹ نوشین نے اپنی نند کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ پر دینے کے لیے نکال لیا۔

☆ ☆ ☆

سلمیٰ اپنی نوشین بھابھی کی اس عادت سے بہت چڑتی تھیں' بچے بھی ممانی کی طرف سے لائی ہوئی چیزوں پر غصہ کرتے' مگر ماں کے سمجھانے پر خاموش ہوجاتے۔ سلمیٰ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ایسا مسئلہ کھڑا ہو کہ بھائی کے گھرانے سے ان بن ہوجائے۔ اعزاز کی سگی بہن ہونے کے باوجود وہ بھائی کی فیملی سے کافی محتاط انداز میں ملتیں۔

اعزاز کو گھریلو سیاستوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' مگر چھوٹی بہن کی جھجک پر کئی بار پیار آجاتا۔ وہ سلمیٰ کے حق کو مانتے ہوئے اکثر شام کو بہن اور دونوں بھانجیوں کی محبت میں بغیر اطلاع دیے ملنے پہنچ

جاتے۔ بہن کے گھر خالی ہاتھ جانا ان کی روایات کے خلاف تھا۔ اسی لیے پھل فروٹ اور جو بھی ان کے دل میں آتا خریدتے چلے جاتے۔ سلمیٰ اتنا سامان دیکھ کر منع کرتیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بھائی کا کوئی بھی احسان ان کے حلق کا نوالہ بھی گھسیٹ لے۔ نوشین ساتھ ہوتی تو دیکھ کر رہ جاتی۔ مگر یہاں اعزاز کو روکنا مشکل ثابت ہوتا اسی لیے وقتی طور پر پسپا ہو جاتی' پر اسے جہاں موقع ملتا۔ وہ ڈنڈی مارنے سے نہیں چوکتی۔

☼ ☼ ☼

دعا خالصتاً "ایک مشرقی لڑکی تھی' اس کا گھرانہ کسی حد تک مذہبی تھا۔ انصر زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ جس کا پیار پاتے ہی اسے یوں لگا جیسے کہ زندگی کا ادھورا پن مکمل ہو گیا ہو' انصر کی خالص محبت اسے حسین سے حسین تر بناتی چلی جا رہی تھی۔ دعا نے اپنی ہنس مکھ طبیعت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے جلد ہی پورے گھرانے کا دل جیت لیا۔ ایک الجھن البتہ پھانس کی طرح چبھے جاتی' جب شوہر نامدار نے شادی کے شروع دنوں میں ہی ہلکے پھلکے انداز میں اسے نوشین کے ڈر و خوف اور سلمیٰ کے گھرانے کے حوالے سے پیدا شدہ تحفظات سے آگاہ کیا۔ یہ بات اس کی شخصی آزادی کے خلاف جاتی تھی' مگر وہ عقل مند لڑکی تھی' انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے خود ہی محتاط ہو گئی۔

"مما۔ نمرہ کی سالگرہ پر کیا گفٹ کر رہی ہیں؟" آئمہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد وہ گرمی کی شدت سے گھبرا کر تو نہانے گھس گئی' فریش ہو کر ماں کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔

"بیٹا۔ فکر کرنے کی بات ہی نہیں۔ گھر سے ہی ایک لان کا سوٹ نکل آیا ہے۔" نوشین نے خوش دلی سے بیٹی کو بتایا۔

"کون سا سوٹ؟" آئمہ نے ماں کو سر اٹھا کر دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

"وہ ہی بابا۔ جو خالہ فاطمہ نے تمہارے پاس ہونے پر دیا تھا۔" اس نے دھیرے سے کہا' اور ٹی وی لاؤنج میں جھانکا جہاں شوہر بیٹھے میچ دیکھ رہے تھے۔

"وہ اتنا بورنگ کلر اور پاپا نے جو آپ کو گفٹ لانے کے پیسے دیے تھے۔ ان کا کیا ہوا؟" آئمہ پہلے چیخی پھر ماں کے آنکھ دکھانے پر اس کی آواز نیچی ہو گئی۔

"ان پیسوں سے کل ہم شاپنگ کرنے جائیں گے۔" نوشین نے مسکرا کر اپنا منصوبہ بتایا۔

نوشین نے اپنی چلائی۔ نمرہ کی سالگرہ پر مہنگے گفٹ پیپر میں سستا سوٹ لپیٹ کر دے آئی اور بعد میں میاں کے دیے ہوئے پیسوں سے جا کر اپنا اور آئمہ کا سوٹ لے آئی۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو گیا تو اعزاز محمد نے ہمیشہ کی طرح اس سال بھی بڑی سی افطار پارٹی کا اہتمام گھر کے نزدیک واقع ایک ہال میں کیا اور سارے خاندان کو بلاوا بھجوا دیا۔ باقی لوگ تو آ چکے تھے' مگر وہ نہیں پہنچے جن کا تھا انتظار۔ نوشین نے چھوٹے بھائی کو فون گھما کر بولنا شروع کر دیا۔ دعا تو عصر کی نماز پڑھ کر تیار ہو گئی تھی۔ انصر کو آفس سے اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ تاہم افطار سے بیس منٹ قبل ان کی گاڑی ہال کے باہر آ کر رکی۔ دعا سفید لباس' جس میں اس نے آتشی گلابی اپلک لگوائی تھی' پہن کر شوہر کے ساتھ ہنستی مسکراتی استقبالیہ میں داخل ہوئی تو نوشین اور آئمہ نے بڑا پرتپاک استقبال کیا۔ دعا کی سنگت کا اثر تھا کہ انصر اب نماز کی پابندی کرتا اور اکثر کرتا شلوار بھی پہن لیتا۔ اس وقت بھی سفید۔ کڑکڑاتے شلوار میں ملبوس بہت سوبر لگ رہا تھا۔

"واہ... بھئی واہ... سالے صاحب۔ آپ دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر دل میں ایک ہی خیال آتا ہے۔" بیوی کے ساتھ کھڑے مہمانوں کا استقبال کرتے اعزاز نے انہیں سراہا۔

"اچھا... وہ کیا بھائی صاحب؟" انصر نے شگفتگی سے کہا' جبکہ آئمہ سے گجرے پہنتی دعا بھی ان کی

طرف متوجہ ہوئی۔
"آپ دونوں... ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔" اعزاز نے دعا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو سب ہنس پڑے۔
افطار پارٹی بہت اچھی رہی۔ اعزاز محمد نے مہمانوں کی تواضع کے لیے بڑا اچھا انتظام کروایا۔ پہلے کھجور، پکوڑوں، فروٹ چاٹ، چھولوں اور شربت سے روزہ کھلوایا گیا بعد نماز مغرب کھانا لگوا دیا گیا۔
"افطار سے ہی پیٹ بھر جاتا ہے... کھانا کون کھاتا ہے؟" نوشین تو مہمانوں کو صرف افطاری پر ٹرخانا چاہتی تھی، پر بیوی کے منہ ناک بنانے کے باوجود اعزاز نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ثمرہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ یہاں موجود تھی، مگر دعا جان کر سلام کے بعد اس سے دور دور رہی۔
"سنیں... وہ گاڑی سے نکال کر لے آئیں۔" دعا نے کھانے کے بعد انصر کو اشارہ کیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ نوشین نے سوالیہ نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا، مگر وہ آئمہ سے باتوں میں لگی رہی۔
"مامی... یہ تحفہ کس خوشی میں ہے؟" دعا نے جانے سے قبل آئمہ کو گلے لگا کر انصر کا لایا ہوا پیکٹ تھمایا تو وہ حیرت اور خوشی سے بولی۔
"بس... عید گفٹ ہے۔ میں نے سوچا، اس بار تم میری پسند کا سوٹ سلوا کر پہنو۔" دعا نے پیار سے آئمہ کے گال تھپتھپائے تو وہ مامی سے لپٹ گئی۔ نوشین بھی یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ دعا اجازت طلب کر کے انصر کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی۔
"اب ہو گا... دھماکا۔" دعا نے پلٹ کر دونوں ماں بیٹی کے مسرور چہرے دیکھ کر سوچا اس کے نازک لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

"مما... لگتا ہے مامی بڑا زور دار تحفہ لائی ہیں۔" رات کو گھر لوٹنے کے بعد بے چینی سے گفٹ کھولتے ہوئے آئمہ نے مسکرا کر کہا۔
"یہ بات تو ہے، ویسے بھی اس کی پسند کتنی اچھی ہے... خود بھی تو ڈیزائنر سے کم سوٹ نہیں پہنتی ہے۔" نوشین نے ریپر پر لگا ہوا ٹیپ اتارتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔
"مما... میں تو عید والے دن مامی کا دیا ہوا سوٹ ہی پہنوں گی۔" آئمہ نے ریپر پھاڑتے ہوئے جوش سے فیصلہ سنایا۔
"ہاں بھئی ضرور پہننا... بھلا مجھے کیا اعتراض ہے۔" نوشین نے ہامی بھری، مگر ڈبے میں سے نکلنے والے سوٹ کو دیکھ کر ان دونوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"مما۔ مما... دیکھیں... چھوٹی ممانی نے مجھے یہ... عید گفٹ دیا ہے؟" آئمہ حیرانی و پریشانی سے چیخی۔
"میرا دماغ بھی یہ ہی دیکھ کر ماؤف ہو رہا ہے، آئمہ غور سے دیکھو یہ ویسا ہی کپڑا نہیں، جو میں نے ہوم شاپ سے نکال کر ثمرہ کو دیا تھا۔" نوشین نے فاختئی سوٹ ہاتھ میں لے کر حیرانی کا اظہار کیا۔
"مما۔ یہ تو بالکل ویسا ہی پرنٹ اور کپڑا ہے۔ جو آپ نے ثمرہ کو دیا تھا۔" آئمہ نے اظہار حیرت کیا۔
"ہاں... اتفاق... دیکھو... رنگ بھی وہ فاختئی ہے۔" نوشین نے چشمہ لگا کر کپڑا الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں ابھی دعا سے پوچھتی ہوں۔ یہ کیا مذاق ہے؟ میری بیٹی کو عید میں دینے کے لیے یہ بری گت کا سوٹ ہی رہ گیا تھا۔" نوشین غصے میں ایک دم فون کی جانب بڑھی۔

آئمہ کے سامنے وہ ہی سوٹ پھیلا ہوا تھا جو فاطمہ خالہ نے پہلے اسے دیا اور ان لوگوں نے پیک کر کے آگے بڑھا دیا۔ دنیا گول ہے یہ تو سنا تھا، ہر چیز گھوم پھر کر اپنے مرکز کی جانب لوٹتی ہے، اس پر بھی ان کو یقین تھا، مگر ان کا سوٹ اپنا سفر اتنی تیزی میں طے کرتا ہوا ان تک واپس لوٹ آئے گا... یہ بات ناقابل یقین تھی۔
"مما... ایک منٹ... جب ثمرہ نے آپ کا دیا ہوا پیکٹ اشتیاق سے کھولا ہو گا اور ایسا ہی سوٹ نکلا ہو گا۔ تو آپ نے سوچا کہ اس نے کیسا محسوس کیا

ہوگا؟" آئمہ کے اندر کوئی چیز ٹوٹی اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

"اس نے جو سوچا ہوگا۔۔۔ وہ اس کا مسئلہ ہے۔۔۔ مگر مجھے تو اس وقت اپنی چندا کی فکر ہے۔۔۔ میں اپنی بچی کا دل توڑنے والی سے ایک بار بات ضرور کروں گی۔"

نوشین کے جذبات اونچائی پر اڑ رہے تھے۔ اس کے پلّے بیٹی کی ذو معنی بات نہیں پڑی۔

"ممّا۔۔۔ آپ۔ پلیز کسی کو فون نہ کریں۔۔۔ اس نے بھی ایسا ہی برا فیل کیا ہوگا' جیسا میں کر رہی ہوں۔۔۔"

آئمہ کے تیکھے انداز پر نوشین کے سامنے سے پردے ہٹتے چلے گئے۔ نوشین کو لگا منہ میں وہ زبان نہیں رہی جس سے دعا سے کوئی سوال جواب کیا جاسکے۔"

کبھی کبھی کوئی سبق دینے کے لیے زبانی کلامی باتوں کی جگہ عملی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ اسی کیفیت سے گزرنے کے بعد سامنے والے کی تکلیف کا بہتر طریقے سے اندازہ ہوپاتا ہے۔

دعا نے بھی ان دونوں کے ساتھ یہ ہی تھراپی آزمائی۔ آئمہ پوری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی' صبح تک اس نے دل میں ایک پلان بنایا اور مسکراتی ہوئی بستر سے باہر آگئی۔

☆ ☆ ☆

دعا بہت سلجھی ہوئی اور کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے والی لڑکی تھی' جب بھی نوشین امی کی طرف رکنے جاتی' وہ اسے خاص پروٹوکول دیتی۔

"آپی! آپ کا کتنے دنوں بعد چکر لگا ہے۔۔۔ آج تو اعزاز بھائی کو اکیلے ہی گھر جانا پڑے گا۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔" دعا پیار سے جانے کے لیے تیار کھڑی نوشین کے ہاتھ سے بیگ لے کر اسے رکنے پر مجبور کردیتی۔ جب تک اس کا پڑاؤ امی کی طرف رہتا وہ ان لوگوں کی خوب خاطر مدارات کرتی۔۔۔ اعزاز محمد جب بھی سلجھی کی تعریف کرتے تو نوشین کو 'بھائی' بھابھی پر فخر محسوس ہوتا۔

"امی! شکر ہے۔ دعا بہت سلجھی ہوئی لڑکی نکلی۔" نوشین کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف نکل جاتی۔ ایسے وقت میں اگر انصر وہاں موجود ہوتا تو اس کی معنی خیز نگاہیں بہن کا احاطہ کیے رہتیں۔

"اگر خدانخواستہ دعا کی جگہ کوئی تیز طرار لڑکی انصر کے جیون کی ڈور تھام لیتی تو گھر کا ماحول مکدر ہوجاتا۔" صالحہ بیگم نے بھی دھیرے سے بیٹی کی تائید کی۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔" نوشین نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"شکر ہے تمہارے ابا اڑ گئے۔۔۔ ورنہ میں تو تمہاری باتوں میں آکر انکار کرنے والی تھی۔" صالحہ بیگم نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ نوشین کے ذہن میں کچھ دن پہلے میکے میں ماں کے ساتھ دعا کے بارے میں کی گئی بات چیت تازہ ہوئی۔

"آج دعا نے ایسا کیوں کیا؟" نوشین کو بستر پر لیٹ کر بھی سکون محسوس نہیں ہورہا تھا' کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے ذہن کی سوئی دعا کے دیے گئے تحفے پر جا اٹکی۔

"کہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں' ہمارا دل جیتنے کے لیے اس نے شروع میں ڈھونگ کیے ہوں اور اب اس کی پرت اترنا شروع ہوگئی ہو؟" نوشین بدگمان ہونے لگی۔

انسانی فطرت بعض معاملات میں سمجھ سے بالاتر ہے' کوئی کسی کے ساتھ دس بار اچھائی کرے۔۔۔ مگر ایک بار برائی کردے تو ساری زندگی اس ایک بات کو پیٹتے ہوئے' باقی نیکیوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ نوشین نے بھی اس وقت وہ ہی کیا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔۔۔ کیسی ہو؟" دعا کی آواز کی کھنک نے جیسے ثمرہ کے اندر توانائیاں سی بھردیں' ورنہ سلمٰی نے ڈانٹ ڈانٹ کر ان دونوں بہنوں کا ناطقہ بند کردیا تھا۔

"میں۔۔۔ ٹھیک ہوں' وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ممانی نے اس سوٹ کو دیکھ کر تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟" اس نے دل میں اٹھتے اندیشوں کو زبان دی۔

"بات سنو۔۔۔ ڈیر اپنا خون نہ جلاؤ۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔۔۔ آپی اور ان کی بیٹی کو ذرا سی آواز بھی نہیں نکلی'

ویسے بھی ڈرے کو ہی سب ڈراتے ہیں۔" دعا کھلکھلائی تو ثمو کی جان واپس آئی۔
"ہونہہ... منہ پر کچھ نہیں کہا' دل میں کلستی ہوں گی۔" ثمو نے ایک نیا نکتہ اٹھایا۔
"چھوڑو نا یار... وہ دل میں چاہے ہزاروں گالیاں دیں' جس دن منہ پر کچھ بولیں گی... میں بھی ان کو ہزار جواب دے دوں گی۔" دعا نے سہیلی کی ہمت بندھانے کے لیے جوش دکھایا۔ ورنہ وہ معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی خواہش مند رہتی۔
"اچھا... انصر آنے والے ہوں گے' میں بعد میں بات کروں گی... ابھی تو صرف تمہیں تسلی دینی تھی کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔" دعا نے دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا اور عجلت میں فون رکھا۔

☼ ☼ ☼

"تم... بہت اچھی اور مخلص دوست ہو... سدا خوش رہو۔" ثمو کے دعائیہ الفاظ کانوں میں گونجے تو جو اس نے فون رکھنے سے پہلے ادا کیے تھے' ایک مسکراہٹ نے دعا کے چہرے کا احاطہ کیا۔
ہلکا جامنی کرتا پائجامہ پہنے وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ انصر کی واپسی کا انتظار تھا۔ فرصت سے بیٹھی تو اس کا دھیان ثمو کی جانب چلا گیا' پچھلے ہفتے کا منظر اس کے دماغ میں فلم کی طرح چلنے لگا' جب وہ میکے رہنے گئی ہوئی تھی۔ دوسرے دن ہی پڑوس میں رہنے والی اپنی بچپن کی دوست ثمرہ کے گھر جا پہنچی۔ جس سے اب اس کی رشتے داری بھی ہو گئی تھی... یہ اور بات کہ اب ان دونوں کے درمیان بظاہر دوری آچکی تھی۔
وہاں کا ماحول کچھ اداس سا تھا۔ سلمیٰ منہ تک چادر اوڑھے اپنے بستر پر لیٹی ہوئی نظر آئیں۔ دعا نے توجہ نہ دی' مگر جب نمرہ کا پھولا منہ اور ثمرہ کا اترا چہرہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ دعا کا شروع سے اس گھر میں بہت آنا جانا تھا' اسی وجہ سے وہ یہاں سب کے مزاج کو اچھے طریقے سے پہچانتی تھی۔
"کوئی تو بات ہے... ورنہ سلمیٰ خالہ کے گھر کا ماحول تو بہت خوش گوار اور پرسکون رہتا ہے۔" دعا نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔
"نمرہ... سوری ہماری دوسری جگہ دعوت تھی' اس لیے تمہاری برتھ ڈے میں نہیں آسکی۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا گفٹ مارا گیا... یہ لو اور باندھ کر چیک کرو۔" دعا نے سنہری ڈائل والی نازک سی گھڑی کا ڈبہ پکڑاتے ہوئے شوخی دکھائی۔ نمرہ نے بغیر کوئی جوش و خروش دکھائے ڈبہ لیا اور سائیڈ میں رکھ کر۔ قرآن شریف کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔
"اسے کیا ہوا...؟ یہ کیوں اداس بلبل کا روپ دھارے بیٹھی ہے؟" دعا نے خود کلامی کی۔ نمرہ بہت پیاری سی سادہ دل بچی تھی۔ اس سے بھی بہن کی طرح لاڈ دکھاتی تھی... مگر آج کا رویہ سمجھ سے بالا تر تھا۔
"ثمرہ۔ گھر میں... سب خیریت تو ہے۔ کیا خالہ کی طبیعت خراب ہے؟" دونوں جب اندر جا کر بیڈ پر لیٹ کر پرانی یادوں کو تازہ کرنے لگیں تو اچانک دعا نے فکر مندی سے پوچھا۔
"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ دراصل۔ امی کا روزہ ہے نا۔ تو نماز پڑھ کر ابھی لیٹی ہیں۔" ثمرہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ٹالا۔
"اچھا... یہ نمرہ میڈم کو کیا ہوا ہے...؟ کوئی لفٹ ہی نہیں کرا رہی۔" دعا نے کروٹ بدلی اور دالان میں بیٹھی نمرہ کی طرف اشارہ کیا' جو رحل پر رکھا قرآن شریف ہل ہل کر پڑھ رہی تھی۔
"کچھ... نہیں۔ بس ایسے ہی... چھوڑو نا... تم بھی کن باتوں میں الجھ رہی ہو۔" ثمرہ نے بات بدلنا چاہی۔ وہ دعا کی شادی کے بعد سے کافی سوچ سمجھ کر بولتی۔ ماں کے سمجھانے پر نوشین یا ان لوگوں کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہ کرتی' مگر آج اس کا دل بھی ممانی کی طرف سے خاصا دکھا ہوا تھا۔
"میں... جو کہہ رہی ہوں۔ وہ بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔" دعا نے آنکھیں دکھائیں تو وہ بجھے دل سے اندر سے نوشین کا گفٹ اٹھا لائی اور پورا واقعہ بیان کیا۔
"اوہ... یہ تو بڑی غلط حرکت ہے۔" دعا کا حلق تک

کڑوا ہو گیا۔

"بس یار... یہ ہی بات ثمرہ نے بھی امی کے سامنے کہہ دی تھی۔ انہوں نے اس کو خوب ڈانٹ پلائی کہ کسی کی دی گئی چیز میں عیب نہیں نکالتے... چیز کی قیمت نہیں۔ دینے والے کا خلوص دیکھو۔" ثمرہ نے بے چینی سے ماں کے الفاظ اپنی سہیلی کے سامنے دہرائے۔

"یہ... بات ہے۔" دعا، ثمرہ کے بنا بتائے بھی کافی کچھ سمجھ چکی تھی۔

"بس اسی وجہ سے گھر کا ماحول پراگندہ ہو گیا ہے۔" ثمرہ کا لہجہ گلوگیر تھا۔

"خالہ کی بات ٹھیک ہے... مگر اس گفٹ میں سے تو تمہاری ممانی کا خلوص کچھ زیادہ ہی جھلک رہا ہے۔" دعا نے طنزیہ انداز میں چٹکی سے کپڑا تھام کر کہا۔

اب وقت آگیا ہے کہ نوشی آپی کی شاپ پر تالا ڈلوا دیا جائے... یہ نہ ہو کہ ان کے دلوں پر قفل لگ جائیں۔ دعا نے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

آئمہ نے ایک دن مذاق ہی مذاق میں اسے اسٹور کا معائنہ کراتے ہوئے اپنی ماں کی عادت کے بارے میں بتایا تھا۔ اس سوٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی دعا سمجھ گئی کہ یہ ہوم شاپ سے نکلنے والا مال ہے۔

"میں۔ یہ... لے جا رہی ہوں... اس کے بدلے میں نیا سوٹ ایک دو دن میں بھجوا دوں گی۔" واپسی پر دعا نے وہ شاپر بڑی بے تکلفی سے اٹھایا اور دھیرے سے ثمرہ کا ہاتھ دبا کر بولی۔ اسے فی الحال ازالے کا یہ ہی طریقہ سمجھ میں آیا۔

"اوئے... کیا غضب کر رہی ہو۔ نہیں۔" ثمرہ ایک دم گھبرا کر اسے روکتی رہ گئی، مگر وہ ہاتھ لہراتی باہر نکل گئی۔

سلمیٰ سے دو دن تک تو یہ بات چھپائی گئی... مگر دعا کی امی نے جب ایک دلکش رنگوں سے سجا لان کا جوڑا ثمرہ کو دیا تو... مجبوراً" ثمرہ کو ماں کو ساری بات بتانی پڑی۔ وہ تو دل تھام کر بیٹھ گئی۔

"اگر تم لوگوں کی بے وقوفیوں کی وجہ سے مجھے اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" سلمیٰ ایک ہی بات کہے جا رہی تھیں، مگر اب دعا سے فون پر بات کر کے ثمرہ نے سکون کا سانس لیا اور ماں کو بھی تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

"سنیں... اس عید پر اپنا وعدہ نبھائیے۔ چل کر میرا گفٹ دلائیں۔" نوشی نے اعزاز کو دیکھ کر بڑے ناز سے کہا، وہ تراویح کے بعد گھر لوٹے تھے۔

"اچھا۔ جی۔ بڑے مزے آرہے ہیں..." اعزاز پر نیند سوار ہونے لگی، وہ لیٹ کر سستی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولے۔

"پندرہ... روزے گزر چکے ہیں۔ آپ مجھے سونے کی چین کب دیں گے؟" نوشین پچھلے کئی مہینوں سے سونے کی چین مانگ رہی تھی۔ اعزاز نے عید میں دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے وہ اب پیچھے پڑ گئی۔

"نوشی۔ آخر... آپ۔ مجھے چین سے سونے کب دیں گی؟" اعزاز نے الٹا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا۔

"معافی... گھسا پٹا لطیفہ سنا کر بور نہ کریں۔" نوشی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا... سنو... میں اس بار آپ کو اور آئمہ کو ایک خاص تحفہ دے رہا ہوں۔" اعزاز نے سنجیدگی سے بیوی کا چہرہ دیکھا۔

"وہ کیا...؟" نوشین کا اشتیاق کے مارے برا حال ہوا۔

"میں نے ایک یتیم خانے میں بچوں کے عید کے کپڑوں کے لیے ہم تینوں کی طرف سے کچھ رقم جمع کرائی ہے۔" اعزاز نے بیوی کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بتایا۔ وہ ایک دم چپ رہ گئی۔

"ٹھیک کیا نا؟" اعزاز نے بیوی کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

"جی... بہت... اچھا تحفہ ہے۔" نوشین نے اپنا دوسرا ہاتھ شوہر کے ہاتھ پر گرم جوشی سے رکھ کر حامی بھری۔

دعا بہت مصروف تھی، عیدی کا سامان ایک جگہ

اکٹھا کرتے ہوئے سوچنے لگی۔

"امید تو یہ ہی ہے کہ اس سوٹ کی واپسی نے نوشی آپی اور آئمہ کو بھی تکلیف کے اسی احساس سے دوچار کیا ہوگا' جس سے پچھلے دنوں نمرہ گزری تھی۔" دعا نے پھلوں کا ٹوکرا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھواتے ہوئے سوچا۔وہ ڈرتے ڈرتے نند کے گھر جارہی تھی۔

نوشین کے لیے میکے کی طرف سے اس بار عیدی بھیجنے کی ذمہ داری دعا نے اٹھائی۔اس کی ساس نے بھی چھوٹی بہو کی محبت کو سراہا۔ دعا نے شاپنگ کرتے ہوئے ان لوگوں کی پسند ناپسند کو دھیان میں رکھا اور تمام شاپنگ بڑے خلوص کے ساتھ کی۔

سب نے نوشین کو سرپرائز دینے کا سوچا یوں بغیر اطلاع کے معہ عیدی اور دیگر لوازمات کے ساتھ پچیسویں روزے کو پہنچ گئے۔ اپنے پیاروں کو اچانک سامنے دیکھ کر نوشین خوشی سے کھل اٹھی۔ آئمہ بھی باربار سب سے لپٹ کر لاڈ دکھاتی رہی۔ دعا کی توقع کے برعکس نند نے اس کا بھی بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

"آئمہ جان۔ مامی کا ایک کام کرو گی....؟" وہ دونوں افطاری کی تیاری میں مصروف تھیں۔ کہ اچانک دعا نے آئمہ کے بھولے بھالے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ الغر نے سرپرائز کی یہ سزا دی کہ آئمہ اور دعا کو کچن میں روانہ کرکے بہن کا ہاتھ تھام کر امی کے پاس لا بٹھایا۔ دونوں بھابھیاں بھی دعا کی ہیلپ کرنے کھڑی ہو گئیں' مگر اس نے سب کو کچن سے باہر نکال دیا۔

"کیا کام ہے آپ.... بتایئے۔ میں ضرور کروں گی۔" آئمہ نے مامی کی ناک میں پہنی نقرئی نوزپن کو دیکھا۔

"اپنے دل کی شاپ کو دوسروں کے لیے کھول لو۔" دعا نے چھری ایک طرف رکھ کر رسانیت سے بولی۔

"دل کی شاپ"۔ میں.... مطلب نہیں سمجھی؟؟" آئمہ نے حیرانی سے سوال کیا۔

"دیکھو.... آج کل کے نفسانفسی کے دور میں.... ہم سب کو اپنے دلوں میں ایک ایسی شاپ کھولنی چاہیے جہاں سے وہ جذبے بے مول مل جائیں' جن کی ہمارے اپنوں یا ارد گرد رہنے والوں کو اشد ضرورت ہے۔" دعا نے سر کا اسکارف برابر کیا اور متانت سے بولی۔

"مامی.... میں یہ شاپ ضرور کھولوں گی.... مگر۔اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" آئمہ نے اشتیاق کا مظاہرہ کیا اور گلابی ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

"گڑیا.... اگر ہمارے ارد گرد کوئی دکھ درد میں مبتلا ہے' تو دل کی شاپ سے اسے خوشیاں خرید کردو.... ایسے لوگوں کے ساتھ محبت بھرا سلوک کرو.... ان کی دل جوئی کرو۔" دعا کے سمجھانے پر آئمہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

"ٹھیک بات ہے۔مامی.... اگر کوئی بیمار ہے تو دل کی شاپ سے اسے توجہ اور ہمدردی کی دوا مل سکتی ہے.... بس میں نے اس رمضان سے اپنے دل کی شاپ کھول لی ہے۔" آئمہ نے شربت کا سیرپ پانی میں گھولتے ہوئے مزید ٹکڑا جوڑا تو دعا اس کی سمجھ داری پر خوش ہوگئی۔

"ایک بات کا دھیان رکھنا۔ دل کی شاپ' بلا کسی تعصب اور امیری غریبی کے فرق کیے بنا چوبیس گھنٹے سب کے لیے یکساں کھلی رہنی چاہیے' اگر یہ بغض' عیاری' بھید بھاؤ یا میل کا شکار ہوئی تو سمجھو دکانداری کا ستیاناس ہوگیا۔" دعا نے نرمی سے اس کے کاندھے پر دباؤ ڈالا۔

"میں.... سمجھ گئی۔" آئمہ نے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"آئی لو یو مامی۔" وہ وفور جذبات سے بول پڑی۔

"لو یو ٹو.... ڈیئر۔" دعا نے پین میں پکوڑے تلنے کے لیے تیل ڈالتے ہوئے' اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

☆ ☆ ☆

نوشین کے منگائے گئے بادام پستے پانی میں بھیگ چکے تھے۔ ہر سال کی طرح اعزاز کی فرمائش پر وہ بڑے اہتمام سے قوامی سویاں پکاتی۔ اس نے ابھی کبابوں کا

قیمہ چڑھایا تھا۔

"سنو... کل مہمانوں کی خاطر کے لیے دہی بڑے اور پڈنگ بھی بنانا۔" اعزاز نے کام میں مصروف بیوی کو مشورہ دے کر گویا اس کے جلال کو آواز دی۔

"اچھا جی اور کچھ رہ گیا ہو تو وہ بھی بتادیں؟" نوشین چڑ کر بولی۔ اس کا تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔ ابھی اعزاز کا کرتا شلوار استری کرنا باقی تھا۔ اس کے علاوہ آئمہ کے دوپٹے میں لیس بھی لگانی تھی۔

"آئندہ سال سے تو میں امی کے گھر جاکر عید مناؤں گی۔" اس نے ہمیشہ کی طرح دھمکی دی۔

"ہا... ہا... افسوس میرے اختیار میں نہیں..." بیوی کا سوجا منہ دیکھ کر اعزاز کو پھر شرارت سوجھی۔

"کس بات کا اظہار افسوس کیا جارہا ہے۔" نوشین نے لاپروائی دکھائی۔

"کاش... مجھے ملک کا آئین بنانے کو موقع ملے تو ایک شق کا اضافہ کردوں گا۔" اعزاز نے سوکھا منہ بنا کر کہا۔

"اچھا... وکیل صاحب۔ ایسی۔ کون سی شق ہوگی؟" نوشین نے بریانی کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اگر بیگمات روٹھ کر میکے چلی جائیں تو گھر کے معاملات سنبھالنے کے لیے نگراں بیوی کا عہدہ ہونا چاہیے۔" اعزاز بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔

"اف کتنی حسرت ہے نا... دوسری شادی... تو آپ مردوں کی آنکھوں میں پلنے والا وہ حسین سپنا ہے، جس کی تعبیر کبھی کبھی بہت بھیانک نکلتی ہے۔" نوشین نے بھی میاں کو زبان دکھائی۔

"ویسے ایزی میں... آج کل آپ کے سارے بدلتے رنگ دیکھ رہی ہوں، پہلے تو یہ ہی فکر ہوتی تھی، کہ نوشی عید کے کپڑے سل کر آئے یا نہیں، میچنگ کی چوڑی چپل خریدی کہ نہیں اور اب تو بس... چھولے، پکوڑے، سموسے اور چاٹ کے علاوہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔" نوشین نے ناک چڑھاتے ہوئے لطیف سا طنز مارا تو اعزاز کا بے ساختہ قہقہہ گونجا۔

"کیا کریں... شادی سے پہلے سارے مرد ہونے والی کو بے پناہ چاہتے ہیں... اور شادی کے بعد ان سے پناہ مانگتے ہیں۔" اعزاز نے پھر چڑایا، نوشین ہاتھ میں تھامی چھری لہراتی اس کے پیچھے دوڑی، وہ ہنستے ہوئے دروازہ پار کر گیا۔

☼ ☼ ☼

چاند رات کو انفران سب کو گاڑی میں بھر کر چوڑیاں پہنانے لے کر گیا تو عارش کی وجہ سے چوڑی لینے دکان کے اندر نہیں گئی۔ اپنا ناپ بڑی جٹھانی کو پکڑا دیا۔ بازار میں بہت رش تھا۔ خاص طور پر چوڑیوں کی شاپ پر تو یوں لگ رہا تھا کہ فری بٹ رہی ہیں۔ وہ اور آئمہ دھکم پیل سے بچنے کے لیے ایک کونے میں کھڑے ہوگئے۔ باقی خواتین اندر جاکر میچنگ چوڑیاں نکلوانے میں مصروف تھیں۔

"بائی۔ دا۔ وے... آئمہ... آج کل مما کی ہوم شاپ کیسی چل رہی ہے۔" دعا نے دھیرے سے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

"مامی... وہ شاپ تو میں نے پچھلے دنوں خالی کردی۔" آئمہ نے فخر سے بتایا۔

"اچھا... سامان کا کیا کیا... گفٹ میں دے دیا؟" دعا کو تھوڑی مایوسی ہوئی۔

"نہیں نا۔ ہمارے پیچھے ایک کچی آبادی ہے۔ میں۔ بابا کے ساتھ جاکر وہاں کے غریب لوگوں میں اس شاپ کا سارا سامان بانٹ آئی۔" آئمہ نے فخر سے بتایا۔

"واہ... تم نے تو دل کی شاپ کا بیعانہ پہلے ہی ادا کردیا... بس اب اپنی مما کے دل میں بھی ایک شاپ کھلواؤ... محبت کے دیپ سے دیپ جلاتی چلی جاؤ۔" اس نے آئمہ کا ماتھا چوم کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ آئمہ کے چہرے پر پھیلی سچی خوشی اور پرسکون مسکراہٹ دعا کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔

شازیہ سحاب

خواص

"آ میری دھی!"
رابعی! دیکھ بھائی اکیلا کتنا زور لگا رہا ہے دیکھ بس دو تین پیڑے رہ گئے ہیں۔"

زرینہ نے پرات میں رکھے آٹے کے پیڑوں سے ایک پیڑا اٹھا کر گھوڑی (ہاتھ سے سویاں بنانے والا آلہ) کے منہ میں دبایا اور انگوٹھے کی مدد سے آٹے کو دبانے لگی۔

کل پہلا روزہ تھا اس لیے ہر سال کی طرح اس سال بھی زرینہ نے گھر پر گھوڑی والی سویاں بنانے کی ٹھانی، کیونکہ یہ کافی مشقت طلب کام تھا اس لیے رمضان سے پہلے ہی وہ یہ کام مکمل کر لیتی اور پھر قریبی رشتہ داروں، محلے داروں کو نہایت ہی اہتمام کے ساتھ وہ یہ سویاں بطور عیدی بھجواتی۔ آج بھی وہ ان سویوں کو بنانے میں صبح سے جتی ہوئی تھی بلکہ منظور حسین (شوہر) سجاد اور چودہ سالہ رابعہ بھی پیش پیش تھی۔ منظور حسین تو جانوروں کو چارہ ڈالنے اٹھ گیا کیونکہ شام ہو چلی تھی۔

"اماں پورے سات لچھے (سویوں کی مقدار) نکلوائے ہیں میں نے اب تو ہاتھ بھی دکھنے لگے ہیں۔"

رابعی نے منہ بسورتے ہوئے ہاتھوں کو دبایا۔

"بس اب جتنے لچھے بھی رہتے ہیں وہ سجو بھائی کے ذمے۔"

لہجے کو ضدی بناتے ہوئے رابعی نے چور نگاہوں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا جو چارپائی کی پائنتی سے کس کر باندھی گئی سویوں والی گھوڑی پر اکیلا اپنا پورا زور آزما رہا تھا۔

"اماں! اس دفعہ پورے آٹھ لچھے میں اپنی سہیلی کو دوں گی۔"

"آٹھ کیا تو پورے دس لچھے اپنی سہیلی کو دے دینا۔ آ تو سہی۔" لوہے کی ہتھی کو زور سے گھماتے ہوئے سجاد نے بہن کو یقین دلایا۔

"چل لچھا رکھ کے آ پورا ہو گیا ہے۔"

زرینہ نے نہایت احتیاط سے گھوڑی کے منہ کے نیچے بنی لوہے کی چھلنی سے آتی میدے اور آٹے کی لمبی لمبی سویوں کو توڑا اور۔

"رابعہ! رابعہ..... رابعہ بہو!"

"جی جی..... جی خالہ" کندھے پر دباؤ محسوس کرتے ہوئے رابعہ اچانک حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹی۔

"کہاں گم ہو؟ کب سے آوازیں دے رہی ہوں اور یہ چولہا بند کرو، دیکھ سویوں کا دودھ سوکھ چکا ہے۔ سویاں نیچے سے لگ رہی ہیں۔"

ذکیہ خاتون نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا اور چمچہ رابعہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

"رہنے دیں خالہ! میں کر لیتی ہوں، وہ تو بس یونہی اماں کے ہاتھ کی بنی سویاں یاد آ گئیں۔" رابعہ نے آنکھوں کی نمی کو ہاتھوں سے رگڑا۔

"یہ کیا رابعہ؟ سویوں کا تو رنگ ہی اتر گیا۔" ذکیہ خاتون نے چمچہ بھر کے رابعہ کے آگے کیا۔

"لگتا ہی نہیں کہ یہ رنگین سویاں ہیں حالانکہ اچھی کمپنی کی ہیں۔"

ذکیہ خاتون کے چہرے پہ افسوس اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"غضب خدا کا ہر چیز نقلی، ہر چیز میں ملاوٹ۔" میٹھے کی انتہائی شوقین ذکیہ خاتون کا ملال کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ سویاں ان کی فرمائش پر ہی بنی تھیں۔

"چھوڑیں خالہ! آپ چیزوں کی ملاوٹ اور مصنوعی پن کا رونا رو رہی ہیں یہاں تو رشتوں میں محبتوں میں ہی ملاوٹ اور مصنوعی پن آگیا ہے کہاں ڈھونڈیں گی آپ خالص چیزیں کہ جہاں خالص محبتیں ملنا مشکل ہوتا جارہا ہے وہ خونی رشتے، وہ محبتیں کہ جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اگر زندگی ہے تو صرف ان ہی کے دم سے ہے اور پھر جب مادیت پرستی کی ملاوٹ ان رشتوں میں اپنا زہر گھولتی ہے تو تب انسان کی ساری امیدیں، ساری خوش فہمیاں اپنے آپ ہی مرنے لگتی ہیں۔" آخری بات پر رابعہ کے کب سے رکے آنسو بہہ نکلے۔

اور یہ کوئی آج کی بات تو نہیں بلکہ جب سے رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا تھا، رابعہ یونہی بات بات پر جذباتی اور اداس ہوجاتی اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ عید قریب آرہی تھی اور پچھلی عید کی طرح اس سال بھی اسے امید تھی کہ اس کے میکے میں بچا اس کا واحد خونی رشتہ اسے عید پہ ملنے ضرور آئے گا اور وہ تھا اس کا سجاد بھائی جو اپنی محنت سے اب اپنے گاؤں کا بڑا زمین دار بن چکا تھا۔ اب اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ شہر میں بیاہی گئی اپنی بہن سے کم از

کم عید کے دن ہی ملنے آتا۔

شروع شروع میں جب اماں ابا زندہ تھے تو کبھی کبھار رابعہ کے گھر چکر لگا لیتا، لیکن اب تو دوسرا سال تھا عید پر آنے کا خیال نہ آیا۔ رابعہ بہن تھی دل کے ہاتھوں مجبور اکثر اپنی ساس جو رابعہ کی ماں کی خالہ زاد بہن تھی، ان کے ساتھ گاؤں چلی جاتی تھی، لیکن اب سال ہونے والا تھا رابعہ نے بھی دل پر پتھر رکھ کے اب وہاں نہ جانے کی ضد پکڑلی تھی یا پھر بہنوں والا مان در آیا تھا اس میں۔

پچھلے چند دنوں سے وہ بہت اداس تھی شوہر نے بھی کہا ساس نے بھی گاؤں چلنے کو کہا، لیکن وہ نہ مانی اس کے اندر شاید ماں باپ کے زمانے کی لاڈلی رابعی ضد پکڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ اکثر ماں کے ہاتھوں سے بنائی گئی سویاں کو یاد کرتی اسے یہ دکھ نہیں تھا کہ اب وہ سوغاتیں نہ تھیں بلکہ غم تو یہ تھا کہ اب وہ محبتیں نہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

عید کی صبح ہر عورت کی طرح رابعہ کے لیے بھی بہت مصروفیت لے کر آئی اور اسی مصروفیت میں رابعہ کو پتا ہی نہ چلا کہ صبح کب دوپہر میں تبدیل ہوئی ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے اپنے پانچ سالہ بیٹے ذیشان کو باپ کے ساتھ آئس کریم کھلانے روانہ کیا اور خود برآمدے میں رکھی چارپائی پر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔ خالہ محلے میں کہیں عید ملنے گئی تھیں۔

"رابعی! رابعی!"

خالہ جاتے ہوئے شاید دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھیں اس لیے تو آنے والا بغیر کسی آہٹ کے رابعہ کی چارپائی کے نزدیک پہنچ گیا۔

"رابعی!"

رابعی کو اس نام سے اس انداز سے اس دنیا میں صرف ایک شخص ہی پکار سکتا تھا اس لیے تو رابعہ نے بند آنکھوں سے فوراً" بازو ہٹایا۔

"سجو بھائی!" رابعہ اٹھی اور اک پل کی تاخیر کیے بغیر فوراً" بھائی سے لپٹ گئی۔

"پگلی عید کے دن بھی کوئی اتنا روتا ہے۔" سجاد کا اپنا چہرہ بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"سن رابعی! تیری بھتیجی پیدا ہوئی ہے۔" چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سجاد نے رابعہ کو خوش خبری سنائی مگر چہرہ اب بھی سنجیدہ تھا۔

"کل سے تیرے دونوں بھتیجے اسے اٹھائے پھر رہے بالکل کسی گڑیا کی طرح، اسے ایک دوسرے سے چھین لیتے ہیں پیار کرتے ہیں۔ تب مجھے اپنی گڑیا یاد آگئی۔"

سجاد نے بھرآئے ہوئے لہجے میں ساتھ بیٹھی رابعہ کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو۔ یہ دیکھ میں تیری عیدی لایا ہوں۔" سجاد نے خوش ہوتے ہوئے ایک طرف رکھے شاپروں کی طرف اشارہ کیا۔

رابعہ خود ہی اٹھ کر ان شاپروں کو کھولنے لگی جس میں اس کے لیے اس کے شوہر کے لیے، بیٹے اور ساس کے لیے ڈھیر ساری چیزیں کپڑے اور جوتے وغیرہ تھے اور ایک شاپر میں دیہاتی رواج کے مطابق گھی، چینی اور سویوں کے پیکٹ تھے۔

"رابعی! ان چیزوں میں اماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی گھوڑی والی خالص سویاں نہیں ہیں، لیکن تو ان بازار سے خریدی گئی سویوں میں، ان چیزوں میں وہی محبت محسوس کر سکتی ہے۔"

سجاد نے بہن کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور رابعہ سے بڑھ کر اور کون ان چیزوں سے خالص محبت اور خوشی کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو محبت سے اٹھا کے دیکھ رہی تھی بے شک ان میں اکثر چیزیں ملاوٹ شدہ تھیں۔ مصنوعی پن لیے ہوئے تھیں، لیکن ہر چیز سے جھلکتی محبت بہت خالص تھی۔ اس عید پہ کوئی ایسا تو نہیں جو اس مصنوعی دور میں آپ کی خالص محبت کا منتظر ہو سوچیے گا ضرور۔

☆

نرگس نایاب کھوکھر

عشق کیا ہے عشق سے

""معلوم کیا؟ کون تھی وہ عورت؟""

"ہاں صاحب! قریبی گاؤں کی ہیلتھ ورکر تھی... پکی نوکری نہیں ہے' چند روزہ پولیو مہم کے لیے عارضی طور پر تین سو روپیہ یومیہ کے حساب سے عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہیں' یہ بھی ان میں سے ایک تھی۔" ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے تفصیل بتائی

"اچھا... اور شوہر کیا کرتا ہے اس کا...؟" ڈرائیور اس التفات پہ کھلا جا رہا تھا کہ آج پہلی بار اس کا صاحب "چلو" اور "رکو" سے ہٹ کر بات کر رہا تھا۔

"صاحب! اس کا شوہر تھا تو جاگیردار آدمی' لیکن شادی کے کچھ ماہ بعد ہی چھوڑ چکا تھا اسے' حویلی سے نکالی گئی تو ماں باپ کے پاس بھی نہ گئی... جانے کیوں نہ گئی. اب تو ایک بیٹا بھی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ اسی اسکول میں پڑھتا ہے' جہاں سے ہم ابھی نکلے..." ڈرائیور گاؤں کی اندرونی گلیوں کے موڑ احتیاط سے کاٹتے ہوئے بولا۔

"پھر رہتی کس کے ساتھ ہے؟" سگریٹ کے جلنے پر اسے اپنے دل کے جلنے کا گمان گزرا۔

"صاحب! سنا ہے حویلی والوں کی ستائی ہوئی، زندگی سے بیزار ایک بڑھیا نے حویلی والوں کو للکارتے ہوئے اسے اپنی کھولی میں پناہ دی تھی۔ بڑھیا تو چند سال بعد چل بسی، اب وہاں ایک کچا پکا مکان ہے اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں رہتی ہے گھر میں کچھ کام کاج کرتی ہے۔ اسی پہ گزر اوقات ہے اس کی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ چھا۔۔۔ چھا۔"

ڈرائیور کا کم گو صاحب اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، لیکن اس کی ایک عام ہیلتھ ورکر میں اس قدر دلچسپی، اس کے دل کی بات عیاں کرنے کو کافی تھی۔

"صاحب! آپ حکم کریں تو اسے۔۔۔ پیسے سے کیا نہیں ملتا؟" ڈرائیور نے آنکھیں چمکاتے ہوئے اپنے صاحب کو داد طلب نظروں سے دیکھا۔

"اپنا منہ بند رکھو اور حد میں رہو۔"

"معافی صاحب۔۔۔!"

گاڑی اس ہیلتھ ورکر کے علاقے سے نکل چکی تھی، جہاں وہ ساری کائنات سے بے خبر اپنا ٹارگٹ پورا کرنے میں جتی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے بعد ہی وہ آفس سے گھر پہنچا ہے۔ حال میں ہی اس کی تقرری شعبہ تعلیم میں اعلا عہدے پر ہوئی ہے اس زندگی ہر لحاظ سے قابل رشک ہے، خوب صورت بنگلہ، گاڑی، نوکر چاکر، پڑھی لکھی بیگم۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اسے ماضی میں اس ہیلتھ ورکر نے ٹھکرایا ہوگا۔۔۔! جو آج ایک چھوٹے سے قصبے کے پرائمری اسکول میں پولیو کے قطرے پلاتی پائی گئی ہے۔!

☆ ☆ ☆

بندیا اور وہ بچپن سے منسوب تھے۔ پانچ سال بڑا تھا وہ اس سے، آپس میں قریبی رشتہ دار تھے، شاید چچا زاد، یا خالہ زاد کزن۔۔۔ یا پھر دونوں۔۔۔ ایک ہی گھر میں بچپن سے عہد جوانی کو پہنچے۔۔۔ فدا ہی تو تھا اس پر، حالانکہ بلا کی انا پرست اور مغرور تھی، جب آنکھوں کو چھوڑ کے ہاتھوں سے بولتی تو وہ شعرا اور شاعری سے پیار کرنے والا لڑکا ان بولتے ہاتھوں کو مسکراتے ہوئے دیکھے جاتا۔۔۔ ہزاروں اشعار اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔۔۔ اس کے ہاتھ تھے بھی تو بہت خوب صورت، اس کی دائیں ہتھیلی پہ بچپن میں کھیل کھیل میں اسی سے چوٹ لگ گئی تھی، جس پہ چوٹ کھانے والی سے زیادہ چوٹ لگانے والا رویا تھا۔ وہ زخم بھرنے کے بعد، دائیں ہتھیلی کی پشت پہ آدھے چاند کی مانند دائرے کی صورت ابھر کر ابدی طور پر اپنی نشانی دے چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا۔۔۔ جب یہ ہاتھ شرعاً "میرا ہو جائے گا" تو میں اس ساتویں کے آدھے اندھے چاند کو، اپنی محبت سے چودھویں کے پورے اور روشن چاند میں بدل دوں گا۔

اسے یونیورسٹی سے پاس آؤٹ کیے ایک سال گزرا تھا، وہ مختلف جگہوں پہ اپلائے کرتا رہتا تھا، مقابلے کے امتحانات کی تیاری اور کامیابی اس کے وصل کی ضامن ہوتی تھی لیکن نہ ہو سکی۔

بندیا، یونیورسٹی کے پہلے ہی سال میں ایک جاگیردار کلاس فیلو کے لیے سنجیدہ ہو گئی۔ گھر والوں کے کورٹ میں کیس رکھا۔۔۔ اور بری طرح ہاری۔۔۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت دینے والے "نئے روشن خیال والدین" اس بات پہ برہم ہو گئے۔

اس کی سہیلیاں بھی اس کے منگیتر اور اس کی محبت سے واقف تھیں، ان کے سمجھانے پر ان کو دشمن اور حاسد قرار دے کر ان سے دور ہو گئی، یہاں تک کہ ایک عزیز سہیلی جو کہ رشتے دار بھی تھی اس سے بھرے کینٹین میں کہہ دیا کہ "اگر تمہیں میرے منگیتر کا اتنا ہی خیال ہے تو جاؤ تم ہی کر لو اس سے شادی۔ خود پر ہنستے سارے چہرے دیکھ کر اس کی وہ عزیز دوست روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

پندرہ سال پہلے وہ آخری بار اس کے پاس آئی تھی،

اس کے روبرو۔۔۔

"میں تمہارے ساتھ شادی کبھی نہیں کروں گی' سمجھاتے کیوں نہیں سب کو؟" اس کی خوب صورت آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔۔۔ اس کی چاند ہتھیلی دوسرے ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔

"یار! تمہارے جیسی خوب صورت پیاری پری مجھے کہاں سے ملے گی' اس اوباش جاگیردار کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔۔۔" اپنے ڈاکومنٹس کے فوٹو اسٹیٹ سیٹ اسٹیپل کرتے ہوئے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ جانے اس نے اس پر طنز کیا تھا یا اپنا مذاق اڑایا تھا۔

"خبردار! اس کے خلاف میں ایک لفظ نہیں سنوں گی۔" چاند ہتھیلی کی انگلی اس کی اور تنی ہوئی تھی۔ کمرے کی دیواروں نے تحیر سے یہ منظر دیکھا عجب اس نے اس کی چاند ہتھیلی تھام کے انگلی نیچے کردی۔

"محبت کی سرشت میں زبردستی نہیں ہوتی' یہ میرا محبوب شاعر کہتا ہے۔ سو رہائی مبارک ہو تمہیں۔۔۔ خدا کرے مجھے کہیں بھی' کبھی بھی نظر نہ آؤ۔۔۔ اور اگر نظر آ بھی جاؤ۔۔۔ تو بہت ہی خوش و خرم نظر آؤ۔۔۔ اب جاؤ۔" اور پھر وہ ایسی گئی کہ کسی کو نظر نہ آئی۔

"وہ کہہ رہا ہے آج اسے ایک معمولی ہیلتھ ورکر کے روپ میں دیکھ آیا ہے۔" ایک چھوٹے قصبے کے چھوٹے سے پرائمری اسکول کے وزٹ کے دوران جیسے ہی وہ اور اس کے ماتحت اور اسکول کا منتظم مچھلی مارکیٹ بنی چھوٹے بچوں کی کلاس میں داخل ہوئے' دو عورتیں بچوں کو پولیو قطرے پلا رہی تھیں' ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رجسٹر تھا' اور دوسری ایک روتے بسورتے بچے کے منہ میں پولیو کے قطرے ٹپکا رہی تھی کہ اچانک اس نے وہ چاند ہتھیلی دیکھ لی اور پھر اسی اسکول میں بیٹھا رہا' جب تک مکمل معلومات حاصل نہ کرلیں۔ "جب سے لوٹا ہے منتشر ہے' کچھ یاد نہیں اسے اس کے سوا!"

وہ کہہ رہا ہے "ایک ہی بیٹا ہے اس کا۔ سرکاری اسکول میں پڑھتا ہے' شوہر نے بھی دوسری شادی کرلی ہے۔"

اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ رکھا ہے اس نے۔ میں خود کو کہتے سن رہی ہوں۔

"آپ شادی کرلیں اس سے۔۔۔ میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔"

وہ کہہ رہا ہے۔ "تم جانتی ہونا' مجھے اس سے محبت وحبت نہیں ہے' وہ رشتے دار ہے میری۔۔۔ خون اپنی جانب کھینچتا ہے' تب ہی میں اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہوں' محبت ماضی کا حصہ اور قصہ تھی۔ اب کہاں ہے میرے پاس محبت کے لیے وقت۔"

میں مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی چومتی ہوں۔

"میں جانتی ہوں' آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' نہ ہی بولیں گے۔"

کمال ہے' اس نے نظریں چرالی ہیں۔ کیا محبت جھوٹ بولنا سکھا دیتی ہے؟

میں بندیا کی وہی دوست ہوں جسے اس نے کہا تھا کہ "اگر تمہیں میرے منگیتر کا اتنا ہی خیال ہے' تو جاؤ تم ہی کرو اس سے شادی۔" دور کی رشتے داری تو تھی ہی' اور پھر لڑکی ہونے کے باوجود میں نے خود ہی اسے شادی کا پیغام بھیجا تھا۔

ناکامیوں سے کامیابی تک کا سفر بے شک اس نے میرے ساتھ طے کیا ہے' لیکن سوچوں' خواہشوں اور خوابوں کے سفر میں' میں کبھی اس کی ہم سفر نہیں رہی' میں جانتی ہوں' وہ آج بھی اس کے خوابوں کی ملکہ ہے' اور یہ راج اور تاج چھیننے کے لیے نہیں ہوتے نا۔۔۔

ایمل رضا

سال ہا سال

''اس کے بال تو بلیک تھے نانو۔۔۔ لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔ بلیک نہیں تھیں۔'' باسل نے کہا تو نانو نے سر اٹھا کر دبی ہوئی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

ویلوٹ کے سیاہ کپڑے کے بڑے ٹکڑے کو لکڑی کے فریم میں کس کر وہ اس پر تنکوں سے تصویر مکمل کر رہی تھیں۔ ڈیزائن ایک چھوٹے سے گھر کا تھا۔ اور اس گھر کو مکمل کرنے میں انہیں پورا ایک ماہ لگ گیا تھا۔ کل یہ تصویر ہر حال میں کاریگروں کو نمونے کے طور پر دینا تھی، تاکہ وہ اسے دیکھ کر مزید اس جیسے پیس تیار کر سکیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ دکان بند کر کے نانو باسل کے ساتھ گھر نہیں گئیں۔ بلکہ وہیں دکان میں بیٹھ کر ہی اس تصویر کو مکمل کرنے لگی تھیں۔

مکمل ناول

اس دوران باسل انہیں مسلسل زمل کے بارے میں یوں بتا تا رہا تھا۔ جیسے فرانس نہیں گیا تھا۔ صرف زمل کے گھر ہی گیا تھا۔ نانو سے باسل کا کوئی جذبہ چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی ساری باتیں سن رہی تھیں۔ اس دوران انہوں نے ایک بھی سوال نہیں پوچھا تھا۔ باسل نے سوال پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ہر بات تفصیلاً بتا رہا تھا۔

"تو کیسی تھیں اس کی آنکھیں....." بالآخر بڑی دیر سماعت کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"سبز..... گہری سبز....." نانو کا دلچسپی لینا جیسے اسے اچھا لگا۔ وہ مزید اشتیاق سے بولا۔

"یعنی تمہیں وہ بہت اچھی لگی.....؟" سرخ رنگے ہوئے تنکے کا سائز لے کر انہوں نے اسے کٹر سے کاٹا۔

یہ تنکا تنکا جوڑ کر شبیہہ ابھارنے کا فن بھی کتنا عجیب تھا ناں۔ جیسے تنکا تنکا جوڑ کر گھونسلا بنانا۔ نانو کا دل بعض اوقات گھبرانے لگتا۔ ساری زندگی انہیں یہ ہی خوف لاحق رہا تھا کہ جوں ہی ان کا گھونسلا مکمل ہو گا۔ کوئی دوسرا اس گھونسلے پر قابض ہو جائے گا۔ یا ان کے بچوں کو ان سے چھین لے گا۔ وہ اپنے اس خوف سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی تھیں۔

دوسری قسط

انہیں کہیں سے مکمل گارنٹی مل ہی نہیں سکی تھی۔ نہ دنیا سے اور نہ اپنے دل سے۔ سامنے شیشے کی شیلف میں باسل کے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ اداس ہو گئیں۔

"اچھی ہے۔۔۔؟ اچھی کا لفظ بہت چھوٹا ہے نانو۔۔۔ وہ تو سنو وائٹ تھی۔ پیاری۔۔۔ مکمل بیوٹی۔۔۔ دلکش۔۔۔ انتہائی خوب صورت۔"

"مجھ سے بھی زیادہ۔۔۔؟" آخری تنکا لگاتے ہوئے انہوں نے ذو معنی انداز میں پوچھا اور فریم کو سوکھنے کے لیے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آپ۔۔۔؟؟ آپ تو کچھ بھی نہیں ہیں اس کے آگے نانو۔۔۔ جتنی وہ خوب صورت تھی۔"

"شریر۔۔۔!" نانو اس کی طرف لپکیں تو وہ جلدی سے پرے ہو گیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔۔۔ پھر باسل نے نانو کو جپھی ڈال لی۔

"آپ تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں نانو۔۔۔!"

نانو نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔۔۔ پھر بتیاں بند کر کے دکان سے باہر نکل کر انہوں نے دروازے کو تالا لگایا۔

"تمہیں وہاں کچھ دیر اور ٹھہر جانا چاہیے تھا۔"

"مشکل تھا نانو۔۔۔! پھر مجھے اس سے محبت ہو جاتی۔"

اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔۔۔ نانو چابیاں ہینڈ بیگ میں ڈال کر اسے دیکھنے لگیں۔۔۔ ان کی آنکھوں میں کوئی عکس نہیں تھا۔

"چلیے نانو۔۔۔ آج بازار میں گھومتے ہیں۔" اس نے بات بدلی۔

"بازار تو بند ہو گیا ہے۔"

"بند بازار میں ہی گھوم لیتے ہیں۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نانو یک ٹک حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ "بارش بھی ہونے والی ہے۔۔۔ چلو گھر چلتے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا نانو۔۔۔ بارش، پھول اور خوشبو بھی بھلا کبھی کچھ کہتے ہیں۔" اس کی باتوں کے بدلتے زاویے اور اس کے لہجے کی خوش کن تبدیلی کو نانو نے محسوس کیا۔

"یہ سردیوں کی بارش ہے باسل۔۔۔ بیمار کر دے گی۔" نانو نے تنبیہہ کی لیکن باسل نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔۔۔ ہلکی بوچھاڑ میں وہ شٹر کے نیچے سے نکل گیا۔ چند دوسرے لوگ بھی ارد گرد کی بند دکانوں کے شٹروں کے نیچے کھڑے تھے۔ باسل انار کلی کے تاریک بازار کے عین وسط میں چلنے لگا تھا۔

"آجایئے نانو۔۔۔ اتنا کیوں ڈر رہی ہیں۔۔۔ اتنی بھی سردی نہیں ہے ابھی۔"

نانو اپنی جگہ سے بھی نہیں ہلی تھیں۔۔۔ بلکہ وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ بنا پلک جھپکائے۔۔۔ سنسان بازار میں وہ اکیلا آگے بڑھ رہا تھا اور بارش کی جو جو بوند اس سے ٹکرا رہی تھی' لمحہ بڑھتے چاند کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔۔۔ نانو دکان کی باہر کی بتی بجھا کر۔۔۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس تک پہنچیں۔

"تمہیں محبت ہو چکی ہے باسل۔۔۔!" قریب پہنچ کر انہوں نے آہستگی سے کہا۔ راز آشکار کر دینے والے انداز میں۔۔۔ باسل نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

"جس رستے پر قدم رکھ کر تم آگے بڑھتے جا رہے ہو' وہاں پیچھے تمہارے قدموں کے نشانوں پر پھول اگ رہے ہیں اور ہواؤں کی ڈوریاں تمہاری انگلیوں سے پیوستہ ہیں۔۔۔ یہ محبت کا موسم آجانے کا سندیسہ ہوتا ہے باسل۔"

☼ ☼ ☼

"ہر آدمی ایک نفسیاتی اکائی (Psychological unit) ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے آدمی سے مختلف ہے۔ ہر شخص اپنی سوچ اپنے انداز سے زندگی گزارتا ہے۔ اس کی زندگی کو جاننے کے لیے اس کی انفرادیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے مس زمل! نفرت' نخوت' اداسی یا افسردگی بلا سبب نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے کسی تلخ تجربے کی بنا پر ہوتی ہے۔ ایسا واقعہ جس کا ہمیں شعور نہ ہو' علم نہ ہو لیکن جو ہماری زندگی کو متاثر کرے اسے لاشعور کہا جاتا

ہے۔ اور وہ ذہن کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ اس کے اس طرح چھپ جانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم اسے بھلا دینا چاہتے ہیں۔ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں' کیونکہ اس کی یاد ذہن میں کانٹے اگا دیتی ہے جو ہمیں چبھتے ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان واقعات کو بھول جائیں لیکن اس کوشش سے وہ ختم نہیں ہوتے' وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ہمیں پریشان کرتے رہتے ہیں۔"

یشار ماہر ڈاکٹر تھا۔ اس کی تربیت میں نانو کا ہاتھ تھا۔ وہ اتنی جلدی تھک جانے یا ہمت ہار جانے والا نہیں تھا۔ وہ مستقل مزاجی سے اس کیس پر کام کر رہا تھا۔

"آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں ڈاکٹر یشار؟"

"آپ اپنے ڈیڈ کی صحت چاہتی ہیں..... اور نفسیاتی صحت مندی کے لیے ہمیں مضبوط محرک درکار ہوتا ہے..... آپ کو وہ محرک تلاش کرنا ہے....."

زمل' یشار کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔ وہ کچھ بھی کیسے تلاش کرے۔ اس کے ہاتھ میں جن چابیوں کا گچھا تھا' ان سے پرانے زمانے کے تالے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔

پورے پینتالیس منٹ اسکائپ پر آن لائن رہنے کے بعد اس نے خدا حافظ کہہ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ڈاکٹر یشار سے بات چیت کر کے اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ڈیڈ کا نہیں بلکہ خود اپنا علاج کروا رہی ہے۔ اس کے باوجود علاج میں کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ ڈیڈ کی صحت مزید گرنے لگی تھی۔ اب وہ اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے لگے تھے۔ زمل کے لیے یہ سب برداشت کرنا اور ڈیڈ کو اس حالت میں دیکھنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ڈیڈ کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ابھی وہ اتنی سنگ دل نہیں ہوئی تھی..... ممی کی طرح۔

ممی نے کبھی دانستہ یا نادانستہ — زمل سے اپنے سابقہ شوہر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ وہ اشارتاً بھی ان کی حالت کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ وہ ان سے ایسے لاتعلق ہو گئی تھیں جیسے کبھی ان کا کسی زیان عالم نامی شخص سے واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ زمل کو ان سے اب کوئی امید بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی زمل کے پاس ڈیڈ کے بارے میں بتانے کے لیے کچھ اچھی باتیں نہیں تھیں۔

وقت فنا پذیر ہے۔ فنا ہوتا چلا گیا..... یشار سے مایوس ہو کر وہ جیسے اب اپنے سارے مہرے چل چکی تھی۔ جیت کے لیے اب اس کی بساط میں اب کوئی چال باقی نہیں بچی تھی۔ اس نے ڈیڈ کی بیماری کو لاعلاج سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

اور ڈیڈ..... وہ خود کو بیمار نہیں سمجھتے تھے شاید..... اگر سمجھتے بھی تھے تو تندرست نہیں ہونا چاہتے تھے اور یہ بات زمل بہت پہلے سے جانتی تھی لیکن اس طرح بیمار رہنے میں ان کو کون سی راحت مل رہی تھی' یہ بات وہ کبھی نہیں جان سکی تھی۔

ڈیڈ کی حالت سدیم انکل جیسی ہو چکی تھی۔ اسے لگا اس کے بچپن کا دور جیسے پھر سے دہرایا جانے لگا ہے۔ اپنی مخبوط الحواسی کے باوجود ڈیڈ کے چہرے پر سدیم انکل جیسی طمانیت چھائی رہتی۔ سدیم انکل کے لیے بھی ملکی اور غیر ملکی علاج بے کار ثابت ہوئے تھے اور آخر میں وہ بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ تو کیا ڈیڈ بھی.....؟

اس سوچ کا پہلا احساس ہی دل دہلا دینے والا تھا۔ وہ کانپ کر رہ جاتی۔

"آپ کو اپنے گرینڈ فادر اور گرینڈ مدر کی قبروں کو تلاش کرنا ہو گا۔ خاص طور پر گرینڈ مدر کی۔ اور پھر اپنے ڈیڈ کو ان کی قبروں پر لے کر جانا ہو گا۔"

یشار نے ایک دن بہت اہم بات کی جانب اس کی توجہ دلائی تھی۔ بات سیدھی تھی۔ پھر بھی زمل بے چین ہو گئی۔

"کیا یہ چیز کوئی فائدہ دے گی؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"یقیناً"..... بلکہ سو فی صد..... آپ کے ڈیڈ کی یہ جمود کی کیفیت یقیناً" وہاں جا کر ختم ہو گی۔"

"آپ کے خیال میں کیا ڈیڈ' نفسیاتی طور پر جمود کا

شکار ہو چکے ہیں؟"
"ایسا ہی سمجھ لیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔
بڑی دیر تک وہ تذبذب کے عالم میں گھری رہی۔
"لیکن کیسے..... میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔"
"پاکستان آکر....."
"میں اپنے گرینڈ فادر اور گرینڈ مدر کی قبروں کے متعلق کچھ نہیں جانتی نہ ہی ڈیڈ نے کبھی بتایا۔"
"یہ تو آپ کو ان سے ہی پوچھنا ہو گا..... لیکن براہ راست نہیں..... ورنہ وہ آپ کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"
"وہ ویسے بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔" اس نے نا امیدی سے کہا۔
"یہ اتنا مشکل کام تو نہیں۔"
اور اتنا آسان بھی نہیں۔ وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔
"آپ کے گھر میں بہت ساری ایسی دستاویزات ہوں گی۔ جن میں ان سے متعلق معلومات درج ہوں گی۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ، پراپرٹی کے انتقال نامے وغیرہ۔ پاکستان میں ان کے گھر کے بارے میں معلومات..... کچھ رشتے داروں کے ایڈریسز....."
"رشتے دار..... میں تو اپنے کسی رشتے دار کے نام تک سے واقف نہیں ہوں مسٹر یشار!"
"یہ اب آپ کا Hectic (سردرد) ہے مس زنل..... میں نے آپ کو حل بتا دیا ہے۔"
اس ساری بات چیت کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ یشار کی بات پر جیسے دنیا کی ساری مثبت گھنٹیاں اس کے کانوں میں گونج اٹھی تھیں..... اور وہ ایک بار پھر سے پر امید ہو گئی تھی۔ ڈیڈ نے تو اسے اسی طرح مایوس کیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔ ان کے لب جیسے نہ کھلنے کے لیے سل چکے تھے۔ پھر وہ چوری چوری خود ہی ڈیڈ کی پرانی چیزوں کی تلاشی لیتی رہی..... وہاں سے بھی اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور اس بات کی توقع اسے ہرگز نہیں تھی لیکن اس بار وہ بہت جوش میں تھی اور اتنی جلدی ہار ماننے والی بھی نہیں تھی۔
کل ساری رات سوچتے رہنے کے بعد اس نے آج صبح اٹھ کر ممی کو کال کی تھی۔
"ممی کیا آپ یشب..... انکل سے پوچھ کر بتا سکتی ہیں کہ پاکستان میں ڈیڈ کا گھر کس جگہ پر تھا؟"

ساری رات پریشان رہنے، خوف زدہ رہنے اور روتے رہنے کے بعد اس کی آواز نارمل نہیں رہی تھی۔ ممی نے اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی سوال جواب نہ کیا اور آہستگی سے فون ہولڈر پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے فون پر یشب انکل کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز سے ہرگز ہم کلام نہیں ہونا چاہتی تھی..... لیکن اس نے اس بوجھ کو بھی دل پر سہہ لیا۔
"لکھو..... لاہور..... ماڈل ٹاؤن، بلاک بی..... ہاؤس نمبر....."
بتانے والا روانی میں بتا رہا تھا جیسے کسی ناپسندیدہ کام کا بوجھ اتار رہا ہو اور زنل جلدی جلدی نوٹ کر رہی تھی۔ جیسے کوئی بھی لفظ اگر رہ گیا تو اس کے ہاتھوں سے دنیا نکل جائے گی۔

یشار کے موبائل کے لاک کا طریقہ اسے معلوم نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بارہا قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ زنل کا کانٹیکٹ نمبر اس موبائل میں تھا۔ جسے اب باسل جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ سوچے بنا کہ وہ نظریات و خیالات میں اس سے کس قدر مختلف ہے۔ اور اس سے بھی بہت بڑھ کر اس کا فیملی اسٹیٹس۔
وہ یہ تمام باتیں وقتی طور پر نظر انداز کر چکا تھا۔ اسے فی الحال صرف اور صرف زنل سے تعلق بنانا تھا۔ خواہ وہ تعلق ایک دوست کا ہی کیوں نہ ہو۔
یشار نے ایک دو بار اسے "تقریباً" پکڑ لیا تھا۔ لیکن وہ سرے سے ہی انجان بن جاتا تھا۔ جیسے اس سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کوئی معصوم ہے ہی نہیں..... چند ایک بار وہ یشار کو زنل سے بات چیت کرتے بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن وہ اس کی اور اس کے ڈیڈ کی خیریت پوچھنے کے علاوہ اور کوئی سوال نہ کر سکا تھا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یشار اپنا لیپ ٹاپ کھلا ہی چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا تھا۔ اور باسل نے فوراً“ ہی اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھالینا چاہا۔ یشار کا فیس بک اکاؤنٹ اوپن تھا۔ اسے وہاں صرف زمل کو تلاش کرنا تھا۔ اور یہ تلاش جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور آدھے راستے میں ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ رخصت بھی ہو گئی۔ باسل کے اوسان خطا ہو گئے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ یشار پتا نہیں کب اندر آیا تھا اور اب حیرت سے باسل کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے ”کام“ میں مگن باسل کو اس کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا۔

”وہ.... وہ میں....“ اس سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

”یہ غلط ہے۔“

”میں تو صرف۔“

”تم کسی کا پرسنل اکاؤنٹ ہیک کر رہے تھے؟؟“

”میں ہیک نہیں کر رہا تھا۔“ وہ منمنایا۔

”واقعی؟“ یشار غصے میں نہیں تھا۔ اس کا انداز شرمندہ کرنے والا تھا۔

”آئی۔ ایم سوری!“ گردن جھکائے وہ اس کی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں زمل تک رسائی چاہیے تھی تو مجھ سے کہہ دیتے۔“ باسل کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔

”تم مجھ سے چھوٹے ہو.... کیا مجھ سے کچھ چھپا سکتے ہو؟“ یشار پوچھ رہا تھا۔ سر جھٹک کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اتنی خفت تو اسے تب بھی نہیں اٹھانا پڑی تھی جب اس نے نانو کے مہنگے سلیمانی پتھر کو غلط کاٹ کر خراب کر دیا تھا۔

”ہفتے کے دن تمہیں ایئرپورٹ جانا ہے.... ذہن میں رکھنا۔“ یشار نے اونچی آواز سے کہتے ہوئے اسے پھر روک لیا۔

”کون سے شہر جانا ہے؟؟“

”نہیں کہیں جانا نہیں ہے.... کسی نے آنا ہے“

”کسی ڈاکٹر....“

”نہیں.... زمل نے.... تم اسے ایئرپورٹ سے پک کر کے کسی اچھے سے ہوٹل چھوڑ آنا اس کے لیے یہ جگہ، یہ شہر بالکل نیا ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔“

یشار نے تو نارمل انداز میں یہ سب کہا تھا لیکن باسل پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کی ہیل کی ٹھک ٹھک سے پورا ہال ابھی تک گونج رہا تھا۔ متوحش نظروں سے انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ زمل جا چکی تھی۔ لیکن اس کی پرچھائیں کے بہت سے عکس انہیں جا بجا نظر آ رہے تھے۔ اپنے دل کی بڑھتی دھڑکنوں پر قابو پانا ان کے لیے مشکل تر ہو گیا۔

چند دن پہلے ہی رات کے وقت وہ ان کے کمرے میں آئی تھی جب وہ کھلی ساکت آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ ان کو اس طرح دیکھ کر زمل جھجک سی گئی۔ تب ہی انہوں نے بھی اسے دیکھا۔ اور آج کسی اور ہی نظر سے دیکھا۔

زمل اب بڑی ہو گئی تھی۔ وہ بالغ تھی۔ لیکن وہ یہاں کی دوسری لڑکیوں کی طرح بے باک کیوں نہیں تھی۔ یہ جھجک تو سراسر مشرقی تھی اور مغرب میں رہتے ہوئے اس نے یہ عادتیں کہاں سے سیکھی تھیں۔

”میں پاکستان جا رہی ہوں۔“ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے انہیں بتایا اور ان کے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا۔

”پاکستان!“ وہ بڑبڑائے۔ انہیں لگا یہ لفظ جیسے وہ صدیوں بعد سن رہے ہیں۔ کیسی اجنبیت سی تھی اس ایک لفظ میں، ان کا ستا ہوا چہرہ لمحوں میں سنگی ہو گیا۔

”کیوں جا رہی ہو پاکستان؟“ زمل پر انہوں نے اپنی اندرونی کیفیت آشکار نہ ہونے دی۔ ”کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہو؟“

”تقریباً“ ایک ماہ کے لیے۔“

”ٹھیک ہے، جاؤ۔“ ایسے کہا گیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب یہاں سے اٹھ جاؤ۔

”آپ کو کوئی اعتراض تو....“

"تم آزاد ہو... اپنی ماں کی طرح... جب چاہو' مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہو۔"

"نہیں ڈیڈ... ایسی بات نہ۔"

اس نے کہنا چاہا لیکن ہاتھ بڑھا کر انہوں نے سائیڈ لیمپ بند کر دیے اور کروٹ بدل لی۔

زمل خاموشی سے ان کے کمزور وجود کو دیکھتی رہی پھر ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

"دروازہ بند کر کے جانا۔" انہوں نے ویسے ہی لیٹے لیٹے کہا۔ زمل نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

وہ رات عجیب کشمکش کے عالم میں گزری۔ ہر آن وہ خود کو طوفانوں کی زد میں دیکھتی رہی اور ڈرتی رہی۔ اور خوابوں سے بھی زیادہ بھیانک یہ احساس تھا کہ اب وہ ڈر کے کس کے پاس جائے گی۔

باقی کے دن بھی اسی وحشت کے عالم میں گزر گئے۔ زیان عالم نے اس سے کوئی سوال و جواب نہ کیا۔ وہ خاموشی سے اسے پاکستان جانے کی تیاری کرتے دیکھتے رہے۔ پاکستان سے ناتا توڑے انہیں ایک لمبا عرصہ گزر چکا تھا اور اس طویل عرصے میں ان کی بیٹی جوان ہو گئی تھی لیکن اپنے ڈیڈ کی بیماری کے سبب دنیا کی تفریح گاہوں سے لطف اندوز نہیں ہو پا رہی تھی۔

گاڑی میں سامان رکھوا کر وہ انہیں الوداع کہنے آئی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"میں اس ایک ماہ میں تمہیں بہت یاد کروں گا۔" ان کی آواز کی لرزش زمل سے چھپی نہ رہ سکی' وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ وہ خاموش رہے۔

زمل بڑی دیر تک روتی رہی۔

"اس طرح مت روؤ۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" بالآخر وہ بولے۔

"میں نہیں جاتی اگر آپ..." اس نے روتے روتے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گی... آپ کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"اس طرح نہیں کرتے... تم جاؤ... میری فکر نہ کرو... ڈیوڈ ہے میرے پاس۔" وہ خاموشی سے ان سے الگ ہو کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" زمل نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ کلائی میں ایک پرانی زنجیر دو تین بلوں کے ساتھ لٹک رہی تھی اور اس زنجیر کے درمیان میں ایک مکڑی کی شکل والا لاکٹ بھی جھول رہا تھا۔

"یہ پرانے سامان سے ملا ہے۔"

"یہ میرا ہے... تم جانتی ہو؟"

"جی!"

"تم میرے سامان کی تلاشی لیتی رہی ہو ناں؟" زمل نے سر جھکا لیا۔

"ڈاکٹرز کی باتوں پر زیادہ دھیان نہ دیا کرو۔ وہ تو کچھ بھی کہتے رہتے ہیں۔ میری پرانی چیزوں میں میرا ماضی نہیں ہے۔ اور میرے ماضی میں کچھ بھی نہیں ہے۔" انہوں نے اسے بتایا۔ وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"اسے اتارو... تم اس کے ذریعے مجھے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہو۔ تمہیں مشکل ہو گی۔ تمہارا ذہن مجھ سے ہٹ نہیں سکے گا' تم اپنا کام صحیح طرح سے نہیں کر سکو گی۔"

"اسی طرح تو آپ کا کام کر سکوں گی ڈیڈ۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

"میں اسے وہاں جاتے ہی اتار دوں گی۔"

"یہ کافی پرانا بھی ہو چکا ہے۔"

"پرانے فیشن ہی تو دوبارہ آ رہے ہیں ڈیڈ!" وہ سوچی آنکھوں سے مسکرائی۔ اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ اس کی ہیل کی ٹھک ٹھک سے پورا ہال گونج اٹھا۔

"پرانے فیشن ہی تو دوبارہ آ رہے ہیں۔" پانچ گھنٹے گزر جانے کے باوجود اس فقرے کی بازگشت آخر ختم کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ متوحش نظروں سے انہوں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ زمل' اس کی پرچھائیاں۔ مکڑی سب ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

"اللہ نہ کرے... اللہ نہ کرے۔" اور تڑپتے تڑپتے انہوں نے آج مدتوں بعد اس کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے جس کو وہ ایک عرصے سے نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

اللہ سے دوبارہ دوستی کرنا' اس قدر مشکل امر ہوگا' انہیں اندازہ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

آشفتہ سر مکڑی چکر کاٹتی اپنے شکار کے گرد تاریں بُن رہی تھی۔ بوڑھے وجود نے سیاہ دیوار پر ابھرتے اس منظر کو دیکھا۔ جال لحہ بہ لحہ تنگ ہوتا شکار کو بے بس کررہا تھا۔ بوڑھے وجود کا دم گھٹنے لگا۔ تارِ عنکبوت اسے اپنے وجود کے گرد لپٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

تو وہ اس تار سے بھی زیادہ بے وقعت تھی۔ اپنی کم مائیگی کے احساس پر اسے رونا آگیا۔ اور وہ چلّا اٹھی۔

"ساگ پیشوا..... سادھ سیوڑا

صغیر ربانی سے پوچھو۔

قدرت اشارہ دے کر پھر انصاف کا خون کیوں کردیتی ہے۔"

سسکیاں بھرتی آواز سن کر فاختہ خوف زدہ ہو کر اُڑ گئی۔ تالاب میں جوار بھاٹا پیدا ہوا۔ اور مور نے "می آؤں..... می آؤں" چلّاتے ہوئے ماتم شروع کردیا۔

☆ ☆ ☆

دھوپ چمک دار تھی۔ اس کی روشن آنکھوں کی طرح..... پردے کھسکا کر اس نے کھڑکی کے پٹ کھولے۔ سرد موسم میں الجھی ہوئی ہوائیں اُس کی سانسوں کی ہم نوا ہو گئیں۔

باسل کی کار ہوٹل کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے زمل کو کھڑکی میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ مسکرا کر اسے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

پاکستان آئے آج اسے پانچواں دن تھا۔ وہ ڈیڈ اور ممی کے ساتھ بہت سے ممالک کی سیر کرچکی تھی۔ برطانیہ' امریکہ' اسپین' اٹلی' یونان وغیرہ کی۔ لیکن تب شعور کی منزلیں اتنی مضبوط نہ تھیں اور کچھ پاکستان میں اُس کی آنے والی زندگی کے حالات بھی درج تھے۔ اس لیے یہ دیس اسے سب سے جدا لگا۔ اسے یہاں ماں جیسی اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

اس لفظ اپنائیت میں بھی بہت سے عوامل کارِ خیر

ثابت ہوئے تھے۔ ہاں۔۔۔ ایک گائیڈ بھی۔۔۔ جو اسے اطالوی مجسموں کی طرح نظروں سے کھینچ لینے کی صلاحیت رکھنے والا لگا تھا۔ زمل اسے دیکھ کر کھل اٹھتی تھی۔

"تمہارے چہرے پر یہ جو تازگی ہے نا باسل۔۔۔ اسے دیکھنے سے فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔" وہ اسے بتانے میں جھجکی نہیں تھی۔

"اور اگر یہ ہی بات میں تمہارے لیے کہوں تو؟"

"میں سمجھوں گی تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا۔۔۔ نانو کہتی ہیں۔"

"تو پھر ایسا مت کہنا۔۔۔" اور باسل اس کی ایسی باتوں پر واقعی خاموش ہو جاتا تھا۔

اس کی بہت سی مہربانیوں میں زمل کے لیے اس کی یہ مہربانی بھی شامل تھی۔۔۔ اس کی خاموشی۔۔۔ ہر ہر مرحلے میں اس نے کسی مسیحا کی طرح زمل کی رہنمائی کی تھی۔ اسے اس انجان جگہ پر کسی طرح کی بھی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

لیکن اس سارے نئے سفر میں وہ فی الحال کسی بھی شریک سفر کی شراکت داری کی حامی نہیں تھی۔۔۔ نجانے کیا کیا دفن تھا۔ کیا کیا کھلنے کے قریب تھا جو خود اس کے لیے بھی خوفناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ یہاں صرف وہاب عالم (دادا) اور گلناب عالم (دادی) کی قبروں کو تلاش کرنے نہیں آئی تھی۔ بلکہ اپنے ڈیڈ کے گم گشتہ ماہ و سال کا کھوج لگانے بھی آئی تھی اور اس حوالے سے کوئی بھی بات اچانک سامنے آسکتی تھی جو زمل کے لیے حیرت اور باسل کی موجودگی میں شرمندگی کا باعث بن سکتی تھی۔ اس لیے وہ بے حد احتیاط سے کام لے رہی تھی۔

پاکستان آنے کے اگلے دن وہ ماڈل ٹاؤن گئی تھی۔ باسل نے کار باغ کی پارکنگ میں کھڑی کی اور خود ٹھہرا رہا۔ وہ اکیلی ہی یشب انکل کے بتائے پتے تک آئی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ گھر ابھی تک ان لوگوں کی ہی ملکیت تھا جن کو ڈیڈ نے بیچا تھا۔ لیکن وہ وہاب عالم یا گلناب عالم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے تھے۔

اردگرد کے گھروں سے بھی کچھ پتا نہ چل سکا۔ بلکہ الٹا انہوں نے حیرت زدہ ہو کر زمل سے سوال کیا تھا۔

"کیا گلناب عالم اپنے بیٹے کے ساتھ فرانس نہیں چلی گئی تھیں؟"

"نہیں۔۔۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا تھا۔"

اس سے اگلے دن وہ ماڈل ٹاؤن کے پرانے قبرستان گئی۔ جہاں کے بوڑھے گورکن اور اس کے بیٹے نے اس کی کافی مدد کی تھی۔ پرانی قبروں کے کتبے صاف کر کے انہوں نے۔۔۔ زمل کو پڑھ کر سنائے تھے۔ لیکن یہ ساری محنت بھی عبث رہی۔ اس کے ہاتھ کوئی نہیں لگ سکا۔ عالم سنز کمپنی کے چوکیدار کے باپ سے اسے صرف ایک دو باتیں پتا چل سکی تھیں۔

"وہاب عالم نوجوانی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ گلناب عالم جوان بیوہ تھیں اور وہ ایک اچھی عورت نہیں تھیں۔ لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔"

عمر رسیدہ پرانے چوکیدار نے روانی میں ہی سب بتایا تھا جسے سن کر زمل کے چہرے پر بہت سے رنگ بیک وقت آئے اور گئے۔ اس کے چہرے کے اس اتار چڑھاؤ کو اس بوڑھے نے بھی محسوس کیا۔

"میرا مطلب ہے تب زمانہ تنگ نظر تھا۔۔۔ بہت سی باتوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اب۔۔۔"

بوڑھے نے بات بدلی اور زمل نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس وقت باسل اس کے ساتھ نہیں کھڑا تھا ورنہ نجانے اسے کتنی خفت سہنا پڑتی۔

پانچ دن کے تھکا دینے والے مرحلوں کے بعد آج اس کا کہیں بھی جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود باسل کی کار کو ہوٹل کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ شدت سے چاہنے لگی کہ اس کے ساتھ وہ چلی جائے۔ کہیں بھی۔

"تمہیں انفارم نہیں کیا۔۔۔ اس کے لیے سوری۔۔۔ مگر آج کے لیے میں کوئی بھی پروگرام ترتیب نہیں دے سکی۔۔۔"

دروازہ کھولتے ہی اس نے باسل کو آگاہ کیا۔ اور وہ

دروازے سے ٹیک لگا کر کی چین کو انگلی پر گھماتا اسے دیکھنے لگا۔

"تو پھر آج میری نانو کی شاپ پر چلو گی؟" ہلکا سا مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

نانو کی دکان واقعی بہت خوب صورت تھی۔ باسل کی بتائی ہوئی تفصیل سے بھی زیادہ۔

وہ شہر کی سب سے خوب صورت اور دستکاری کی سب سے بڑی دکان تھی چاراطراف سے شیشے میں لپٹی اور شیلف پر سجے بے انتہا قیمتی نوادرات میں گھری وہ دکان، قبل مسیح کے دور کی یاد دلاتی تھی۔

باسل سارے راستے خاموش نہیں رہا تھا۔ وہاں یہ ہے، وہاں وہ ہے، کس قدر مہنگی اشیا ہیں۔ زمل اپنی زندگی میں اس بازار سے بھی بہت بڑے اور دلکش اور تاریخی بازار دیکھ چکی تھی۔ نانو کی دکان کی طرح کی بھی ہزاروں دکانیں وہ گھوم چکی تھی۔ لیکن اس دکان "نگار خانہ" میں داخل ہوتے ہی اسے ایک عجیب طرح کا احساس ہوا تھا۔

نانو کی محنت اور اپنائیت بھرا خلوص پوری دکان کی ایک ایک چیز سے جھلک رہا تھا۔ انہوں نے زمل کا پرتپاک استقبال کیا اور زمل کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ باسل سامنے ہی کھڑا تھا نانو نے سر کی جنبش سے اسے اس کی پسند کی داد دی، وہ مسکرانے لگا۔ خود زمل نانو کے بازوؤں کے حصار سے جدا ہوتے ہوئے حیران تھی۔

"یہ شخصیت باسل سے لفظوں میں بیان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔" اس نے سوچا۔

دکان پر گاہکوں کا رش بھی تھا۔ وہ زمل سے معذرت کر کے ان کی طرف بھی متوجہ تھیں۔ ایک مثبت مسکراہٹ کے ساتھ۔ زمل دکان میں رکھی چیزیں دیکھتے ہوئے بار بار انہیں بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک شفیق شخصیت کی مالک تھیں۔ زمل اپنی پوری زندگی میں ایسی بے لوث، بے غرض شخصیت سے کبھی نہیں ملی تھی۔ باسل اور یشار کے مخلصانہ رویوں کا سبب اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ ان کی تربیت ہی بہت عظیم ہاتھوں نے کی تھی۔ وہ چہل قدمی کرتے ہوئے دکان میں گھومنے لگی۔

"یہ کیا ہے باسل؟" شیشے کی پانی سے بھری بوتل میں بند چارپائی کو دیکھ کر وہ باسل سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ چارپائی ہے۔"

"چارپائی؟" وہ سمجھی نہیں۔

"ہاں۔۔۔۔ یہاں کا روایتی بیڈ۔"

"مجھے ایسا بیڈ دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہے۔" وہ ہنسی۔

"یہ دیسی بیڈ ہے۔۔۔۔ ہاتھوں سے بنا جاتا ہے۔"

"یہ بوتل کے اندر کیسے جاتا ہے؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"یہی تو آرٹ ہے۔" باسل کو خود نہیں پتا تھا کہ یہ چھوٹی سی چارپائی اسی چھوٹی سی بوتل کے اندر کیسے جاتی ہے۔

"یہ باہر ہی تیار کی جاتی ہے زمل بیٹی!" نانو نے اس کے پاس آ کر کہا تھا۔ "پھر اسے تہ کر کے مختلف اوزاروں کے ذریعے اندر داخل کیا جاتا ہے اور دوبارہ سے کھول لیا جاتا ہے۔۔۔۔ یہ ایک مشکل آرٹ ہے۔"

"کیا یہ آپ نے بنایا ہے۔۔۔۔ آنٹی۔"

"تم مجھے نانو کہہ سکتی ہو زمل۔۔۔۔ باسل کی طرح۔" وہ مسکرائیں۔

"نہیں، یہ میں نے نہیں بنایا۔۔۔۔ میں اس میں ماہر نہیں ہو سکی۔۔۔۔ بدقسمتی سے۔۔۔۔ بعض چیزوں میں میں ہمیشہ ناکام رہی ہوں۔" نانو کے چہرے پر اداسی جھلکنے لگی۔

"تو پھر مجھے اپنے ہاتھوں کی بنائی چیزیں دکھائیں ناں۔" ان کی اداسی دور کرنے کی غرض سے اس نے فرمائش کی۔

"یہ میں نے بنایا ہے۔" نانو نے تنکا ورک پینٹنگ کے فریم کو پکڑا۔ "یہ پچھلے ہی دنوں مکمل ہوا ہے۔"

فریم کو ہاتھ میں پکڑے وہ بڑے غور سے ایک چھوٹے سے گھر والی تصویر کو دیکھنے لگی۔ اسے یقین

نہیں آرہا تھا کہ یہ تصویر کسی انسانی ہاتھوں نے ہی مکمل کی ہے۔

"میرے پاس اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔" اس نے اپنی لاچاری ظاہر کردی۔

"تمہارا اتنا کہہ دینا ہی میرے لیے کافی ہے۔" وہ بھی جواباً" مسکرائیں۔

"تم یہاں کس سلسلے میں آئی ہو زمل؟" نانو نے راک سالٹ کا ایک تراشا ہوا پیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ زمل نے ایک لمحہ باسل کو دیکھا پھر نانو کو۔

میں یہاں اپنی این جی او کے ورک کے سلسلے میں آئی ہوں، آنٹی!"

"آنٹی نہیں میری جان!"

"اوہ سوری۔" وہ شرمندہ ہوگئی۔

دوپہر کے قریب گاہکوں کا رش مزید بڑھنے لگا تھا۔ ورنہ باسل کا ارادہ تھا کہ تینوں کہیں باہر جاکر کھانا کھائیں۔ گاہکوں کو دیکھتے ہوئے مجبوراً" اسے کھانے کے پارسل وہیں پر لانے پڑے۔ کھانا لینے جاتے وقت باسل نانو کو آنکھ مارتے ہوئے اور اشارہ کرتے ہوئے کسی بات کی یاددہانی کراگیا تھا۔ جسے سمجھ کر اور یاد کر کے نانو مسکرائی تھیں۔

یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ جب زمل کو پاکستان آئے ابھی صرف تیسرا دن ہی ہوا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے باسل نے نانو کی منت کی۔

"نانو! وہ لڑکی' انجان دیس' انجان ملک' انجان سرزمین پر رہ رہی ہے۔ کچھ تو خیال کریں آپ اس کا۔" اور کھانا کھاتے ہوئے یشار اور نانو' دونوں کے ہاتھ رک گئے تھے۔

"دیس' ملک' سرزمین تینوں ایک ہی لفظ ہیں باسل... اپنی بات کو ان لفظوں کے سہارے سنجیدہ مت بناؤ۔"

"چلیے ٹھیک ہیں... پر لوگ تو انجان ہیں ناں نانو"

"پھر ہم کیا کرسکتے ہیں اس کے لیے..." وہ اندر ہی اندر مسکرائیں... وہ جانتی تھیں کہ باسل ان سے کیا چاہتا ہے۔

"آپ اسے یہاں ٹھہرالیں ناں... ہمارے گھر... وہ ہم سب کے ساتھ رہ لے گی۔"

"ہم بھی تو اس کے لیے انجان ہی ہیں۔" انہوں نے باسل کو چڑایا پر باسل سنجیدہ ہوگیا۔

"آپ تو محبت سے بے جان چیزوں میں جان ڈال دیتی ہیں نانو... وہ تو پھر ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔" اور نانو کی آنکھیں چھلک گئیں۔

"مجھے جذباتی مت کیا کرو باسل... تمہیں پتا ہے۔ میں تم دونوں بھائیوں کی بات نہیں ٹال سکتی۔"

"ہاں نانو! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے... زمل کو اس گھر میں ہی رکھ لیں... شاید اس طرح یہ پھر کلینک آجائے... جب سے وہ یہاں آئی ہے۔ یہ کلینک سے غائب ہے۔" یشار نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ٹھیک ہے... جب تم اسے ملوانے لاؤ گے تو میں اسے راضی کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔"

"وہ مان جائے گی۔" باسل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور اب کھانے کے دوران وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ نانو نے زمل سے ان کے گھر رہنے کی بات کرلی ہے کہ نہیں... ؟ نانو نے نفی میں گردن ہلائی تو باسل کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

کھانا کھا کر زمل پھر سے شیلف میں رکھی اشیاء دیکھنے لگی۔

"یہ ہرن کتنا خوب صورت ہے ناں باسل۔" اس نے باسل کو پکارا جو نانو سے بس جنگ عظیم کرنے ہی والا تھا۔

"ہاں!" سلیمانی کا ہی سے بنا وہ ہرن نفیس اور قیمتی تھا۔

"اسے تم رکھ لو زمل!" نانو نے پیش کش کی۔

"نہیں نانو..."

"میری طرف سے تحفہ سمجھ کر۔" انہوں نے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا رنگ تمہاری آنکھوں سے بھی ملتا ہے۔"

"میں اس تحفے کو جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔"
اس نے کہہ کر پیش کش قبول کرلی۔ نانو نے کاریگر سے اس ہرن کو پیک کرواکر زمل کو تھمایا۔ باسل اس دوران مسلسل نانو کو گھور رہا تھا۔ جسے نانو بڑی فیاضی سے نظرانداز کر رہی تھیں۔
اللہ حافظ نانو.... جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی.... ان شاءاللہ۔"
"اللہ حافظ بیٹی۔"
"اللہ حافظ نانو جی...." باسل نے بتیس کے بتیس دانت پیسے تھے۔ نانو مزہ لے رہی تھیں اور اس کے ضبط کی انتہا ہوچکی تھی۔ نانو نے باسل کو مزید ستانا مناسب نہ سمجھا۔
"زمل بیٹی! اُس کے باہر نکلنے سے پہلے انہوں نے زمل کو پکارا۔
"جی نانو!" وہ رکی۔
"تم جتنے دن بھی یہاں ہو، ہوٹل کے بجائے ہمارے گھر کیوں نہیں رہ لیتیں۔"
"نہیں.... نہیں نانو.... آپ کا بہت بہت شکریہ.... مگر مجھے ہوٹل میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔"
"تکلف مت کرو زمل.... تم ہمارے ساتھ رہو گی تو مجھے خوشی ہوگی۔"
"مجھے آپ کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگے گا۔"
"ایسی بات نہ کرو.... جیسا میرے لیے باسل ہے.... ویسی ہی تم بھی ہو۔" نانو نے کہا تو زمل خاموش ہوگئی۔ نانو کا دو تین بار اس کے نام کے ساتھ باسل کے نام کو بھی نسبت دینا وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ باسل کی پشت اس کی طرف تھی۔ مگر خوشی اس کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔

☼ ☼ ☼

سا دھا نی۔ سا نی۔ سا۔ گا۔
پا گا۔ سا نی، دا نی، سا۔ گا۔ سا۔
ہوا کی آغوش میں قید، راگ کلاوتی کھماج تال اٹھا رہا تھا۔ مور فاختاؤں اور کوئلوں نے دم سادھ لیا۔
"اس بار میں آپ کی مرضی نہیں چلنے دوں گی۔" کمرے میں زلیخابی کی آواز گونجی۔
برگد کی طرح وہ بھی سر جھکائے، بابا، ہمایوں اور زلیخابی کے گھیرے میں بیٹھی تھی۔
"اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیں آپ۔" زلیخابی غدایار سے فیصلہ کن انداز میں کہہ رہی تھیں۔
"لیکن.... زلیخا...."
"بس بہت ہوگئی بابا.... بہت ساتھ دے لیا آپ نے، ہر اچھی بری بات میں اپنی بیٹی کا...." ہمایوں بھی تیز لہجے میں بولا تھا۔ وہ خاموش ہوگئے۔ نگار نے لاچاری سے ان کی طرف دیکھا۔ ایک صرف وہ ہی اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔
"کوئی وجہ بھی تو ہو انکار کرنے کی.... اتنا اچھا رشتہ.... لوگ تو ترستے ہیں ایسے رشتوں کے لیے۔" زلیخابی، بابا سے کہتی اسے سنانے لگیں۔
"وہ جواز دے تو رہی ہے۔"
"جواز....؟" ہمایوں نے قہقہہ لگایا۔ "یہ کہ اس کی آنکھوں میں انتقام کا کالا موتیا ہے۔" اور ہنستا چلا گیا۔
"دراصل آپ کی بیٹی پاگل ہوگئی ہے بابا.... اس سٹھیائے ہوئے پروفیسر نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔" نگار نظریں اٹھا کر ہمایوں کو نہ دیکھ سکی۔
"رہی بات گلناب عالم کی تو ان کا طرز زندگی ان کا مسئلہ ہے.... اور رہا زیان.... تو چند ایک برائیاں کس لڑکے میں نہیں ہیں آج کل.... ماڈل ٹاؤن میں اتنی بڑی کوٹھی ہے ان کی.... زیان ان ہی کی کمپنی چلاتا ہے.... اور کیا چاہیے اسے.... آپ بھی تو اس کے لیے یہ ہی سب کچھ چاہتے تھے نا بابا...."
"ہاں.... لیکن...."
"میں اس رشتے سے انکار کسی صورت نہیں کروں گی.... سن لیں آپ.... اور بتادیں اپنی بیٹی کو بھی...."

زلیخابی اپنا آخری فیصلہ سنا کر باہر چلی گئیں۔

ہمایوں وہیں کھڑے کھڑے پھنکارنے لگا۔ نگار کے انکار نے دونوں کو سیخ پا کیا ہوا تھا۔ بابا اس کی بات سمجھ سکتے تھے اور کسی حد تک اس کی مدد بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اب زلیخابی اور ہمایوں کے رویوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس معاملے میں بابا اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتے۔

اس سب کے باوجود وہ پست ہمت نہیں ہوئی تھی۔ کوئی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود کو جانتی تھی۔ اور اس میں اتنی ہمت بھی تھی کہ گلناب عالم کو وہ خود انکار کر سکے۔

"حسن پلیز۔۔۔ آنٹی کو جلدی بھیجو ہمارے گھر۔۔۔ ہماری شادی کی بات کرنے۔"

وہ پہلی فرصت میں حسن سے ملی۔ اس پریشانی میں حسن نا صرف اس کا ساتھ دے سکتا تھا بلکہ اسے اس مصیبت سے نکال بھی سکتا تھا۔ اس نے کہا اور حسن نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"مجھے نوکری مل گئی ہے نگار۔۔۔ ایک بہت بڑی کمپنی میں۔" حسن نے اسے کندھوں سے تھام کر گھماتے ہوئے خوش خبری سنائی۔

"کیا واقعی۔۔۔؟" وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہو گئی۔۔۔ سارے دن کے بعد اس نے اب کھل کر سانس لیا تھا۔ کل سے اب تک جو جو اس پر بیتی تھی اس دورانیے میں یہ واحد خبر اس کے حق میں جا سکتی تھی۔

"کہاں۔۔۔ کیسے؟" وہ اطمینان سے تفصیل پوچھنے لگی۔

"بہت بڑی کمپنی ہے نگار۔۔۔ انہوں نے مجھے خود بلایا۔۔۔ میں نے تو وہاں اپنا C.V بھی نہیں بھیجا تھا۔ لیکن منیجر نے بتایا کہ انہوں نے میرا سی۔وی کہیں اور سے حاصل کیا ہے۔۔۔ نگار میں بہت خوش ہوں۔" وہ واقعی خوش تھا۔

"کمپنی اتنی بڑی ہے تو تنخواہ بھی اچھی ہو گی۔" وہ تسلی کر لینا چاہتی تھی۔

"تنخواہ تو میں نے پوچھی ہی نہیں۔۔۔ یہ ہی کیا کم ہے کہ وہ مجھے امریکہ بھیج رہے ہیں۔۔۔"

"امریکہ۔۔۔ لیکن کیوں؟" وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"امریکہ میں بھی کاروبار ہے ان کا۔۔۔ پورے چار سال کا کنٹریکٹ ہے۔"

"چار سال۔۔۔؟" چار سال کا لفظ اس کے منہ سے چار آتش فشاں پھٹنے کی صورت نکلا۔

"جانا کب ہے؟"

"اگلے ہفتے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو حسن۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" واقعی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"میں امریکہ جا رہا ہوں۔۔۔ چار سال کے لیے۔۔۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"تو کیا اس ایک ہفتے میں سب کچھ ہو سکے گا۔"

"کس نے کہا ہے کرنے کو۔" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"

"تم انتظار کر لینا۔۔۔ چار سال کی تو بات ہے۔"

"گھر پر ایک رشتہ آیا ہوا ہے حسن۔۔۔ اور امی انہیں انکار نہیں کرنا چاہتیں۔"

"ہم دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی جا رہا ہوں میں یار۔۔۔" حسن نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن حسن۔۔۔!" وہ بولتے بولتے رکی۔ ایک خیال چھناکے کی صورت اس کے ذہن کے پردے پر وارد ہوا تھا۔

"اس کمپنی کا نام کیا ہے حسن؟"

"عالم سنز۔" حسن نے بتایا اور نگار کے چہرے کا سارا رنگ نچڑ گیا۔ وہ اس کے سامنے زیان عالم کی کمپنی کا نام لے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پہلی کشتی کے جلنے کا نظارہ آخری کشتی کے جلنے جیسا تھا۔ اسے لگا واپسی کے سارے راستے اس کے

لیے بند ہو گئے ہیں۔ اور اگر کوئی کشتی باقی بھی بچی ہے تو سمندر سوکھ گئے ہیں۔ وہ پیدل اتنی مسافت کیسے طے کرے گی۔

حسن امریکہ چلا گیا تھا۔ حالانکہ نگار نے اسے ایک ایک بات بتادی تھی۔ یونیورسٹی میں ہوئے ہنگامے کی ایک ایک خبر۔۔۔ جسے سن کر حسن نے کسی طرح کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ پھر اگلے چھ دن عاصمہ کے گھر کے بہت سے چکر لگانے کے باوجود بھی وہ نگار کو نہیں ملا۔ اس لیے اس کے امریکہ چلے جانے کی خبر اس کے لیے زیادہ حیرت انگیز ثابت نہیں ہوئی تھی۔

اس کی محبت منہ دکھائی کے اس سکے سے مشابہہ تھی جسے لڑکی ساری زندگی سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ اور جب اسے استعمال کرنے کا وقت آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ تو اصل میں کھوٹا تھا۔

وہ حسن کے لیے دل میں کوئی شکوہ نہیں رکھتی تھی۔ اسے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کا پورا حق حاصل تھا۔ جو اس نے استعمال کیا۔ بچپن سے ہی اس نے زندگی بہت کسمپرسی کی حالت میں گزاری تھی۔

ایسے میں وہ زیان کی طرف سے دی جانے والی پیش کش سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ لیکن نگار اس بات سے گھائل ہوتی رہی کہ اس نے اس پیش کش کے بدلے اس کی سچی محبت کو کیوں قربان کردیا۔

گلناب عالم دوبار آچکی تھیں۔ اور دونوں بار زلیخابی نے انہیں مختلف انداز سے ٹالا تھا۔ گھر کے موجودہ ماحول کے باعث زلیخابی انہیں ہاں نہیں کہہ پارہی تھیں اور انکار وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ گلناب عالم کی سمجھ سے بالا تر تھا کہ آخر انہیں واضح جواب کیوں نہیں دیا جارہا۔ دونوں بار ان کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد بھرپور ہنگامہ ہوا تھا۔ ہمایوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"میں آپ کو بتارہا ہوں بابا۔۔۔ اگر آپ نے اس رشتے سے انکار کیا تو آپ اپنی بیٹی کے ساتھ الگ کمرے میں رہیں گے۔۔۔ اور میں اور اماں الگ کمرے میں۔"

بابا نگار کی مرضی کے آگے بے بس تھے۔ وہ خود کتنی بار نگار کو سمجھا چکے تھے کہ انکار کی جو وجوہات وہ بتارہی ہے وہ کچھ ایسی بھی معقول نہیں اور زلیخابی کی طرح وہ خود بھی اس رشتے سے انکار نہیں کرنا چاہتے لیکن نگار کی ضد کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

آج یونیورسٹی آتے وقت نگار نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زیان عالم سے ملے گی۔

"آصفہ مجھے زیان سے ملنا ہے۔"

"وہ اب یونیورسٹی نہیں آتا۔۔۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں اس کے آفس لے کر جاسکتی ہوں۔" آصفہ نے منہ موڑ کر پیش کش کی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔" تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

آمنہ اسے زیان کے آفس لے آئی۔ جس وقت وہ غصے میں بھری اندر داخل ہوئی' وہاں پہلے سے دو تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ زیان ان سے کچھ ڈسکس کررہا تھا۔ نگار کو اس طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ سے بعد میں بات ہوگی۔" اس نے کہا اور باقی سب اٹھ کر آفس سے نکل گئے۔

"یہ کیا پاگل پن ہے زیان؟" سائنس بلاک کے باہر رونما ہونے والے واقعے کے بعد وہ اسے آج دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گرم چائے سے جلنے کے نشان مندمل ہونے کے بجائے مزید گہرے ہوگئے تھے۔ اور نگار کو اس چہرے سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

"لوگ اس پاگل پن کو محبت کہتے ہیں نگار!" وہ اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کو کھسکا کر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ نگار کو اس کے اس رویے اور بات پر بیک وقت ہنسی اور غصہ آیا تھا۔

"تمہارے لیے کچھ آرڈر کروں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

نگار اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"میں تمہارے رویے کو سمجھ نہیں پارہی زیان۔"

"تم محبت کو سمجھ نہیں پارہیں نگار؟" الٹا وہ اس

سے پوچھنے لگا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" قہقہہ لگانے والے انداز میں وہ بولی۔

"اپنی محبت کا مظاہرہ تم سائنس بلاک کے باہر کر چکے ہو۔" اس نے طنزاً" کہا۔

"وہ ایک غلطی تھی۔۔۔ خدا کا شکر کہ اس کو پروفیسر صغیر ربانی نے سرزد ہونے سے بچا لیا۔ میں اس حرکت کے لیے گلٹی ہوں۔۔۔ اور تم سے ایکسکیوز بھی کرتا ہوں' دراصل۔۔۔ اسی دن مجھے اندازہ ہوا کہ میں۔۔۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔"

"کیونکہ تم ہمیشہ غصے میں رہتی ہو نگار۔۔۔ اس لیے تمہارے ذہن سے وہ پہلا دن نکلا ہی نہیں۔۔۔ میرے معافی مانگنے کے باوجود بھی۔۔۔ یہ تمام واقعات صرف تمہاری وجہ۔۔۔"

"تم اس رشتے سے خود ہی پیچھے ہٹ جاؤ زیان۔"

"اب۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔"

"میری فیملی مجھ پر دباؤ ڈال رہی ہے' میں یہاں تم سے ریکویسٹ کرنے آئی ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔۔۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہی زیان؟" وہ تقریباً" چلائی تھی۔

"مجھے اپنی سی کوشش تو کرلینے دو' تمہیں منانے کی۔"

"تمہارا خیال ہے میں مان جاؤں گی۔" جواباً" زیان نے سر کو مثبت انداز میں خم دیا تو نگار نے ایک ہنکارا بھرا۔

"حسن کو تم نے چالاکی سے امریکہ بھجوا دیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اب تمہارے ساتھ۔۔۔"

"غلط مت سوچو نگار۔۔۔ وہ ہماری پرانی ملازمہ کا بیٹا تھا۔۔۔ وہ بہت بار اپنے بیٹے کے بارے میں مجھ سے ذکر کرچکی تھی۔۔۔" نگار کو اس کے جھوٹ پر غصہ آیا۔

"تم اتنا منفی کیوں سوچ رہی ہو۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔ تمہارے اندر مصباح کی سوچ سرائیت کر گئی ہے۔۔۔ شدت آمیز۔۔۔"

"اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میری ممی جب آئیں گی تو تم خود انہیں انکار کردینا۔۔۔ پھر وہ دوبارہ تمہارے گھر نہیں آئیں گی۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ اب خوش۔۔۔"

وہ پیار سے پوچھنے لگا۔ نگار واپسی میں سارے راستے حالات واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن ناکام رہی۔ گھر میں کون تھا جو گلناب عالم کو انکار کرنا چاہتا تھا؟

زلیخا بی اور ہمایوں نے رات گئے تک پھر روز کی طرح ہنگامہ کیے رکھا۔ جس کی وہ اب تک عادی نہیں ہوسکی تھی۔ بابا بھی ان کے آگے ہمت ہارنے لگے تھے۔۔۔ اور نگار ہمت چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"جیسا تم سوچ رہے ہو۔۔۔ ویسا میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی زیان عالم!" اس نے ایک بار پھر سے اپنے عزائم مضبوط کیے۔

"بابا۔" اس نے پلنگ پر لیٹے بابا کو پکارا۔ آفس سے واپسی پر ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بابا کو ہر بات بتادے گی۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے بابا کو سب کچھ بتادیا۔ شروع سے لے کر آخر تک۔ ہال کے جلسے' نوٹس بورڈ پر چسپاں تصویریں' کینٹین کے ہنگامے' سائنس بلاک کے باہر ہوتی اس سے بدتمیزی کی کوشش اور۔۔۔ اور حسن کے بارے بھی۔۔۔

وہ سر جھکائے بولتی رہی اور روتی رہی۔ سب سنتے سنتے پہلے تو بابا کی آنکھیں بے تاثر رہیں پھر ان میں جلال سا ابھرنے لگا۔

"یہ سب کچھ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ گرجے۔۔۔ نگار جواباً" خاموش رہی۔

"تم فکر نہ کرو۔ گلناب عالم کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ دوبارہ ہمارے گھر میں قدم بھی رکھے۔"

بابا اپنے غصے کو اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر دبا رہے تھے۔۔۔ نگار ایک طرح سے مطمئن ہوگئی۔ یہ اس کا اچھا فیصلہ تھا جو اس کے حق میں گیا تھا۔

بابا نے اگلے دن گلناب عالم کو خود انکار کردیا۔ زلیخا بی

اور ہمایوں کو کچھ بھی بتائے بغیر اور ان کی ذرہ برابر بھی پرواہ کیے بغیر۔

"یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ مہربانی فرما کر آپ دوبارہ یہاں تشریف مت لائیے گا۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا اور گلناب عالم کا چہرہ فق ہو گیا۔ حیرت اور درشتگی ان کی آنکھوں سے جھلکی تھی۔

رات میں نگار نے زلیخا بی اور ہمایوں کی تیکھی نظروں کو بڑی بے نیازی سے نظر انداز کر دیا۔ بابا ہی تھے جو اس کی طرف کے جواب بھی دے رہے تھے۔ وہ رات اس نے بہت سکون سے گزاری۔

☼ ☼ ☼

چنگیزی ڈرتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ چنگیزی نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔

زیان سینٹر ٹیبل پر پڑے آرائشی کرسٹل گلوب کو ہاتھ سے گھما رہا تھا۔

"اندر آجا چنگیزی!" زیان نے گردن موڑے بغیر کہا۔ چنگیزی آگے بڑھ آیا۔

"مجھ سے اتنا ڈرتا کیوں ہے چنگیزی؟" زیان نے پوچھا۔ "میں تو تم سے چھوٹا بھی ہوں۔" چنگیزی کچھ نہ بول سکا۔

"میں اتنا برا ہوں چنگیزی کہ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کیا میں محبت کے قابل نہیں ہوں؟"

"آپ کے لیے کچھ لاؤں مالک؟"

"اس نے کہا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری محبت میں مبتلا ہو۔"

"بیگم صاحبہ آپ کے لیے فکر مند ہیں۔۔۔ آپ اسے بھول جائیں مالک!" چنگیزی نے کہا۔ زیان کی آنکھوں کے رنگ بدلے۔

"وہ چہرہ تو اب مجھے سوتے جاگتے میں پریشان کرنے لگا ہے۔ وہ میرے وہموں میں ہے۔ میرے گمانوں میں۔ میری بیداری میں، میرے خوابوں میں، اسے کیسے بھول جاؤں؟"

"کیا وہ اتنی خوب صورت ہے؟"

"خوب صورت؟" اس نے جھٹکا دے کر کرسٹل گلوب کو گھمایا۔ گلوب بڑی دیر تک گھومتا رہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ بہت خوب صورت ہے۔۔۔ اتنی کہ اس کی خوب صورتی نے مجھے حیران کر دیا۔ اور تمہیں پتا ہے کہ زیان عالم کو حیران کرنا آسان نہیں۔۔۔ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ اب میں اس کی خوب صورتی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"لیکن وہاں سے انکار ہو گیا ہے۔۔۔ بیگم صاحبہ غصے میں ہیں۔"

"میں منا لوں گا۔"

"بیگم صاحبہ کو؟"

"نہیں اسے۔"

"آپ کو اتنی شدید محبت کیسے ہو گئی مالک؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔ "محبت نہیں، جنون ہے چنگیزی۔۔۔ وہ ہے ہی ایسی کہ اس سے صرف محبت ہی کی جا سکتی ہے۔" اس نے محبت کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"لڑکی اگر نگار ہو تو ہو۔۔۔ ورنہ نہ ہو۔" اس نے جھٹکا دے کر پھر گلوب گھمایا۔

خاموشی میں، دو مختلف کانچ کے ٹکڑوں کی آپس میں رگڑ کی آواز گونجتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"حاجرہ خالہ، گھر کی چابیاں دے دیں۔" یونیورسٹی سے وہ گھر واپس آئی تو اس نے گھر کے دروازے پر تالا لگا دیکھا۔ زلیخا بی بازار وغیرہ جاتی تھیں تو چابیاں حاجرہ خالہ کو دے جاتی تھیں۔ اس لیے آج بھی گھر پہ تالا دیکھ کر وہ سیدھا حاجرہ خالہ کے گھر چلی آئی۔

"کچھ بتا کر گئی ہیں کہ کب تک آئیں گی؟" اس نے پوچھا۔ حاجرہ خالہ نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ ہی وہ اندر چابیاں لینے گئیں۔

"کیا بات ہے حاجرہ خالہ؟ ان کے چہرے پر آئی دہشت کو اس نے محسوس کیا۔

"تمہارے بابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے نگار..... وہ اسپتال میں ہیں۔" حاجرہ خالہ نے ایک ہی جملے میں بڑے آرام سے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی.....

✡ ✡ ✡

ندا یار کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں تھے۔

خون کافی بہہ چکا تھا۔ انہیں ہوش نہیں آرہا تھا اس لیے ڈاکٹر انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ جس وقت وہ بھاگتی ہوئی اسپتال میں داخل ہوئی، زلیخابی اس وقت بینچ پر بیٹھی تسبیح ہاتھ میں لیے، آنسو بہا رہی تھیں۔ اس کے حواس منجمد ہونے لگے۔

ہمایوں ادھر سے ادھر آنے جانے میں ہی ہلکان ہو رہا تھا۔ شام کے وقت جب اس نے بابا کی حالت دیکھی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بہت سے بھیانک خدشوں نے اسے آگھیرا تھا۔ مضبوط اعصاب رکھنے کے باوجود وہ ٹوٹ گئی اور بے تحاشا رونے لگی۔

زلیخابی نے اسے سنبھالا اور دلاسا دیا۔ رات میں ڈاکٹرز نے بھی کسی طور امید دی۔ جسے سن کر وہ تھوڑی بہتر حالت میں آئی۔ تب ہی اس نے ایک شناسا چہرے کو بھی وہاں پر دیکھا۔ وہ چہرہ زیان عالم کا تھا، جو ہمایوں کے ساتھ ساتھ مختلف ڈاکٹرز سے مل رہا تھا۔ بابا کے کیس کو لے کر ان سے بات چیت کر رہا تھا۔ نگار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"یہ..... یہ یہاں.....؟" وہ حیرت زدہ، زلیخابی سے پوچھنے لگی۔

"بہت بری طرح سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا تمہارے بابا کا..... زیان بھی وہیں موجود تھا..... اللہ کا کرم ہی سمجھ لو اسے تم..... وہ ہی تمہارے بابا کو اسپتال لایا ہے۔" زلیخابی نے بتایا۔ وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔

"اگر آنے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو..... تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" زلیخابی رونے لگیں۔ نگار میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کے آنسو پونچھ سکتی۔ اس نئے انکشاف نے اس کے ذہن کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

چند دن بعد بابا کو ایمرجنسی سے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ زیان اس دوران وقتاً فوقتاً وہاں آتا رہا تھا۔ نگار کی اور اس کی صرف نظریں ہی چار ہوتی تھیں۔ نہ نگار نے اس سے کوئی بات کی نہ زیان نے اس سے..... تاہم زلیخابی اور ہمایوں زیان کے سامنے اپنے سر نہیں اٹھا پا رہے تھے۔ دوائیوں کے بلز اور ڈاکٹرز کی بھاری فیسیں وہ خود ہی ادا کر رہا تھا۔ ہمایوں کے بار بار کہنے کے باوجود بھی اس نے بابا کو پرائیویٹ اسپتال سے سرکاری اسپتال منتقل نہیں ہونے دیا تھا۔

پندرہ روز بعد بابا کو پلستر چڑھی ٹانگ سمیت اسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا۔ زیان تب بھی وہیں موجود تھا۔

"ہمایوں! تم بابا کو دوبارہ یہیں لانا..... پلیز..... چارجز وغیرہ کی فکر مت کرنا۔"

زیان نے ہمایوں سے کہا۔ اور ہمایوں جیسے مزید شرمندہ ہو گیا۔ نگار سب دیکھ رہی تھی..... اور سچ جھوٹ میں تمیز کرنے سے قاصر تھی۔

سب بابا کو لے کر گھر آگئے اور گھر کا ماحول نگار کے لیے وحشت زدہ ہو گیا۔ ہمایوں نے اسے بلانا چھوڑ دیا تھا۔ زلیخابی انتہائی ضرورت کے وقت اس سے مخاطب ہوتی تھیں..... ان دنوں اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ یونیورسٹی میں الیکشن مہم کے آخری دن چل رہے تھے۔ اور وہ اپنی ساری توجہ چاہ کر بھی وہاں مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔

"کیا بات ہے نگار..... مجھے تم ڈسٹرب لگ رہی ہو۔" زارا نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زیان کے رشتے کی بات یونیورسٹی میں پھیلے..... بابا کے گھر آنے کے تین دن بعد گلناب عالم بھی آئی تھیں..... خلاف توقع..... بہت سارے پھل اور امپورٹڈ ٹن پیک اشیاء لے کر۔

"میں آپ کی خیریت دریافت کرنے آئی ہوں بھائی صاحب..... امید ہے آپ کو برا نہیں لگا ہوگا۔" ان کے نرم لہجے میں طنز نہیں تھا پھر بھی بابا جیسے ان کے

سامنے جھکتے ہی چلے گئے۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" انہوں نے پوچھا تو بابا نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ وہ ابھی بول نہیں پارہے تھے۔ نگار کی طرح زلیخابی اور ہمایوں بھی ان کی دوبارہ آمد سے مضطرب تھے۔

"زیان باہر کھڑا ہے بھائی صاحب... آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے... آپ اجازت دیں تو..."

"جی... جی... کیوں نہیں... میں اسے اندر لاتا ہوں..." بابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ہمایوں اٹھا اور زیان کو اندر لے آیا۔

کمرے میں چند ثانیے خاموشی رہی پھر زیان گویا ہوا۔

"میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ... آپ سب کے سامنے... نگار سے معافی مانگ سکوں۔"

نگار نے نظریں اٹھا کر زیان کی طرف دیکھا۔ جو سر جھکائے شرمسار سا بیٹھا تھا۔

"یونیورسٹی میں مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئیں... جو ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن آپ اسے میرا بچپنا یا جذباتی پن کہہ سکتے ہیں۔ میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں اور نگار سے معافی چاہتا ہوں۔" زیان کہہ کر خاموش ہوگیا۔

نگار سمیت کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ زیان اٹھ کر بابا کے پاس گیا۔

"بابا! کیا آپ مجھے معاف کردیں گے... اپنا بیٹا سمجھ کر...؟" وہ ان سے پوچھنے لگا۔ بابا کی آنکھوں میں آنسو آگئے... انہوں نے نگار کو دیکھا۔ جس کی اپنی آنکھوں میں نمی تھی۔

رات کو زلیخابی اس کے کمرے میں آئیں۔

"اتنا مت سوچو نگار... بدگمانی ختم کرو... اس نے سب کے سامنے معافی مانگی ہے تم سے... ایسے رشتے باربار نہیں ملتے... یہ تو ہماری قسمت ہے... تمہارے بابا اور میری دعاؤں کا نتیجہ ہے... کتنے احسان ہیں اس کے ہم پر... بیماری میں جس طرح تمہارے بابا کی دیکھ بھال ہوئی ہے... ہم میں کہاں تھا اتنا دم خم کہ اتنی رقم خرچ کرتے... لیکن خدا کے لیے تم اپنی زندگی سے مت کھیلو نگار... قدرت نے اچھی زندگی گزارنے کا جو موقع تمہیں دیا ہے تم تو اسے حاصل کرو..."

زلیخابی رونے لگیں... وہ ان کی باتیں سنتی گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھے ساکت بیٹھی تھی۔

"تمہارے بابا اب اتنا حوصلہ نہیں رکھتے کہ انہیں انکار کریں... ان کا مزید امتحان نہ لو... یہ گلناب عالم کا ظرف ہے جو وہ باربار اس در پر چلی آتی ہیں جہاں سے وہ دھتکاری جاچکی ہیں... تم دیکھ چکی ہو انہیں... کیا وہ ایسی عورت ہیں جو اپنی بے عزتی کروانے دوبارہ چلی آئیں... اپنے بیٹے کی پسند کے آگے مجبور ہیں وہ انہیں مزید ذلیل مت کرو۔" سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے وہ اسے سمجھانے لگیں۔

"سب کے سامنے معاف کیا ہے تو دل سے بھی کردو... زیان بہت اچھا لڑکا..."

"مجھے یہ رشتہ منظور ہے امی...! آپ گلناب عالم کو ہاں کردیں..." اس نے کہا اور اپنا منہ گھٹنوں میں دے لیا۔

☆ ☆ ☆

"پتھر پہاڑ سے نیچے گرجائے تو وہ پتھر ہی ہے۔ پہاڑ کا حصہ نہیں۔" پروفیسر صغیر ربانی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے ان کی صورت دیکھنے لگی۔

"تم دہرے رویے پال رہی ہو... اوپر سے ظاہر کررہی ہو کہ تم مضبوط ہو... لیکن اندر سے تم اس پتھر کی طرح اپنا مقام کھوچکی ہو۔ حسن کی بے وفائی نے تمہیں بے وقعتی کے احساس سے روشناس کرایا ہے..." نگار کی آنکھوں میں ایک آنسو ابھر آیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں زیادہ عرصہ اس فریبی احساس میں نہیں رہی۔"

"اس خوشی سے بڑھ کر وہ دکھ ہے کہ فریب حقیقت ہوجاتا۔" وہ رکے' چائے کا گھونٹ بھرا۔ پھر بولے۔

"یہ بات قابل اطمینان ہے کہ تم نے جلد ہی شادی

کا فیصلہ کرلیا ہے۔۔۔ شادی اچھی چیز ہے زندگی میں تبدیلی لاتی ہے۔"

"پھر آپ نے شادی کیوں نہیں کی سر؟" دکھ میں وہ بمشکل مسکرائی۔

"میں خود کو جان گیا تھا نگار!" مجھے ہمیشہ ایسا لگتا رہا کہ میں اس نازک صنف کو ٹھیس پہنچاؤں گا۔۔۔ انسان پیالے میں پڑا پانی ہی تو ہے۔ کبھی نہ کبھی کسی ناگہانی وقت چھلک جاتا ہے۔ دائرے سے بھی نکل جاتا ہے اور حد سے بھی۔۔۔ انسان کی جو حد مقرر ہے' وہ اس حد کو پھلانگنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ میں اس بے تابی سے ڈرتا ہوں۔ مجھے خوف رہا کہ میں حد سے نکل جاؤں گا اور بہت سوں کو لے ڈوبوں گا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ کسی دوسرے کی زندگی خراب کرتا۔"

"اس چیز کا کیسے پتا چلتا ہے سر۔۔۔ کہ ہم یا دوسرا۔۔۔ شادی کے بعد زندگی خراب نہیں کرے گا۔" نگار نے پوچھا اور پروفیسر صغیر ربانی چائے کا کپ لبوں سے لگاتے لگاتے رکے۔

"نگار۔۔۔! بہتر ہے کہ تم اس لڑکے سے ایک بار مل لو۔۔۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے سر۔۔۔ میں تو آپ سے صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ جسے انسان ناپسند کرتا ہے' اس کے ساتھ پھر پسندیدہ زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے۔"

"کیا وہ لڑکا تمہیں پسند نہیں ہے؟ کیا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو؟"

"مجھے بہت سوں کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشی نظر انداز کرنی پڑی سر!"

"وہ لڑکا کون ہے نگار؟"

"ہمارے والدین ہمیں پیار دیتے ہیں۔۔۔ لیکن اندر دل کے تہہ خانے میں وہ کابوسی جال کی چرخی بھی لگائے رکھتے ہیں۔۔۔ وقت آنے پر وہ جال ہم پر ڈال دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔"

"نگار۔۔۔ وہ لڑکا کون ہے؟"

"بابا کا احسانات تلے دب کر دم گھٹنے لگا تھا۔۔۔ اماں چاہتی تھیں کہ میں بہتر زندگی گزاروں۔۔۔ ہمایوں میرے لیے فکر مند تھا۔۔۔ سب ٹھیک تھے۔ کوئی غلط نہیں تھا۔۔۔ شاید میں ہی زیادہ حساس ہونے لگی کہ پیار تو خراج مانگتا ہی ہے۔ پر شفقت میں سودے بازی کیوں آ گئی ہے۔"

"نگار۔۔۔ کیا وہ لڑکا زیان ہے؟" انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نگار بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

"بتاؤ نگار۔۔۔ کیا وہ زیان ہی ہے؟"

"میری مرضی پوچھ کر بھی اپنی مرضی مسلط کر دی گئی۔ پھر چاہے وہ زیان ہوتا یا کوئی اور۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے سر۔۔۔"

☼ ☼ ☼

شادی کی تاریخ ایک ہفتے بعد کی رکھی گئی تھی۔ بابا کی "ہاں" نے گلناب عالم کو خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ ایک بہت بڑی رقم انہوں نے بابا کو دینی چاہی تھی۔

"یہ تحفہ میں اپنی طرف سے دے رہی ہوں۔۔۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔" لیکن بابا نے وہ پیسے نہیں لیے تھے۔ نہ ہی ہمایوں اس بات کے حق میں تھا۔ ایک ہفتہ زلیخا بی اسے لیے بازاروں کے چکر لگاتی رہیں اور وہ بت بنی ان کے ساتھ ساتھ چلتی پھرتی رہی تھی۔

زارا مہندی والی رات کو آئی۔ جب وہ اپنے ہاتھوں پر لگی مہندی کے رنگ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ مہندی اسے عاصمہ نے لگائی تھی۔ نگار کو اس سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ عاصمہ شرمندہ تھی۔ اس کے بھائی نے نگار کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا لیکن نگار نے اپنا دل اس کی طرف سے صاف کر لیا تھا۔

"جس کو جو بہتر لگا' اس نے وہ ہی کیا۔۔۔" اس نے یہ کہہ کر اس بات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔

"بھئی' فلموں میں دیکھا تھا۔۔۔ پہلے لڑائی' بعد میں شادی۔۔۔ حقیقت میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔" زارا

نے شوخی سے کہا۔ وہ اس شادی کو لے کر خوش تھی۔
"یونیورسٹی کی بدمزگی کو بھلے گھر مت لے کر جانا نگار...." اس نے بھی اسے سمجھایا اور ایسی باتوں کو وہ خود بھی اب تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگی تھی۔
"کل جلدی آجانا زارا.... میں الیکشن کے نتائج کی منتظر رہوں گی۔" نگار نے جاتے وقت زارا کو تاکید کی۔ لیکن پھر بھی وہ بارات والے دن کافی دیر سے آئی۔ جب اس کی رخصتی کا وقت بالکل قریب تھا۔
"اتنی دیر سے آئی ہو زارا....! جلدی بتاؤ کون جیتا؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"تمہاری پارٹی جیت گئی نگار.... مصباح جیت گیا۔" زارا نے بتایا۔
"کیا.... سچ کہہ رہی ہو نا؟" اس کا چہرہ اس کے لباس کی طرح دمکنے لگا۔
زارا بت بنی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے زارا.... کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ مصباح کی جیت...."
"کل ظہر کے بعد مصباح کا جنازہ ہے نگار.... آج شام اس کی کار پر کسی نے فائرنگ کردی ہے...." زارا روتے ہوئے اس کے اوپر گری تھی۔

***

"بس کرو نگار بیٹی...." زلیخا بی نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے سینے سے ---- لگی روئے چلی جارہی تھی۔ بابا بھی فکرمندی سے اسے دیکھنے لگے۔
"چپ ہوجاؤ نگار.... لوگ کچھ اور مطلب نکال لیتے ہیں۔" زلیخا بی نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاکر کہا۔ ہمایوں قہربار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہو کہ ہاں کردینے کے باوجود بھی نگار اس شادی کے لیے دل سے رضامند نہیں ہے۔
عروسی کمرے میں پہنچ کر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے چہرے پر جھوٹی ہی سہی، مسکراہٹ کیسے سجائے۔ کیسی ناگہانی خبر اسے عین اس کی شادی والے دن ملی تھی۔ کاش زارا اس خبر کو وقتی طور پر دبا لینے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتی۔
زیان کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کھنکھارا اور اس کے قریب آیا۔ نگار کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ پھر وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔
"مجھے اندازہ ہے کہ شاید ابھی بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہیں آیا ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ پھر اس نے بڑھ کر نگار کا ہاتھ تھام لیا۔ نگار جیسے کہیں اور دیکھتے ہوئے اس کی صورت دیکھنے لگی۔
"میں اس وقت تک تمہارا انتظار کروں گا جب تک تم خود میرا ہاتھ نہ تھام لو۔" اس نے نگار کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"مصباح کا انتقال ہوگیا ہے.... تم اس کی خاص سپورٹر تھیں۔ اگر تم کل وہاں جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ واپسی پر اس نے نائٹ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بتی بند کرکے وہ صوفے پر لیٹ گیا۔
نگار نے اپنے سینے سے کوئی وزنی بوجھ سرکتا ہوا محسوس کیا تھا۔

***

وہ ہوٹل سے نانو کے گھر منتقل ہوگئی تھی۔
نانو نے دوسری بار اسے فون پر پھر دعوت دی تھی۔ اور وہ یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ فون یقیناً "باسل" نے ہی کروایا تھا۔
"میں تمہارے لیے کمرہ بھی سیٹ کرچکی ہوں زمل!"
نانو نے بتایا اور اس بار وہ "رسماً" بھی انکار نہ کرسکی۔ وہ انکار کرنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ سامان پیک کرکے وہ حبیب اللہ روڈ پر واقع اس ایک منزلہ پرانی طرز کے

بنے ہوئے مکان میں آگئی۔

وہ مکان قدرے بڑا' کافی پرانا لیکن ہر طرح کی جدید آسائشوں سے پُر تھا۔ سرخ اینٹوں' اونچی چھتوں' موٹی دیواروں' روشن دانوں' بے تحاشا کھڑکیوں اور دروازوں سے بھرا ہوا وہ مکان زمل کو بہت بھایا تھا۔ جس کے فرش پر سفید چپس اور سنگ مرمر کے مختلف نمونوں کے ڈیزائن ہموار کیے گئے تھے۔ چاروں طرف سے باغ اور درختوں میں وہاں کیلے اور پپیتے کے درخت تھے۔ لمبی لمبی بغیر کانٹ چھانٹ کی گھاس جو کسی طرح کی دیکھ بھال کے بغیر بھی بہت خوب صورت لگتی تھی۔ اور جس پر جابجا نانو کے "نوادرات" دھوپ میں سوکھنے کے لیے ہمہ وقت بکھرے رہتے تھے۔ سالوں کی تاریخ سمٹ کر جیسے اس ایک خطے میں آگئی تھی۔

جو کمرہ اسے دیا گیا' وہ اس گھر کے باقی تمام کمروں سے زیادہ بڑا تھا۔ وہاں ہوٹل جیسا سکون نہیں تھا۔ مگر ہوٹل کے کمرے سے بڑھ کر راحت ضرور تھی۔ وہ خوش تھی۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اس طرح کے ماحول میں آئی تھی۔ جہاں کسی کے رویے میں منافقت نہیں تھی۔ کوئی چہرہ سازشی نہیں تھا۔ اسے ان دنوں خود پر رشک آرہا تھا۔

نانو ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ وہ ہر روز کھانا بنانے پر پہلے اس سے اس کی پسند پوچھا کرتیں۔ سوائے چند ایک ڈشز کے' وہ پاکستانی کھانوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بار بار ان ہی کے نام لے لیتی۔

"لگتا ہے تمہیں صرف بریانی وغیرہ کا ہی پتا ہے زمل!" نانو سمجھ گئی تھیں۔

"جی نانو.....!" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر ایک دن جب اس نے نانو کے آگے کوفتے کا نام لیا تو نانو حیران رہ گئیں۔

"تم جانتی ہو اس ڈش کو؟"

"جی نانو.....!"

سدیم انکل کو یہ ڈش بہت پسند تھی۔ اس نے صرف ایک دو بار اسے کھایا تھا۔ اسے نام یاد آگیا تو اس نے نانو سے فرمائش کر دی۔ جسے نانو نے فوراً" ہی پورا کر دیا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ نانو کے دو ظاہری ہاتھوں کے علاوہ تین چار اور خفیہ ہاتھ بھی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ اتنے سارے کام اتنی آسانی سے اور جلدی سے کیسے کر لیتی ہیں۔ شاید وہ ایسا اس لیے بھی سوچ رہی تھی کہ ان کے گھر میڈز کی ایک پوری ٹیم تھی اور زمل نے خود کبھی ڈیڈ کے کاموں کے علاوہ زیادہ کام نہیں کیے تھے۔

ڈیڈ کے حوالے سے یشار سے بھی وقتاً" فوقتاً" بات چیت جاری تھی۔ زمل کی مایوسی میں یشار کی باتیں کسی ٹانک کا کام کرتیں۔ وہ پھر سے تازہ دم ہو جاتی۔

"فکر مت کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عجز بھری آنکھوں اور ساکن چہرے سے اس کا یہ کہہ دینا ہی نجانے کیسے زمل کو پُرسکون کر دیتا وہ واقعی بے فکر ہو جاتی۔

باسل شرارتی آنکھوں والا لڑکا تھا۔ کھانے کی میز پر یا گھر کے کسی بھی حصے میں اس کی نظریں زمل کا طواف کرتی رہتیں۔ اور نانو کی ان دونوں کا۔ اس کی محبت ایسی خاموش' ایسی مقدس تھی کہ زمل کے دل کی خالی لوح پر اس کی ذات کے قصیدے رقم ہوتے چلے گئے۔ یہ احساس نیا تھا' لڑکپن سے بالغ ہو جانے جیسا۔

جس مقصد کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔ اسے اس میں زیادہ کامیابی نہیں ملی تھی۔ یشب انکل کا ایک بھائی لاہور میں ہی آباد تھا جس سے وہ ملنا نہیں چاہتی تھی۔ سدیم انکل کی دو بہنیں لاہور سے باہر رہتی تھیں۔ اس کے پاس ان دونوں کے پتے موجود تھے۔ فرانس سے ان کے بینک اکاؤنٹس میں بہت لمبے عرصے تک پیسے ٹرانسفر ہوتے رہے تھے۔ وہ ان کے ناموں سے واقف تھی اور بہت جلد ان سے ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ڈیڈ کے کسی پرانے چنگیزی نامی ملازم کا اسے علم ہوا تو وہ پہلی فرصت میں اس کے گھر پہنچی۔ چنگیزی کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بیٹے سے ملاقات میں اسے

کسی نئی بات کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔
"زیان عالم غصے کے تیز تھے۔۔۔ کیا وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔"
"تقریباً" ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ ان کی زندگی کے موجودہ حالات تفصیلاً" نہیں بتا سکتی تھی۔
"ان کی شادی کے دنوں کی گہما گہمی مجھے آج بھی یاد ہے۔۔۔ میں اس وقت دس سال کا تھا۔" آدمی نے اسے بتایا۔ وہ ڈیڈ کی پاکستان میں شادی کے بارے جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ شادی ناکام رہی تھی۔
"لیکن وہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ تب سنا تھا کہ وہ لڑکی کسی اور کو پسند کرتی تھی اس لیے اس نے زیان عالم سے طلاق لے لی۔" آدمی اسے مزید بتا رہا تھا جبکہ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔
"اور بدقسمتی سے ان کی دوسری شادی بھی نہ چل سکی۔ ان کی دوسری بیوی بھی کسی اور کو پسند کرنے لگیں۔ اور انہوں نے ان سے طلاق لے لی۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ کتنے دکھ تھے اس کے ڈیڈ کی زندگی میں۔ کسی ایک طرف سے بھی انہیں خوشی نہیں مل سکی تھی۔
"تو گلناب عالم کی وفات کب ہوئی؟"
"اس بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کہ ایک دن زیان صاحب نے گھر بار سب بیچ دیا۔ تمام ملازموں کو بھی فارغ کر دیا اور وہ لوگ فرانس شفٹ ہو گئے۔"
اور ایک کنجی کو یہیں چھوڑ گئے۔ اور اب وہ اس کنجی کو کیسے ڈھونڈے گی؟ شار نے کس قدر مشکل کام اس کے ذمے لگایا تھا۔
گزرتے دنوں میں اسے اندازہ ہوا کہ اس کے پاکستان کے ایک ماہ کے ٹور میں سے پچیس دن گزر چکے ہیں۔ وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی، وہ بھولنے لگی تھی۔ اسے ابھی مزید یہاں رہنا تھا۔ وہ بس یہ بات جانتی تھی۔
ڈیڈ کو فون کر کے اس نے اپنے یہاں قیام کے طویل ہو جانے کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا۔ ڈیڈ کا رویہ حسب توقع تھا۔ بات سن کر انہوں نے فون بند کر دیا اور شاید پہلی بار زمل خود غرض ہوئی۔ اس نے ڈیڈ کے رویے کی پرواہ نہیں کی تھی۔
اس طرح کے دن اسے آنے والی زندگی میں پھر کبھی نہیں ملنے والے تھے۔ وہ یہ دن پورے دل سے جی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نانو! آپ نے اسے کم از کم تین ماہ کے بعد کھولنا ہے۔۔۔" وہ نانو سے کہہ رہی تھی۔ جب باسل اندر داخل ہوا۔
نانو اور وہ۔۔۔ دونوں صحن میں تخت پر بیٹھی تھیں۔ زمل کمچیاں (cimchi) بنا رہی تھی۔ یہ ڈش اس نے اپنی ایک انڈونیشین میڈ سے سیکھی تھی اور ہر بار اسے بنانے میں اسے بہت مزہ آیا تھا۔ آج وہ یہ ڈش نانو کو سکھا رہی تھی، جسے نانو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ سیکھنے کے عمل سے انہیں ایک جذباتی لگاؤ سا ہو گیا تھا۔
دونوں ہاتھ سرخ مرچوں اور دوسرے مسالوں سے لتھڑے وہ بند گوبھی کے بڑے بڑے پتوں پر مسالا لگا چکنے کے بعد اب انہیں جار کے اندر بند کر رہی تھی۔ باسل کے آنے کی دونوں کو ہی خبر نہیں ہوئی۔
"السلام علیکم نانو!"
نانو چونکیں۔ "تم آج جلدی واپس نہیں آ گئے؟" انہوں نے باسل سے پوچھا جو بدستور زمل کو دیکھ رہا تھا۔
"آج کلینک میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔" زمل نے اس بات پر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ گردن موڑ لی۔
"تم بیٹھو، میں تمہارے لیے جوس لاتی ہوں۔۔۔" نانو کہہ کر اٹھنے لگیں۔
"یہ پیام تو میں لایا تھا نا آپ کے لیے نانو۔۔۔ فرانس سے۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ یہ وہ ہی ہیں۔۔۔ زمل نے کہا کوئی اچھے سے

جار دیں تو میں نے یہ دے دیے۔۔۔ اس سے اچھے تو میری پوری دکان میں بھی نہیں ہیں۔" وہ مسکرائیں اور کچن میں چلی گئیں۔ زمل خاموشی سے کام کرنے لگی۔ لیکن اب پہلی والی پھرتی نہیں تھی۔

"وہی ڈش۔۔۔ جو تم مجھے اور نشار کو بھی اپنے گھر کھلا چکی ہو؟"

"ہاں۔۔۔" وہ گردن جھکا کے گویا ہوئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور فی الحال وہ بے سکون نہیں ہونا چاہتی تھی۔

باسل بھی تخت پر بیٹھ گیا۔ زمل کے بالوں کی ایک لٹ جار کو چھو رہی تھی۔ باسل نے اسے اپنی انگلی سے پرے کر دیا۔

"اب نانو کو کھلا کر ان کو بھی اپنا دیوانہ بنانا چاہتی ہو؟"

لفظ "بھی" پر زور تھا۔ زمل کو جیسے صرف ایک یہ ہی لفظ سمجھ میں آیا۔ اس نے باسل کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے بال پرے کر کے ہاتھ پیچھے کرنا بھول گیا تھا۔

"اوہ نانو۔۔۔!" اس نے اس کے پیچھے دیکھ کر کہا اور باسل چونک کر اٹھا۔ زمل کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک ہنستی رہی۔ باسل کو لگا یہ ہنسی آج اس کی جان لے لے گی۔

"نانو سے ڈرتے ہو؟" وہ مذاق اڑانے والے انداز سے بولی۔

"یہ ڈر نہیں احترام ہے۔"

"مجھے تو ڈر ہی لگا۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے اور پھر سے ہنسنے لگی۔ نانو جوس لے آئیں تو وہ گلاس پکڑ کر خاموشی سے پینے لگا۔

"لگتا ہے میری غیر موجودگی میں تم زمل کو خوب ہنساتے رہے ہو۔" نانو نے کہا تو زمل کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ نانو باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔ انجان نظروں سے۔ حالانکہ وہ کچن کی کھڑکی سے سب دیکھ چکی تھیں۔

"نانو! اس کے ساتھ چاول بوائل کیجیے نا۔" دونوں جار بھر کر وہ ان پر ڈھکن رکھ کر بند کرنے لگی۔

"جب کھائیں گی تو مجھے یاد ہی کریں گی۔۔۔ تین ماہ بعد میں تو ہوں گی نہیں آپ کے پاس۔۔۔"

اس نے روانی سے فقرہ پورا کیا اور بولتے وقت جیسے اس پر خود یہ اسرار کھلا کہ وہ تین ماہ بعد یہاں نہیں ہو گی۔ نانو نے ایک دم سے اس پر حاوی ہو جانے والی اس کی اداسی کو نوٹ کیا۔

"اور اگر تم پھر بھی یہاں ہوئیں تو؟" باسل براہ راست اس سے پوچھنے لگا۔ زمل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتفاق سے بھئی۔۔۔" وہ ہنسا۔۔۔ اس نے پچھلی بات کا جیسے بدلہ لیا تھا۔ مجبوراً اسے بھی ہنسنا پڑا۔۔۔ یہ لفظ وہ نہ ہی کہتا اور۔۔۔ اور پھر کچھ اور ہی کہہ دیتا۔ وہ سوچنے لگی۔

"تو اچھا ہے نا۔۔۔" اس کے بجائے نانو نے جواب دیا۔ وہ جار اٹھا کر اندر جانے لگیں تو۔ زمل بھی فوراً ان کے پیچھے لپکی۔ ہاتھ دھونے کا کہہ کر۔ باسل وہیں کھڑے کھڑے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ فضا میں تیز مسالے کی خوشبو تھی اور زمل کے ہاتھوں سے مس ہو کر نکلتی اس خوشبو میں جکڑ لینے کی صلاحیت تھی۔

باسل نے سیل فون نکال کر دکان کے کاریگر کا نمبر ملایا۔

"تیار ہو گئی؟" اس نے پوچھا۔

"جی چھوٹے صاحب!" کاریگر ملازم نے جواب دیا۔

"خوب صورت سی پیکنگ میں پیک کر دو پھر اسے۔" اس نے ہدایت دے کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

پیانو کی مدھم آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ پیانو جیسے مدھم سروں میں کوئی گیت بھی گنگنا رہا تھا۔ جس کے زیر اثر ہر چیز نے جیسے خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

وہ شہر کا مصروف اور ایک مہنگا ترین ہوٹل تھا جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا۔

زمل نے مینو کارڈ دیکھا اور آرڈر کرنے لگی۔
"سر آپ؟" زمل کے آرڈر کو لکھ کر کے ویٹر نے باسل کی طرف رخ کیا۔ تو وہ زمل کو دیکھنے سے چونکا۔
"جو کچھ میم نے منگوایا ہے۔ وہی کچھ میرے لیے بھی۔۔۔" وہ چاہتا تھا کہ ویٹر جلد سے جلد وہاں سے چلا جائے۔ اس نے اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ زمل نے نہ جانے کس طرح کی ڈش منگوائی ہوگی۔ اور جسے وہ کھا بھی سکے گا کہ نہیں۔ زمل ارد گرد کے ماحول سے خاصی مرعوب نظر آرہی تھی۔
"اس فیاضی کی وجہ جان سکتی ہوں۔۔۔ مسٹر باسل!" ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا گیا۔
"کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس خاص دنوں کو خاص اہتمام سے منانا چاہیے۔" وہ کرسی پر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا۔
"خاص دن۔۔۔" وہ ناسمجھی سے بولی۔
"آج میری سالگرہ تو نہیں۔۔۔ تو پھر تمہاری؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو باسل نے نفی میں گردن ہلا دی۔
"یشار بھائی کی؟"
"نہیں۔۔۔"
"اگر نانو کی ہے تو پھر انہیں بھی ساتھ لانا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔ باسل نے سائیڈ میں رکھا پارسل زمل کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"تمہارے لیے ہے بھئی۔۔۔ کھولو اسے۔۔۔"
"تم پہلے بھی مجھے ایک پارسل دے چکے ہو۔۔۔ جو میرے لیے زیادہ فائدہ مند نہیں تھا۔" وہ ساتھ ساتھ پارسل کا کور بھی ہٹا رہی تھی۔
"لیکن یہ ہوگا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
پیکٹ کھلا تو اندر سے پانی سے بھری ایک شیشے کی بوتل نکلی جس کے اندر نفاست سے بنی ہوئی لکڑی کی کشتی تھی۔
"اوہ گاڈ!" زمل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"یہ تو بہت خوب صورت ہے باسل!" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
"یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے تیار کروائی ہے۔"
"یہ حیران کن ہے۔"
"اسے تھوڑا غور سے دیکھو زمل۔" باسل نے خالی پلیٹ میں چمچہ گھماتے ہوئے کہا۔
"مطلب؟" وہ ناسمجھی سے باسل کو دیکھ کر دوبارہ غور سے بوتل کو دیکھنے لگی۔ وہ کشتی بوتل کے اندر انچ انچ تیر رہی تھی۔ بہت سے لمحے اسی طرح بیت گئے۔
"کچھ ملا؟" وہ بھنویں جوڑ کے پوچھنے لگا۔
کشتی کے بادبان میں سنہری دھاگے سے ول یو میری می (مجھ سے شادی کرو گی؟) لکھا ہوا تھا۔ زمل کا دل وسیع و عریض سمندر میں لہراتے بادبان کی طرح ہی پھڑپھڑایا۔ ایک تنگ خول اس نے اپنی دھڑکنوں پر چڑھتے ہوئے محسوس کیا۔
"زمل۔۔۔؟" اس نے پھر سوال کیا۔
"ہاں۔۔۔ مل گیا۔۔۔" اس نے بوتل واپس ٹیبل پر رکھ دی۔ باسل خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔
"تو پھر۔۔۔؟"
"تو پھر کیا۔۔۔؟"
"کوئی جواب نہیں دو گی؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
"اتنی جلدی۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ اتنی ہی جلدی۔۔۔"
"سوچنے کے لیے وقت نہیں دو گے؟"
"بالکل نہیں۔۔۔ ابھی۔۔۔" اس نے ضد کی۔
"زبردستی جواب چاہتے ہو۔"
"زبردستی ہی سمجھ لو۔"
"ممی میری زندگی سے لاتعلق ہیں اور ڈیڈ اللہ کے بعد میرے لیے سب سے اہم ہیں باسل۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔
لمحے بھر میں وہ واپس فرانس والی زمل بن گئی تھی۔ شہزادے کے آنسو کی منتظر۔۔۔ سالوں سے سوئی ہوئی سنو وائٹ۔۔۔

"ٹھیک ہے... پر جلدی... اور مجھے جواب ہاں میں چاہیے۔" اس نے پیار بھری دھونس جمائی تو زمل زبردستی مسکرائی۔
گھر آکر وہ ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ وہ بوتل اس کے اندر کی تحریر 'مام ڈیڈ کی کمی کا احساس... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے ساری رات کس چیز نے بے چین رکھا ہے۔

☆ ☆ ☆

دو دن بعد اس نے ممی کو کال کی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس بات کو بتانے کرنے کے لیے اسے ممی کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا اور فون کر کے جیسے وہ خود ہی پچھتائی۔
"تم Independent (آزاد) ہو زمل... اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی ہو۔" ممی نے کہا۔ "تمہیں مکمل اختیار ہے۔"
"تو کیا آپ...؟"
"ہاں... میں ضرور آؤں گی تقریب میں... کب تک ارادہ ہے تم دونوں کا شادی کا؟"
اس نے فون بند کر دیا۔ ممی سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھیں۔ وہ خود بھی پاکستانی نژاد تھیں کیا انہیں یہاں کی روایتوں اور اقدار کا علم نہیں تھا؟ چاروناچار اسے ڈیڈ کو فون کرنا پڑا۔ اور ڈیڈ کا رویہ خلاف توقع نہیں تھا۔
"کیا تم وہاں یہ کام کرنے گئی تھیں... یہ تھا تمہارا این جی او ورک؟" وہ طنز سے بولے۔
اسے عجیب نہیں لگا۔ ڈیڈ سے اسی بات کی امید تھی۔ وہ قدامت پسند نہیں تھے۔ زمل اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی ایسی بات پر انہیں زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن انہیں اپنا غصہ کسی نہ کسی طرح تو نکالنا ہی ہوتا تھا۔
"بولو... جواب دو... تمہیں بھی اپنی ماں کی طرح خوب دھوکا دینا آتا ہے۔ وہ بھی..."
"میں اسے پسند کرتی ہوں۔" اس نے انہیں بیچ میں ہی ٹوکا۔ وہ بھی خاموش ہو گئے۔
"واپس آجاؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔"
"بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں... میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"
"پھر مجھے فون کیوں کیا ہے؟"
"اطلاع دینے کے لیے..."
"دے دی...؟"
"فون بند مت کیجئے گا ڈیڈی!" وہ روہانسی آواز میں چلائی۔ زیان عالم خاموش ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح ان کے غصے کو زمل کے آنسو ہی تو در کار تھے۔
"ٹھیک ہے... اگر وہ فرانس سیٹل ہونے پر راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... ورنہ تمہاری مرضی۔"
"میں اس سے پوچھ لوں گی۔"
"تم واپس کب آرہی ہو۔"
"بہت جلد..." اس نے دھیرے سے کہا۔ جیسے اسے خود بتا نہ ہو کہ اس کا واپس جانے کا ارادہ آخر کب تک ہے۔

☆ ☆ ☆

صنوبر اور دیودار کے درختوں سے ڈھکے پہاڑ اور ان میں گھرا وہ ریسٹ ہاؤس جنت کے کسی ٹکڑے سے کم نہیں تھا۔ ہوا میں تازگی تھی اور خوشبو ساتھ قریب ہی کہیں گرتے جھرنے کا شور بھی۔ وہ باہر ٹیرس پر نکل آئی۔ زیان نیچے کھڑا تھا۔ ابھی وہ اوپر نہیں آیا تھا۔ لمبے سفر نے شاید اس پر تھکن کے اثرات نہیں ڈالے تھے۔ نگار اسے دیکھنے لگی۔
بلیک جینز پر سفید ٹی شرٹ اس پر بلیک جیکٹ۔ بلاشبہ وہ اس سارے ماحول سے بڑھ کر خوب صورت تھا۔ وہ ملازم کو کچھ ہدایت دے رہا تھا۔ الفاظ نگار کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ وہ ان الفاظ پر دھیان دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسے زارا کی مہندی کی رات کہی ہوئی بات یاد آئی۔
"یونیورسٹی کی ساری بدمزگی کو نئے گھر مت لے کر

جانا نگار!"

ایسی باتوں کی تھوڑی تھوڑی قائل ہوتی وہ اب مکمل قائل ہو چکی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے زیان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ ہاتھ کتنی ہی دیر تک اس کے ہاتھ میں رہا تھا۔ دل تک جانے والا سارا خون نگار کے ہاتھ میں سمٹ آیا تھا۔

"ایک دل تمہارے ہاتھ میں دھڑک رہا ہے نگار! معلوم کرو، یہ تمہارا ہے یا میرا؟" اس نے پوچھا۔

نگار نے اپنا ہونٹ دانت تلے دبا لیا اور بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس لمحے زیان کو دیکھنا کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔ ٹیرس پر کھڑے ہو کر اتنی دور سے اسے دیکھنا بھی معرکہ ہی تھا۔

زیان نے سر اوپر کر کے اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔ نگار نے یک لخت نگاہوں کا رخ بدلا، لیکن مسکراہٹ کا رخ نہ بدلا جاسکا۔ دور پہاڑوں سے صدا بلند ہوئی اور نگار نے یہ جاننے کے لیے کہ ایسی صدا کا 'صداکار' کون ہوسکتا ہے، سر اٹھا کر دیکھنا چاہا۔ صدا کوک رہی تھی۔ مسکراہٹ نگار کے چہرے سے نچڑ گئی۔ سوکھی گھاس کی طرح وہ لو میں جلنے لگی۔

ملازم سے باتیں کرتے زیان نے اسے پھر ترچھی نظروں سے دیکھا تو وہ پھر سے اپنی مسکراہٹ کو کھلکھلاہٹ میں بدلنے سے روک نہ سکی۔

اب زیان کو اسے دیکھنے کے بہانے چاہیے تھے اور اسے مسکرانے کے.... زندگی میں اس سے زیادہ کیا چاہا جاسکتا ہے....؟

سوٹ کیس کھول کر اس نے رات کے لیے سرخ سوٹ منتخب کیا۔ شاور لے کر، بالوں کو سکھا کر میک اپ شروع کیا۔ زیان اس دوران اندر آیا۔ اس نے آئینے میں اس کی نگاہوں کو خود پر مرکوز پایا اور اس کے گال سرخی سے دمک اٹھے۔ زیان کی آنکھوں میں شوخی اور دلچسپی تھی، وہ شرما سی گئی۔ زیان کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب وہ کھلے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی تب پھر سے پہاڑوں سے صدا بلند ہوئی۔ وہ حیران تھی۔ کوئی کتنا مستقل مزاج ہے جو صدا دیے جا رہا ہے۔ وہ بھی ایسی صدائیں جن کی ہیبت پہاڑوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ ایسی پکار جو الفاظ سے تو مبرا تھی، لیکن پرسوز تھی۔

زیان کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ اسے بھوک لگنے لگی۔ دراصل وہ زیان سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باہر باغ میں ٹہلنا چاہتی تھی۔ جھرنے تک جانا چاہتی تھی اور پہاڑوں کی بلندی کو اس کے ساتھ سر اٹھا کر دیکھنا چاہتی تھی۔

جس وقت وہ ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلی، ریسٹ ہاؤس کا ملازم جس سے زیان باتیں کر رہا تھا۔ لالٹین ہاتھ میں لیے تیز تیز قدم اٹھاتا ریسٹ ہاؤس سے باہر جاتا ہوا نظر آیا۔

"پہاڑوں سے ایسی صدائیں کیا ہمیشہ ہی گونجتی رہتی ہیں؟" نگار نے مسکرا کر ملازم سے پوچھا۔ ملازم نے اچنبھے سے نگار کو دیکھا۔

"جو لوگ پہاڑوں میں نہیں رہتے، انہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ ان کے استقبال میں پہاڑ ان ہی کے ناموں کی صدائیں بلند کریں گے۔" نگار نے ایسے بے ساختہ جواب پر قہقہہ لگایا۔

"میرے پروفیسر کہتے ہیں کہ پہاڑ کان رکھتے ہیں اور زبان بھی۔ اور کچھ ایسے راز بھی جو ان پر پہلے سے ہی آشکار ہو چکے ہوتے ہیں۔"

"پہاڑ بے بسی بھی رکھتے ہیں.... انہوں نے یہ نہیں بتایا۔" نگار ایسے گہرے جواب سے لاجواب ہو گئی۔

"پہاڑ بے بس کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو دھڑام سے کسی پر بھی گر سکتا ہے۔ کسی کو بھی گرا سکتا ہے۔"

"جو کام انسان کر رہے ہیں، وہ پہاڑوں کو کرنے کی کیا ضرورت ہے...."

یہ کہہ کر ملازم جلدی سے گیٹ کے پار چلا گیا۔ نگار کو اس سے پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ زیان کو کہیں دیکھا ہے اس نے۔ وہ خود ہی باغ اور درختوں کے درمیان گھومتی رہی۔ کئی بار اس نے مبہوت ہو کر ان بلندیوں کو دیکھا جن پر پہاڑ قائم تھے۔

"انسان کو بلند ہونے کے لیے اونچائی کی ضرورت نہیں ہوتی نگار! وہ اپنے کردار سے بلند ہوتا ہے۔ جس انسان کو کردار کی بلندی نصیب نہ ہو اسے بدکرداری کی پستی ہی ملتی ہے۔" اسے پروفیسر کی بات یاد آئی۔

وسیع ریسٹ ہاؤس میں گھومتے' وہ دور باغ میں بنے گارڈن ہاؤس کی سمت دیکھنے لگی۔ گارڈن ہاؤس کچھ زیادہ ہی روشن تھا۔ اس کی گولائی میں تنی ہوئی اطرافی شیشے کی دیواریں ارتعاش کا شکار نظر آ رہی تھیں۔ ان کی پشت پر موجود پہاڑ ان کے اوپر گرتا ہوا سا لگتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت گارڈن ہاؤس تھا۔ جس کے شفاف شیشے اندر جگمگاتے ایک بڑے فانوس کے وجود کی نشاندہی کر رہے تھے۔ پھر بھی ایسے لگتا تھا اندھیرے غاروں سے چمگادڑیں پھڑپھڑاتی ہوئی ان شیشوں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

جس وقت وہ اس گارڈن ہاؤس کی طرف بڑھی۔ پہاڑوں کی بلندی اسے گھستی ہوئی لگی۔ پھر وہی پہاڑ اسے گارڈن ہاؤس پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے اور ٹھیک اس وقت ایک پتھر لڑھکتا دور بلندی سے نیچے آ گرا۔ نگار ڈر کر بدک سی گئی اور پلٹ کر پتھر کو دیکھنے لگی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پتھر ایسے بھی آ گرتے ہیں۔ اس نے ایک خائف نظر پتھر پر ڈالی۔

پتھر پر جالا سا لپٹا تھا... مکڑی کا جالا...

نگار کے مہندی لگے ہاتھوں نے جیسے ہی گارڈن ہاؤس کا لکڑی کے فریم کا شیشے کا دروازہ دھکیلا... صحرا کی کوک نخلستان کی طرف بڑھنے لگی۔

اندر زیان عالم بیٹھا تھا۔

"تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی میں زیان!" اس نے کہا ہی تھا کہ اس کی نظر ٹھٹک گئی۔ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا... مشروبات کی موجودگی بھی ایسی دل شکن نہیں تھی... لیکن سدیم اور ریشب کی موجودگی...؟؟ وہ حیران ہوئی اور واپسی کے لیے پلٹی۔

"کہاں جا رہی ہو نگار؟" زیان نے اسے پکارا۔ وہ رک گئی۔

"ادھر آؤ... بیٹھو۔" زیان نے اپنے قریب صوفے کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر اسے اپنی طرف آنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پیوؤ گی...؟" وہ جام اس کی طرف کیے پوچھنے لگا۔

نگار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھبرا کیوں رہی ہو... تم تو ویسے بھی بہت بے باک ہو۔" زیان نے پہلے گردن موڑ کر اسے غور سے دیکھا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا انداز اسے یونیورسٹی والے زیان کی یاد دلانے لگا۔

اچانک ہی نگار نے جان لیا کہ وہ صداکار کون ہے... وہ تو وہ خود ہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے نگار... مجھے تم سے کب محبت ہوئی تھی؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ جیسے صرف ایک سانس تھا جو اسے مستعار دیا گیا تھا' باقی سب ہی سانس اس کے حلق سے کھینچ لیے گئے۔

"نہیں... سائنس بلاک کے باہر نہیں... جس دن ہال میں تم نے میرا مذاق اڑایا تھا اس دن..." وہ انگلی سے اس کے بالوں کی ایک لٹ پکڑ کر اسی انگلی کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بتا رہا تھا۔

"اب یہ باتیں کیوں کر رہے ہو زیان؟" اس نے پوچھا' لیکن زیان اپنی ہی ترنگ میں بولتا گیا۔

"وہ ساری تقریر اور تمہارا طنز... نہیں طنز نہیں... گالی... اس چیز کا ریکارڈ میرے پاس موجود ہے... میں نے اب تک نجانے کتنی ہی بار سنا ہے... تم سنو گی... پھر سے..."

اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ اٹھا اور اس نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ بک فیشو کا اجرا یونین کے ہاتھوں میں ہو تاکہ اس کے منافع کو طلبہ کی بہبود پر لگایا جا سکے... اور وہ چاہتے ہیں کہ اینٹ پلستر سے کلاسز کے درمیان میں دیواریں کھڑی کی جائیں تاکہ لڑکے لڑکیاں الگ الگ بیٹھ سکیں۔" زیان کی آواز تھمی اور ہال کے قہقہوں کی آواز ہر سو چھا گئی۔

"زیان! میں اس بات کی معذرت کرنے تمہارے پاس آہی رہی تھی۔" زمین سے نظریں ہٹا کر اس نے زیان سے کہا۔ سدیم اور یشب آپس میں نظروں کا تبادلہ کرتے ہوئے ذو معنی انداز میں مسکرائے۔

"معذرت۔" وہ چلایا۔۔۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ گالی کی معذرت بھی گالی ہی ہوتی ہے۔ کس کس بات کی معذرت کروگی تم نگار۔۔۔ میرا مذاق اڑانے کی۔۔۔ مجھے گالی دینے کی یا میرا چہرہ جلانے کی۔"

"اور ان دین کے ٹھیکے داروں کا موقف ہے کہ بینچ پر کوئی لڑکا لڑکی اکٹھے نہ بیٹھ سکیں۔۔۔ کوئی بیٹھا مل جائے تو اس سے چارج کیا جائے۔۔۔ زدوکوب کیا جائے۔ سزا دی جائے۔ سب کے سامنے ذلیل کیا جائے۔"

"بند کرو اسے زیان۔" وہ اٹھ کر آگے بڑھی اور زیان نے اپنے مضبوط ہاتھ کے پنجے سے اسے گردن سے دبوچ لیا۔

"شش۔۔۔!" زیان بولا۔ اور وہ اس کے اس "شش" کہنے کی دہشت سے ڈر گئی۔

"خاموشی سے سنو۔"

"دین کا نام لے کر ورغلانے والوں کو مات دینی ہے اور اس یونیورسٹی کے خراب ماحول کو درست کرنا ہے۔" تالیاں گونجیں اور پھر ایک نسوانی قہقہے نے اسپیکر سے نکل کر کمرے کی فضا کو جامد کردیا۔ وہ نسوانی قہقہہ نگار کا تھا۔ نگار بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔

"زیان۔۔۔! یہ کیا پاگل پن ہے۔" وہ اس کی گرفت میں مچلی۔

"غور سے سنو۔۔۔ اس دن تمہیں جواب نہیں دے سکا تھا، لیکن اس بات کا جواب آج دوں گا۔"

"تمہیں معلوم ہے سب درست کرنے کا کیا مطلب ہے؟"

"ہاں۔۔۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"اگر سب معلوم ہے تو اس درستی کی ابتدا تم اپنے گھر سے کیوں نہیں کرتے۔ اپنی ماں سے۔۔۔ بولو۔"

"تمہیں جواب چاہیے نا۔" وہ شیطانی مسکراہٹ سجائے پوچھنے لگا۔ نگار کی ایک سانس کی مدت تمام ہوئی۔ وہ یک ٹک زیان کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں جواب چاہیے نگار؟" وہ اتنی قوت سے چلایا، جتنی قوت سے وہ اس کا حلق دبوچے کھڑا تھا۔ آنکھوں سے اس نے کیسٹ پلیئر کی طرف اشارہ کیا۔ پلیئر سے آواز نکلی تھی۔

"میں زیان عالم۔۔۔ اپنے مکمل ہوش و حواس میں نگار کو طلاق دیتا ہوں۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔"

اجلی صبح کا چراغ غلاظت کی سیاہی کی تاب نہ لاسکا اور بجھ گیا۔

زیان کی آواز صور اسرافیل کی ہمراہی میں بلند ہوئی اور کمرے کے در و دیوار سمیت پہاڑوں، درختوں اور چرند پرند کو بھی دہلا گئی۔ نگار پھٹی پھٹی آنکھوں سے زیان کو دیکھنے لگی۔ اس کے عین پیروں کے نیچے کی زمین کی ساتوں تہوں میں شدید زلزلہ آیا تھا۔ اور اس زلزلے میں کیسی کیسی تباہ کاریاں مقید تھیں، وہ جانتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سعدیہ اظفر

خود غرض

"امی! آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ آپ خواب نہیں آنکھیں نوچ رہی ہیں میری۔۔۔ کیوں مجھے اندھا کرنا چاہتی ہیں؟ آپ کیسے۔۔۔؟"

ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آنکھوں میں جمع ہوتے پانی نے اپنا راستہ بنا لیا۔ شفاف قطرے گر گر کے اپنی اہمیت کھونے لگے۔ آنسوؤں کا اصل مقام آنکھیں ہوتی ہیں جو انہیں سنبھالے رکھتی ہیں اور ایک دن اپنی بے قدری پر انہیں سزا کے طور پر باہر نکال دیتی ہیں اور زمین اپنے فراخ سینے میں ان قطروں کو جذب کر لیتی ہے۔

"ہم تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کر رہے' وہ واقعی۔۔۔" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
اس نے بات کاٹ کر گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

"آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا دبا رہی ہیں۔ آپ کو پتا ہے مجھے سانس نہیں آ رہی یا پھر شاید آ رہی ہو' لیکن مجھے محسوس نہیں ہو رہی۔ مجھے اندر ہی اندر کوئی چیز کاٹ رہی ہے۔ بچھو کے کاٹے سا درد اٹھتا ہے۔ امی اور پھر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ مر جائے گا امی' وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔"

وہ بیڈ پر بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ یہ رونا عام رونا تو نہیں تھا۔ یہ آنسو تو وہ آنسو تھے جو کسی اپنے کی موت پر بہائے جاتے ہیں۔

"وہ مر جائے گا اونہہ۔۔۔" انہوں نے نفرت سے اس کی بات دہرائی تھی۔

"یہ خوش فہمی بھی تمہاری جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اس جیسے کمینے مار تو سکتے ہیں' لیکن مرتے نہیں' بہت ڈھیل دیتا ہے اللہ انہیں۔"

اب کی دفعہ وہ غصے سے بولی تھیں یا پھر اپنی بے بسی کو غصے کے پردے میں چھپانا چاہا تھا۔ لیکن یہ وہ بے بسی تھی جو چھپتی نہیں تھی۔ اک اک ادا سے مترشح تھی۔

ان کی بات سن کے وہ جو بے آواز رو رہی تھی۔ اونچی آواز میں رونے لگی۔ کچھ غم اگر شخصیت کو گہرائی بخشتے ہیں تو کچھ دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پرتیں اتار دیتے ہیں۔

وہ سنجیدہ و تعلیم یافتہ لڑکی اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اگر بولنے کی طاقت ہوتی تو وہ انہیں ایسا بولنے سے منع کر دیتی۔ لیکن اب جذبات نے زبان کے آگے جال بچھا دیا تھا اور زبان اس جال میں الجھ الجھ جاتی تھی۔

"امی! ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ وہ سب جھوٹ کہہ رہے ہوں۔"

"کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی مجھے۔ تین دفعہ استخارہ کر چکی ہوں۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہیں؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمیں پہلے پتا چل گیا۔"

بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ آنسو ضبط کرتی کمرے سے نکل گئیں۔

"ایک دن یہ خود سمجھ جائے گی۔ اب تو یہ سمجھنا نہیں چاہ رہی۔ وقت سب سمجھا دے گا کہ ہمارا فیصلہ اس کے حق میں کتنا اچھا تھا۔" انہوں نے یہ سوچ کر دل بہلانا چاہا۔

وہ غلط سوچ رہی تھیں۔ ارم علی کی آنکھوں میں دھند نہیں تھی جو غائب ہو جاتی ہے۔ وہ گرد تھی جو بیٹھ جاتی ہے۔ بار بار اٹھنے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"یار! میں تو اس مصنف سے بہت متاثر ہوئی

ہوں۔ کیسے اپنی ساری خوبیاں اور خامیاں بلکہ خامیاں ہی خامیاں لوگوں کے سامنے ڈھیر کردی ہیں۔ کسی کسی کے دل جگرے کا کام ہے یہ.....“

وہ کتاب جس سے ارم پانچ دنوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ آج ختم ہوگئی تھی۔ اب مہینہ بھر اس پر تبصرہ جاری رہنا تھا۔

”خیر میں تو متاثر نہیں ہوئی۔ جن عیبوں پر اللہ پردہ ڈال دے۔ انہیں بندہ افشا کیوں کرے۔ ویسے بھی انسان کو اپنی اچھائیاں ہی بیان کرنی چاہئیں۔ برائیاں تو دوسرے خود سے گھڑ لیتے ہیں۔“

اس کی کزن سدرہ کو تو اس کی ہر بات سے اختلاف ہوتا تھا۔

”سدرہ کو کالے کوؤں میں سفید کوا بن کے تکو بننے کا شوق جو ہوا۔“ ارم نے جل کر سوچا تھا۔

موبائل کی بجتی گھنٹی نے سوچ کو بریک لگائی۔

”کیا کررہی ہو؟“ معطر ظفر بات کا آغاز اس سوال ہی سے کرتا تھا۔ اپنی خیریت وہ پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیتی تھی۔

”تمہیں پتا تو ہے۔“ جواب بھی ہمیشہ والا تھا۔ مبہم... ارم علی نے مبہم جواب ہی دینے ہوتے تھے۔ زیادہ واضح چیزیں بھی تو چبھنے لگتی ہیں۔

”اور بھی کام ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔“ جواب پرانا تھا، لیکن جواب کے بعد کی خاموشی نئی تھی۔

معطر خاموش ہوا تھا اور پھر خاموش ہی رہا۔ اتنا کہ ارم علی کے دل کو وسوسہ بخش گیا۔

”کیا ہوا؟“ اندر جڑ پکڑتے اندیشے سے گھبرا کر وہ بولی تھی۔ بچپن کی منگیتر تھی وہ اس کی۔ بہت جلد اسے پہچان جانے والی۔

”کچھ نہیں، پریشان ہوں بس.....“

وہ پریشان تھا اور اس سے زیادہ پریشانی والی بات ارم علی کے لیے کوئی نہیں تھی۔ معطر کو تو ہر بات ہلکا لینے کی عادت تھی۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ویسے ہی دل گھبرا

رہا ہے آج کل۔ دل پہ دباؤ سا محسوس ہو رہا ہے مجھے۔" اس سے پہلے کہ وہ منگیتر سے ڈاکٹر بنتی' وہ بولا تھا اور لہجہ ایسا تھا کہ وہ چونکی تھی۔

"پتا ہے کل رات کیا ہوا؟" یوں لگا جیسے کوئی میرا گلا دبا رہا ہے اور جب میں جاگا تو میں نے ایک سائے کو خود سے دور ہٹتا محسوس کیا۔

"مجھے لگتا ہے تم کسی چیز کی ٹینشن لے رہے ہو' اتنی ٹینشن کہ تم اضطراری عارضہ (Panic Disorder) کا شکار ہو رہے ہو۔" ارم علی کی اندر کی سائیکالوجسٹ پوری طرح بے دار ہو چکی تھی۔

"کوئی ٹینشن نہیں ہے مجھے۔ ویسے ہی ہوا ہو گا۔ امی آئیں گی کل تمہاری طرف...." اس نے بات پلٹ دی تھی۔

"پھپھو آئیں گی گڈ!" وہ مسکرائی تھی۔

"نہیں بتاؤں گی میں نے ان دو ماہ میں کیا کیا پڑھا۔ وہی تو ہیں جو میری باتیں توجہ سے سنتی ہیں۔" لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

"کتابوں کی دیوانی لڑکی۔ تم مجھ سے بھی شیئر کر سکتی ہو کہ تم نے کیا کیا پڑھا۔"

اس کا دل اس سے لمبی بات کرنے کو چاہ رہا تھا۔ ارم نے سوچا اور سوچ سمجھ کے کہنے لگی۔

"ایک سائیکاٹرسٹ سے پوچھا گیا' اگر آپ کو پتا چلے کہ ایک انسان جو ایک لمحے نارمل لگے' اگلے لمحے اتنا ڈپریسڈ ہوئے کہ خودکشی کرنے کی کوشش کرے آپ اسے کیا مشورہ دیں گے؟"

سائیکاٹرسٹ نے کہا۔ "میں اسے کہوں گا کہ وہ کسی ضرورت مند انسان کو ڈھونڈے اور اس کی مدد کرے۔ روح کو ہم جو کچھ دیتے ہیں' وہ جسم کو لوٹا دیتی ہے۔ روح کو غذا فراہم کرنا جسمانی صحت کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"اچھا! سائیکالوجسٹ صاحبہ باقی سیشن بعد میں۔ اس وقت دل چاہ رہا ہے دل کی بات کی جائے۔"

"وائے ناٹ!" ارم مسکرائی تھی اور موبائل جا کے ماں کو پکڑا دیا۔ "جتنی مرضی باتیں کرو۔"

☆ ☆ ☆

سورج کا چہرہ ضبط کی ڈھیروں سرخی سمیٹ لایا تھا۔ شام کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس کی راجدھانی پر قبضہ کرتی۔

ایسے میں نائلہ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی کسی جوڑ توڑ میں مصروف دروازے کی طرف متوجہ ہوئی۔ جہاں سے مولوی صاحب کی بیوی تشریف لا رہی تھیں۔

وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مذہبی لوگوں سے ہم سب کہیں نہ کہیں ضرور متاثر ہوتے ہیں وہ بھی تھی۔

"میں نے سنا ہے کل وہ لوگ ارم کی شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہے ہیں۔"

چھوٹا سا گاؤں تھا اور کمرے سے کمرہ ٹکائے مکانات' زور سے سانس لینے کی آواز ساتھ والے گھر میں سنائی دیتی تھی۔ یہ تو پھر بڑی بات تھی۔

"جی! کل ارم کی پھوپھو آ رہی ہیں۔" انہوں نے کہا اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔

سوچیں بھی ضدی بچے کی طرح ہوتی ہیں' سلانا چاہتے ہیں تو اور زیادہ جاگتی ہیں۔

وہ خود اس رشتے سے خوش نہ تھیں۔ وہ ارم کا رشتہ اپنے بھائی کی طرف کرنا چاہتی تھی۔ ایک ہی تو بھائی تھا ان کا اور کتنا امیر تھا ادھر معطر دو سال بعد گھر کا ایک چکر لگاتا تھا اور آمدنی پھر بھی زیادہ نہ تھی۔

"استخارہ کیا؟" نائلہ چونکیں۔

"اتنے سال ہو گئے لڑکا بیرون ملک ہے۔ پتا نہیں کیا' کیا گل کھلائے ہوں گے۔ استخارہ کر لیتیں تو اچھا تھا۔ اس طرح کے کاموں میں اللہ سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ معلوم نہیں کب پاؤں کے نیچے زمین کے بجائے کھائی آ جائے اور انسان دھڑام سے اس میں جا گرے۔"

چند باتوں کے بعد وہ چلی گئیں۔ لیکن دماغ میں ایک خیال بھی ابھار گئیں اور سوچ کے پانی سے خیال راسخ

ہو رہا تھا۔

"اندیشے بھی بند باندھے پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ ذرا سی راہ دے دی جائے تو بہتے چلے جاتے ہیں' اتنا کہ ڈبو دیتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

اگلا دن روشن تھا اور اتنا زیادہ روشن تھا کہ آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

سورج غضب کی آگ سمیٹ لایا تھا۔ یہ آگ ایک مرکز پر جمع ہوگئی تھی اور یہ مرکز نائلہ جاوید کا گھر تھا۔ انہوں نے استخارہ کیا اور رشتے سے انکار کر دیا تھا۔

"پہلے تو آپ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اب کیا ہوا ہے؟ آپ کو معلوم بھی ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پھر کیوں یہ ظلم کر رہی ہیں آپ؟"

معطر کی ماں چیخی۔ چنگھاڑی۔ گرجی بھی اور پھر برستے ہوئے رخصت ہوگئی۔

نائلہ کا ایک ہی جواب تھا کہ.....

"ہم نے استخارہ کیا ہے۔ ضرور معطر نے ادھر شادی کر رکھی ہے۔"

ان کے جانے کے بعد نائلہ کی نظریں ارم علی پر گئی تھیں۔ چہرے پر کسی نے آٹا پھینک دیا تھا۔ اندر شاید تیزاب کی سی جلن تھی۔

نائلہ بھاگ کر اس کے پاس گئیں اور اس بت بے جان میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن
میں اسے نہیں بچا سکی
اک شام بہت چپکے سے
تمہاری محبوبہ مجھ میں دم توڑ گئی

☆ ☆ ☆

فلک پر بادلوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ آگ کا گولہ غصے سے سیاہ پڑ گیا تھا۔

آسمان پر چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ بالکل اس کے ذہن کی طرح جس میں خیالات کا جم غفیر تھا اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

آنگن میں پڑی چارپائی پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ آنگن میں کوئی درخت نہیں تھا۔ زمین میں کوئی مسئلہ تھا۔ ذرا درخت بڑھتا اور پھر سوکھ جاتا۔

"کیا آسمان کا دم بھی گھٹتا ہوگا اتنے بادلوں سے....؟"

عجیب سوچ تھی جو اس کے ذہن میں آئی تھی اور جو خالی جگہ تھی' وہ بھی پر ہوگئی۔ پر خالی پن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

"یہ جو کتابیں ہوتی ہیں نا! یہ دوسروں کے دکھوں پر رونا اور اپنے دکھوں پر ہنسنا سکھا دیتی ہیں۔"

یہ بات اس نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے کرتے کہی تھی۔ مگر اب اسے لگ رہا تھا دکھ جو اپنی ذات پر ہوتا ہے اگر وہ دکھ محبت کا ہو تو وہ آسمان سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ انسان کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے اور انسان کے اندر کو کسی آسیب زدہ مکان کی طرح کر دیتا ہے' جو کسی اور کو اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتا۔ دکھ تو جیون ساتھی ہوتے ہیں۔ مرتے دم تک ساتھ نبھاتے ہیں۔ یہ دوست بہت باکمال ہوتے ہیں۔ کاٹتے ہیں تو بھی اندر سے' مارتے ہیں تو بھی اندر سے.....

"موسم کتنا پیارا ہے! وہ کیا کر رہا ہوگا؟"

ارم نے سوچ کو وسعت دی۔ اتنی کہ وہ شعور میں اندھی ہوگئی۔ سوچتے ہوئے کب نظر آتا ہے۔ ہاں تحت الشعور آنکھوں کے سامنے عیاں ہوتا ہے۔

آج کل اس کا دل بہت تنگ ہوگیا تھا۔ اس کی یاد کے سوا اس میں کوئی چیز نہیں سماتی تھی۔

"بیٹا! تم یہاں لیٹی ہو۔ اندر چلو.... بارش آنے والی ہے۔ سارے کپڑے بھیگ جائیں گے۔"

نائلہ کی بات ختم ہوتے ہی بارش کی بوندیں اس کے چہرے پر گری تھیں' وہ ہوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئی' جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔

"آج جمعرات ہے نا' لو! اب یہ جھڑی سات دن تک جاری رہے گی۔"

گاؤں میں لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اگر جمعرات' جمعہ کو بارش آجائے تو پھر سات دن تک جھڑی لگی

رہتی ہے۔
وہ خاموشی سے برآمدے میں جا بیٹھی اور نظریں اس سوکھے ہوئے درخت پر جمادیں، جو بے نیازی سے کھڑا تھا اور بارش کی بوندیں نچھاور ہو ہو کر اس کے پاؤں چوم رہی تھیں۔
اگر ہوا کا جھونکا آتا تو وہ جڑ سے اکھڑ جاتا، لیکن بارش اسے مضبوط کر رہی تھی۔ غم بھی بارش ہی سے مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ بارش جو باہر نہ برسے تو اندر برستی رہتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"معطر ظفر واپس آگیا تھا۔" ہمیشہ کی طرح پورے دو سال بعد چار دن کے لیے.....
وہ بھی چیخا تھا، رویا تھا اس نے بھی مرجانا چاہا تھا۔
اس چھوٹے سے گھر کے اک اک کونے میں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کارڈز آویزاں تھے۔ ان سب کو اکھیڑا تھا۔ تصویریں، بریسلیٹ، ربڑ بینڈز وہ ایک ایک چیز کو اکٹھا کر رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔
"وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کرسکتی ہے؟ اس نے اپنی ماں سے کچھ نہیں کہا۔
اس نے بات مان لی ان کی۔ میں جو اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے میرے بارے میں سوچا تک نہیں۔"
اب وہ اس ڈھیر کو جو مجموعہ درد تھا اس کے لیے، کو آگ لگا رہا تھا۔
ماچس گیلی تھی یا پھر ہاتھوں میں کپکپاہٹ آگئی تھی۔ ہاتھ پھسل پھسل جا رہا تھا۔
یادیں جل رہی تھیں، خوش گوار لمحے آگ کی نظر ہو رہے تھے۔ وہ ہنس رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے منہ میں چلی گئی۔ معطر ظفر نے آنکھوں کو چھلکنے سے روکا۔ وہ آنسو اس آگ پر پانی کا نہیں تیل کا کام کرتے۔

میرے دل نے تمہاری یادوں کی۔۔۔
اک قبر بنا کر اس پہ چادر چڑھا ڈالی
کہ اب سال کے سال
مجھے اک کام کرنا ہے
تمہاری یادوں پر چڑھائی گئی
اس چادر کو بدلنا ہے
سوچنے پر پابندی نہیں، لیکن اکثر عمل پر دل پابندی لگا دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"محبت خود غرضوں کا کھیل ہے۔ اس میں وہی جیتتے ہیں جو خود غرض ہوتے ہیں۔"
"وہ چلا گیا۔" ارم علی نے سنا تو دل میں تو طغیانی آئی لیکن آنکھوں کے سمندر خشک رہے۔ دل کو تو ہمیشہ لیے نذر سیلاب کر دیا تھا اس نے۔ دل نے تو ہمیشہ یادوں میں ڈوبتے ابھرتے دھڑکنا تھا۔ اس کے دل نے تو بوڑھوں کا سا ہنر سیکھ لیا تھا۔ ماضی کو حال بنا کے اس نے اس حال میں جینا تھا اور یہ کام ارم علی نے نہایت مہارت سے سرانجام دینا تھا۔
معطر نے اسے فون کیے تھے، لیکن اس نے نہیں سنے تھے۔ اسے یقین تھا اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔
"اس کی ماں کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ مائیں تو ویسے ہی بہت جلد وہموں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ استخارے میں بھی شاید کوئی واہمہ ہی آنکھوں کے سامنے آگیا ہو۔ واہمے جب دل پر قبضہ جما کر آنکھوں میں بسیرا کرلیں تو وہ بہت جلد یقین میں بدل جاتے ہیں اور غلط یقین انسان کو ڈبو دیتے ہیں۔"
سو دلیلیں تھیں جو معطر کے حق میں تھیں۔ لاکھوں گمان تھے جو اسے سچا ثابت کرتے تھے۔
اگلے ماہ اس کے ماموں کے بیٹے سے اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔
اس کے دل کو تو ایک ہی واقعہ سے سر پھوڑنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ یہ بھلا اسے خوش رہنے دیتا۔ انسان خوش رہ بھی کتنا سکتا ہے۔ انسان کا خوش رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سانپ کا ڈسے بغیر گزرنا۔ کچھ چیزیں فطرت سے مجبور ہوتی ہیں اور کچھ فطرت کی طرف سے ہوتی ہیں۔

جو مقدر پر راضی نہیں ہوتے' وہ ایسی ہی زندگی گزارتے ہیں ارم علی جیسی۔ یوں ہی روتے دھوتے' یوں ہی شکوے شکایات لیے۔ دوسروں کی پریشانیوں سے لاپروا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسروں کی پریشانی کی وجہ ان کے ہی غم ہیں۔ یہ ہی لوگ ہوتے ہیں جو خودغرض ہوتے ہیں۔

ارم علی کی سوچ ایک دائرے میں مقید تھی اور خودغرضوں کی سوچ ہمیشہ ایک ہی محور کے گرد چکراتی رہتی ہے۔

غم کی چادر جو ہوتی ہے نا! یہ لوہے کی ہوتی ہے۔ رات کی سی۔ جو اسے اوڑھ لیتے ہیں' وہ اسی میں محصور ہوجاتے ہیں۔ اس کے پار دیکھنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اسی لیے اسی کے بیچ گھٹے گھٹے سانس لیتے رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

دلوں کی ویرانی گھر میں بسیرا کرنے لگی تھی۔

اب کے بھی وہی ہوا تھا۔ پودا تھوڑا سا بڑا ہوا اور پھر سوکھنے لگا۔ نائلہ کی تشویش زدہ نگاہیں اس پر تھیں اور سوچ پودے سے ہوتی ارم تک جا پہنچی۔ اس گھر کی اکلوتی بیٹی بھی سوکھتی جارہی تھی۔

زندگی کو بے زار' بے زار دیکھ کر موت قریب آنے لگی تھی۔

نائلہ نے ایک فیصلہ کرکے قریب پڑا موبائل اٹھالیا۔ ان کا معطر ظفر سے بات کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ ارم کی شادی کے پورے دو سال بعد وہ واپس آیا تھا۔

"مجھے بات کرنا ہی ہوگی؟" ان کی بڑبڑاہٹ صحن میں لگے سوکھے درخت سے جالپٹی تھی۔

انہیں پتا تھا' وہ بڑی مشکل سے مانے گا۔ ان کے گھر' ان کی بات سننے کے لیے آنا' بہت مشکل امر تھا اس کے لیے۔

انہوں نے مشکل کام ہی تو کیے تھے۔ اسے بھی راضی کرلیا تھا۔ بڑی منتوں کے بعد وہ ان کے گھر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر جھکائے خاموش۔۔۔۔

"کتنا اچھا تھا یہ لڑکا۔۔۔ مگر میں نے اپنی بیٹی کو غرض کی بھینٹ چڑھادیا۔"

"کیا تم مجھے معاف کرسکتے ہو؟" وہ سر اٹھا کر نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا سب سے۔۔۔ مجھے استخارے میں کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ میرا ایک ہی تو بھائی ہے میں اس سے رشتہ مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ ایک مضبوط تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ بھائی اپنے بچوں میں لگ کر مجھے بھولنے لگا تھا۔ مجھے یہ ہی راستہ سجھائی دیا۔

عورت کسی بھی عمر کو پہنچ جائے' وہ اپنے بھائیوں سے اتنی ہی شدید محبت کرتی ہے جتنی ایک ماں اپنی اولاد سے۔" نائلہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ ساکت رہ گیا تھا۔ حیرانی کے اس مجسمے کی آنکھیں اتنی پھٹی ہوئی تھیں جتنی پھٹ سکتی تھیں۔

"آپ نے اللہ کا نام لے کر جھوٹ بولا۔ شرم نہیں آئی آپ کو ایسا کرتے ہوئے۔ آپ نے میری زندگی تباہ کردی۔ اپنی بیٹی کی زندگی داؤ پر لگادی۔ آپ نے میرے دل کی جگہ پر آگ رکھ دی تھی۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا آپ نے مجھے۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں سمندر کا پانی چرالائی تھیں۔ نائلہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"اب آپ کو معافی چاہیے۔ ضمیر کے بوجھ سے رہائی چاہیے۔ کتنی خودغرض ہیں آپ۔"

"مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ مجھے کچھ اور چاہیے تم سے۔۔۔"

وہ جو شدید دکھ کی حالت میں بولے جارہا تھا۔ ان کی بات پر ٹھٹکا۔

"کیا۔۔۔؟" ایک حرفی جملہ بڑے بے ساختہ انداز میں منہ سے پھسلا تھا۔

"دیکھو! تم انکار نہیں کروگے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

معطر خاموش کھڑا رہا۔

"کل۔۔۔ کل ارم یہاں آئے گی۔ تم اس سے کہنا

کہ تم نے واقعی وہاں شادی کر رکھی تھی۔ تم اسے پسند کرنے لگے تھے' پھر تم نے شادی کرلی۔" وہ اٹک اٹک کے کہہ رہی تھیں۔ "تم کہہ دینا۔ پھر وہ سنبھل جائے گی۔ وہ خوش رہنے لگے گی۔ میں نے اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ اس کے دل کو دل رہنے دو۔ ایسی کٹیا نہ بناؤ جہاں غم کے سوا کوئی چیز رہنا پسند نہیں کرتی۔

تم کرو گے نا ایسا؟

"نہیں! میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔"

نائلہ جاوید ساکت رہ گئیں۔ ان کے یقین کو بے اعتباری نے ڈس لیا تھا۔

وہ آنکھیں جن میں پہلے درد تھا' اب بے چارگی اتری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے چارگی محبت میں بدل گئی۔ وہ ششدر تھیں۔

"میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مجھے بھول جائے گی۔ اس کے ذہن و دل سے میں محو ہوتا جاؤں گا۔ کسی اپنے کی آنکھ میں اجنبیت دیکھنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا خودکشی کرنا۔ آپ مجھے خودکشی کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ میں کیسے مان لوں آپ کی بات...."

"یہ کیسی محبت ہے تمہاری جو اسے خوش نہیں دیکھ سکتی۔"

ان کے لہجے میں غصہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں تھا۔ ہر بے بسی غصے کے ذریعے ہی افشا نہیں ہوتی۔

"خوش تو وہ رہنے لگے گی۔ ایک سال نہیں تو دو سال بعد.... اگر ایک دفعہ مجھ سے بدگمان ہو گئی تو اپنی بے وقعتی' کمتری اور ٹھکرائے جانے کا احساس اسے کبھی خوش نہیں رہنے دے گا اور میں اسے اپنے آپ کو اس طرح مارتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ سوری...."

وہ چلا گیا اور نائلہ اس تیسرے خودغرض کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

"مجھے ایک بات ہمیشہ سکھائی گئی ہے دوست' انسان کو گلی کے اس کتے کی طرح نہیں ہونا چاہیے جس کو پھٹکارنا ہر کوئی اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

"اگر میں اس کو سچ' مطلب سچ بتا دیتا تو خاندان میں میری حیثیت گلی کے کتے کی سی ہو جاتی۔ سب مجھے برا کہتے' برا سمجھتے۔"

"میرے باپ نے کہا تھا۔ "عزت کروانا سیکھو" بعد میں انہوں نے اضافہ کیا تھا اور کرنا بھی...." مجھے لگا تھا دوست.... ان سے ترتیب الٹی ہو گئی ہے۔ جو بات پہلے کہنی چاہیے تھی وہ بعد میں کہہ رہے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر پتا چلا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ عزت کرنی ہر کسی کو آتی ہے۔ عزت کروانا کسی ایک کا ہی ہنر ہوتا ہے۔

استخاروں سے بہت پہلے میں نے شادی کرلی تھی۔ محبت کا اس شادی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے پاکستان میں شادی کرنی تھی اور ارم علی ہی سے کرنی تھی۔ کیونکہ مجھے اس سے محبت تھی اور ہے۔ اب میں یہاں شادی نہیں کروں گا' کبھی نہیں....

"اسے دکھ ہوگا۔"

"معلوم ہے مجھے...."

لیکن میں اپنے اس دل کا کیا کروں دوست' جو اسے اپنی یاد میں جلتا دیکھ کر کھلتا ہے۔

"ارم علی میری زندگی کا لازمی جز ہے' کوئی جملہ معترضہ نہیں۔ جسے نکال بھی پھینکو تو فرق نہ پڑے۔ مجھے فرق پڑتا ہے دوست' جس طرح ارم علی میری زندگی سے نہیں نکل جاتی۔ اسی طرح میں خود کو اس کی زندگی سے نہیں نکلنے دوں گا۔"

"میرے لیے ارم علی کی یاد وہ قبر ہے جس پر روز چادر چڑھانی پڑتی ہے۔ جس دن ایسا نہ ہوا۔ اس دن اس شادی کا اعلان کردوں گا' لیکن تب!"

وہ کیا شعر ہے کہ.... پیار آنے لگا رسوائی پر....

میں سامان پیک کرنے لگا ہوں۔ خدا حافظ

دوست....

☆

امت العزیز شہزاد

من دیپک اور آگ محبت

بھید بھری اس رات کا اندھیرا آج معمول سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس پر مستزاد متواتر برستی بارش نے جیسے قبر کے اندھیرے کی یاد دلا دی تھی.... صرف ان لوگوں کو جو خود کو انسان سمجھتے ہیں۔

"بھاگو.... پلیز اور تیز بھاگنے کی کوشش کرو۔"

اچانک ہی اس ہول ناک اندھیرے گرجتے بادلوں اور برستی بارش میں ایک وحشت زدہ سی مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

"نہیں بھاگ سکتے.... اپنی جان کے درپے ان لوگوں سے بچ کر ہم کہیں نہیں بھاگ سکیں گے.... وہ ہمیں مار دیں گے عمر! ہمیں مار دیں گے۔" درد میں ڈوبی اپنی زندگی سے لمحہ بہ لمحہ مایوس ہوتی اس آواز میں نہ جانے کیسا سوز اور ہیبت تھی کہ عمر کے بھاگتے قدم بے ساختہ ٹھٹھک کے ٹھہر گئے اور اس نے مڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔ اسی لمحے بڑی زور دار آواز کے ساتھ بجلی کڑکی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اس خوف زدہ ہرنی کا چہرہ بھی چمکا.... اس کی گلابی چنری کا کچا رنگ اس کے ملیح چہرے پر بہہ رہا تھا.... ناگن سے کالے بالوں کی بے ترتیب مگر

موٹی موٹی لٹیں اس کے گندمی چمک دار گالوں سے چپکی ہوئی تھیں اور وہ گھنیری پلکوں والی کٹورے جیسی آنکھیں جو شدت گریہ سے سرخ پڑ چکی تھیں۔ اس وقت بہت بجھی بجھی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے

مکمل ناول

زندگی کی ساری آس وامید ان میں اپنی موت آپ مر چکی ہو۔

عمر کا دل جیسے کسی نے سل پر رکھ کر بٹے سے کچل ڈالا تھا۔۔۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا نازک کپکپاتا ٹھنڈا برف ہاتھ مضبوطی سے اپنے آہنی ہاتھ میں تھامتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"نہیں ماروی۔۔۔ ایسا مت سوچو۔۔۔ تھوڑی ہمت اور کرلو۔۔۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔۔۔ پھر تم یوں بیچ راہ میں کیسے تھک سکتی ہو۔۔۔ اور یوں بھی میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اندھیرے کے باعث راستہ بھٹک گئے ہیں۔۔۔ اب چلو۔" اس نے ماروی کے عقب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی لاحاصل کوشش کی۔ مگر اندھیرے کے سوا واقعی کچھ دکھائی نہ دیا۔

"وہ دیکھو۔۔۔ وہ رہے۔۔۔" اسی لمحے ان سے قدرے فاصلے پر ایک غصے میں بھری ہوئی آواز ہوا نے ان کے کانوں تک پہنچائی تو ان کے قدموں نے ایک بار پھر آگے کی سمت بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔۔۔ اور وہ مشعل بردار خدائی فوجدار کہ جن کی مشعلیں موسلا دھار بارش نے بجھا کر اپنے تئیں انہیں بھٹکانے کی پوری کوشش کی تھی۔ ان کے خون کے پیاسے تھے۔ انہیں روشنی کی حاجت نہیں تھی۔۔۔ وہ تو اپنے شکار کی خون کی بو کے پیچھے بھاگے آ رہے تھے۔

"بچ کر جانے نہ پائیں دونوں بے غیرت۔" کسی نے کلہاڑے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پرجوش نعرہ مارا۔

"ہاں سانول۔۔۔ اگر آج تیرے ہاتھوں سے یہ دونوں بچ کر نکل گئے تو تیری نامردی کی داستان ہماری آنے والی نسلیں رہتی دنیا تک سنیں گی۔" غلام علی نے، جسے اس "فوج" میں سپہ سالار کی سی حیثیت حاصل تھی، پہلے ہی سے بپھرے ہوئے سانول کو مزید ابھارتے ہوئے کہا۔

"نہیں چچا سائیں۔۔۔ آج میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ بالکل نہیں چھوڑوں گا۔" وہ جو پہلے ہی ہوا کی سی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب تو گویا اس کے پیروں میں بجلی سی بھر گئی۔

حالانکہ اندھیرا تھا۔ تابڑتوڑ برستی بارش میں اس زمین کی مٹی پھسلن زدہ ہو چکی تھی۔ نشیبی راستہ ہونے کے باعث پانی بھاری ریلے کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس ڈھلوانی راستے کا اختتام تند و تیز دریائے سندھ پر جا کر ہوتا تھا۔ اور اس بے رحم موسم میں یہ راستہ بے حد خطرناک ہو جایا کرتا تھا۔

مگر نجانے کون سا ایسا جذبہ تھا جو ان لوگوں کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ ان کے پیچھے، جو اپنی جان ان لوگوں سے بچا کر بھاگ رہے تھے۔

یہ تعاقب مزید دس منٹ جاری رہا۔ گوکہ اندھیرا تھا مگر پانی میں پڑتے بھاری قدموں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ وہ دوڑتے رہے یہاں تک کہ ان کے مابین فاصلہ محض دو ہاتھ برابر رہ گیا۔

"میری غیرت کا جنازہ نکالنے والی۔۔۔ تجھے آج میں نہیں چھوڑوں گا۔" سانول نے جیسے انہیں آخری بار للکارا اور درمیانی فاصلہ انتہائی کم رہ جانے کی رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کلہاڑی فضا میں بلند کرکے پوری قوت سے ماروی کی پشت کی جانب اچھالی۔

"آہ۔۔۔!" ایک دل خراش چیخ فضا میں گونجی تھی۔

اسی پل بجلی چمکی۔۔۔ اور دیوانہ وار ماروی اور عمر کے پیچھے دوڑتا سانول مارے خوف کے اپنی جگہ یک دم گویا منجمد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ آگے راستہ ختم ہو چکا تھا۔

اور یقیناً "عمر اور ماروی کی زندگی بھی۔۔۔ سندھو نے دو محبت کرنے والوں کو اپنے فراخ سینے میں ہمیشہ کے لیے چھپا لیا تھا۔ نجانے ہر عمر اور ماروی کا مقدر یہ جدائی ہی کیوں ٹھہرتی ہے۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

"ہاں تو بھئی جیز۔۔۔ کہو تمہیں کیسا لگا ہمارا وطن؟" حنا جمالی نے مسکرا کر شرارتی سے انداز میں، بے حد کوفت زدہ سے انداز میں بیٹھی محترمہ "جیز" سے استفسار کیا۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے۔" اس نے گھپ اندھیرے میں اپنے کان میں راگ بھیرویں سناتے مچھر کو سیدھے ہاتھ سے اڑاتے ہوئے اپنا لہجہ حتی المقدور "معتدل" کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مگر جب یہ لائٹ جاتی ہے نا تو یقین کرو مجھے ایسا فیل (محسوس) ہوتا ہے جیسے میرے اپنے سیل "ویک" ہو گئے ہوں۔"

اس کی بات پر حنا بے ساختہ ہنس پڑی جبکہ مس عالیہ بٹ جو ولایت جا کر "ایلی" کہلوانے لگی تھیں۔ جیز کے منہ پر اپنے آئی فون کی روشنی ڈالتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولیں۔

"او کوئی نئیں... ابھی آجانی اے لائٹ... تسی فکر نہ کرو۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ کہیں دور ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ گونجی اور پھر واقعی پورا گیسٹ ہاؤس جگمگانے لگا۔

"دیکھا... کیا کہا تھا میں نے۔" ایلی کی خوشی دیدنی تھی۔

"یہ تو میں بھی جانتی تھی کہ ابھی جنریٹر آن ہو جانا ہے۔" حنا نے ناک چڑھائی۔

"یار، جنریٹر ہی سے سہی کمرہ تو روشن ہو گیا نا بس خیر ہے۔" ایلی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ سب چھوڑو... " بیڈ پر نیم دراز جیز نے اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کسی قدر پرجوش لہجے میں کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ کل ہم کون کون سی جگہ وزٹ کرنے والے ہیں؟"

"تھوڑا صبر لڑکی..." حنا نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ایک تو تم نے ایک دم اچانک ہی یہاں آنے کا پلان بنا لیا، اب ایسا کرتے ہیں کہ ایک دو دن آرام کے بعد۔"

"بالکل نہیں..." قبل اس کے کہ حنا کی بات مکمل ہو پاتی جیز نے ایک نعرہ سا مارتے ہوئے اس کی بات قطع کی اور معافی مانگے بغیر ہی بولتی گئی۔

"یونو... میرا کسی جگہ کو وزٹ کرنے کا انداز دوسروں سے ذرا مختلف ہوتا ہے، میں محض گوگل پر "ٹورسٹ اٹریکشن" دیکھ دیکھ کر کسی شہر یا گاؤں میں وزٹ کرنے پر یقین نہیں رکھتی... میں یہاں کی عام گلیاں، بازار، محلے سب تفصیلا "ڈس کور" کرنا چاہتی ہوں اور ہمارے پاس ویسے بھی صرف ایک ہفتہ ہے، جو کہ بے حد کم ہے اور تم ایک دو دن یونہی ضائع کرنے کا کہہ رہی ہو۔" وہ اپنی گھنیری پلکیں جھپک جھپک کر بولی۔

"او شہزادی"، ایلی نے بنٹیز کا پیکٹ کھولتے ہوئے اسے ٹوکا۔ "مگر یہ تیرا یورپ اور امریکہ نہیں ہے... یہ ہمارے سوہنے پاکستان کا صوبہ سندھ ہے رانی... اور پھر یہ اس وقت ہم جہاں بیٹھے ہیں یہ اندرون سندھ" اس نے نفی میں سر ہلا کر مٹھی بھر کر... رنگ برنگی باؤنٹیز اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یار یہاں کی گلیوں میں پیدل پھرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ دھول مٹی اڑاتے کچے پکے راستے... چلو ان کی بھی خیر ہے لیکن یہاں کی گرمی، اف توبہ، جیز تو نے تو دو قدم چلتے ہی فوت ہو جانا ہے... اور پتا ہے نا... کہ ایک ڈیڈ باڈی کو دوسرے ملک لے جانے پر کتنا کھٹراگ کھڑا ہو جاتا ہے۔" اس نے اپنی اہم بات مکمل کرتے ہوئے دوسری مٹھی بھری۔

"اوہ پلیز۔" جیز نے ازحد کوفت سے اسے ٹوکا۔

"نہیں یار! ایلی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم یہاں کی گرمی برداشت نہیں کر سکو گی مگر فکر مت کرو۔ آنٹی سند ھل سے میری بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے اپنا ڈرائیور بھجوانے کا کہہ دیا ہے۔ کل پہلے ہم ان کی طرف چلیں گے پھر انہی کے ساتھ ان کا گوٹھ اور آس پاس کے علاقے آرام سے گھوم لیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

حنا نے یہ پلان بتایا تو جیز کو مطمئن کرنے کے لیے تھا مگر یہ اور بات کہ وہ کچھ اور بے چین ہو گئی۔

"مگر یار، کل کتنے بجے تک پہنچ جائے گا ان کا ڈرائیور؟" جیز نے اس کی بات ختم ہوتے ہی اپنے فطری انداز سے پوچھا تو حنا جمالی بے ساختہ ہی اس وقت کو کوسنے لگی کہ جب جیسمن نے اس کی جانب

دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆☆☆

حنا جمالی ایک خوب صورت اور قابل لڑکی تھی۔ اس کے والد اکبر جمالی سندھ کے ایک نامور صحافی تھے۔ والدہ کسی این جی او میں جاب کرتی تھیں۔ اس کا چھوٹا بھائی این ای ڈی سے سول انجینئرنگ کر رہا تھا جبکہ وہ خود اسکالر شپ پہ یونی ورسٹی آف لندن سے بی بی اے کرنے کے لیے گئی ہوئی تھی۔

گوری چٹی، اونچی لمبی فربہی مائل جسامت ... زندہ دل اور خوش خوراک عالیہ بٹ سے حنا کی دوستی لندن آکر ہوئی تھی۔ وہ بھی یہاں اپنے شوق (اور والد محترم کے روپے پیسے) کی وجہ سے بزنس پڑھنے آئی ہوئی تھی۔ دو بھائی وہیں لاہور میں والد کے امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے منسلک تھے۔ ایک بہن نازیہ لندن کے مضافات میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ عالیہ سب سے چھوٹی تھی۔ وہ ویک اینڈ بہن کے ساتھ گزارنے کے بعد ہاسٹل آجایا کرتی۔ عالیہ اور حنا روم میٹ تو تھیں ہی بعد میں اچھی دوست بھی بن گئیں۔

اور جہاں تک بات رہی "یاسمین علی خان" کی تو وہ یہیں کی پیدائش تھی۔ (اور اسے اس بات پر بے حد فخر بھی تھا) مگر اس کے والدین پاکستانی تھے اور اتنے سال گوروں کے دیس میں گزارنے کے بعد مزید پاکستانی بن چکے تھے۔ اور وسطی لندن کے ایک گھر میں رہتے ہوئے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا بلاشبہ ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ مگر ان کے گھر کی دہلیز سے باہر بھی ایک دنیا آباد تھی ... اور انہوں نے اپنی اکلوتی اولاد کو گھر کے اندر چاہے لاکھ مشرقی، پاکستانی وغیرہ وغیرہ بنانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی تھی مگر بہرحال اس پر اس معاشرے کا کچھ نہ کچھ رنگ تو چڑھنا ہی تھا۔ تو بس اتنا ہوا کہ اس نے سب سے پہلے اپنا دقیانوسی نام "یاسمین" (جو اس کی دادی نے اس کی پیاری سی نازک نازک صورت دیکھ کر رکھا تھا) آفیشلی انگریزی میں تبدیل کیا جسے بعد میں اس کی دوستوں نے جیز بنانے میں ذرا تاخیر نہ برتی۔ مغربی کپڑے بھی پہننے لگی۔ ہاں مگر ستر پوشی کا بطور خاص دھیان رکھا کرتی ... اس کے دادا یہاں بزنس کرتے تھے جبکہ والد نے جاب کو ترجیح دی تھی۔ دادی اور والدہ گھریلو خواتین تھیں۔ اس کی تربیت میں اس کے دادا، دادی کا بھی بڑا حصہ رہا تھا۔ ابھی چند سال قبل ہی وہ دونوں آگے پیچھے اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ان کا گھرانا اس سفید فام معاشرے میں براؤن ہونے کے باوجود بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے دادا دادی اور والدین کو اس نے اکثر ہی پاکستان کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کرتے سنا تھا۔ بلکہ جس طرح ان لوگوں نے اسے پاکستان سے متعارف کروا رکھا تھا، اسے تو وہ خطہ زمین کوئی ونڈر لینڈ ہی محسوس ہوا کرتا۔

مگر وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ اس کے والدین اکلوتے تھے۔ نانا نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دیگر رشتے دار بھی ان لوگوں کے بقول دیار غیر جا بسے تھے۔ جو بھی تھا اسے وہاں جانے کا ازحد شوق تھا۔ حنا اور عالیہ سے اس کی دوستی کالج ہی میں ہوئی تھی۔ ان کے پاکستانی اور اپنے گھر سے ہزاروں میل دور ہونے کی بنا پر اس کی والدہ ان کا بالکل جیز کی طرح خیال رکھنے لگی تھیں۔ ویسے تو دن اچھے کٹ رہے تھے مگر کبھی کبھار جیز نے دیکھا تھا کہ اس کی والدہ پاکستان کو یاد کر کے باقاعدہ آنسو بہایا کرتی تھیں ... تب جیز انہیں پاکستان لے جانے کا مصمم ارادہ باندھ لیتی ... اور پھر بڑی جلدی ہی اسے زندگی نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ عالیہ بٹ کے بھائی کی شادی ان کے سمسٹر بریک میں متوقع تھی۔ حنا بھی اس بار اپنے گھر والوں سے ملنے جا رہی تھی۔ عالیہ نے حنا کے ساتھ ساتھ جیز کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ... وہ تو گویا تیار ہی بیٹھی تھی۔ خوشی خوشی گھر آکر بتایا۔ مگر اس کا اتنا خطرناک رد عمل سامنے آیا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

جیز کی والدہ نے اسے پاکستان جانے سے صاف منع کر دیا۔ اس نے للچایا بھی کہ آپ بھی چل سکتی ہیں۔ عالیہ کے بھائی کی شادی ہے آخر۔۔۔ مگر وہ کچھ اور ناراض ہو گئیں کہ بن بلائی مہمان بن کر جاتی اچھی لگیں گی کیا؟ تب عالیہ نے باقاعدہ دعوت دے ڈالی بلکہ پاکستان سے انہیں دعوتی کارڈ بھی بھجوا دیا۔۔۔ وہ جیز کو گھورنے لگیں۔

وہ تو کسی طور بھی اسے پاکستان بھیجنے پر راضی نہ ہوتیں اگر اس کے ڈیڈ مداخلت نہ کرتے۔۔۔ بہرحال اسے عالیہ کے بھائی کی شادی میں شرکت کی اجازت بڑی دقتوں کے بعد ہزار ہا نصیحتوں کے ساتھ ملی تھی۔ وہ پاکستان جانے کے لیے بے حد پرجوش ہو رہی تھی۔ اور اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر ہوتا ہے نا کوئی ایسا ظالم لمحہ بھی جو دبے پاؤں آ کر آپ پر اچانک بہت کچھ منکشف کرنے کے بعد انسان کی بے فکری اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اب یہ اس کی خرابی قسمت کہ وہ بے درد لمحہ اس کی زندگی میں بنا بلائے ہی چلا آیا تھا۔۔۔ پاکستان روانگی سے محض دو روز قبل اس کی سیدھی سادی زندگی میں ایک انجان موڑ نے آ کر اس کی زندگی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کب سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔۔۔ یہ کوئی وقت ہے تمہارے آنے کا؟" غصے سے بھری ہوئی جیز نے خاصی تاخیر سے وارد ہونے والے ڈرائیور کے نزدیک آتے ہی اسے بڑی بری طرح سے لتاڑ کر رکھ دیا۔ آنٹی سندھل نے رات ہی انہیں یاد دہانی کرائی تھی کہ ان کا ڈرائیور علی الصبح ہی انہیں لینے آجائے گا لہٰذا وہ لوگ پابندی وقت کا خیال کرتے ہوئے بنا تاخیر کیے اس کے ساتھ ان کے گھر چلی آئیں۔

حنا چونکہ اپنی آنٹی سندھل کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی اسی لیے وہ ان کے حکم کے بموجب علی الصبح ہی اپنا سامان بمعہ ایلی اور جیز کے اس درمیانے درجے کے نہایت ہی خستہ حال سے لاؤنج میں آ بیٹھی تھی۔۔۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ انہیں یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہوئے ایک نہ دو۔۔۔ پورے تین گھنٹے گزر گئے مگر وہ نہ آیا۔۔۔ آنٹی سندھل کو فون بھی کیا مگر ان کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ پریشانی ہی پریشانی تھی۔ تب ہی کالی ڈریس پینٹ اور شرٹ میں ملبوس دراز قد شخص نے ان کے قریب آ کر محض اتنا ہی کہا تھا کہ اسے سندھل میم نے بھیجا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اتنی دیر سے انتظار کی صورت اٹھائی جانے والی کوفت نے غصے کی صورت اس شخص پر برسنا اپنا فرض سمجھا۔ ابتدا جیز نے کی تھی۔

"جی؟" ڈرائیور نے جیز کے برسنے کو بڑے تعجب سے دیکھا۔

"کیا جی؟" اس کا استعجابیہ انداز ایلی کو ایک آنکھ نہ بھایا تھا، اسی لیے دانت کچکچا کر بولی۔ "ایک تو اتنی دیر سے آئے ہو۔۔۔ اوپر سے سلمان خان کی طرح بھونڈی اداکاری کر رہے ہو۔" اس نے اپنے سرخ بیگ کا اسٹرپ بڑے غصے سے کندھے پر ڈالا تھا۔

"لیکن وہ سندھل میم نے۔۔۔" ڈرائیور نے ان کے کڑے تیوروں، گھورتی آنکھوں پر جھنجلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی یہ بے چاری سی کوشش اس مرتبہ حنا نے حسرت بنا دی۔

"ہاں ہاں سندھل میم نے" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرواتے ہوئے کہا "آنٹی ہیں میری۔ میں جانتی ہوں انہوں نے تو تمہیں وقت پر ہی بھیجا ہو گا، یہ تم ہی نے کہیں نہ کہیں دیر لگا دی ہو گی، اب اٹھاؤ ہمارا یہ سامان اور فوراً گاڑی میں رکھو، تمہاری تو میں اچھی طرح شکایت لگاؤں گی آنٹی سندھل سے۔"

اس نے تنتناتے ہوئے کہا اور بنا اس کی سنے آگے بڑھ گئی۔ ایلی اور جیز تو خیر پہلے ہی پارکنگ کی جانب جا چکی تھیں۔ کچھ دیر تو ڈرائیور وہیں کھڑا قہر آلود نگاہوں سے ان کی پشت تکتے گیا۔ پھر نجانے کیا سوچ کر اس نے ان کا سامان جو دو مختصر سے بیگز پر مشتمل تھا اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

سندھل نظامانی اس پسماندہ علاقے کی ترقی کے لیے بنائی گئی ایک علاقائی تنظیم کی رکن تھیں۔ وہ اپنے کام کے لیے بہت فعال اور سرگرم رہا کرتی تھیں۔ ان کے پاس قابل اور مخلص لوگوں کی باقاعدہ ایک ٹیم موجود تھی۔ آج ان کی شہر میں ایک غیر ملکی وفد سے ملاقات طے تھی۔ ظاہر ہے انہیں وہاں جانا ہی تھا۔ سندھل رات ہی حنا کو یہ بات فون پر بتا چکی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے وقت پر ڈرائیور بھیجنے کا بھی کہہ دیا تھا۔ اپنی مستقل اور قابل اعتماد ملازمہ سونی کو ان کے لیے کمرے تیار کرنے اور لنچ پر اچھا سا اہتمام کرنے کی خصوصی تاکید بھی کردی تھی۔

ڈرائیور انہیں سندھل کے گھر کے باہر ڈراپ کرنے کے بعد چھو منتر ہو گیا۔ سندھل کا بڑا سا گھر شہر اور گوٹھ کے سنگم پر واقع تھا اور واقعی شہری اور دیہی طرز زندگی کا بہترین شاہکار دکھائی دیتا تھا۔ ان لوگوں نے جاتے کے ساتھ ہی غسل کیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد سونی انہیں کھانے پر بلانے آگئی۔ اس نے سیال گوشت، سندھی بریانی وغیرہ کے علاوہ نوڈلز اور فرائڈ رائس بنانے کی کامیاب کوشش کی تھی.... حنا کو لنچ کے دوران ہی سندھل کی کال موصول ہوئی۔ ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ اب کل صبح ہی گوٹھ پہنچ سکیں گی۔ اگر وہ لوگ چاہیں تو وہ شاہ کو گاڑی لے کر آنے کا کہہ دیں گی۔ اس طرح ان کا آج کا دن ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔

اور ظاہر ہے وہ لوگ یہاں گھر میں رہ کر آرام کرنے کی غرض سے تو آئی نہیں تھیں اور پھر یہاں سے چند روز بعد ہی انہیں لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ بس اسی لیے حنا نے جیز اور ایلی سے مشورے کے بعد ڈرائیور کو آنے کے لیے کہہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"منڈا تو رج کے سوہنا اے.... قسم سے بالکل ڈرائیور نہیں لگتا۔"

محض دو گھنٹے بعد ہی وہ خان نامی اسمارٹ اور ڈیشنگ سا ڈرائیور بمعہ گاڑی ان کے روبرو حاضر تھا۔ خالصتاً" جیز کی خواہش پر پہلے مرحلے میں گوٹھ کے کھیت کھلیانوں کی "خاک چھاننا" طے پایا تھا۔ سو اب سواری کھیتوں کی جانب گامزن تھی.... اس ڈرائیور پہ آیا غصہ بھی خاصی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اسی لیے یہاں وہاں کی باتوں کے درمیان انہیں، اس کا بھی دھیان آ گیا۔ اور ایلی نے جو سوچا اپنے مخصوص بلند آہنگ انداز میں جھٹ کہہ بھی ڈالا۔

"ہاں اور کافی تمیزدار بھی دکھائی دے رہا ہے۔" جیز نے انگریزی میں کہا "تب تو یہ کوئی اور کام بھی کر سکتا ہو شاید؟" اس نے خالصتاً" فرنگیوں کے سے انداز میں گردن ترچھی کر کے کندھے اچکائے۔

"تمہیں یہاں کی بے روزگاری کا اندازہ نہیں ہے جیز، اسے یہ کام مل گیا بس یہی غنیمت سمجھو۔" حنا نے سنجیدگی سے کہا۔

یہ ساری گفتگو جان بوجھ کر انگریزی میں کی جا رہی تھی تاکہ ڈرائیور کچھ نہ سمجھ سکے۔ اور واقعی وہ یونہی سپاٹ چہرے کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جیسے اسے گاڑی چلانے کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو....

"مگر مجھے تو بے حد افسوس ہو رہا ہے بے چارے پر۔" جیز کی آنکھوں میں تاسف اُمڈ آیا۔

"اپنا افسوس اپنے پاس رکھو یار۔" حنا نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا، ایلی نے تائیداً" کہا "افسوس اپنی جگہ مگر انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔"

"اگر کرنا چاہے تو بہت کچھ.... کم از کم ایک انسان، دوسرے انسان کو اس کا جائز مقام دلوانے کے لیے کوشش تو کر ہی سکتا ہے۔" اس نے گہرے لہجے میں کہا۔

ایلی اور حنا کے چہروں پر دبی دبی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بے ریا، ہمدرد، دردمند اور انسانیت کا بھلا چاہنے اور کرنے والی.... مگر یہاں کا

ماحول ذرا مختلف تھا، یہاں ایک بے ضرر سی بات کے سوا افسانے بن جایا کرتے تھے اور اسی لیے وہ ایسے باز رہنے کی تلقین کرنا چاہ رہی تھیں کہ اس سے قبل ہی جیز بڑے دل گیر لہجے میں اس ڈرائیور سے پوچھنے لگی۔

"تمہارا نام کیا ہے مسٹر؟" اس کے براہ راست اردو میں پوچھے گئے سوال پر اس سپاٹ چہرے والے ڈرائیور نے بیک ویو مرر سے سوال پوچھنے والی کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"جی بی بی... میرا نام اللہ وسایا ہے۔" بڑے ادب سے جواب دیا گیا۔

"اوہ نو" اس پرسنالٹی پر یہ نام ذرا بھی سوٹ نہیں کر رہا۔" حنا بجائے جیز کو ٹوکنے کے ڈرائیور کا نام سن کر بے ساختہ کہہ اٹھی۔

"بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے بریڈ پٹ نے اپنا نام جیرا چوہدری رکھ لیا ہے۔" قہقہے کے ساتھ یہ تبصرہ ایلی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جیز یکدم ہنس پڑی۔ اس کی شفاف ہنسی کو دو شہد رنگ آنکھوں نے بڑی توجہ سے دیکھا تھا۔ کبھی نہ بھولنے کے لیے۔

"کچھ پڑھے لکھے ہو؟" ہنسنے کے بعد 'جیز ہی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی میڈم!" کسی قدر 'شرمیلا سا لہجہ تھا موصوف کا۔ "کچھ پڑھ بھی لیتا ہوں اور لکھ بھی۔"

"اچھا!" جواب اس کی سمجھ میں تو نہیں آیا تھا مگر خیر ہے اس نے نجانے کیا سوچ کر اگلا سوال کیا۔

"کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"آپ دلوا دیں میڈم کر لوں گا۔" لہجہ نہایت ہی شریفانہ بلکہ بے چارہ سا تھا۔

"اوہ جیز 'چھوڑ دے اس کا پیچھا بندہ بہت تیز لگ رہا ہے۔" ایلی اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ تو جیز جو کسی سوچ میں گم تھی' نفی میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"شارپ تو نہیں البتہ حاضر جواب ضرور لگ رہا ہے۔" پھر اس نے اپنا روئے سخن بے زار بیٹھی حنا کی جانب موڑا "تم اپنی آنٹی سے کہہ کر اسے کوئی اور کام کیوں نہیں دلوا دیتیں... تم ان سے بات کرو نا۔" اس نے اصرار کیا تو حنا بھنا کر بولی۔

"جی بہت بہتر اور کچھ...؟" مگر اور کچھ کہنے کا اب موقع نہیں رہا تھا... ان کی منزل آچکی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔

☼ ☼ ☼

"سوری بچیوں... کل میں اپنے گھر پہ تم لوگوں کو ویلکم نہیں کر سکی... بٹ آئی ہوپ' سونی نے تمہاری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں رہنے دی ہوگی۔ اور شاہ کو بھی میں نے تم لوگوں کے بارے میں خصوصی تاکید کر دی تھی... سب ٹھیک رہا نا؟" آنٹی سندھل نے اپنے نرم لہجے میں نہایت محبت سے پوچھا۔ سندھل سے ان لوگوں کی ملاقات آج ناشتے کی میز پر ہو رہی تھی۔

سندھل صبح سویرے ہی گھر پہنچ سکی تھیں۔ حنا کی تو خیر وہ خالہ تھیں مگر جیسمن اور ایلی کو بھی یہ سنجیدہ' پروقار شفیق سی خاتون بہت اچھی لگ رہی تھیں... سندھل کو بھی جیسمن اور عالیہ پسند آئی تھیں۔

"کوئی بات نہیں آنٹی... آئی انڈر اسٹینڈ... اور ویسے بھی یہ سونی تو تھی نا ہمارے استقبال کے لیے۔" حنا نے کہا تو کیپ میں چائے انڈیلتی نو عمر مگر خوبصورت سی سونی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"ہاں اور وہ آپ کا ڈرائیور بھی خاصا معقول انسان ثابت ہوا ہے۔ ہم نے جہاں جہاں کہا بلا چوں چراں ہمیں لے گیا۔" ایلی نے پراٹھے انڈے سے انصاف کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"ڈرائیور ہی کی تو اصل فکر تھی مجھے 'میں نے تم سے کہہ تو دیا تھا کہ ڈرائیور بھیج دوں گی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ عین وقت پر بے چارے ماجھو کی طبیعت بگڑ گئی۔ ہیضہ ہو گیا ہے اسے۔ میرا جانا بھی بے حد ضروری تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں... میں

نے شاہ سے اپنی اس پریشانی کا ذکر ایئرپورٹ جانے سے کچھ دیر پہلے کیا۔ اس بچے نے جھٹ مجھے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ پہلے اس نے مجھے ایئرپورٹ ڈراپ کیا، اس کے بعد تم لوگوں کو لینے گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔۔۔"
آنٹی سندھل جوں جوں تفصیلات بتاتی جا رہی تھیں ان تینوں کے چہرے اپنا رنگ بدلتے جا رہے تھے۔
"وہ شاہ۔۔۔ وہ آپ کا ڈرائیور نہیں ہے؟" چند ثانیے بعد حنا نے ہکلاتے ہوئے استفسار کیا۔
"ارے نہیں بھئی۔" سندھل چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرائیں "تمہیں کہاں سے لگا وہ ڈرائیور۔"
"لگا ہی تو نہیں تھا۔۔۔" ایلی منہ ہی منہ بڑبڑائی۔
"تو پھر کون تھا وہ؟" اٹکتے اٹکتے بالآخر جیسمن نے کافی دیر سے ذہن میں کلبلاتا سوال ان سے کر ہی لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں تو مسٹر اللہ وسایا۔۔۔ اس روز تو آپ نے ہم لوگوں کو خوب ہی بے وقوف بنایا۔" حنا نے اسے دیکھ کر چھوٹتے ہی ناراضی سے کہا۔
سجاول شاہ ایک قابل اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ جس نے شہر سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گوٹھ میں رہ کر یہاں کے لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے عملی کوشش کرنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ اپنے علاقے میں مثبت تبدیلی لانے کا خواہاں تھا۔ اور اس کے لیے بہت پرعزم بھی تھا۔ اور اس کا یہی عزم اور استقلال اس کی چمکتی کانچ جیسی آنکھوں میں نمایاں تھا۔۔۔ وہ سندھل کی تنظیم میں بطور ریسرچ آفیسر اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اور اپنے کام سے کافی مطمئن بھی تھا۔۔۔ اس روز اس نے محض "سندھل میم" کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے ان کی بھانجی اور اس کی دوستوں کو گیسٹ ہاؤس سے لانے کی پیش کش کر دی تھی۔
اس وقت وہ ایک فائل لے کر کسی کام کے سلسلے میں ان کے گھر آیا ہوا تھا کہ اس کا سامنا لاؤنج میں براجمان ان سب سے ہو گیا۔
"جملے کی تصحیح کر لیجئے ادی" وہ اس کے حملہ آور ہونے پر پہلے ٹھٹکا، پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔
"میں نے آپ لوگوں کو بیوقوف نہیں بنایا تھا بلکہ آپ لوگ میرے متعلق شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل شیشے کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"مگر آپ ہماری غلط فہمی دور بھی تو کر سکتے تھے۔" ٹوسیٹر پر بیٹھی جیز سنجیدگی سے بولی۔
سجاول نے بے اختیار اس کا دمکتا چہرہ بغور دیکھا۔
"کوشش کی تو تھی۔" اس نے پہلے اپنی صفائی دی، پھر معنی خیزی سے مسکرا کر کہنے لگا۔
"مگر جو ہوا اچھا ہی ہوا، اسی بہانے کچھ لوگوں کی خوب صورت سوچ تو مجھ پر آشکار ہو گئی۔"
"اور اگر ہم آپ کے بارے میں کوئی نامناسب بات کرتے تب؟" ایلی کو اس کا پراعتماد انداز ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا، اسی لیے کڑے تیوروں سے اسے گھور کر بولی۔
"تب بھی یقین رکھیے محترم خواتین! میں آپ لوگوں سے اسی عزت اور توقیر سے پیش آتا۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر کو ذرا سا خم دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔
ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ سندھل سر پہ اجرک اوڑھے، آنکھوں پر گاگلز لگائے ہاتھ میں سیاہ ہینڈ بیگ لٹکائے اندر سے نمودار ہو کر بولیں۔
"ہاں بھئی سجاول، کہو اس وقت کیسے آنا ہوا۔"
"سوسوری میم" اس نے یکدم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "کام بہت ارجنٹ اور ضروری تھا اس لیے اس وقت یوں آنا پڑا، مگر آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں غالباً؟" اس نے اب جا کر غور کیا تھا۔ وہ لوگ تو جیسے کہیں جانے کو تیار تھے۔
"ہاں بچیوں کو چھانچھر بازار لے کر جا رہی ہوں، دراصل جیز نے وہاں جانے کی فرمائش کی ہے۔" وہ

اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولیں۔

"اوہ! اس نے بے چین کھڑی جیز کو دیکھ کر اس طرح اثبات میں سر ہلایا جیسے سب معاملہ سمجھ گیا ہو۔

" وہی فارنرز والی ٹپیکل اٹریکشن کھینچ لے جا رہی ہو گی وہاں انہیں۔ ورنہ تو دنیا کے مہنگے ترین مالز سے شاپنگ کرنے والوں کو گوٹھ کے اس معمولی ہفتہ بازار سے اور کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تو جیسے جیز نے احتجاجاً اسے دیکھا۔

"دیکھیے مسٹر، آپ اپنے خیالات اپنے پاس رکھیں تو بہتر ہے۔" وہ برہمی سے گویا ہوئی۔

"اوروں کا تو مجھے پتا نہیں مگر میرے لیے وہاں جانا کسی خواب کے پورے ہونے جیسا ہے.... ڈو یو انڈر اسٹینڈ؟" اس کے جواب پر ایلی اور حنا مسکرانے لگیں جبکہ سندھل نے بے اختیار دونوں کو ٹوکا۔

"اوہو بھئی چھوڑو تم لوگ اس بحث کو۔" پھر وہ اپنے سامنے کھڑے سجاول سے مخاطب ہو کر بولیں "تم بتاؤ بیٹا کیا کام تھا تمہیں؟"

"جی دراصل پچھلے ایک سال میں یہاں ہونے والے کاروباری کیسز پر میری ریسرچ فائل تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اسی کے متعلق چند اہم نکات آپ سے ڈسکس کر کے مجھے یہ فائل کل تک صوبائی وزارت داخلہ کو ارسال کرنی ہے۔" اس نے میز سے فائل اٹھاتے ہوئے کہا تو سندھل ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئیں۔ اس تنظیم کی بنیاد انہوں نے اپنے شوہر اور کزن حیات نظامانی کے ساتھ مل کر رکھی تھی۔ جہاں وہ لوگ عوام کی امید تھے وہیں کچھ لوگوں کی آنکھوں کا کانٹا بنے ہوئے تھے۔ مگر راہ میں حائل ہزارہا مشکلات کے باوجود ان کا سفر کامیابی سے جاری تھا۔ اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا، جب اس علاقے میں علم کی شمع روشن کرنے کی پاداش میں ان کے شوہر کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ مگر اتنا بڑا سانحہ بھی ان کے عزم و استقلال کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکا تھا بلکہ اس عظیم قربانی کے بعد ان کا جذبہ کچھ اور نکھر گیا تھا۔

"اٹس ناٹ فیئر آنٹی۔" انہیں سوچ میں دیکھ کر جیسمن بے ساختہ چلا اٹھی۔

"آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں سجاول۔" وہ بے چارگی سے مسکرا کر بولیں۔

"میں نے انہیں ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور تم جانتے ہو تنہا میں انہیں بھیج نہیں سکتی۔" وہ متفکر ہو گئیں۔

"اس میں کیا مسئلہ ہے۔" چند ثانیے کے بعد حنا یکدم بولی۔

"سجاول بھی ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیں اور آپ لوگ راستے میں ڈسکشن کر لیں۔" اس نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" سندھل نے مطمئن ہو کر کہا۔

"اوکے!" سجاول اور کیا کہہ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لگتا ہے مجھ سے اب تک خفا ہیں؟" سجاول نے لان چیئر پر بیٹھی اپنے ہی کسی خیال میں کھوئی کھوئی سی جیز کو دیکھ کر کہا۔ وہ کل راستے بھر سندھل سے فائل پر بات چیت کرتے ہوئے بازار تک جا پہنچا تھا۔ سندھل کا گھر اور آفس شہر کے اختتام اور گوٹھ کے آغاز کے درمیان واقع تھا اور گاؤں کا یہ بازار ان کے اور ساتھ والے گوٹھ کے درمیان سجا کرتا تھا۔ کچھ سوچ کر سجاول بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔ ان لوگوں کے لیے تو یہ بازار اور یہاں کی روایتی اشیاء میں کوئی نئی بات نہ تھی مگر ایلی اور بالخصوص جیز ۔۔۔ کے جوش و خروش کا عالم دیدنی تھا۔ چزیاں، چوڑے، رلیاں، بھرت کی کڑھائی والے سوٹ، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ پورا بازار خرید ڈالے۔ سندھل نے بھی اسے اور ایلی کو تحفتاً بہت کچھ خرید کر دیا۔ حنا کے پاس یہ سب کچھ پہلے ہی وافر تعداد میں موجود تھا چنانچہ اس نے صرف شیشوں والی کڑھائی سے مزین لال اور نیلا دیدہ زیب ہینڈ بیگ لینے پر اکتفا کیا۔

سارا وقت جیز اپنے ہینڈی کیم سے وہاں کی ویڈیو بناتی رہی۔ اس کے چہرے اور وجود سے چھلکتی سرشاری سجاول کو اچنبھے میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ آخر ایسی کون سی کشش محسوس ہوئی تھی اس لڑکی کو اس کے اس پسماندہ گوٹھ میں جو وہ لندن سے بطور خاص یہاں گھومنے کے لیے آئی تھی؟

"کون سی بات؟" اس کی آمد پر وہ جیسے اپنے خیالوں سے بری طرح چونک اٹھی۔ ایلی اور حنا اندر سونی کے ساتھ مل کر "چائے" کے اہتمام میں لگی ہوئی تھیں۔

"وہی، مہنگے ترین مالز سے شاپنگ کرنے والی بات پر۔" وہ اس کے بنا کہے ہی اس کے سامنے رکھی کین کی لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بے اعتنائی سے بولی۔

"میں خفا صرف اپنوں سے ہوتی ہوں۔" اس کے انداز پر بے اختیار سجاول کے لب کھلے تھے۔

"اچھی بات ہے" اس نے جیسے جیز کی بات پر سر دھنتے ہوئے کہا۔ "ویسے خفا ہونے کے زیادہ مواقع اپنے ہی تو فراہم کرتے ہیں اس لیے انہی سے ہونا چاہیے، ویری گڈ۔"

"آپ میری بات کا مذاق اڑا رہے ہیں؟" آن واحد میں اس کی آنکھوں میں اشتعال امڈ آیا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ اس کے انداز پر بوکھلا اٹھا۔ "بلکہ میں تو آپ سے معافی مانگنے آیا تھا کہ اگر میری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔" اس نے گڑبڑاتے ہوئے جلدی جلدی کہا تو اسے سنجیدہ نگاہوں سے گھورتی جیز یکدم ہنس پڑی۔ اور سجاول کو لگا جیسے اس کے من میں جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

"آپ کو معافی کی ضرورت نہیں مسٹر سجاول۔ ویسے آپ ایک انٹرسٹنگ پرسنالٹی ہیں۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

"یہ بات آپ اپنی سہیلیوں کو بھی ضرور بتائیے گا، یہ جب بھی مجھے دیکھتی ہیں خوامخواہ ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں۔" سونی کے ساتھ مختلف لوازمات کی ٹرے اٹھائے ایلی اور حنا نمودار ہو رہی تھیں اور اسے جیز کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بناتے دیکھا تو منہ کے زاویے بھی ذرا بگڑ ہی گئے تھے۔

"یہ آپ اپنے آفس میں کم اور یہاں زیادہ کیوں پائے جاتے ہیں؟" آلو اور چکن کے کٹلس کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے حنا اکتاہٹ سے بولی۔

"ارے حنا، ایسی کوئی بات نہیں۔" سندھل کو سونی نے چائے لان کی میز پر لگنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اسی لیے وہ بھی یہیں چلی آئیں اور آتے ہی حنا کا کچھ سخت قسم کا جملہ کانوں سے ٹکرایا تو بے اختیار اسے ٹوک بیٹھیں۔

"یہ تو میں ہی اسے اکثر بلا لیتی ہوں، مجھے اس میں اپنا دانی دکھائی دیتا ہے۔" انہوں نے قریب آ کر افسردگی سے کہا۔ تو حنا شرمندہ ہو گئی۔۔۔ دانش آنٹی کا اکلوتا بیٹا تھا جو بغرض تعلیم آسٹریلیا گیا تھا بعد میں یہاں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سندھل نے اسے وہیں سیٹل ہونے کو کہہ دیا تھا۔ آنٹی اسے یہاں آنے نہیں دیتی تھیں اور خود اس کے پاس جانا ان کی اپنی مصروفیات کی وجہ سے بہت کم ہوتا تھا۔

"نہیں آنٹی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے پشیمانی سے وضاحت کی۔

"جو بھی مطلب تھا، اب ساری باتیں اور شکوے گلے دور کرو اور مزیدار اسنیکس سے انصاف کرنا شروع کر دو۔" ایلی نے ماحول کی سنجیدگی کو زائل کرنے کے لیے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

سب بے اختیار مسکرا دیے۔

جو بھی تھا آج کی اس نشست کے بعد ان سب کے درمیان کسی حد تک بے تکلفی کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ لوگ دریائے سندھ کے کنارے پکنک کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آنا تو سندھل کو بھی تھا مگر آج صبح

ہی انہیں کورٹ کی جانب سے عدالت میں حاضر ہونے کا "آخری" نوٹس موصول ہوا تھا۔ اس لیے وہ انہیں کسی ضروری کام کا کہہ کر خود شہر چلی گئیں جبکہ سجاول کو ان کی ذمے داری سونپ گئیں... اور اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو آج کل یوں بھی اپنی عادت کے برخلاف نجانے کس لیے جیز کے قرب کے بہانے ہی تلاش رہا تھا اور یہاں تو قدرت نے اسے بھرپور جواز فراہم کر دیا تھا اور دل کی بے ایمانی اپنی جگہ مگر اسے سندھل کے خود پہ کیے جانے والے بھروسے کا پورا پورا خیال تھا۔ اسی لیے انہیں دریا کنارے واقع ایک ریستوران سے یہاں کی مشہور پلا مچھلی کھلانے کے بعد وہ ان سے قدرے الگ تھلگ جا بیٹھا تھا تاکہ وہ اس کی موجودگی سے پریشانی محسوس نہ کریں۔ یہ الگ بات کہ نگاہیں بھٹک بھٹک کر ایک ہی منزل کا طواف کیے جا رہی تھیں۔ سندھو اپنی مخصوص شان بے نیازی سے بہہ رہا تھا۔ اور اس کی مخصوص باس، نم آلود ہوا نے سارے میں پھیلا رکھی تھی۔

یکایک گھن گھور گھٹاؤں نے آسمان کا منہ اپنی چادر سے ڈھانپ دیا تو ماحول کی دلفریبی بام عروج پر جا پہنچی، جیز حسب معمول ہاتھ میں اپنا کیم لیے ویڈیو بناتی رہی اسے

پھر ڈھلنے پر انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا... ابھی وہ ذرا سی چڑھائی چڑھے ہی تھے کہ ایک پرسوز، سحر انگیز آواز نے ان کے بڑھتے قدموں کو گویا زنجیر پہنا دی۔

"سندھو میں سورج ڈوبتا ہے
تو اگلے دن افق پر
ابھر آتا ہے
مگر یہ تمہاری آنکھیں
سندھو سے بھی زیادہ گہری ہیں
ان میں میرا دل جو ڈوبا
تو آج تک نہیں ابھرا"

یہ ایک کچی اینٹوں، جس پر سپیدی پوتی گئی تھی والی چار دیواری تھی۔ جس کی چھت رنگ برنگی جھنڈیوں اور لال، ہری چمک دار پٹیوں سے بنائی گئی تھی۔ جبکہ چھت کے درمیان سے ایک ہرا بھرا پیپل سر نکالے ایستادہ تھا۔ اسی چار دیواری کے دروازے کے باہر بیٹھا سائیں اپنا اکتارہ لیے یہ گیت، آنکھیں بند کیے پورے جذب سے گا رہا تھا... گو کہ جیز کی سمجھ میں زبان نہیں آ رہی تھی مگر نجانے کیسی کشش تھی اس کی آواز میں کہ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھے گئی... جیز نے آگے بڑھ کر کچھ نوٹ سائیں کے کاسے میں ڈالے اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر دروازے سے اندر داخل ہو گئی... ایلی اور حنا نے بھی اس کی تقلید کی...

"ہائے او ربا!" ایلی بے اختیار سر پہ دوپٹہ رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو کوئی مزار لگتا ہے۔" اس نے تائید طلب نظروں سے سنجیدہ کھڑی حنا کو دیکھا۔ حنا کا سر تو خیر اسکارف سے ہمیشہ ہی ڈھکا رہتا تھا۔

"مزار؟" جیز نے بھی ایلی کو دیکھ کر سر پہ اجرک ڈالتے ہوئے جھنجلا کر پوچھا۔

"ہاں۔" حنا نے سنجیدگی سے کہا "یہ یہاں کا مشہور "معصوم جو مزار" ہے۔"

"کن برگزیدہ ہستیوں کا ہے؟" ایلی متاثر ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اس بات کا تو پتا نہیں۔" حنا نے کندھے اچکا کر لا علمی ظاہر کی "البتہ اس مزار کے ساتھ ایک پراسرار داستان ضرور منسوب ہے۔"

"کیسی داستان؟" جیز نے بے اختیار حنا کو دیکھ کر دلچسپی سے پوچھا۔

"مشہور ہے کہ کئی سال پہلے اسی جگہ دو محبت کرنے والے معصوم انسانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔" ان کے عقب میں موجود دروازے سے اندر داخل ہوتا سجاول بولا۔

اس کی آواز میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ بے اختیار جیز کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی... ایلی بے ساختہ اپنی جگہ سے دو قدم پیچھے ہٹی جبکہ حنا یونہی اس کی جانب دیکھے گئی۔

"کیوں قتل کیا گیا تھا انہیں' اور کیا ہے وہ داستان؟"
چند ثانیے کی خاموشی کے بعد' سنبھلتے ہوئے جہز نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"سننا چاہیں گی آپ؟" سجاول اپنی پینٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھتے ہوئے بولا۔

نہ صرف جہز بلکہ اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ایلی نے بھی میکانکی انداز سے سرہلا دیا تھا البتہ حنا یونہی سپاٹ انداز میں خاموش کھڑی رہی کہ وہ اس "مزار" کی "تاریخ" پہلے بھی کئی لوگوں کی زبانی سن چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھلی کری آیا پت..... سب خیریت رہی۔"

گہری رنگت' تیکھے نقوش والا تھکا تھکا سا سانول جس لمحے اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوا' تو سامنے ہی رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھا چاچا غلام علی اسے دیکھ کر خوشدلی سے بولا۔ دوسری چارپائی پر سلیقے سے اجرک اوڑھے اماں خدیجہ بیٹھی تھیں۔ وہ تو اسے دیکھ کر نہال ہی ہو گئیں۔ اس نے دونوں کو سلام کرتے ہوئے پہلے اماں اس کے بعد چاچا غلام علی کے گھٹنے چھوئے تو انہوں نے اس کی پشت پر اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں چاچا ویسے تو سب خیریت رہی..... بس راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اسی چکر میں ذرا دیر ہو گئی پہنچنے میں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھاری کالے رنگ کا سفری بیگ چارپائی کے نزدیک رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو شکر ہے اللہ سائیں کا..... بس اب تو جلدی سے نہا کر آجا پھر تیرے لیے کھانا نکالتی ہوں....." اماں خدیجہ نے نثار ہو جانے والے لہجے میں کہا۔

ظاہر ہے ان کا اکلوتا بیٹا پڑھائی کی غرض سے شہر میں رہ رہا تھا' جب کبھی وہ چھٹیوں میں گوٹھ آیا کرتا تو وہ اس پر یوں ہی ہزار جان سے نثار ہوا کرتی تھیں۔

"وہ اماں....." اس نے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محتاط لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "وہ میرے ساتھ میرے دو شہری دوست بھی آئے ہیں۔ آپ ان کے لیے بھی کھانے کا انتظام کر دیں اور چاچا سائیں!" اب اس نے گھورتی نگاہوں سے خود کو دیکھتے غلام علی کو مخاطب کیا۔ "آپ نواز سے کہہ کر مہمان خانہ کھلوا کر ان کا سامان وہاں رکھوا دیں۔"

"کیسے دوست ہیں تیرے؟ اور تو کیوں لے آیا انہیں یہاں؟" غلام علی نے قدرے ناپسندیدہ لہجے میں برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ چاچا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "حسن اور عمر میرے دوست ہیں..... دونوں کو بہت شوق تھا ہمارا گوٹھ دیکھنے کا بس اسی لیے ساتھ لے آیا میں انہیں۔"

"اب لے آئے ہو تو ان کا دھیان بھی رکھنا۔ جانتے ہو نا اپنے رسموں اور رواجوں کو..... اور یہ شہری لوگ تو ایسی باتوں سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔" وہ محتاط لہجے میں کہتا گیا۔

اس دوران اماں خدیجہ خاموشی سے بیٹھی رہیں البتہ غلام علی کی بات پر وہ کچھ متفکر ضرور ہو گئی تھیں۔

غلام علی کے خدشات پر سانول ہنس پڑا۔ "فکر نہ کرو چاچا سائیں' میں شہر میں رہ کر پڑھ لکھ گیا ہوں مگر اندر سے پکا دیہاتی ہوں اور آج بھی اپنی عزت کے لیے جان دے بھی سکتا ہوں اور لے بھی سکتا ہوں۔" آخر میں اس کا لہجہ کسی قدر سفاک ہو گیا تھا۔

"یہ کی ہے نا تو نے ادا غلام نبی (سانول کے والد) جیسی بات..... چل رکھواتا ہوں تیرے دوستوں کا سامان' جا تو نہا لے۔" وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

اماں خدیجہ جی نیچے جھک کر اپنی چپل تلاش کرنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سانول سے حسن کی دوستی یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں انگلش میں ایم اے کر رہے تھے جبکہ عمر کا ڈپارٹمنٹ علیحدہ تھا۔ چونکہ وہ حسن کا اچھا دوست

تھا تو سانول سے بھی اس کی خاصی دوستی ہو گئی .... دراصل حسن ہی کو اشتیاق تھا سانول کا گاؤں اور وہاں کا رہن سہن دیکھنے کا .... اور عمر کے گھر والے آج کل پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے سو وہ حسن اور سانول کے اصرار کرنے پر ان کے ساتھ ہولیا۔ مگر یہ تو اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں چلا آیا ہے .... نہیں جانتا تھا کہ وہ آیا نہیں لایا گیا ہے۔ تقدیر بھی اپنا آپ منوانے کی خاطر کیسی کیسی چالیں چلتی ہے کہ اس کے سامنے ہتھیار ڈالے بنا چارہ نہیں رہتا۔

☆ ☆ ☆

"اور یہ رہا آپ کا سامان ...." دوسرے دن سانول اپنا بیگ کھولے بیٹھا تھا اور ان لوگوں کے لیے لائے گئے تحائف اور منگوایا گیا سامان نکال نکال کر چارپائی پر ڈھیر کر رہا تھا تبھی اپنے کمرے سے ماروی برآمد ہوئی۔

"اور ادا .... جو سامان میں نے منگوایا تھا وہ لے کر آئے؟" اس نے نزدیک آتے ہوئے پرشوق لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔" سانول نے بے ساختہ اپنا سر پیٹا "وہ تو میں لانا بھول ہی گیا۔"

"ہائے کیسے بھول گئے .... میں نے تو مومل کو بتا بھی دیا تھا کہ آپ میرے لیے سامان لے کر آؤ گے .... اب وہ میرا کتنا مذاق بنائے گی۔" اس کا کھلتا گلاب جیسا چہرہ مرجھا گیا اور آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی .... چند ثانیے سانول یونہی سنجیدگی سے بیٹھا رہا پھر بے ساختہ ہنس پڑا۔ اماں خدیجہ بھی اس کی شرارت سمجھ کر مسکرادیں۔

"مذاق کر رہا تھا پگلی، کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنی اتنی پیاری بہن کی فرمائش ٹال دوں یا بھول جاؤں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

"معاف کرنا ادا سائیں، میں آپ کا مذاق سمجھ نہیں پائی۔" وہ اب جھینپی جھینپی سی اپنی آنکھ میں آئی نمی صاف کرنے لگی۔

سانول اس سے الگ ہوا اور شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اٹھالو .... یہ رہا تمہارا سامان۔"

"آہا .... سب میرا ہے؟" وہ خوشی سے چہکی۔

"ہاں ...."

"بہت شکریہ آپ کا ادا سائیں .... آپ نے میرا مان بڑھا دیا۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں کہتی اپنا سامان اٹھا کر سرشاری سے اندر کی جانب چل دی۔ تب سانول نے مسلسل مسکراتی اماں کو دیکھ کر خود بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت معصوم ہے اماں ماروی .... اللہ سائیں اسے ہمیشہ خوش رکھے۔"

مگر آج وہ یہ دعا اسے دیتے ہوئے نہیں جانتا تھا کہ کل وہ خود ہی اس دعا کی قبولیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو گا۔

☆ ☆ ☆

"سنا ہے تیرا ادا اپنے ساتھ شہری مہمان بھی لے کر آیا ہے؟" مومل نے جو ماروی کے پاس آئی بیٹھی تھی، سانول کے شہر سے لایا گیا سامان دیکھ لینے کے بعد سوال کیا۔

مومل، غلام علی کی بیٹی اور سانول کی منگیتر تھی۔ اچھی معقول لڑکی تھی۔ مگر جب سے سانول شہر پڑھنے کے لیے گیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ ہمہ وقت یہی خوف اسے کھائے جاتا کہ اتنا پڑھ لکھ جانے کے بعد کیا وہ اس گوٹھ میں رہنے والی پانچویں فیل کا ساتھ بہ آسانی قبول کر لے گا؟

مگر اس کے خدشات بے جا ہی تھے کہ سانول پڑھ لکھ جانے کے باوجود کچھ باتوں میں کٹر واقع ہوا تھا۔ پڑھنا لکھنا اپنی جگہ مگر بیوی اسے گاؤں ہی سے چاہیے تھی .... حالانکہ اس کے ساتھ کئی پری چہرہ بھی زیر تعلیم تھیں مگر بات محض دوستی سے آگے نہ بڑھائی تھی اس نے۔

"ہاں وہیں شہر میں ان کے ساتھ پڑھتے ہیں، دونوں

دوست ہیں ان کے.... اماں کو بتا رہے تھے کہ انہیں ہمارا گوٹھ دیکھنے کا بہت شوق تھا بس اسی لیے ساتھ آ گئے۔" ماروی نے اپنی چیزیں واپس شاپر میں ڈالتے ہوئے بتایا۔

"تو نے دیکھا ہے انہیں؟ کیسے دکھتے ہیں؟" اس نے پر تجسس لہجے میں پوچھا۔

"مجھے کیا پتا کیسے دکھتے ہیں وہ تو مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" اس نے شاپر کو گرہ لگاتے ہوئے سادگی سے بتایا۔

"مگر سارا دن تو وہیں پڑے نہیں رہتے باہر بھی تو نکلتے ہی ہوں گے۔" وہ اس کی سادگی سے نجانے کیوں چڑ گئی۔

"ہاں نکلتے تو ہوں گے۔" اس نے جھٹ اس کی بات سے اتفاق کیا اور شاپر اٹھا کر کونے میں رکھے صندوق میں لے جا کر رکھنے لگی....

"پتا ہے بابا سائیں بہت ناراض ہیں تیرے ادا پر کہ اسے کیا ضرورت تھی اپنے شہری دوستوں کو گوٹھ لے کر آنے کی۔" اس نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

"مگر اس میں ناراضی والی کون سی بات ہے؟" اسے چچا کی ناراضی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

"تو تو ہے ہی سدا کی بے عقل۔" مومل کو اس کے انداز نے بری طرح تپا دیا تھا۔

"اب یہ شہری لوگ کیا جانیں کہ ہمیں اپنے رسم و رواج کتنے پیارے ہیں' یہ لوگ تو کچھ جانتے نہیں یہاں آ کر یونہی دندناتے پھرتے ہیں۔ اب اگر کل کلاں کوئی بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟" وہ بہت فکر مندی سے بولی جیسے اسے پورا یقین ہو کہ کوئی بات ہو کر رہے گی....

"کیسی بات مومل؟" ماروی نے بڑے تحیر سے استفسار کیا تھا مگر مومل بھنا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس' تیری یہی معصومیت نا ایک دن تجھے دریا میں ڈبو دے گی.... میں جا رہی ہوں دوپہر کی روٹی پکانے' بابا سائیں کھیت میں میرا انتظار کرتے ہوں گے۔"

"کھیتوں پر جا رہی ہے....؟" ماروی نے اس کی دوسری باتیں نظر انداز کرتے ہوئے سرہلا کر کہا۔ "آج تو ادا سائیں بھی وہیں جانے کا کہہ رہے تھے۔ چل اچھا ہے' تیری ملاقات ہو جائے گی ان سے۔" ماروی نے شریر لہجے میں اسے چھیڑا تو وہ آن واحد میں شرم سے سرخ پڑ گئی۔

"ہائے' سچ کہہ رہی ہے تو تب تو مجھے اس کے لیے بھی روٹی پکا لینی چاہیے اور مجھے تھوڑی تیاری بھی کرنی ہو گی۔ اس میں تو بہت دیر لگ سکتی ہے۔" وہ قدرے سوچ میں پڑ گئی۔

"تو جا.... جا کر تیار ہو' چچا سائیں اور ادا سانول کے لیے روٹی میں ڈال دیتی ہوں پھر ساتھ ہی دینے چلیں گے۔" ماروی نے اس کی پریشانی کا حل نکالتے ہوئے کہا۔

تو مومل بے ساختہ مسکرا کر بولی۔ "تو بہت اچھی ہے ماروی.... میں بس تھوڑی دیر میں تیار ہو کر آئی۔"

☼ ☼ ☼

"کیوں سائیں عمر! بہت آسان کام کر رہا ہوں نا میں؟" سانول نے مزے لینے والے انداز میں عمر سے پوچھا۔

وہ آج صبح سے ان لوگوں کو گاؤں کے مختلف مقامات کی سیر کروا رہا تھا۔ اب دوپہر ہو چلی تھی تب وہ انہیں لے کر اپنے کھیتوں پر پہنچا تھا۔ جہاں غلام علی اپنے دو ایک ہاریوں کے ساتھ مصروف تھا۔ سانول نے بڑے تفاخر سے انہیں اپنے کھیت دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں ہمارے کھیت' ہماری محنت کا منہ بولتا ثبوت۔"

تو حسن مسکرا کر شرارتی لہجے میں بولا۔ "لیکن یار تم تو چار سالوں سے وہاں شہر میں رہ کر پڑھائی کر رہے ہو تم نے یہاں محنت کب کی؟"

"کیا بچپن میں کیا کرتے تھے کھیتی باڑی؟" عمر نے بھی ازراہ مذاق پوچھا۔

"ارے یارو ..... یہاں جب بچہ چھ سات سال کا ہو جاتا ہے تو اسے کام پر لگالیا جاتا ہے تاکہ اسے کھیت کھلیانوں کی سمجھ آسکے البتہ جو بچے اسکول جانے لگتے ہیں ان پر یہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔" سانول نے مسکرا کر انہیں بتایا۔

تو حسن بے ساختہ ہی ہنس کر بولا۔ "اس کا مطلب تو یہی ہوا ناکہ تمہیں باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔"

"ایسی بات نہیں، چاہے پڑھ لکھ گیا ہوں مگر ہوں تو بالآخر ایک ہاری ہی کا بیٹا نا۔" وہ اب کی بار سنجیدگی سے بولا تو عمر نے اسے اکسایا۔

"اچھا تو ذرا پھر ہمیں کوئی ثبوت بھی دو۔"

"یہ بات ہے تو یہ لو..... "سانول جذباتی ہو کر کھیت سے باہر پڑی درانتی اٹھاتا ہوا اندر کھیت میں جا گھسا..... غلام علی ان لوگوں سے تھوڑی دور کام کر رہا تھا..... کڑی دھوپ اور سخت گرمی کے باوجود اس کی پھرتی اس عمر میں لائق ستائش تھی۔

"اوہ یار..... یہ آسان کام تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔" عمر نے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تو دیر کس بات کی بسم اللہ کیجیے۔" سانول جو اس طرح کی محنت کا عادی نہ تھا جلد ہی پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ اس کی بات پر بھنا کر بولا۔

"چل یار! آج تو دکھا ہی دیتے ہیں اسے کہ ہم بھی یہ آسان سا کام کر سکتے ہیں۔" عمر نے کہا اور درانتی اٹھاتے ہوئے کھیت میں جا گھسا۔

البتہ حسن احمق نہ تھا..... اس لیے کھیت میں داخل ضرور ہوا مگر بس یونہی..... کوئی اوزار اٹھا کر نہیں..... کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کرنا کیا ہے پھر سانول کو دیکھ دیکھ کر فصل کاٹنے کی کوشش کرنے لگا..... مگر کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ حال سے بے حال ہو گیا۔

"ہاں بھائی..... وہ کیا کہتے ہیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔" وہ سیدھا ہو کر پسپا لہجے میں بولا تو حسن اور سانول قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"چلو آؤ چل کر منہ ہاتھ دھو لو۔" سانول کھیت کے کنارے بنے ایک کچے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

"ہاں آتا ہوں..... "وہ جھک کر اپنی جینز اور جوگرز پر لگا کیچڑ اور کچرا وغیرہ صاف کر رہا تھا کہ..... ایک دلکش نسوانی آواز بڑی زور سے اس کے عقب میں گونجی۔

"ہاؤ..... "اس نے بے ساختہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

اور یہ بتانے کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں پر کیا گزرا کرتی ہے؟

☼ ☼ ☼

"ہائے ماروی..... میری تو جان ہی نکل گئی تھی اس شہری بابو کو تیرے سامنے کھڑا دیکھ کر۔" مومل نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ ابھی بھی اسی واقعے کے زیر اثر ہو۔

اور وہ واقعی تھی بھی۔ اس کے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اس وقت کہ جب ماروی نے عمر کو سانول سمجھتے ہوئے پیچھے سے جا کر ڈرایا تھا اس روز اتفاقاً"عمر اور سانول دونوں ہی نے کالے رنگ کی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ قد کاٹھ بھی تقریباً"ایک جیسا تھا اسی لیے ماروی دھوکا کھا گئی..... قسمت نے جنہیں ملوانا ہو، ان کے لیے وہ کیسے کیسے عمدہ حیلے بہانے تلاش کر لیتی ہے۔

"ہاں مومل جب اس نے مڑ کر دیکھا..... جان تو میری بھی نکل گئی تھی اسی لمحے۔" ماروی اپنی ٹھوڑی گھٹنے پر ٹکائے گم صم سی بیٹھی تھی نجانے کل سے اسے کیا ہو گیا تھا۔

"شکر کر ماروی! کسی نے تجھے یا مجھے کچھ کہا نہیں۔ ورنہ جانتی ہے نا تو بابا سائیں کو..... جب ایک دم سے سب وہاں چلے آئے میرا تو سانس ہی سینے میں اٹک گیا تھا۔" مومل ڈرے ڈرے لہجے میں بولی۔

"چھوڑونا مومل... کوئی اور بات کر۔" ماروی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
"کیوں تجھے کیا ہوا... کل سے دیکھ رہی ہوں کچھ کھوئی کھوئی سی ہے۔" مومل نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"پتا نہیں کیوں دل خالی خالی سا ہو رہا ہے۔" وہ چارپائی پر بچھی رلی کے ڈیزائن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے یاسیت سے بولی۔
"چل اب اتنی فکر نہ کرو۔" مومل نے نجانے کیا سمجھ کر اسے دلاسا دینا شروع کر دیا۔
"تو نے سانول کو کہہ تو دیا تھا کہ تو اس کے دوست کو اس کی غلط فہمی میں ڈرا بیٹھی پھر تو نے اس سے معافی مانگ لی تھی... ہاں بابا سائیں تھوڑا ناراض ضرور ہوئے مگر بعد میں وہ بھی تجھ سے ٹھیک ہو گئے تھے تب تو کیوں اس بات کو دل سے لگا رہی ہے۔" مومل نے اسے سمجھانا چاہا۔
"نہیں بس یوں ہی۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔
"کہیں اس شہری بابو نے تجھے نظر تو نہیں لگا دی... دیکھ بھی تو کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رہا تھا۔" مومل اس کا دھیان ہٹانے کو اپنے تئیں چھیڑتے ہوئے بولی۔ مگر اس کی بات پر ماروی کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا تھا۔
"بس کرو مومل۔" اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے یہاں وہاں محتاط نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "چپ کر جا اگر کہیں کسی نے کچھ سن لیا نا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"
"اچھا چل چھوڑ۔" اس کے خوفزدہ ہونے پر وہ مسکرا دی "اب اتنا ڈر مت، آرام سے سو جا... میں کل دوپہر میں کام کرنے کے بعد آؤں گی پھر۔" یہ کہہ کر مومل تو یہاں سے چلی گئی... مگر ماروی کے دھیان کے پردے پر وہی دو روشن آنکھیں بار بار سرسراتی رہیں کہ جن کی روشنی نے کل سے اس کی روح کو منور کر رکھا تھا۔

"کیا حسین صورت تھی وہ... جسے صرف خوب صورت کہنا اس چہرے کی توہین ہے پری چہرہ، روشن ماہتاب... غنچہ دہن... یا پھر... یا پھر۔" عمر کروٹیں بدلتے بدلتے بے قراری سے اٹھ بیٹھا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔
اس نے دیکھا حسن اس کے برابر میں اطمینان سے میٹھی نیند سو رہا تھا... وہ سو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے دل نے اسے دعا نہیں دی تھی۔ اس کی آنکھیں سکون سے بند ہو سکتی تھیں کیونکہ رت جگے ان کا مقدر نہیں بنے تھے... اس کا قرار نہیں لٹا تھا۔
بے قراری حد سے سوا ہو چلی تھی... وہ کچھ دیر تو یونہی عالم اضطراب میں اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا رہا پھر اپنے بستر سے نیچے اتر آیا اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا کمرے میں موجود واحد کھڑکی، جو صحن کے رخ پر کھلی ہوئی تھی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
ماہ کامل اپنی پوری آب و تاب سے آسمان کے ماتھے پر جگمگا رہا تھا۔
"ہاں۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور اپنی نگاہیں اس نے چاند پر مرکوز کرتے ہوئے گویا اسے ہی مخاطب کیا تھا۔ "وہ چہرہ بھی تو تیرے جیسا ہی تھا، روشن، شفاف اور پرکشش... مگر اب دوبارہ وہ کیسے ملے گی؟ میں کیا کروں یہ میرے دل میں یکایک ہی اس کی دید کی پیاس کیوں بڑھتی چلی جا رہی ہے... بتاؤ... جواب دو نا مجھے۔" وہ ناراض لہجے میں سوالی بنا کھڑا تھا۔
اور چاند... اس نے ایسے دیوانے اکثر ہی دیکھ رکھے تھے۔ سو وہ مسکرا رہا تھا۔ بڑی ہی معنی خیزی سے!

☆ ☆ ☆

"پُٹ... بہت پڑھ لیا تو نے بس اب شادی کر لے۔" خدیجہ بڑی شفقت سے رغبت سے ناشتہ کرتے ہوئے سانول کو دیکھ کر بولیں۔
وہ اس کے ساتھ ہی چارپائی پر براجمان مسلسل

اسے دستی پنکھا جھل رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ اسے خاندان اور محلے بھر کی تازہ ترین خبروں سے باخبر بھی کرتی جا رہی تھیں۔ صحن کی بائیں دیوار کے ساتھ چولہا رکھے ماروی تازہ تازہ خستہ خستہ سنہری پراٹھے اتار رہی تھی۔

"نہیں اماں" اس نے نوالہ چباتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو میرا فائنل ایگزام رہتا ہے۔۔۔ اور پھر آپ جانتی ہو کہ میں پہلے ماروی کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتا ہوں۔"

اپنے ہاتھ پیلے ہونے کے ذکر پر ماروی نے اپنا سر کچھ اور جھکا لیا تھا۔ اور مزید دلجمعی سے پراٹھا بیلنے لگی۔

"تو پھر تو غلام علی کو اب خود ہی یہ جواب دے دے۔ وہ کئی بار آکر اپنے منہ سے مومل کو رخصت کروانے کا کہہ چکا ہے بلکہ پچھلی بار تو صاف کہہ گیا تھا کہ وہ اب مزید انتظار نہیں کرے گا۔" انہوں نے خفگی سے بتایا۔

"ایسے کیسے انتظار نہیں کریں گے۔" یکدم ہی اس کے تاثرات بگڑے تھے۔ "وہ عزت ہے میری۔۔۔ میرے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔" اس نے خالی ٹرے پرے کھسکائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بابا کہہ دوں گی مگر پہلے تو ناشتہ تو کر لے۔" خدیجہ کو اسے صرف "تین" ہی پراٹھوں کے بعد اٹھتے دیکھ کر ملال نے آگھیرا۔

"کر لیا ہے اماں، فکر نہ کریں اور اب بس سنجیدگی سے ماروی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرنا شروع کریں اور باقی رہے چچا سائیں ان کو میں خود دیکھ لوں گا۔۔۔ فی الحال آپ جلدی سے ناشتہ بنوائیں، میرے دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے صحن کے نلکے سے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بس بنا ہی رہی ہے ابھی تیار ہو جائے گا۔" خدیجہ نے اس کے موڈ کے پیش نظر جلدی سے کہا۔۔۔ تو ماروی جس نے ظاہر ہے کہ ساری گفتگو سن ہی لی تھی، اپنے ہاتھ مزید تیز چلانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"صاف کہہ دیا ہے تیرے ادا نے بابا سائیں کو۔۔۔ کہ پہلے ماروی کو بیاہوں گا تب ہی تجھے رخصت کروائے گا وہ۔" ماروی کی رنگین پایوں والی چارپائی پر براجمان مومل سخت ناراض دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اس وقت ماروی کو لینے کی خاطر یہاں آئی بیٹھی تھی۔۔۔ گوٹھ کے باہر تین روزہ میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ میلہ ان کے گوٹھ کے باہر ہر سال ہی لگا کرتا تھا۔ جہاں دیگر نزدیکی گوٹھوں سے بھی وہاں کے باسیوں کی بڑی تعداد شرکت کیا کرتی تھی۔ میلے میں جھولوں، کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹالوں کے علاوہ مختلف چیزوں کی دکانیں وغیرہ بھی سجا کرتی تھیں اور یہ ماروی، مومل اور ان کی آس پاس کی سہیلیوں کا معمول تھا کہ وہ لوگ اس میلے میں بڑے ذوق و شوق اور اہتمام سے شرکت کیا کرتی تھیں۔

"ارے پگلی!" ماروی نے اپنی آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیرتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا۔ "وہ تو انہوں نے یونہی کہہ دیا ہے، اصل مسئلہ تو ان کے امتحانوں کا ہے۔"

"نہ ری۔" مومل نے اپنا سر جھٹکا تو اس کے کانوں میں سجا چاندی کا بھاری جھمکا آگے پیچھے ڈولنے لگا۔ تیرے ادا کو مجھ سے زیادہ تیری شادی کی فکر ہے۔"

سارا غصہ سانول پہ تھا جو وہ یہاں نکال رہی تھی۔ اب بھلا یہ کوئی بات ہوئی۔ پڑھائیاں کرے وہ اور انتظار اس کے نصیب میں آئے۔۔۔ اور آخر اس نے اتنا پڑھ لکھ کر کرنا ہی کیا تھا؟ مومل تو یوں بھی دل و جان سے اس بانکے ہاری سانول پہ فدا تھی کہ جس کا نام بچپن ہی سے اپنے نام کے ساتھ جڑا دیکھ رہی تھی۔ سانول اس سے جب بھی مخاطب ہوتا تو بڑے نرم گرم سے لہجے میں بات کیا کرتا اور مومل مہینوں سرشار رہا کرتی۔

"سب سمجھتی ہوں کہ کیوں اتنی خفا ہو رہی ہے تو؟" سرمے سے آنکھیں سجانے کے بعد وہ اس کی

جانب گھوم کر شرارتاً" بولی۔ "تجھ سے اس بار انہوں نے ابھی تک کوئی میٹھا بول جو نہیں بولا مگر فکر نہ کر اماں سے وہ کہہ رہے تھے کہ میرے علاوہ چچا مومل کو کہیں رخصت کر کے تو دیکھے مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اس نے بڑے پیار سے مومل کی ٹھوڑی چھو کر اسے بتایا تو وہ مارے شرم کے سرخ ہو گئی۔

"چل۔" اس نے مصنوعی ناراضی سے ماروی کا ہاتھ جھٹکا۔ "اب جلدی کر۔۔۔ ساری ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہوں گی۔"

✡ ✡ ✡

"اور سائیں شہر میں پڑھائی کے علاوہ کیا کرتے ہو؟" نواز نے اپنے ساتھ کھڑے سفید کرتے شلوار میں ملبوس عمر سے پوچھا۔

حسن تو صبح سے سانول کے ساتھ اس کے کسی کام کے سلسلے میں نزدیکی گوٹھ گیا ہوا تھا' وہ لوگ تو اسے بھی ساتھ لے جانے پر کمربستہ تھے مگر اس نے بڑی دقتوں سے اپنی جان خلاصی کروائی تھی۔ پہلی وجہ تو اس کی طبیعت کی بے زاری اور سستی تھی جبکہ دوسری وجہ وہ خود جاننے سے قاصر تھا۔۔۔ دن چڑھے جب وہ گھر میں پڑے پڑے بے زار ہو گیا تب غسل کر کے یونہی باہر چلا آیا۔ سوئے اتفاق گلی کے کونے میں نواز دو چار لوگوں کے ساتھ کھڑا مل گیا' نواز ہی نے اسے روکا اور ادھر ادھر کی بات چیت کرنے لگا۔

"کرکٹ کھیلتا ہوں' گھومتا پھرتا ہوں' موویز دیکھتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے بتایا تو ایک طنز آمیز مسکراہٹ نواز کے لبوں پر رینگ گئی۔۔۔

"واہ سائیں سارے نوابی شوق ہیں تمہارے' لگتا ہے امیر باپ کے بیٹے ہو؟" اس نے اپنی کالی سیاہ گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں دراصل۔۔۔" یک دم ہی نواز اعلان کرنے کے سے انداز میں "پاسو۔۔۔ پاسو۔" چلایا۔

آن واحد میں خود نواز سمیت ان کے ساتھ کھڑے تینوں ہی افراد نے اپنے چہرے دیوار کی جانب کر لیے

تھے۔۔۔ اس سے قبل کہ عمر کچھ سمجھ پاتا۔۔۔ سامنے سے چار پانچ لڑکیاں آتی دکھائی دیں۔ گو کہ ان سبھی نے اپنی اوڑھنیاں اپنے چہروں پر گرا رکھی تھیں مگر عمر کو ان میں سے ماروی کو پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں اٹھانی پڑی۔ شاید ہر محبت کرنے والے کا دل اپنے محبوب کے معاملے میں انتہائی حساس ہوتا ہے۔

"ہائے ماروی۔۔۔ یہ تو وہی ہے سانول کا شہری دوست۔" وزدیدہ نگاہوں سے نا صرف مومل بلکہ ماروی بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

"شش۔۔۔" ماروی نے اپنے ساتھ چلتی اور اپنے کان میں بولتی مومل کو کہنی مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے قدم مزید تیز کر لیے۔

بس لمحے بھر کی بات تھی مگر جیسے عمر کا دل پھر سے زندہ ہو گیا۔

"بابا۔۔۔ یہ کیا حرکت کی تم نے؟" وہ جو ابھی ان ہی پُرفسوں لمحات کے زیر اثر تھا نواز کی بات پر ہڑبڑاتے ہوئے چونک پڑا۔۔۔ نواز اسے سخت غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا جبکہ دیگر تاسف سے۔۔۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے ادراک ہو گیا کہ وہ "کچھ" غلط کر بیٹھا ہے۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" اس نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"جب میں نے صدا لگائی پاسو۔۔۔ پاسو تو تم نے اپنا چہرہ دیوار کی جانب گھمایا کیوں نہیں؟" وہ برہمی سے بولا۔

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی صفائی دی۔

"ارے بابا۔۔۔ یہ ہمارے ادھر کا رواج ہے کہ جب بھی گوٹھ کی بہن بیٹیاں کسی جگہ سے گزر رہی ہوتی ہیں تو ہم ان کے احترام میں اپنے چہرے دوسری جانب گھما لیتے ہیں اور اس صدا لگانے کا مطلب یہی ہوتا ہے۔" نواز کے بجائے ڈنو نے اسے تفصیل بتائی تو وہ کھسیا سا گیا۔

"آئم سو سوری۔۔۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا' اچھا مجھے ذرا کچھ کام ہے۔۔۔ چلتا ہوں۔" اس نے بعجلت ان سے اپنی جان چھڑائی اور سرعت سے قدم آگے بڑھا لیے۔ اسے یہ موقع قدرت نے ان لوگوں کے آگے جواب دہی کے لیے فراہم نہیں کیا تھا۔

"ٹھیک کہتے ہیں سائیں غلام علی۔" اس کی لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی پشت کو بڑی چبھتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے نواز نے کہا تھا۔ "یہ شہری لوگ بڑے ہی بے حیا ہوتے ہیں۔ اس بات کا ذکر سائیں سے کرنا ہی پڑے گا۔"

☆ ☆ ☆

"ہائے اللہ ماروی۔۔۔ وہ دیکھ مجھے لگ رہا ہے وہ ہمارا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گیا ہے۔" مومل نے دہل کر بغور سر جھکائے کسی چوڑی کا ڈیزائن دیکھتی ماروی کو مخاطب کیا۔

وہ سب اب سے کچھ دیر قبل ہی میلے میں پہنچی تھیں۔ دوسری لڑکیاں تو اپنی اپنی دلچسپی کی چیزوں کی جانب بڑھ گئیں۔ مومل' اور ماروی رنگ برنگی چوڑیوں کی دکان کی طرف چلی آئیں۔ عمر بڑی احتیاط سے ان کا تعاقب کرتا یہاں تک پہنچا تھا۔

"ہائے۔" ماروی نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ "کدھر ہے وہ؟"

"اوہ اللہ سائیں۔" مومل کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔۔۔ "وہ تو ادھر ہی چلا آرہا ہے۔" اس نے سنسناتی آواز میں اپنا منہ ماروی کے مزید قریب لے جا کر سرگوشی کی۔۔۔

"دوسرا رنگ بھی ہے ادی۔۔۔ دکھاؤں؟" چوڑیوں سے بھرے اسٹال کی دوسری جانب کھڑے دکان دار نے انہیں آپس میں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر خالص پیشہ ورانہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چوڑیوں کا دوسرا ڈبا کھولتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو' ابھی دیکھ رہے ہیں۔" مومل نے جلدی سے کہا۔ اس کا سارا دھیان تیزی سے قریب آتے عمر کی جانب تھا جو اب بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔

"سلام بھائی۔" وہ دکان پر پہنچنے کے بعد یکدم ہی

دکان دار سے مخاطب ہوا۔ دُکاندار نے چونک کر اسے دیکھا۔ ماروی اور مومل اپنی جگہ جم کر رہ گئیں۔

"بھائی! بہت پیاس لگی ہے... ایک گلاس پانی ملے گا؟" اس نے دکان دار سے کہا۔

"ہاں... ہاں اڈا!" وہ خوشدلی سے مسکرا کر بولا۔ ابھی دیتا ہوں۔" اور مڑ کر دو قدم کے فاصلے پر موجود اسٹول پر رکھے نارنجی رنگ کے کولر کی جانب بڑھ گیا۔

"سنو اے لڑکی!" عمر نے بظاہر سر جھکا کر چوڑیاں دیکھتے ہوئے، سہمی ہوئی سی ماروی کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر مخاطب کیا۔

"میں تمہارے لیے اجنبی تو نہیں... مگر پھر بھی تمہیں یاد دلا دوں کہ اس روز کھیتوں میں اتفاقاً ہماری ملاقات ہوئی تھی اور اس دن کے بعد ہی سے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں... کل دوپہر کو میں آم کے باغ میں تمہارا انتظار کروں گا اور اگر جو تم نہ آئیں تو بس سمجھ لینا کہ میں نے تمہارے گھر کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جانا ہے۔" عمر نے اپنی بات مکمل کی اور سر اٹھا کر بڑی بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا...

ماروی دم بخود رہ گئی۔

"ارے کہاں چلا گیا؟" دکان دار جو ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر پلٹا تھا تعجب سے بولا۔

"بڑے جلدی میں تھا... چلا گیا۔" گھبرائی ہوئی مومل نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

ماروی ابھی تک پتھرائی ہوئی سی کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہائے مومل...! اب کیا ہو گا؟ وہ شہری بابو تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔"

کل سے ماروی کا رو رو کر برا حال تھا۔ کل وہ دونوں میلے کی رونقیں یونہی چھوڑ کر افتاں و خیزاں واپس پلٹی تھیں۔ خدیجہ کے استفسار پر انہوں نے ماروی کی طبیعت کی خرابی کا بہانا گھڑا تھا۔ بہانا اپنی جگہ، مگر واقعی اس کی حالت کل سے کافی خستہ ہو رہی تھی۔

"لگتا ہے بڑی بری طرح بھا گئی ہے تو اسے تو نے نہیں دیکھا ماروی، جاتے جاتے اس نے تجھے بڑی میٹھی میٹھی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر تو نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اپنا کہا کر گزرے گا۔" اس کے نزدیک بیٹھی مومل تشویش سے بولی۔

"چری نہ بن۔" ماروی اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ "کیا تو نہیں جانتی کہ ہمارے ہاں دل کی بات ماننے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔"

"تو کیا تیرا دل بھی اس کے نام پر دھڑکنے لگا ہے؟" مومل نے تحیر سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں۔" وہ جیسے اپنی ہی کسی کیفیت پر جھلاتے ہوئے بولی۔ "مگر اتنا ضرور ہے کہ جس دن سے اسے دیکھا ہے، میرے سینے میں کچھ سلگتا ہے مومل! میرے اندر جیسے اس کی وہ نگاہیں پنجے گاڑ کر بیٹھی ہیں، کسی ناسور کی طرح۔" وہ مومل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بالآخر بے بسی سے کہنے لگی۔

مومل ششدر رہ گئی۔

"اس کا مطلب اس کے من میں کھوٹ نہیں۔" کچھ دیر بعد مومل بولی۔ "اگر ہوتا تو اس کے دل کی آگ تیرے من تک یوں نہ پہنچی ہوتی۔"

"مگر میں کیا کروں مومل... اب کیا کروں؟" وہ پھر سے چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

وہ اس سے پوچھ تو رہی تھی مگر اسے اور کیا کرنا تھا محبوب کی صدا پر لبیک کہنے کے علاوہ۔

☆ ☆ ☆

"میں جانتا تھا کہ میرے جذبے کی سچائی تمہیں ضرور کھینچ لائے گی۔" وہ حسن کو بنا بتائے صبح ہی سے یہاں چلا آیا تھا۔ اس باغ کا شمار گوٹھ کے نسبتاً سنسان باغوں میں کیا جا سکتا تھا اور اتنے دن گوٹھ کے سیر سپاٹوں کے بعد عمر اتنا تو بہرحال جان ہی گیا تھا اسی لیے اسے یہاں بلایا تھا۔ مگر اس کے آنے کی زیادہ امید بھی نہیں تھی۔ اب جب کہ وہ سامنے تھی تو اس کے

دل میں جذبات کا جیسے طوفان سا آیا ہوا تھا۔

"تم جانتے تھے کہ میں آؤں گی؟ مگر کیسے؟" وہ جو درخت کے سائے تلے مارے شرم کے سر جھکائے کھڑی تھی' اس کی بات پر تحیر سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ ایسے کہ محبت دو دلوں کا شکار بیک وقت کیا کرتی ہے۔۔۔ میرا دل گھائل ہو چکا ہے کیا تمہیں دل میں درد محسوس نہیں ہو رہا؟" اس نے نثار ہوتی نظروں سے اس کی حیران آنکھیں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے ایسی باتیں کرنی نہیں آتیں۔" وہ اس کے اظہار محبت پر شرم سے گلابی پڑتے ہوئے مدھم آواز میں بولی "مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ کوئی تو جذبہ ہے جو مجھے بے اختیار تمہاری جانب کھینچ لایا ہے۔"

"بس اسی بے اختیاری کا نام محبت ہے ماروی۔" وہ جو درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا بے اختیار بولا۔

"تم نہیں جانتے عمر۔۔۔ یہاں محبت کرنے والوں کا مقدر صرف جدائی ہوا کرتی ہے۔" اس نے خوف و یاس سے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میری محبت ہو اور اس وقت میرے سامنے دنیا کی سب سے بڑی حقیقت بن کر کھڑی ہو۔" اس نے بڑے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔۔۔ اور ماروی جو یہاں تک ہزاروں اندیشے' وسوسے اور خوف پالتی آئی تھی اس کی محض ایک تسلی آمیز مسکراہٹ پر اپنا دامن ان سب سے جھٹک بیٹھی۔۔۔

نجانے یہ محبت کرنے والے ایک دوسرے کی زبان پر اتنا اعتبار کیوں کر لیتے ہیں؟

☆ ☆ ☆

"سانول! میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ اپنے شہری دوست' تو لے تو آیا ہے مگر انہیں لگام ڈال کر رکھنا۔" غلام علی نے سانول سے غصے میں کہا۔

سانول اس وقت ان کے گھر کے صحن میں رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھا' اپنی مختصر سی زمین کا کوئی حساب دیکھ رہا تھا۔ اس کی چاچی پڑوس میں گئی ہوئی تھی اور مومل' ماروی کے پاس۔

"کیوں چاچا! ایسا کیا ہو گیا جو آپ اتنے ناراض ہیں۔" اس نے ان کے انداز پر رجسٹر سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"نواز بتا رہا تھا' پرسوں اس نے پاسو سننے کے باوجود اپنا منہ دیوار کی طرف نہ موڑا۔" وہ ناراضی سے بتانے لگا۔

"اوہ چچا سائیں! ان کی شکایت پر وہ مسکرا اٹھا۔ "اس نے کس نے؟ حسن تو میرے ساتھ' ساتھ والے گوٹھ گیا ہوا تھا؟ اچھا! عمر نے؟ اب چچا اسے کہاں سمجھ آئی ہو گی اس بات کی؟" اس نے ان کا زائل کرنے کی کوشش کی۔

"تو بات کو مذاق سمجھ رہا ہے۔" وہ اس کے انداز پر مزید بھڑک اٹھا۔

"بات کو مذاق نہیں کہہ رہا' آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ عمر بہت اچھا لڑکا ہے۔۔۔ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔" اس نے اب کی بار سنجیدگی سے کہا۔

"چار جماعتیں پڑھ گیا ہے نا' اب اسی لیے تیرے نزدیک اس ان پڑھ ہاری کی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ ارے اسے اچھا کہہ رہا ہے جو پہلے دن ہی مجھے پسند نہیں آیا۔ جب کوئی چاند چڑھا دے گا نا وہ اچھا لڑکا تب پوچھوں گا تجھ سے۔" وہ ناراضی سے کہتا چلا گیا۔

"اچھا چچا' اتنا غصہ نہ کریں۔۔۔ آپ کہتے ہیں تو میں سمجھا دوں گا اسے' اب ٹھیک۔۔۔ اب مجھے کام کرنے دیں۔" اس نے غلام علی کو ٹھنڈا کیا اور دوبارہ اپنے سامنے کھلے رجسٹر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

غلام علی فی الحال خاموش ضرور ہو گیا تھا مگر اس نے اب اپنے طور پر کچھ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سچ مومل۔۔۔ وہ اتنا اچھا' اتنا سچا ہے کہ میرے پاس اس پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔۔۔ دل کرتا تھا کہ وہ یونہی میرے کانوں میں رس گھولتا رہے

اور میں دنیا سے بے پروا ہو کر صرف اسے ہی سنتی ---- جاؤں۔" ماروی کی آواز میں کوکتی کوئل اور کٹیلے نینوں کے گلابی پڑتے کنارے اور ان میں رقصاں تازہ ملاقات کا جادو سب ہی گواہ تھے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

"مگر ماروی۔" مومل نے سرتاپا محبت کے نئے نئے خمار میں ڈوبی اپنی سہیلی کو فکر مندی سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔ "جس راہ پر تو چل پڑی ہے تو جانتی ہے کہ یہ ہرگز بھی آسان نہیں۔ یہاں دو محبت بھرے دلوں کا مقدر جدائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"مقدر بدل بھی جاتے ہیں پگلی۔" ماروی نے جیسے اس کی بیوقوفانہ بات کو چنداں اہمیت نہ دیتے ہوئے جواباً اسے آگاہ کیا۔ "تو دیکھنا ہماری نیت ہماری راہ کو کتنا آسان بنا دے گی۔" اس نے پرعزم نگاہوں سے مومل کو دیکھتے ہوئے کہا تو مومل جو سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی یکدم مسکرا دی۔

"تیرے اندر اتنی ہمت کہاں سے آ گئی ماروی.... تیرا تو چڑیا جتنا دل تھا۔"

"میں خود بھی حیران ہوں مومل! مگر شاید محبت انسان کو جرات مند بھی بنا دیتی ہے؟" ماروی نے مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں کیا جانوں۔" مومل نے سر جھٹکا۔ "میں نے کون سا کبھی محبت کی ہے؟"

"ہے ہے.... " ماروی نے تحیر سے اسے دیکھا۔ "مگر ادا سانول تو تیرے منگیتر ہیں.... کیا تو ان سے محبت نہیں کرتی؟"

"نہیں ماروی!" مومل بردباری سے مسکرائی۔ "محبت اور لگاؤ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سانول سے میرا رشتہ بچپن سے جڑا ہے اس سے لگاؤ ہونا فطری ہے مگر محبت .... محبت دیوانگی کا نام ہے ماروی اور وہ دیوانگی میں تیری آنکھوں سے جھلکتی دیکھ رہی ہوں.... اللہ سائیں تیری مرادیں پوری کرے۔" مومل نے جذب سے کہا تو ماروی بے اختیار اس کے گلے سے جا لگی۔

اور محبت کے علاوہ، دوسرا آفاقی سچ یہ بھی ہے کہ اچھے اور مخلص دوست بلاشبہ نعمت خداوندی ہوا کرتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

"ابے یار.... یہ اس دور افتادہ گاؤں میں آخر تو نے ایسی کون سی مصروفیات تلاش کر لی ہیں۔ جو تو اب ہمیں دستیاب نہیں ہو رہا۔" حسن نے اپنے ساتھ نیم دراز بیٹی پر کسی شوخ سی دھن بجاتے اور اپنے ہی کسی دھیان میں ڈوبے عمر کو کھوجتی نگاہوں سے دیکھ کر استفسار کیا۔

اور عمر جو پہلی پہلی محبت کی اول ملاقات کے نشے میں پوری طرح مست تھا یکدم بے .... چونک پڑا .... پہلے ہونٹ اپنی اصل حالت پر واپس پلٹے، پھر مسلسل ہلتی ٹانگیں تھر کنا بند ہوئیں۔ اس کے بعد وہ خود باقاعدہ اٹھ بیٹھا۔

"میں نے ....؟" اس نے انگشت شہادت سے اپنے سینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ازحد تحیر سے پوچھا۔

"میرے خیال سے اگر میں غلطی پر نہیں تو اس کمرے میں اس وقت میرے علاوہ ایک تو ہی آدم زاد موجود ہے تو ظاہر ہے تجھ ہی سے سوال کر رہا ہوں نا۔" حسن نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا.... اچھا۔" اس نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہاں مصروف ہونا ہے یار.... ہاں کل یونہی ذرا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گیا تھا۔ مگر کیوں.... کیا ہوا؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے محتاط انداز میں جوابی استفسار کیا۔

"ہوا تو کچھ نہیں۔" شاید حسن کا شک زائل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی مشکوک نگاہیں عمر سے ہٹا کے ہوئے کہا۔

"مگر خیال رہے یار.... یہاں کا ماحول اور رسم و رواج وغیرہ ہمارے شہر سے ٹوٹلی ڈفرنٹ ہیں اس لیے

ذرا انہیں آنے جانے میں محتاط رہا کرو۔"

"ہاں یار!" اس نے اس تذکرے پر بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "جانتا ہوں یہاں کے لوگ خاصے کنزرویٹو ہیں۔"

"بات کنزرویٹو ہونے کی نہیں ہوتی عمر! یہ ان کے اپنے اصول اور رسم و رواج ہیں جو انہیں بہت پیارے ہیں تو ان کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے اور یوں بھی ہم تو محض سیرو سیاحت اور گوٹھ دیکھنے کے شوق میں یہاں چلے آئے تھے' دو تین روز میں ہماری واپسی ہے تو بہتر ہے کہ ہم اپنی اچھی یادیں یہاں چھوڑ کر اور یہاں سے لے کر واپس لوٹیں۔" حسن نے ٹی وی سے بیزار ہو کر اپنی نگاہیں واپس عمر پر جما دیں۔ اس کا انداز ناصحانہ تھا۔

"کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" عمر نے اس کے اس قدر سنجیدہ انداز پر پریشانی سے پوچھا۔

"نہیں' کچھ بھی نہیں ہوا۔" اسے پریشان ہوتا دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ "بس وہ سانول سے اس کے چچا نے تمہاری شکایت کی ہے کہ تم نے پردے کا دھیان نہیں رکھا اور باوجود ان لوگوں کے صدا لگانے کے تم آنکھیں پھاڑے ان کی بہن بیٹیوں کو دیکھتے رہے۔" اب اس کے انداز میں شگفتگی اور لطافت تھی۔

"واٹ نان سینس!" عمر بھنا گیا۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا... بس وہ لوگ جو بول رہے تھے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔" کچھ تو اس نے اپنے دفاع میں سچ ہی کہا تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ جس چہرے کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش من میں لیے وہ دیوانوں کی طرح پھر رہا تھا' وہ چہرہ جب قدرت کی مہربانی سے اتفاقاً سامنے آگیا تو پھر کچھ اور دیکھنے اور سننے کی گنجائش ہی کہاں تھی؟

"ارے ہاں یار!" حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "میں سمجھتا ہوں اور سانول بھی جانتا ہے کہ تم کوئی ایسے ویسے مزاج کے لڑکے نہیں۔ ہوتے تو وہ ہمیں یوں اپنے ساتھ لے کر آتا؟ خیر تم ٹینشن مت لو۔ سانول نے انہیں سمجھا دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس نے مجھے بھی اس واقعے سے آگاہ کر کے تمہیں محتاط رویہ اپنانے کو کہا ہے' خود سے تمہیں یہ سب بتاتے ہوئے اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔" اس نے کہا تو عمر کو ڈھیروں شرمندگی نے آلیا۔

یہ قسمت بھی انسان کو کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے۔ اب کیا یہ ضروری تھا کہ ماروی اسی کی بہن ہوتی؟ گوکہ اس کی نیت اور ارادوں میں رتی برابر کھوٹ نہیں تھا۔ مگر اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ اس کا اور ماروی کا تعلق معاشرتی اعتبار سے کسی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔

پھر وہ کیا کرے؟

دل تو بے بس ہے... ہاں مگر اس کا طرز عمل تو اس کے بس میں ہے نا... اسے ماروی کو اپنی عزت بنانا ہے۔ صرف دید کی طلب مٹانے کی خاطر اس کی اور اپنی عزت کا جگہ جگہ تماشا نہیں بنوانا۔

"تو بس پھر فیصلہ ہو گیا... دوسری اور آخری بار' جانے سے پہلے اس سے مل کر اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ شہر جاتے ہی میں اس کا ہاتھ مانگنے اپنے والدین کو یہاں بھیجوں گا... سانول ایجوکیٹڈ ہے... وہ یقیناً اس رشتے کی راہ میں حائل نہیں ہو گا۔" وہ ایک کے بعد دوسری بات سوچ گیا۔

"کہاں کھو گئے؟" حسن نے اس کی آنکھوں کے آگے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ لہرایا۔

"آں... کچھ نہیں' نہیں نہیں۔" اس نے چونکتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے تو بہت نیند آرہی ہے یار!" حسن نے بنا ہاتھ رکھے اپنا بھاڑ کا سا منہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "جب سے یہاں آیا ہوں' سر شام ہی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں... اب تم بھی سو جاؤ... پھر علی الصبح ہی ناشتہ لیے سانول حاضر ہو جاتا ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کی اور ٹی وی بند کیے بغیر دھپ سے اپنے تکیے پر گر گیا۔

"ہاں یار' میں بھی بس سونے ہی لگا ہوں۔" وہ بھی

ڈھیلے ڈھالے انداز میں اٹھا۔ ٹی وی بند کرنے کے بعد بتی بجھائی اور واپس اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔
مگر وہ سویا نہیں۔۔۔ محبت کو یونہی تو لاعلاج مرض نہیں کہا گیا۔

☆ ☆ ☆

"جیجی آمنہ نے اپنے پوتے کے لیے ماروی کا نام لیا ہے۔" خدیجہ نے خوشی سے پلنگ پر دراز سوچوں میں غلطاں سانول کو بتایا۔
وہ اب سے کچھ دیر قبل ہی گھر آیا تھا۔ صبح سے یہ وقت ہو چلا تھا، زمین کے معاملات نپٹاتے ہوئے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہر بار ہی گوٹھ آنے پر زمینوں کا اتنا کام نپٹانا اب اس کے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ بس ایک سوچ وارد ہوئی تھی اس کے دماغ میں کہ کیوں نہ وہ ان زمینوں کا سودا غلام علی کے ساتھ کر کے اس رقم سے شہر ہی میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لے۔۔۔ اس کی شامت اعمال کہ اس نے اپنے اس خیال کا تذکرہ "فوراً" سے پیشتر غلام علی سے بھی کر دیا اور جواباً "غلام علی نے بھی اسے "فوراً" سے پیشتر" ہی سخت سست سنا ڈالی تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ اس کے مسئلے کا بہترین حل تھا مگر غلام علی نے اس بات کو کچھ ایسا مسئلہ بنا ڈالا جیسے خدانخواستہ وہ اپنی "عزت" کا سودا کرنے چلا ہو۔
"یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے اماں۔" اس نے جواباً "خوشی کا اظہار کیا۔۔۔ بات واقعی کسی حد تک خوشی کی تھی بھی۔
"عبدالرشید دس جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔ بڑا اخلاق والا بچہ ہے۔ زمین تو اس کے پاس تھوڑی ہی ہے مگر آمنہ بتا رہی تھی کہ فصل بڑی اچھی تیار ہوتی ہے وہاں۔ عبدالرشید کی ماں بھی بھلی عورت ہے۔۔۔ بیٹیاں بھی ساری بیاہ کر فارغ ہو چکی ہے۔" خدیجہ نے خوشی خوشی "رشتے" کی چیدہ چیدہ جملہ خصوصیات سے اسے آگاہ کیا۔
"ہاں اماں۔۔۔ آپ دیکھ لو، اچھا ہے نا۔۔۔ اگلی بار آؤں گا تو بس ماروی کو بیاہ دیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے لڑکی کو بیاہنے کی۔۔۔ اگر بیس سال کی ہو گئی یونہی بیٹھے بیٹھے تو کون سوال ڈالے گا اس کے لیے۔" خدیجہ نے ازحد فکرمندی سے کہا۔ تو بے اختیار سانول ہنس پڑا۔
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں اماں۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، "وہاں شہر میں تو اس عمر میں لڑکیاں سولہویں جماعت پڑھ رہی ہوتی ہیں۔۔۔ بیس سال میں کوئی بڑھاپا تھوڑی آ جاتا ہے۔"
"تو چپ رہ۔" وہ اس کے ہنسنے پر خفگی سے بولی "تجھے کیا پتا۔۔۔ جب میرا بیسواں سن شروع ہوا تھا۔۔۔ تب تک تو پورے چار برس کا ہو چکا تھا۔ یہی عمر ہوتی ہے دھی بیاہنے کی اور شہر کی تو بات ہی مت کر۔ وہاں تو لڑکیوں کو کسی شہزادے کے انتظار میں بٹھا کر بوڑھی کرنے کا عام رواج ہے۔۔۔" وہ قطعیت سے یوں بولیں گویا سب کچھ آنکھوں دیکھا ہو۔
"خیر۔۔۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، بہرحال اماں جو بھی ہے اب فائنل کریں۔ چچا غلام علی خوامخواہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جیسے میں موٹل کی بجائے اب کسی اور لڑکی کے چکروں میں پڑ گیا ہوں۔" اس نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔
"ہاں کل ہی بلاوا بھجواتی ہوں میں جیجی آمنہ کو۔" خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
اور اپنے کمرے میں بیٹھی ان کے مابین ہوتی گفتگو حرف بہ حرف سنتی ماروی کا دم جیسے سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔۔۔ ابھی تو سفر محبت شروع ہی ہوا تھا اور ابھی سے اختتام کی باتیں۔

☆ ☆ ☆

"اوہ ماروی۔۔۔ تم آ گئیں؟" عمر جو آم کے گھنے درخت سے ٹیک لگائے زمین پر مایوسی سے بیٹھا، آس پاس اگی خود رو جھاڑیاں اضطراری انداز میں نوچ رہا تھا۔ ماروی کو یکدم اپنے سامنے پا کر والہانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

وہ موبائل فونز کا دور نہیں تھا۔ خط وہ ایک دوسرے کو پہنچا نہیں سکتے تھے اور پیغام رسانی کی کوئی دوسری معقول صورت موجود نہ تھی۔ لہٰذا ان کے درمیان یہی طے پایا تھا کہ عمر روزانہ اس باغ کے مخصوص گوشے میں روزانہ دوپہر کو اس کا منتظر رہا کرے گا۔ جب بھی قسمت یاوری کر جائے تب وہ یہاں آجایا کرے گی۔۔۔

"ہاں عمر۔۔۔ آنا ہی پڑا۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ اس نے اوڑھنی اپنے آدھے چہرے پر ڈال رکھی تھی۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟" اس نے یونہی پوچھا۔ شاید ذہن میں حسن کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ اماں اور ادا سانول؟ ساتھ والے گوٹھ میں میرے رشتے کی بات کرنے گئے ہوئے ہیں۔۔۔ مومل بھی گھر میں میرے ساتھ، صرف اسے معلوم ہے۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں بتایا۔ تو عمر جو اسے روبرو پا کر حکایت دل سنانے کو بے تاب تھا، یکایک شدید پریشانی کا شکار ہو گیا۔

"تمہارے رشتے کے لیے۔۔۔" اس نے یقین نہ کرنے والے انداز میں دہرایا تو ماروی نے نگاہ اٹھا کر اسے شاکی انداز میں دیکھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولتی سائیں۔" اس نے ناراضی سے جتایا۔

"اوہ نہیں۔" عمر کو اس پریشانی میں بھی اس کا انداز مزہ دے گیا۔ وہ اس دھانی چنریا میں پہلے سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ سچ بولتی ہو۔۔۔ تمہاری چمکتی شفاف اور بے ریا آنکھیں تمہاری سچائی کی گواہ ہیں۔" اس نے بہت جذب سے کہا تو وہ شرما گئی۔۔۔ پھر کہنے لگی۔

"ایک تو تم نجانے ہر بات پہلے سے کیسے جان جاتے ہو۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "اس روز بھی کہہ رہے تھے کہ تم جانتے تھے کہ میں ضرور آؤں گی۔ آج بھی کہہ رہے ہو کہ تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ سچ بولتی ہوں۔"

اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے کی سادگی اور روانی نے عمر کو بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

"واہ یار!" اس نے محظوظ ہو کر کہا۔ "تم تو بہت عقل مندی کی باتیں کرتی ہو۔"

"ہاں تو۔۔۔ کیا ساری عقل تم شہر والوں ہی میں ہوتی ہے؟" اس نے اس کے انداز پر جیسے برا مناتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا۔" عمر نے جلدی سے وضاحت کی۔۔۔ اور بولا "خیر چھوڑو یہ باتیں ماروی اچھا ہوا کہ آج تمہیں آنے کا موقع مل گیا۔۔۔ شاید پرسوں تک میں اور حسن واپس کراچی چلے جائیں۔۔۔ میرا ارادہ وہاں جانے کے بعد اپنے والدین کو ساتھ لا کر باقاعدہ تمہارا ہاتھ مانگنے آنے کا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"مگر وہ ادا سانول۔۔۔ چچا سائیں۔۔۔ وہ سب کیا آسانی سے مان جائیں گے؟" اسے ہول اٹھنے لگے۔

"اپنے چاچا کو تو تم رہنے دو۔" عمر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک سانول کا سوال ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا انسان ہے۔۔۔ میں اسے منا لوں گا۔" اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ اس نے اتنے عرصے میں جتنا سانول کو جانا تھا اسی تناظر میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی روایتی انسان نہیں تھا۔۔۔ ہاں شاید واقعی وہ ایک روایتی سا انسان نہیں تھا۔

"تم ایسا اس لیے کہہ رہے ہو کیونکہ تم ہماری روایات کو جانتے ہی نہیں ہو۔" اس کے بے نیاز اور پر اعتماد انداز پر وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تم تو جانتی تھیں نا اپنے رواجوں کو، اپنی رسموں کو اپنے معاشرے کو، تب بھی مجھ سے محبت کر بیٹھیں۔ اب اتنا آگے آکر یوں پریشان ہونے کا فائدہ۔" وہ بھی ماروی کے لہجے کی سنجیدگی کے زیر اثر آگیا۔

"دل کی بات الگ ہے۔" ماروی سر جھٹک کر بے بسی سے مسکرائی۔ "اس نے کب کسی کی مانی ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، کیوں اتنی فکر کر رہی ہو

..... میں ہوں نا، دیکھنا سب سنبھال لوں گا۔" وہ اس کی افسردگی اور فکر مندی زائل کرنے کو دانستہ کچھ زیادہ ہی شیخی سے بولا..... مگر نہیں جانتا تھا کہ اب سے اگلا پل اس کے اسی قول کی مضبوطی کا امتحان بن کر آنے والا ہے..... اس کے انداز پر ماروی مسکرا کر کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ..... الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ادھر.....؟" ان کے عقب میں کوئی جانی پہچانی مگر قہر آلود آواز گونجی ..... دونوں نے بے ساختہ ہی بری طرح چونک کر اس آواز کی جانب دیکھا۔

اور ٹھیک اسی لمحے ماروی کے سر سے اس کی دھانی چنر اتر گئی۔

☆ ☆ ☆

"اوہ مائی گاڈ!" حسن از حد تاسف اور پریشانی سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

"یہ تو نے کیا کر دیا عمر"

غلام علی نے تو نواز کو اسی روز عمر کی حرکات و سکنات نظر رکھنے پر مامور کر دیا تھا کہ جس دن اس نے سانول کو عمر کے بارے میں اپنی شکایت کا خاطر خواہ نوٹس نہ لیتے دیکھا تھا۔ اور نواز بھی جیسے تیار ہی تھا۔ وہ کسی ماہر جاسوس کی طرح عمر کی نقل و حرکت پہ کڑی اور چوکنی نگاہ رکھے ہوئے تھا..... وہ کچھ دن سے عمر کو روز دوپہر میں بڑی پابندی کے ساتھ آم کے باغ میں جاتا دیکھ رہا تھا۔ مگر وہاں جا کر وہ خاموشی سے کیوں بیٹھ جاتا تھا..... یہ راز اس پر آج آشکار ہوا تھا۔

وہ لڑکی کون تھی جو اس سے ملاقات کر رہی تھی؟ چہرہ تو اس کا وہ نہیں دیکھ سکا تھا مگر وہ فی الفور الٹے قدموں غلام علی کے پاس بھاگا تھا تاکہ عمر کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکے..... اور اس کے بعد تو جیسے قیامت ہی بپا ہو گئی تھی..... ماروی کو عمر کے ساتھ دیکھ کر غلام علی پر جیسے کوئی جنون سا سوار ہو گیا تھا۔

عمر تو عمر، غلام علی نے ماروی کو بھی اتنا زدوکوب کیا کہ وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی..... اپنے بچاؤ میں مسلسل ہاتھ پیر چلاتے عمر نے جب ماروی کو تشدد کی وجہ سے بے دم ہوتے دیکھا، پھر تو جیسے اس پر کوئی دیوانگی طاری ہو گئی..... اس نے ایک کا سر پھاڑا، دوسرے کا بازو توڑا مگر ان چھ سات ہٹے کٹوں کے سامنے وہ کر ہی کیا سکتا تھا..... وہ لوگ تو اسے وہیں جان سے مار دیتے اگر جو حسن عمر کے والد کے اثر و رسوخ کی دھمکی کے ساتھ درمیان میں نہ آجاتا..... اور پھر ان کے گوٹھ کے سرکردہ اور معتبر، سائیں اللہ ڈنو نے بھی اس مار کٹائی کو فی الفور بند کر کے معاملہ پنچایت کے ذریعے حل کرنے کا حکم سنا دیا تھا..... اسی لیے چاروناچار غلام علی اور اس کے حواریوں کو ان کی بات ماننی پڑی۔

اور اب حسن اپنے سامنے جگہ جگہ سے پھٹی شرٹ اور گرد آلود پینٹ میں ملبوس، پھٹے ہونٹ سے رستے خون اور سوجے چہرے والے عمر کو تاسف سے دیکھتے ہوئے مسلسل اسے، اس کی حرکت اور معاملے کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میرا یقین کرو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جتنا یہ لوگ اوور ری ایکٹ کر رہے ہیں۔" سوجے منہ کے ساتھ وہ بمشکل تمام مگر غصیلے لہجے میں گویا تھا۔

"اوور ری ایکٹ؟ حسن نے تعجب سے دہرایا۔

"کس جہان میں رہتے ہیں عمر صاحب آپ؟" اس نے از حد طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔" ارے یہ گاؤں ہے گاؤں، یہاں ایسی باتوں پہ خاندان کے خاندان ذبح کر دیے جاتے ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تم نے ایسا کیا ہی کیا ہے؟ ارے یہ لوگ تو تمہاری اس روز کی نظر بازی ہی پر آگ بگولہ ہوئے بیٹھے تھے..... اور آج تو تم سانول کی بہن کے ساتھ باغ میں ملاقات کرتے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو..... اور اتنے عقل مند تو تم بہر حال ہو کہ اپنے متوقع حشر کا اندازہ لگا سکو۔" حسن اس کے انداز پر بگڑ کر کہتا چلا گیا۔

"میں نے اس سے محبت کی ہے، کوئی گناہ نہیں۔" اس نے بھی ترنت جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے..... یہی جواب دینا اب تم پنچائیت کو۔" حسن نے تڑختے ہوئے کہا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خود اس کی پوزیشن یہاں

بے حد عجیب ہو چکی تھی۔۔۔ اور اب اسے اس بات کی فکر لاحق تھی کہ سانول اور یہاں کے لوگ کہیں اسے عمر کا شریک راز سمجھتے ہوئے اس کے لیے بھی کوئی "سزا" تجویز نہ کردیں۔

☆ ☆ ☆

"ہائے منھنجا اللہ سائیں۔۔۔ یہ بلا پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی؟" نیم مردہ صحن کی چارپائی پر پڑی ماروی کو خدیجہ اپنے استخوانی ہاتھوں سے بری طرح پیٹتے ہوئے بولیں۔

سانول اور وہ بڑے شاداں و فرحاں سے اس کا رشتہ عبدالرشید کے ساتھ طے کر کے لوٹے تھے۔ ابھی وہ گوٹھ میں داخل ہی ہوئے تھے کہ انہیں یہ روح فرسا خبر ملی۔ خدیجہ کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔۔۔ اور سانول۔۔۔ سب سے عجیب تھا سانول کا ردعمل۔۔۔ وہ تو یوں خاموش ہوا تھا جیسی بولنا جانتا ہی نہ ہو۔۔۔

وہ گھر میں داخل ہونے کے بجائے غلام علی کی طرف نکل گیا تھا۔۔۔ جس دم ہانپتی کانپتی خدیجہ گھر میں داخل ہوئیں، سامنے ہی چارپائی پر وہ کلنک کا ٹیکا انہیں دکھائی دیا جسے ان کے مطابق بہت پہلے مٹا دینا چاہیے تھا۔

"ہائے اب کیا ہوگا۔۔۔ ہائے۔" وہ بہت دل خراش انداز چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ اور ان کے کھلے دروازے کے سامنے لحہ بہ لحہ بھیڑ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"محبت کرنا کوئی جرم نہیں کہ جس کی سزا دی جائے۔" عمر بھری پنچایت کے سامنے پورے اعتماد سے مضبوط اور پختہ لہجے میں بولا تو یہاں سے وہاں تک پورے مجمع میں بھنبھناہٹ دوڑ گئی۔

"اس بے شرم کو تو یہیں سنگسار کر دینا چاہیے۔" کسی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"ہاں جو اتنی ڈھٹائی سے اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہے بابا۔۔۔ اسے تو ایسی سزا ملنی چاہیے کہ کوئی آئندہ ہماری بہنوں، بیٹیوں کو ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہ دیکھ سکے۔" وسائے نے فضا میں مکے لہراتے ہوئے اس کے لیے سخت سے سخت سزا تجویز کرنے کا مطالبہ کیا۔

حسن خوامخواہ اس تماشے میں شامل ہونے پر مجبور تھا۔ وہ تو بیگ اٹھا کر اسی وقت یہاں سے جان بچا کر بھاگنے کے چکر میں تھا مگر اسے بس ذرا سی دیر ہو گئی۔۔۔ سانول گوٹھ آچکا تھا۔۔۔ پنچایت غلام علی کے صحن میں لگ چکی تھی۔۔۔ وہ لوگ جب عمر کو لینے آئے تو اسے بھی کھینچ کر لے گئے۔

اس نے مزاحمت نہیں کی، جب وہ کسی راز یا جرم میں شریک کار تھا ہی نہیں تو کیوں بلاوجہ مار کھاتا؟ سو اس نے اپنی روانگی پنچایت کے فیصلے کے بعد تک کے لیے موخر کر دی تھی۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟" وہ بے بسی سے چلایا۔

"ہم نے خود تمہیں اپنی آنکھوں سے رنگ رلیاں مناتے دیکھا ہے باغ میں ماروی کے ساتھ اور تم کہتے ہو کہ کوئی گناہ نہیں کیا۔" نواز نے مسلسل سر جھکائے بیٹھے سانول کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بہت اونچی آواز میں کہا۔

"بکواس بند کر اپنی۔" عمر نے اپنے دائیں بائیں کھڑے آدمیوں سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے مشتعل ہو کر کہا۔ "اپنی ناپاک زبان سے اگر ماروی کا نام دوبارہ لیا تو تیری زبان کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

"دیکھا، الٹا ہمیں دھمکا رہا ہے۔" کسی نے کہا۔

سارا مجمع مشتعل ہو کر اپنی اپنی بولیاں بولنے لگا۔۔۔

"بس خاموش۔" بالآخر سائیں اللہ ڈنو ہی نے دبنگ آواز سے مداخلت کرتے ہوئے سب کو خاموش کرایا۔

"اب کوئی کچھ نہیں بولے گا۔۔۔ ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں فیصلہ ہمیں کرنے دو۔"

سائیں اللہ ڈنو اس پنچایت کا سربراہ تھا۔ وہ نہ صرف دینی شعور رکھتا تھا بلکہ وہ اپنے زمانے کا تعلیم یافتہ انسان سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان سب سے زیادہ زمین

بھی اس کی ملکیت تھی۔ اس لیے بھی اس کا رعب گوٹھ میں زیادہ تھا۔ اس لیے اس کے گھر کنے پر سب یکدم ہی خاموش ہو گئے تب وہ پتھرائے ہوئے سانول سے بڑی نرم روی سے مخاطب ہوا۔ ایک زمانہ تھا جب اس کی اور سانول کے باپ کی بڑی دوستی ہوا کرتی تھی۔ گاؤں کا معزز شخص اور ایک نیک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ غلام نبی بھی اس پنچایت کا ایک رکن ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ جگہ غلام علی نے سنبھال لی تھی۔

"پٹ..... تم کچھ نہیں کہو گے؟"

"یہ کیا کہے گا؟" غلام علی چمک کر بولا۔ "بہت اعتبار تھا نا اسے اپنے دوست پر..... ارے پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اس نے تیری ..... بول اسے کیا سزا دلوانا چاہے گا۔" اس نے خون آشام نگاہوں سے اپنے آدمیوں کے نرغے میں کھڑے عمر کو گھورتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

سانول نے اس بات پر میکانکی انداز سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا.....

"مجھے نہ ماروی کی صفائی میں کچھ کہنا ہے..... اور نہ ہی کسی کے لیے کوئی سزا تجویز کرنی ہے..... آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔" وہ بے تاثر انداز میں غیر مرئی نقطے کو تکتے ہوئے بولا۔

"ارے اس نے کیا کسی کو سزا دلوانی ہے۔" اس کے سپاٹ انداز پر غلام علی بری طرح چڑ گیا۔ "شہر میں پڑھائیاں کر اپنی غیرت جو بیچ آیا ہے۔" اس نے حقارت سے اسے دیکھا' اس کی بات پر سانول نے اپنا جھکا ہوا سر مزید جھکا لیا تھا۔

"میں ماروی کا چچا ہونے کی حیثیت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ان دونوں کو "کاری" کر دیا جائے تاکہ آئندہ کوئی شہر سے آ کر ہماری بہن' بیٹیوں کو بہکا نہ سکے۔" وہ بلند آواز میں دہاڑا۔

مارے خوف کے حسن کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ مجمع غلام علی پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"کوئی مجھے بتائے گا کہ دنیا کی کس کتاب میں محبت کرنے کی سزا موت لکھی گئی ہے؟" عمر تلملا کر بولا۔

"کتابوں کی باتیں کر کے خود کو بچانے کی کوشش نامرد کرتے ہیں..... کہیں لکھا ہو یا نہ لکھا ہو..... یہ ہمارا قانون ہے۔" غلام علی نے نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ نہیں جانتے غلام علی۔" سائیں اللہ ڈنو نے مداخلت کی 'لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جرم بہت بڑا اور ناقابل معافی ہے مگر اس بات پر اسے موت کی سزا تو نہیں دی جا سکتی۔" سائیں نے دبنگ آواز میں کہا تو گویا بپھرے ہوئے مجمع کو سانپ سونگھ گیا..... البتہ عمر کے چہرے پر اس دوران پہلی مرتبہ اطمینان سا جھلکا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" کچھ دیر بعد غلام علی ہی نے لب کشائی کی۔

"مگر ہماری روایات....."

"رسم و رواج اور روایات انسانوں اور معاشروں کی بہتری اور بھلائی کے لیے بنائے جاتے ہیں نہ کہ ان کے مزید بگاڑ کے لیے..... تو ہمارے لیے بہتر یہ ہو گا کہ جتنا ان کا جرم ہے اتنی ہی انہیں سزا دی جائے۔ یاد رکھو غلام علی! حد سے تجاوز کرنے والوں کو اللہ سائیں سخت ناپسند کرتا ہے۔" سائیں نے اپنی مخصوص گھن گرج والی آواز کے ساتھ کہا تو ان میں سے کئی ایک نے اس وقت کو کوسا کہ جب وہ پنچایت کا سربراہ بنایا گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"واہ میرے اللہ! تیرے نرالے کھیل تو ہی جانے۔" صبح سے ماروی کے غم میں نیر بہاتی موول کے آنسو اب تشکرانہ رنگ اختیار کر چکے تھے۔ اس کا دل بے اختیار ہی اپنے مہربان رب کے حضور شکر گزاری سے سجدہ ریز تھا۔

ماروی اور عمر کے پکڑے جانے کی اطلاع پلک جھپکتے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہوئی جس دم ماروی کے گھر میں موجود موول تک پہنچی' وہ بنا ایک

لمحے کی تاخیر کیے چپ چپاتے وہاں سے نکل کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ اپنی ماں کے ماروی کے متعلق استفسار کرنے پر اس نے بمشکل اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے انہیں یہ بتایا کہ وہ تو کافی دیر پہلے ہی ماروی کے پاس سے اٹھ کر سسی کے ہاں چلی گئی تھی اور اس سے بھرت کا ٹانکا سیکھ رہی تھی۔ ماں نے اس کی بات پر یقین کیا یا نہیں البتہ اسے اس معاملے میں بالکل خاموش رہنے کا حکم ضرور سنا دیا' اور اگر وہ اسے یہ تاکید نہ بھی کرتی۔ تب بھی اس نے اب مہر بہ لب ہی رہنا تھا۔

اور بول کر اسے کیا مل جاتا؟ الٹا ماروی کا رازدار ہونے کی قیمت شاید اسے اپنی جان دے کر چکانی پڑتی ..... بات مشکل وقت میں اپنی سہیلی کو تنہا چھوڑنے کی نہیں تھی۔ بات زندگی کی تھی۔ اس نے اپنی جان تو محفوظ کر لی تھی مگر اس کا دل ماروی ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ اور اس کا روم روم اس کی سلامتی کے لیے دعاگو تھا جبکہ یہاں تو مولا نے اس کی سلامتی کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی معجزاتی طور پر اس کا مقدر کر دی تھی۔

سائیں اللہ ڈنو کے نزدیک عمر کی ماروی سے محبت کوئی جرم نہ تھا جبکہ وہ اسے پوری عزت و احترام سے اپنانے کو بھی تیار تھا۔ ہاں مگر ان کا طرز عمل ناقابل قبول اور بے حیائی قرار پایا تھا اور اسی لیے سائیں نے دونوں کا نکاح پڑھا کر ماروی کو ہمیشہ کے لیے گاؤں بدر ہونے کا حکم سنا دیا تھا۔ اور عمر کو بطور جرمانہ دس لاکھ روپے نقد سانول کو ادا کرنے کا پابند کرتے ہوئے پکے کاغذ پر اس کے دستخط بھی لیے تھے۔ اسے رقم مہیا کرنے کے لیے کل تک کا وقت دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی پنچایت برخاست ہو گئی تھی۔ احتیاط کے طور پر آج کی رات سائیں اللہ ڈنو نے ماروی کو اپنی سرپرستی میں لیتے ہوئے اسے اپنی طرف ٹھہرایا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے مزاج سے واقف تھے۔ جانتے تھے کہ ان کا فیصلہ ناپسند کیا گیا ہے.... اسی لیے فیصلے کی حفاظت بھی انہیں اپنی ذمے داری محسوس ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ غلام علی کے بڑے سے صحن سے بھیڑ چھٹتی گئی۔ یہاں تک صحن بالکل خالی ہو گیا مگر سر جھکا کر بیٹھے سانول کے انداز نشست میں سر مو تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

"کیا نامردوں کی طرح سر جھکائے بیٹھا ہے۔" غلام علی نے سب کے رخصت ہوتے ہی بھپر کر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔۔۔ سانول بنا مزاحمت کیے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا' سر اور آنکھیں اب بھی فرش کر چھو رہی تھیں۔

"ارے شرم سے ڈوب مرکہیں۔" غلام علی نے خون آشام نگاہوں سے اسے گھور کر زور کا دھکا دیا۔۔۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر گرا نہیں۔

"اس شہری پڑھائی نے تیری ساری غیرت نچوڑلی' ارے تو پنچایت کے فیصلے پر خاموشی سے کیوں بیٹھا رہا تو نے۔ کچھ بولا کیوں نہیں؟" وہ حلق کے بل پوری قوت سے دہاڑ رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگا چاچا سائیں.... " سنبھل کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے' سانول نے اس مرتبہ اپنا سر اور قہر میں ڈوبی سرخ انگارہ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ اتنا سرد اور کٹھور تھا کہ غصے میں لال پیلا ہوتا غلام علی بے اختیار ٹھٹک گیا....

"دس لاکھ روپے۔" اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "صرف دس لاکھ روپے میری اور میرے خاندان کی عزت کی قیمت' مجھے قبول ہو سکتے ہیں؟" وہ وحشت ناک انداز سے یوں مسکرایا کہ غلام علی جیسے نڈر اور سفاک آدمی کے وجود میں بھی بے اختیار سنسنی دوڑ گئی۔

"تب پھر تو نے پنچوں کے سامنے احتجاج کیوں نہ کیا؟" اس کے انداز و اطوار پر غلام علی نے کچھ ڈھارس محسوس کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"کیونکہ میں جانتا تھا کہ اللہ ڈنو ایسا ہی کوئی فیصلہ دے گا۔ آپ شاید بھول گئے ڈھائی سال پہلے اس عبدالقادر کی بیٹی کا قصہ اور ایک سال پہلے کا وہ واقعہ جب اس اللہ ڈنو نے ملہار اور سامی کو کچھ ایسی ہی سزا سنائی تھی۔" اس نے سرد تاثرات چہرے پر سجائے

سفاکی سے کہا تو بے ساختہ غلام علی کے چہرے پر اپنے بھتیجے کے لیے ستائشی اور متاثر کن تاثرات ابھر آئے ۔۔۔

"تو اب پھر؟" اس نے بے تابانہ پوچھا۔

"تو یہ کہ جن کا فیصلہ مجھے قبول ہی نہیں کرنا تھا تو ان کے سامنے خوامخواہ احتجاج کر کے کیا کرتا۔ وہ دونوں میرے مجرم ہیں اور ان کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گا اور وہ بھی اپنی کلہاڑی سے۔"

☆☆☆

اور ابھی تو موول سجدہ شکر ٹھیک سے ادا بھی نہ کر پائی تھی کہ سب کے جانے کے بعد اسے صحن سے آتی اپنے بابا سائیں کی قہر آلود آواز سنائی دی۔۔۔ اور اس کے بعد اس نے جو کچھ سانول کی زبانی سنا اس نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

ایسی شقاوت، اتنی سفاکی؟ اور اس طرح کی چالبازی؟

وہ پڑھی لکھی نہیں تھی ۔۔۔ شہر سے اعلا تعلیم حاصل کرتے منگیتر پر اسے بہت فخر، بہت مان تھا۔ وہ اسے بہت باشعور اور روشن خیال انسان تصور کرتی تھی۔ وہ جب بھی اس سے مخاطب ہوتا، لہجہ بہت شائستہ اور باتیں بہت خوب صورت ہوا کرتی تھیں۔ بالکل ویسی باتیں جیسی کتابوں میں درج ہوتی ہیں مگر وہ یہ کیوں فراموش کر گئی کہ کتابی باتیں صرف کتابوں ہی کی حد تک ہوا کرتی ہیں انہیں زندگی میں عملاً "لاگو یا تو بے وقوف یا "پھر لاچار" لوگ کیا کرتے ہیں اور سانول نہ ہی بے عقل تھا اور نہ ہی بے بس۔۔۔ اور کتابوں سے اس نے اور کچھ سیکھا نہیں ۔۔۔ مگر مناسب وقت پر، صحیح نشانے پر اس نے کامیاب وار کرنا ضرور سیکھ لیا تھا۔

باہر اس کا منگیتر اور باپ مل کر آگے کا لائحہ عمل سرگوشیوں میں طے کر رہے تھے ۔۔۔ اور اندر اس کی پریشانی تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

"کیا کروں میں اللہ سائیں، کیسے مدد کروں میں اس کی؟"

اس نے بڑی دل گیری سے اپنی صدا عرش تک پہنچائی تھی۔

☆☆☆

زندگی بھی انسان کو کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ اس کا اگلا پل ہمارے لیے کیا لے کر آنے والا ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔۔۔ ماروی آج صبح جب جاگی تھی تو اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اس کے نصیب میں آج کی رات سائیں اللہ ڈنو کی حویلی نما گھر کے اس کمرے کی چھت تلے بسر کرنا لکھا ہے۔ اس کا نکاح نہیں ہوا تھا، اس کے "سزانامے" پر اس سے انگوٹھا لگوایا گیا تھا۔۔۔ اسے ماں نے رخصت نہیں، گھر سے غارت کیا تھا۔ اسے گلابی جوڑا نہیں کفن پہنایا گیا تھا ۔۔۔ وہ صبح سے آنسو بہاتے بہاتے تھک چکی تھی۔۔۔ پورا جسم دکھ رہا تھا مگر دل سے زیادہ نہیں اور وہ اس حویلی کے اس ویران کمرے میں رکھی جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھی گھٹنوں پر سوگوار نیل و نیل چہرہ رکھے سوچ رہی تھی کہ کیا اس نے اتنی غلط خواہش کی تھی جس کا انجام اس قدر بھیانک نکلا۔۔۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تھا، مگر اس کے انداز نشست میں تبدیلی واقع نہ ہوئی جانتی تھی ملازمہ ہوگی، دو دفعہ پہلے بھی اس کے لیے ٹرے میں کھانا سجا کر لائی تھی جسے اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا، شاید وہ ایک مرتبہ پھر۔۔۔

"ماروی!" اور اس پرسوز، مگر محبت سے لبریز پکار پر بے جان ہوئی ماروی کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"امید ہے آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں گے ۔۔۔ میں یہاں گاؤں میں بیٹھ کر مطلوبہ رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔" عمر جھلا کر بے بسی سے بولا۔

اس کی اور ماروی کی قسمت کا فیصلہ تو کر دیا گیا تھا۔ مگر مسئلہ سارا یہ تھا کہ وہ گاؤں میں بیٹھے بیٹھے تو اتنی

بڑی رقم کا بندوبست کر نہیں سکتا تھا اور بنا رقم ادا کیے اس کا یہاں سے جانا محال تھا۔ عمر نے حسن سے صرف اتنی مدد چاہی تھی کہ وہ شہر جا کر اس کے والد کو یہاں پیش آنے والی ناگہانی مصیبت سے آگاہ کر کے انہیں رقم کا بندوبست کرنے کا کہے۔ مگر اس نے نہ صرف اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ فوراً" سے پیشتر بذریعہ پبلک ٹرانسپورٹ، وہ شہر کے لیے نکل بھی چکا تھا۔

عمر کو سائیں کے دو آدمیوں نے اپنی نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ اور یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو پیسوں کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی پریشانی کا ذکر کرنے کے لیے اس وقت اللہ ڈنو کے مہمان خانے میں کھڑا انہیں اپنے مسئلے سے آگاہ کر رہا تھا۔

"بابا، اپنے گھر فون کر دو" ان کے معتمد خاص بچل نے کہا۔ سائیں ملکے نیلے صوفے پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے ہوئے اس کی سنے گئے۔

"آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔" وہ زچ ہو گیا۔ "میرے ڈیڈی کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں رہتی، اب اگر میں انہیں فون پر یہ سب بتاتا ہوں تب نجانے ان کا کیا رد عمل ہو؟ انہیں تو یہی معلوم ہے ناکہ میں یہاں گھومنے آیا ہوا ہوں۔" وہ اپنا مختصر سا سفری بیگ کندھے سے اتار کر نیچے رکھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟" چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد سائیں اللہ ڈنو نے اپنی بارعب آواز میں پوچھا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ بتاتا، باہر سے تیزی کے ساتھ اندر آتے، وسائے نے اللہ ڈنو سے مخاطب ہو کر تیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"حویلی کے دروازے پر اپنا چہرہ چھپائے ایک عورت آئی ہے سائیں! کہتی ہے ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہے، یہ کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

اس نے کہا تو عمر نے بری طرح سے چونکتے ہوئے پریشانی سے پہلے نو وارد کو اور بعد ازاں یکدم متفکر ہوتے اللہ ڈنو کا چہرہ دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

غلام علی اور سانول کی وہ ساری دل دہلا دینے والی گفتگو سن لینے کے بعد مومل کا رو رو کر برا حال تھا مگر یہ وقت رونے کا نہیں، کچھ کر گزرنے کا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، تب ہی یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اور اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جاتی، اس خیال پر اسے فوراً" ہی عمل در آمد کرنا تھا۔ ماروی اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ رازدار تھی اور آج پنچایت نے اسے ہمیشہ کے لیے گاؤں بدر ہونے کی سزا سنا دی تھی اور اس سزا کا مطلب بہ الفاظ دیگر ماروی کا ان لوگوں کے لیے جیتے جی مرجانا تھا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا مومل کے لیے، یہ بات اس کی ماں جانتی تھی۔ اور ماں کو اعتماد میں لیے بنا مومل اپنے خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھی۔ سو وہ ذرا سی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ماں کے سامنے خوب روئی، اس کی منت سماجت کی کہ وہ آخری بار، ماروی سے ملنے کے لیے اسے جانے دے۔ پہلے تو وہ خود بھی روتی ہوئی مسلسل نفی میں سر ہلاتی رہی مگر جب مومل نے یہ کہا کہ اگر ماروی کی جگہ مومل ہوتی تو؟

تب وہ برداشت نہ کر سکی، ماں ہی تھی نا۔ اپنی دھی رانی کے آنسو دیکھ کر پسیج گئی.... یہ عشا کے بعد کا عمل تھا۔ گوٹھ کے دیگر باسیوں کی طرح اس وقت تک مومل بھی اپنی ماں کے ساتھ سو چکی ہوتی تھی۔ جبکہ غلام علی گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ ڈیرے پر گزارنے کے بعد گھر آکر اپنے علیحدہ کمرے میں سو جایا کرتا تھا۔ مومل نے اپنی ماں کو مطمئن کر دیا تھا کہ وہ بیس منٹ کے اندر اندر ہی واپس لوٹ آئے گی۔ اور اصل معاملہ یہ تھا کہ اس کی ماں کو صرف پنچایت تک کی کہانی معلوم تھی۔ اس کے بعد سانول اور غلام علی نے اس کہانی کا انجام اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے جو لائحہ

عمل ترتیب دیا تھا وہ اس سے یکسر لاعلم تھی اور مومل نے انہیں لاعلم ہی رہنے دیا۔ اگر سب بتا کر اپنا ماروی کے پاس جانے کا اصل مقصد انہیں بتا دیتی۔ تب تو چاہے وہ ان کے سامنے رو رو کر اپنی آنکھیں بھی گنوا دیتی۔ تب بھی وہ نہ پگھلتی ...... بہرحال مومل نے بڑی سی چادر سے خود کو چھپایا اور گھر کے پچھلے صحن سے، جہاں گندم کا ڈھیر اور دیگر سامان پڑا رہتا تھا بڑی راز داری کے ساتھ دروازے سے باہر نکل کر اندھیرے میں گم ہو گئی.... اس کی ماں نے اسے بحالت مجبوری اجازت دے تو دی تھی مگر اب اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا کہہ رہی ہو لڑکی؟" اس سر تاپا چادر میں ملفوف لڑکی کے منہ سے سانول اور غلام علی کے خوفناک عزائم سن کر، سائیں بے یقینی میں گھر گئے تھے۔ سائیں اللہ ڈنو نے جب مومل کو اندر بلوایا تھا تب انہیں قطعاً" اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہیں کس بات سے آگاہ کرنے کے لیے آئی ہے۔ مومل نے کسی کے بھی سامنے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ احتیاط کے پیش نظر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ دیگر لوگوں کے ساتھ جھلاہٹ میں مبتلا عمر کو باہر نکلنے سے اس نے از خود روک دیا تھا۔

"کون ہو تم؟ اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟" سائیں شک میں گھر کر پوچھنے لگے۔

"سائیں!" مومل جلدی سے بولی "میں سب کے سامنے اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتی، مگر آپ کی تسلی اور اپنی بات کی صداقت کے ثبوت کے طور پر بتا دیتی ہوں کہ میں غلام علی کی بیٹی ہوں اور میں نے ان دونوں کا سارا منصوبہ اپنے کانوں سے سنا ہے۔" اس نے بتایا تو اللہ ڈنو کو بے تحاشا غصے کے ساتھ ساتھ بے پناہ تفکر نے بھی آگھیرا۔

"اوہ نو۔" عمر نے یہ سب سن کر بے ساختہ وحشت زدہ ہو کر کہا۔ "اب میں کیا کروں۔" اور بے اختیار اپنا مفلوج ہوتا سر تھامتے ہوئے دھپ سے صوفے پر گر سا گیا۔

"ان کے نزدیک آپ کے فیصلے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ وہ انہیں مار دیں گے سائیں، وہ ان کی تاک میں بیٹھ گئے ہیں۔" مومل روہانسی آواز میں بولی۔

سائیں کے باوقار چہرے پر اب اشتعال کی سرخی کی جگہ کسی گہری سوچ نے لے لی تھی۔ بے انتہا پریشانی اور فطری خوف میں مبتلا عمر، اور اپنا چہرہ چادر میں چھپائے فکر مند سی مومل ان کی طرف سوالیہ اور پر امید نگاہوں سے یک ٹک دیکھ رہے تھے۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" کچھ دیر کی بوجھل اور تکلیف دہ خاموشی کے بعد سائیں کی فیصلہ کن آواز گونجی۔

"اگر انہیں ہمارے فیصلے پر کوئی اعتراض تھا تو اسی وقت کہنا چاہیے تھا۔ اور اب اگر وہ ہمارے فیصلے کا پاس نہ رکھتے ہوئے درندگی پر اترنا چاہتے ہیں تب ہم بھی اب وہی کریں گے جو انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے، تم اپنا بیگ اٹھاؤ لڑکے، اب صبح تک کا انتظار فضول ہے، تمہیں اور ماروی کو ابھی اور اسی وقت یہ گوٹھ چھوڑ دینا چاہیے۔"

اور یہ غیر معمولی فیصلہ سائیں نے خود نہیں کیا تھا، انہیں اس پر خود سانول اور غلام علی نے مجبور کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماروی!" مومل کی محبت بھری پکار پر، اپنی سوگوار سوچوں میں غلطاں ماروی دیوانہ وار اٹھ کر اس کے گلے سے جا لگی تھی۔ ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر وہ دونوں اتنا روئیں کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر وقت کی کمی اور موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومل ہی نے خود کو سنبھالا اور اس سے علیحدہ ہو کر اس کے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"وقت بہت کم ہے ماروی! مجھ سے دو باتیں کر لے پھر اس کے بعد تو ... زندگی بھر ہمارے ملنے کا کوئی امکان نہیں۔" مومل کے لب سے ایک سسکاری سی

نکلی۔

"تو بہت اچھی سہیلی ہے مومل۔" ماروی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اتنا کچھ ہو جانے پر بھی مجھ سے ملنے چلی ہی آئی۔"

"اگر وہ سب جاننے کے بعد بھی خاموش رہ جاتی تو زندگی بھر خود کو کبھی معاف نہ کرپاتی۔ ماروی! تیرا ادا سائیں اور میرا بابا تیرے قتل کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں وہاں، اور تجھے ابھی اور اسی وقت عمر کے ساتھ یہاں سے نکلنا ہو گا۔" اس نے ناچار اسے مطلع کیا تو ماروی کے منہ سے بے اختیار ایک وحشت زدہ سی چیخ نکل کر رہ گئی۔

"مجھ پر جان چھڑکنے والے، میرے شہر سے پڑھنے والے ادا گیا، میرے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتے ہیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"اتنی حیران مت ہو پگلی!" مومل عجیب زخمی انداز سے مسکرائی۔ "انسان کی اصلیت کا پتا تو موقع آنے پر ہی چلتا ہے۔۔۔ بس تو اب ساری پچھلی باتیں اور زندگی بھول کر نئے سفر کا آغاز کر، میری دعا ہے تو جہاں رہے ہمیشہ خوش اور آباد رہے۔" مومل کہتے کہتے ضبط کھو کر پھر بری طرح رو پڑی۔

"مومل، میں تیرا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" وہ متشکرانہ لہجے میں کہہ کر ایک دم بکھر گئی۔

"نہ نہ ماروی!" مومل نے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے تسلی دیتے ہوئے مدبرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ میرا احسان نہیں، سانول اور بابا کے عزائم میرے علم میں لا کر رب کی طرف سے مجھے سونپی گئی ذمے داری تھی۔۔۔ اب جا۔ باہر عمر تیرا منتظر ہے، تجھے اللہ سائیں کی امان میں دیا۔"

☼ ☼ ☼

سانول کے منصوبے کے مطابق نواز کو مہمان خانے میں موجود عمر پہ نظر رکھنی تھی۔ یہاں تک کہ رات گہری ہو جاتی تب وہ لوگ اسے قابو کرنے کے بعد اسے قتل کر کے اس کی لاش دریا برد کر دیتے۔ اگلے دن سب لوگ یہی سمجھتے کہ وہ راتوں رات شہر فرار ہو گیا ہے۔ تب یہ لوگ اللہ ڈنو کے فیصلے کو کٹھرے میں کھڑا کر کے ماروی کی حوالگی کا مطالبہ کرتے۔ (اور اگر مطالبہ نہ بھی کرتے تب بھی ماروی کے لیے پنچایت کا نیا فیصلہ آجانے تک قانوناً" ماروی کے والی وہی لوگ تھے) اور اس کے بعد ماروی کا کیا کرنا تھا یہ بھی انہوں نے سوچ رکھا تھا۔

مگر ہوا سب اس کے برعکس۔ جس لمحے نواز نے عمر کو اللہ ڈنو کی حویلی کی جانب جاتے دیکھا، وہ بہت پریشانی سے یہ خبر ان لوگوں کو دینے بھاگا گیا۔ اور اس کی زبانی یہ جان کر کہ عمر سائیں کی حویلی کی طرف گیا ہے، یہ خیال سانول ہی کے ذہن میں آیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سائیں اللہ ڈنو انہیں راتوں رات ہی شہر روانہ کر دے کیونکہ ماروی کو تو پہلے ہی اس نے احتیاط کے پیش نظر اپنی حویلی میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ (اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی کہ سائیں جانتے تھے کہ وہ پنچایت کے سربراہ بننے کے بعد کچھ ایسے فیصلے کر رہے ہیں جو درست ہونے کے باوجود ان کے گوٹھ باسیوں کو پسند نہیں آ رہے) اس خیال کا اظہار اس کی جانب سے ہوتے ہی غلام علی کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا تھا۔ اور اس نے نواز کو فی الفور عمر کے پیچھے، انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہی کے لیے روانہ کرنے کے بعد سانول اور اپنے دیگر ساتھیوں کو اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر تیار رہنے کا حکم صادر کیا۔

گو کہ وہ اگر چاہتے تو سر عام ہی ان دونوں کا قتل کر سکتے تھے مگر سارے فساد کی جڑ یہ اللہ ڈنو تھا۔ اب جبکہ وہ فیصلہ سنا چکا تھا تو وہ لوگ اس کا فیصلہ ماننے کے پابند تھے اور فیصلہ آنے کے بعد اپنی من مانی کرنے کی صورت میں ان کے رواج کے مطابق وہ لوگ سزاوار ٹھہرائے جاتے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ غلام علی میں سائیں سے ببانگ دہل الجھنے کا دم نہ تھا۔ نہ صرف اس کا بڑا بیٹا پولیس آفیسر تھا بلکہ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

اللہ ڈنو اگر چاہتا تو اگلی صبح کھلم کھلا ' سانول اور غلام علی کے ارادے سب کو بتانے کے بعد عمر اور ماروی کو شہر روانہ کردیتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس صورت میں اپنی بات کی گواہی کہاں سے لاتا کہ مومل تو ایسی صورت میں گواہی دینے سے 'مارے خوف کے صاف انکاری تھی۔ اور اگر رات کے اندھیرے میں انہیں اپنے آدمی کے ساتھ اپنی گاڑی میں سہولت سے شہر بھجواتا تو سارے گاؤں کی نظر میں بے اعتبار ' بے توقیر ہو کر رہ جاتا اور ایک نیا تنازعہ بے وجہ کھڑا ہو جاتا۔ مسئلہ اس کی سربراہی کا نہیں ' اس تبدیلی کا تھا جو وہ اس گوٹھ میں لانا چاہتا تھا۔ اس لیے طے یہ پایا کہ عمر اور ماروی نہایت ہی خاموشی کے ساتھ ' کچے کے راستے سے بڑی سڑک تک پہنچیں گے جہاں سے بچل کا چاچا زاد شاہو (جو ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور اللہ ڈنو کے باغات کا پھل شہر پہنچانے کا کام کرتا تھا) انہیں اپنے ٹرک میں سوار کروا کر شہر لے جائے گا.... اور اب اگر قانوناً" شوہر اور بیوی ساتھ فرار ہو جاتے ہیں تب کوئی کیا کر سکتا ہے؟

بظاہر یہ منصوبہ بے عیب تھا مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ دشمن تمام تر رازداری برتنے کے باوجود گھات لگائے بیٹھا ہے۔

آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اور ایسے میں تاک لگائے بیٹھے نواز نے دو ڈرے سہمے سے ہیولوں کو حویلی سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا.... ان کا رخ کچے کی جانب تھا.... ہو نہ ہو یہی عمر اور ماروی ہیں.... اس اندازے کا تقویت پکڑنا تھا کہ نواز سرپٹ غلام علی کے ڈیرے کی جانب دوڑ گیا۔

جس وقت ان لوگوں نے ان کا تعاقب کرنے کے لیے کچے کا راستہ پکڑا ' اسی وقت اچانک ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی.... ان لوگوں نے تعاقب کرتے کرتے ان کو جالیا اور سانول نے کلہاڑی سے وار کر کے انہیں قتل کردیا۔

دوسرے روز جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ عمر جرمانے کے دس لاکھ دینے سے بچنے کے لیے ماروی کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ مگر چونکہ وہ دونوں شاہو کے ٹرک تک نہیں پہنچے تھے اس لیے سائیں کو پورا یقین تھا کہ وہ دونوں قتل کردیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی ثبوت یا گواہ نہیں تھا پھر بھی انہوں نے غلام علی اور سانول کو بلا کر باز پرس کی۔ جواباً" ان دونوں نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر خود کو بے قصور ثابت کردیا۔ بارش تھم جانے کے اگلے دن گاؤں کا ایک آدمی خبر لایا کہ ایک گلابی دوپٹہ کچے کے ڈھلوانی راستے میں کیچڑ سے برآمد ہوا ہے۔ یہ دوپٹہ ماروی کے گھر پہچان کے لیے بھیجا گیا.... پہچان لیا گیا۔ یوں گاؤں کے سب ہی لوگوں بشمول اللہ ڈنو کے یقین آگیا کہ وہ بھاگتے ہوئے بارش اور اندھیرے کے باعث راستہ بھٹک کر دریا میں جا گرے ہیں۔

اللہ ڈنو ان کی موت پر بہت افسردہ تھا۔ مومل تو یہ خبر سن کر بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ ماروی کی ماں کو جیتے جی چپ سی لگ گئی۔ اور ایسے میں اگر کوئی ازحد مطمئن اور مسرور تھا تو وہ سانول اور غلام علی تھے۔ ابھی اس اندوہناک واقعے کو گزرے تین اور مومل کو سانول کی زوجیت میں آئے محض ایک ماہ کا عرصہ گزرا تھا ' تب ہی ایک عجیب واقعہ رونما ہوا.... نواز پر آسمانی بجلی گر گئی اور وہ خاکستر ہو گیا.... اس کے کچھ ہی دن بعد شامہ کی لاش کھیتوں سے ملی اسے زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا.... اعظم نہر میں ڈوب گیا.... یہ وہ لوگ تھے جو اس رات غلام علی کے ساتھ تھے۔ انہیں ایک ایک کرکے حادثاتی طور پر مرتا دیکھ کر غلام علی کے ذہن پر نجانے کیا خوف طاری ہوا کہ اس کا دماغ الٹ گیا وہ ماروی کا وہی دوپٹہ جو قتل والی رات اس نے اوڑھا ہوا تھا ' ہاتھ میں لیے سارا سارا دن ' ساری ساری رات اسی جگہ بیٹھا رہتا کہ جس جگہ سے وہ دوپٹہ ملا تھا۔

وہ چلا چلا کر روتے ہوئے ایک ایک کو بتایا کرتا کہ ان لوگوں نے کس بے دردی سے ماروی اور عمر کو قتل کرنے کے بعد کتنی ڈھٹائی سے قرآن پاک کی قسم اٹھائی ہے.... اور اب اس کا اور سانول کا حال بھی ان سے مختلف نہیں ہو گا.... سانول نے اسے سنبھالنے کی

بہت کوشش کی اور بہتیرا سمجھایا کہ ان لوگوں کی اموات 'سوائے اتفاق کے اور کچھ نہیں مگروہ سمجھنے سمجھانے کی حدود سے آگے جا چکا تھا۔ اس کی اس دیوانگی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز اس کی لاش بھی اسی جگہ ملی کہ جس جگہ ماروی اور عمر کو قتل کیا گیا تھا... اس روز پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں سانول کے دل میں خوف ـــ جاگا۔ اس نے ان پر فاتحہ خوانی کے لیے ان کی علامتی قبور ٹھیک اسی مقام پر بنوا دیں کہ جس جگہ اس کے خیال کے مطابق کلہاڑی کے وار کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ دریا میں جا گرے تھے... گاؤں کے سیدھے سادے اور لاعلم لوگ اس جگہ آکر فاتحہ خوانی کرنے لگے' دعائیں مانگنے لگے 'ان میں سے چند کی دعائیں قبول کیا ہوئیں جیسے اس ''معصوم جو مزار'' کی اہمیت مسلم ہو گئی اور یہ مزار آج تک یونہی قائم ہے۔'' سجاول مسلسل بول بول کر جیسے تھک کر خاموش ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے خاموش ہونے پر وہ تینوں جو دم سادھے اسے سن رہی تھیں جیسے یکلخت چونکتے ہوئے ہوش میں آئیں۔

''سانول ؟'' جیز کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی ''اور سانول کا انجام کیا ہوا؟''

''ان لوگوں سے قطعی مختلف۔'' وہ عجیب پُرسوز اور افسردگی آمیز انداز سے مسکرایا۔ ''وہ غلام علی کی موت کے کئی سال بعد تک زندہ رہا مگر اس نے کسی کے سامنے بھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا' مومل کے سامنے بھی نہیں۔ مگر اعتراف جرم نہ کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ من میں احساس جرم کچوکے نہیں لگاتا۔ سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ چونکہ ان لوگوں نے پنچایت کے فیصلے سے بغاوت کر کے دو معصوم انسانوں کی جان لی ہے۔ سو جلد یا بدیر سانول کو بھی ایسے ہی کسی انجام کو پہنچنا ہے۔ سانول نے یہ باتیں سن کر کوشش کہ وہ اپنے خاندان کو لے کر شہر جا بسے مگر مومل اور خود اس کی ماں راضی نہ ہوئی۔ تب اس نے اپنی ساری زمینیں اونے پونے بیچ ڈالیں اور خود شہر جا کر کاروبار کر لیا۔ اب وہ گوٹھ بالکل نہیں آنا چاہتا تھا... اور مومل شہر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے پھر ایک روز شہر سے اس کی میت گوٹھ آئی۔ وہ پھیپھڑوں کے کینسر کا شکار ہو کر مرا تھا۔ اس وقت اس کا بیٹا چھ یا سات برس کا تھا...'' سجاول کی آنکھوں کے کونے سے گلابی ـــ ہو گئے... اس نے کسی داستان گو کی طرح یہ کہانی سنائی تھی۔

وہ خاموش ہوا تو جیز کے لبوں سے بے ساختہ ایک ٹھنڈی افسردہ سانس خارج ہوئی... حنا اور ایلی بھی افسردہ دکھائی دے رہی تھیں... کچھ دیر ماحول پر بوجھل سکوت طاری رہا... پھر سجاول چونک پڑا۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' اس نے تیزی سے چاروں سمت پھیلتے اندھیرے کو دیکھا اور مڑ کر یکدم وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ان تینوں نے بھی اپنی اپنی سوچوں اور احساسات میں گھرے ہوئے اس کی تقلید کی... کافی دیر سے پڑتی پھوار اب تیز بوچھاڑ میں تبدیل ہو گئی تھی... مگر وہ سائیں ہر شے سے بے نیاز یونہی کسی کے خیال میں ڈوبے دیوار سے ٹیک لگائے ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اور نجانے اسے کب تک وہیں بیٹھے رہنا تھا۔

''میں نے یہ داستان یہاں کے اکثر لوگوں سے سن رکھی ہے'' حنا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سجاول کے نزدیک پہنچ کر بولی ''مگر تم نے تو یہ کہانی ہمیں یوں سنائی ہے جیسے آنکھوں دیکھی ہو۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ایلی ـــ اس کی حمایت میں اثبات میں سر ہلانے لگی۔ جبکہ جیز یونہی خاموشی سے چلتی رہی۔

''جن آنکھوں نے دیکھی تھی' ان ہی کے منہ سے سن رکھی ہے۔ اسی لیے مجھے بھی آنکھوں دیکھی ہی لگتی ہے۔'' وہ حزنیہ لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ؟'' حنا نے بے ساختہ اچنبھے سے پوچھا۔ جیز جیسے بری طرح چونک کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کون ہو تم؟" اور اسے کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"سجاول شاہ!" وہ جیسے اعتراف جرم کرنے والے لہجے میں بولا۔

"سانول اور موسل کا بیٹا۔"

"کیا؟" جیز اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"جب سے آئے ہو، پریشان دکھائی دیتے ہو.... کوئی مسئلہ ہے کیا؟" موسل نے اپنے قریب، بستر پر لیٹے کسی گہری سوچ میں غلطاں سجاول کے ماتھے سے بال ہٹا کر ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔ اس کے گندمی خوب صورت ہاتھوں پر اب جھریاں پڑ چکی تھیں۔ لچکیلا جسم پھیلا تو نہیں تھا البتہ فربہی مائل ضرور ہو گیا تھا۔ بال بھی ماتھے کی طرف سے کچھ کچھ سفید ہو چکے تھے۔ اس نے زندگی نہیں، دکھ بسر کیے تھے ایک ایک کر کے اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا بہت کڑی آزمائش ثابت ہوئی تھی اس کے لیے۔ حقیقی معنوں میں اس کی کل کائنات سجاول ہی تھا۔ سانول کے قید تنہائی بھگت کر گزر جانے کے بعد اس نے سجاول کی تعلیم و تربیت پر شبانہ روز محنت کی تھی۔ اسے نہ صرف "ڈگری یافتہ" بلکہ واقعتاً "ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ وہ اور سجاول نہ صرف ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے بلکہ اچھے دوست، ایک دوسرے کے راز دار، غمگسار الغرض سب ہی کچھ تھے۔

"نہیں امی۔" اس نے موسل کا ہاتھ تھام کر چومنے کے بعد چھوڑ دیا اور اٹھ بیٹھا۔

"مسئلہ تو کوئی نہیں.... بس تھوڑا تھک گیا ہوں.... اپنے خاندان کی کہانی میں جب بھی دہراتا ہوں، نجانے اعصاب اتنے کشیدہ اور دل اتنا بھاری کیوں ہو جاتا ہے۔" اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکاوٹ سے کہا۔

"کیوں وہ اذیت ناک کہانی بار بار دہراتے ہو تم...." موسل خفگی سے بولی۔

"جو ہونا تھا کئی سال پہلے ہو چکا۔ یہ سب ازل سے ہماری قسمت میں لکھا تھا۔"

"قسمت میں لکھا تھا۔" وہ زہرخند ہو کر بولا۔ "اگر وہ سب تقدیر کا لکھا تھا تب پھر لوگوں نے کیوں میری پھوپھی، میرے بابا کے حوالے سے مجھے طعنے دے دے کر میرا بچپن خراب کیا.... مجھے لڑکپن میں کیوں یہ کہانی نت نئے انداز اور زاویے سے سنا کر اذیت سے دوچار کیا.... کیوں امی.... کیوں؟" وہ ہسٹریائی انداز سے بولتا چلا گیا۔

موسل نے اسے اپنی بھڑاس نکالنے دی اور صبر سے بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کے نصیب میں عام زندگی نہیں آئی تھی اور اسی لیے اس نے سجاول کو بہت خاص بنانے پر بہت محنت کی تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا، باشعور نوجوان تھا، اپنی جاب میں محنت کرتا تھا، اعصاب بہت مضبوط تھے اس کے.... مگر کبھی کبھار وہ بہت بری طرح سے بکھر جایا کرتا تھا۔

"میرے بیٹے نے لوگوں کی باتوں کو کب سے ذہن پر سوار کرنا شروع کر دیا؟" اس نے سرزنش کرنے والے لہجے میں کہا۔

"اگر لوگوں کی فکر کرنے لگو گے تو ضائع ہو جاؤ گے میرے بیٹے۔ میں نے اسی لیے اسی گوٹھ میں سب کے درمیان رہ کر تمہاری پرورش کی تھی کہ تم ایک مضبوط انسان بن کر ابھرو اور جو کچھ ہمارے ماضی میں ہم نے بھگتا ہے اس کے تدارک کے لیے تم کوشش کرو۔ کیا یہ سب تم بھول گئے ہو؟" اس نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

سیانی تو خیر وہ پہلے بھی تھی۔ مگر اپنے خاندان پہ بیتے اس سانحے نے جیسے اسے بہت زیادہ باشعور بنا دیا تھا۔ دل اجڑا تو اس نے رب سے لو لگالی اور دین سے قریب ہو کر مولوی کی عالمہ فاضلہ بیٹی سے درس لینے لگی۔ اس کی دی ہوئی کتابیں پڑھنے لگی.... ذہن نے کتابوں کو دوست بنایا تو اس کی ذہانت جگمگا اٹھی۔

"کچھ نہیں بھولا امی۔" اس کی سرزنش پر وہ شرمندہ

ہو کر وضاحت دینے لگا۔

آپ کی قربانیاں، آپ کی محنت مجھے سب یاد ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مومل کے قدموں میں آ بیٹھا۔۔۔ مومل کا ہاتھ پھر سے اس کے سر پر آ پڑا۔

"اب وہ بات بتاؤ جو اندر سے تمہیں مضطرب کر کے جھلاہٹ میں مبتلا کیے دے رہی ہے۔" اس نے پر شفقت لہجے میں پوچھا۔ تو سجاول نے بے اختیار سر اٹھا کر حیرانی سے اس کی جانب دیکھا، وہ اس کے تحیّر پہ مسکرا دی۔

"ماں ہوں تمہاری۔ کیا اتنا بھی نہیں جانوں گی کہ میرا، اپنے کام میں مصروف رہنے والا بیٹا، ایک ہفتے میں دوسری مرتبہ اپنا کام چھوڑ کر میرے پاس کیوں چلا آیا ہے۔ کوئی بات تو ضرور ہو گی نا؟"

"آپ نے ٹھیک سمجھا۔" اس کے سو فیصد درست اندازے اور محبت پر اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

"جن آنکھوں میں کل تک میرے لیے پسندیدگی دکھائی دیتی تھی، میرے خاندان کی یہ کہانی سننے کے بعد وہاں میرے لیے ملامت آ ٹھہری ہے امی، یہ میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا امی اور میں یہاں چلا آیا۔" اس نے بالآخر اپنے دل کا زخم انہیں دکھا ہی دیا۔ جہز کی آمد اور اس عرصے میں اپنے دل میں اس کے لیے پنپتے لطیف جذبات سے سجاول نے مومل کو آگاہ کر رکھا تھا۔۔۔ مومل اس کی شکستہ دلی کی وجہ جان کر مسکرا دی۔

یہ دل میں نئی نئی سر ابھارتی محبت بھی کیسی دیوانی ہوتی ہے نا، دنیا کے بڑے بڑے خطرات کی اسے پروا نہیں ہوتی مگر محبوب کی آنکھ کا ذرا سا بدلا ہوا تیور اسے بری طرح خوفزدہ کر دیتا ہے۔

"ہوں۔" اس نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ "یعنی بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ مگر کیا وہ تمہارے جذبات سے آگاہ ہے؟" اس نے سنجیدہ نظروں سے متفکر بیٹھے سجاول کو دیکھا۔

"نہیں، اور اسے بتانے کا فائدہ بھی کیا، وہ آسمان ہے اور میں زمین میں جانتا ہوں اس کا جواب انکار ہی ہو گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔

"پہلا قدم اٹھایا نہیں، اور تیسرے کے بارے میں فکر کرنے لگے۔" وہ اس کی قنوطیت دیکھ کر ناراضی سے بولی۔

"ارے پہلا قدم اٹھاؤ گے تو دوسرا وہ اٹھائے گی تب ہی تم تیسرے کے بارے میں سوچو گے نا۔ انکار کرے گی یا اقرار مگر تمہارے دل سے تو یہ خلش مٹ جائے گی نا کہ تم اسے بتا بھی نہ سکے۔" وہ دوستوں کی طرح اس کی دلجوئی کرنے لگی تھی۔

"اور اگر اس نے مجھے قاتل کا بیٹا کہہ کر انکار کر دیا تو؟" وہ آنکھوں میں وہم لیے متذبذب لہجے میں پوچھنے لگا۔

مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔۔۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج رات سندھل نے جیسمن، ایلی اور حنا (حنا کا نام صرف خانہ پری تھا) کے اعزاز میں ڈنر دیا تھا۔

عشائیے کا سارا انتظام ان کے خوب صورت لان میں کیا گیا تھا۔ شیشے کی گول میزوں کے درمیان کرسٹل گلدانوں میں سجے سفید ٹیولپز نے تقریب کو معطر کر رکھا تھا۔ لان کی تیز اسپاٹ لائیٹس میں چمکتے مہمانوں کے چہرے بے فکر دکھائی دے رہے تھے اور وہ ڈرنکس ہاتھ میں پکڑے آپس میں مسکراتے ہوئے محو گفتگو تھے۔

لان کی مشرقی دیوار کے ساتھ بوفے ٹیبل لگائی گئی تھی۔ باوردی بیرے ہاتھ میں مختلف اسٹارٹرز اور ڈرنکس کی ٹرے اٹھائے مہمانوں کے سامنے بڑے مودب انداز میں انہیں پیش کر رہے تھے۔ سندھل ہلکے آسمانی سوٹ میں اجرک کندھے پر ڈالے بڑی خوش خلقی سے مہمانوں کو اٹینڈ کر رہی تھیں۔ مجموعی طور پر تقریب کا ماحول خاصا خوشگوار سا تھا اور ایسے میں کالا گھیر دار ٹخنوں کو چھوتا فراک جو اوپر سے نسبتاً فٹ تھا اور جس کے دائیں کندھے سے ذرا سا نیچے بڑا

خوب صورت اور نفیس سا سنہری پھول ٹکا ہوا تھا' زیب تن کیے جیز' ہاتھ میں اورنج سلیش کا گلاس تھامے' بڑے پرسوچ انداز میں کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی۔۔۔ جبکہ اس کے ساتھ سرخ شرٹ' ٹراؤزر میں ملبوس ہیزل کلر کے لینس لگائے ایلی' بڑے خوشگوار موڈ میں کھڑی' ونگ ٹونگ سے انصاف کرتے ہوئے سرشاری سے گویا تھی۔

"جب سے اس سجاول نے وہ دردناک' ناقابل یقین کہانی سنائی ہے' قسم سے دکھ کے مارے میرا تو برا حال تھا۔۔۔ آنٹی سندھل نے یہ پارٹی دے کر بہت اچھا کیا۔"

"ہوں۔" جیز نے محض اسی قدر کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کے من میں کل سے مستقل ایک جنگ سی چھڑی ہوئی تھی اور جو حالت جنگ میں ہو' خوشگوار لمحات اس پر اثرانداز نہیں ہوا کرتے۔

"اچھا' ذرا میں حنا کو دیکھ آؤں۔ نجانے پچھلے آدھے گھنٹے سے ان ماڈرن سی آنٹی کے ساتھ اتنا ہنس ہنس کر کیا باتیں کر رہی ہے۔" اس نے باقی ماندہ وونگ ٹونگ جلدی سے نگل کر ٹشو سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور نیوی بلیو سوٹ میں ہمیشہ کی طرح اپنا سر ہم رنگ اسکارف سے ڈھانپے ہوئے' کسی خاتون کے ساتھ محو گفتگو حنا کی جانب بڑھ گئی۔۔۔ اور اپنے کولیگز کے ساتھ ٹیبل پر بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس کافی دیر سے جیز کی جانب متوجہ سجاول کو لگا جیسے کہ بس یہی ایک موقع ہے' اپنے جذبات محتاط الفاظ میں اس تک پہنچانے کا۔ اب نہیں تو یقیناً' کبھی نہیں۔ اسی لیے وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے معذرت کرتا ہوا اس تک چلا آیا۔

"السلام علیکم' کیسی ہیں جیز آپ؟" وہ اس کے نزدیک آکر گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔ جیز بری طرح چونک اٹھی۔

"جی ٹھیک ہوں۔" وہ بے دلی سے مسکرا کر بولی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس خاموشی سے کھڑا تقریب کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بنا اس کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی تمام ترہمت مجتمع کرکے بالآخر بول ہی اٹھا۔

"جیز' دراصل۔۔۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کچھ میں بھی آپ کو بتانا چاہتی ہوں سجاول۔" وہ بلوریں گلاس کے کنارے پر اضطراری انداز سے انگلی پھیرتے ہوئے بے ساختہ بولی تو وہ حیرانی سے دوچار ہوتے ہوئے جیسے ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

"اچھا! جی ضرور۔۔۔ کہیے میں سن رہا ہوں۔" اور اگر یہ کہنا اتنا ہی آسان ہوتا تو کیا ہی بات تھی۔ کوئی تیز دھار تلوار تھی جس پر برہنہ پا اسے چلنا تھا۔

"نہیں!" وہ بڑی مضبوط آواز میں بولی۔ "پہلے جو آپ کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں' کیونکہ ہو سکتا ہے کہ میری بات سننے کے بعد آپ مجھ سے مخاطب ہونا بھی پسند نہ کریں۔" وہ زہریلے انداز سے مسکرا کر بولی تو سجاول کشمکش کا شکار ہو گیا۔

چند ثانیے ان کے مابین متکلم خاموشی در آئی۔ پھر جیسے سجاول نے آر یا پار والی کیفیت کے زیر اثر بولنا شروع کیا۔

"ہو سکتا ہے جو میں آپ سے کہنے جا رہا ہوں اس کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو۔ کیونکہ بہرحال آپ ایک ماڈرن ملک کی باشعور تعلیم یافتہ لڑکی ہیں۔ مگر میرے لیے اس بات کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کیونکہ نہ میں کوئی فلرٹ ہوں اور نہ آج سے قبل میں نے کسی لڑکی سے یہ کہا ہے کہ۔" یہاں تک تمہید باندھ کر وہ ٹھہر گیا۔

"کہ؟" وہ اس کے یوں تمہید باندھنے پر الجھ کر' استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ تو اس بار سامنے دیکھتے سجاول نے گردن موڑ کر بغور اس کی جانب دیکھا۔

"کہ میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں جیز۔ کب' کیوں اور کیسے یہ میں خود بھی نہیں جانتا مگر کوئی جذبہ تو ہے جو مجھے آپ کی جانب کھینچتا ہے۔" وہ اس کی گہری آنکھوں سے جھلکتے اضطراب سے بے نیاز جذبوں سے پرآواز میں یکدم کہہ گیا۔

وہ اس کے منہ سے یہ غیر متوقع بات سن کر ہکا بکا رہ گئی ... پھر اس نے خود کو جیسے سنبھالا۔ اس دوران سجاول مسلسل اس پر اپنی گہری جواب طلب نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔ مگر وہ خاموشی کی دبیز چادر اتارنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وہ گومگو کا شکار دکھائی دیتی تھی۔

"جیز پلیز!" اس کی معنی خیز خاموشی پر وہ بے چینی سے بولا۔ "کچھ تو کہیں آپ۔"

"کیا کہوں سجاول! وہ گم صم لہجے میں گویا ہوئی۔ "آپ میری سچائی سے واقف نہیں ہیں۔ اسی لیے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ گئے۔"

"آپ کی سچائی جو بھی رہی ہو۔" وہ جذباتیت سے بولا۔ "میرے جذبوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ محبت اتنی کم ظرف نہیں ہوتی یاسمین۔" وہ اسے یقین دلانے والے لہجے میں کہتا گیا۔

"یقیناً" ... وہ اس مرتبہ پورے اعتماد سے مسکرائی' جیسے وہ کچھ دیر قبل کی کش مکش سے خود کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو چکی ہو "محبت کم ظرف نہیں ہوتی سجاول شاہ' مگر لوگ ہوتے ہیں ... تو کیا کہتی ہے آپ کی یہ نئی نویلی محبت ... کیا وہ ایک ایسی لڑکی پر نثار ہونا چاہے گی جس کی ماں کو اس کے ماں جائے نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی صرف اپنی جھوٹی انا کی خاطر غیرت کے نام پر قتل کر دیا ہو۔" وہ عجیب انداز سے مسکراتی ہوئی بھید بھرے انداز میں بولی تو سجاول نے چونکتے ہوئے قدرے الجھ کر نافہم نگاہوں سے اس کا "مانوس" چہرہ دیکھا ...

"کیا مطلب؟ کس کی بیٹی ... کون ہو تم؟" وہ یکلخت پورے کا پورا اس کی جانب گھوم گیا۔

"میں اس ماروی کی بیٹی ہوں سجاول' جسے تمہارے باپ نے سالوں پہلے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" اس نے آگ برساتے نفرت انگیز لہجے میں یہ عجیب تر انکشاف کیا اور سجاول شاہ ... اس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اور کہنے والے تو کہتے ہیں کہ افسانے زندگی سے قطعاً" عبارت نہیں ہوتے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی بعض قصوں' کہانیوں سے عجیب تر ہوتی ہے۔ اتنی حیران کن کہ اگر اسے افسانے کے قالب میں ڈھالو تو قاری ناقابل یقین کہہ کر فی الفور مسترد کر دے۔ وقت کا پہیہ الٹا گھومنے لگا اور اس لرزہ خیز منظر پر جا کر ٹھہر گیا کہ جب سانول نے ماروی کو للکارتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کلہاڑی پوری قوت سے اس کی جانب پھینکی تھی۔

فضا میں ماروی کی دل خراش چیخ گونجی اور اس کے بعد چہار جانب گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ سانول خوف سے اپنی جگہ پتھر ہو گیا تھا۔ اس کی دانست میں اس کی کلہاڑی کے وار سے زخمی ہونے والی ماروی اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے عمر' اس کی کلہاڑی سمیت دریا برد ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا' کہاں گئے وہ؟" دیوانوں کی طرح ان کا تعاقب کرتا غلام علی پھولی ہوئی سانسوں سمیت پتھرائے ہوئے سانول کے نزدیک پہنچ کر دہاڑا تھا۔

"مار دیا۔" سانول کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ "میں نے مار دیا انہیں' وہ زخمی ہو کر دریا میں جا گرے۔"

"یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔" غلام علی کا تھکا ماندہ وجود جیسے پھر سے جوان ہو اٹھا۔

"تو نے اپنی روایت کو برقرار رکھا' تو دیکھنا ساری برادری تجھ پر فخر کرے گی کل کو۔" اس نے سانول کی خم ٹھونکتے ہوئے کہا۔ وہ جو ایک ذرا سا ملال اس کے اندر سر ابھارنے لگا تھا وہ غلام علی کے ان الفاظ سے اپنی موت آپ مر گیا اور وہ پہلے سے زیادہ مطمئن اور زعم بھرے لہجے میں بولا ...

"میں نے آپ سے کہا تھا نا چاچا سائیں! بھلے میں شہر میں لکھ پڑھ رہا ہوں مگر مجھے اپنے رسم و رواج اور روایات اپنی جان سے زیادہ پیارے ہیں' تو میں ان دونوں کی جان کیسے بخش سکتا تھا۔"

"ہاں ... ہاں ٹھیک ہے۔" دفعتاً" غلام علی پر کوئی نئی فکر سوار ہوئی ...

"بس اب جلدی سے یہاں سے واپس چلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ڈنو کا کوئی کارندہ ہمیں یہاں دیکھ لے۔" اس نے فکرمندی سے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سب "فوراً" ہی واپس ہولیے۔

اور ان کے روانہ ہونے کے ٹھیک بیس منٹ بعد، ایک دیوہیکل پتھر کی اوٹ میں چھپا عمر، ہوش و خرد سے بیگانی ماروی کو اپنی مضبوط باہنوں میں اٹھائے نمودار ہوا اور غلام علی وغیرہ کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔۔۔ جس وقت سانول نے کلہاڑا ان کی جانب اچھالا، عمر پہلے ہی اس پتھر، کہ جس کے ساتھ ساتھ بارش کا گدلا پانی کسی ریلے کی صورت میں بہتا ہوا دریا کی سمت جارہا تھا کی اوٹ میں بڑی پھرتی سے ہو گیا تھا اور اس سے قبل کہ وہ ماروی کو کھینچ پاتا سانول کی کلہاڑی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ وہ اس کا دایاں کندھا زخمی کرتی ہوئی گزر گئی مگر ماروی مارے خوف کے بے ہوش ہو گئی تھی۔

وہ اسے ہاتھوں میں اٹھائے دیوانوں کی طرح بھاگا چلا جارہا تھا۔۔۔ وہ کب تک بھاگتا رہا اسے یاد نہیں، یاد رہا تو صرف اتنا کہ سامنے سڑک نظر آگئی تھی۔ اور اس پر دوڑتی ہوئی وہ کالی پیلی ٹیکسی بھی۔۔۔ جس میں ایک نوجوان اپنے معمر، دل کے مریض باپ کو لیے کراچی جا رہا تھا۔ اس نے انہیں روک کر مدد مانگی، زخمی ماروی اس کی آغوش میں تھی اور وہ خود حواس باختہ، اس نے انہیں ایکسیڈنٹ کا بتایا۔ عام حالات میں شاید ان سے سو طرح کے سوالات کیے جاتے مگر فی الحال وہ لوگ نہ صرف جلدی میں تھے بلکہ اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ لڑکا بھی رقیق القلب سا ہو رہا تھا، اسی لیے ان کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔

یوں وہ ان کے ساتھ اسپتال آ گئے۔ جہاں پہنچ کر عمر نے پہلی فرصت میں اپنے والد عثمان خان کو فون کیا۔۔۔ وہ افتاں و خیزاں دوڑے چلے آئے۔۔۔ تب انہیں ساری روداد سنائی۔ کچھ ان کی بری بھلی سننا پڑی۔۔۔ مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ماروی اس کی محبت تھی، شرعی منکوحہ تھی۔۔۔ لہٰذا ان کی مرہم پٹی کروا کر گھر لے آئے۔۔۔ اور ایک ماہ کے اندر اندر پہلے عمر، اس کے بعد ماروی کو اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے انگلینڈ بھجوا دیا۔

بعد ازاں وہ اور ان کی بیگم بھی اپنے اکلوتے لخت جگر اور بہو کے پاس چلے آئے۔ پیچھے کوئی لمبا چوڑا خاندان نہیں تھا۔ جو تھے وہ بھی بیرون ملک سکونت پذیر تھے، اس لیے پاکستان سے ان کا تعلق بہ آسانی ٹوٹ گیا اور رہا حسن تو وہ خود عمر اور اس کے خاندان کے سائے سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کھوج میں کیا پڑتا۔ پھر وقت اور زندگی دونوں ہی بہت آگے نکل گئے۔ اور بہت کچھ پیچھے رہ گیا۔

عمر نے ماروی کو اپنی محبت کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر آسائش فراہم کی تھی مگر اس کے من میں پنپتے وچھوڑے کا اس کے پاس کوئی حل موجود نہ تھا۔ جہز کو ان لوگوں نے دیدہ و دانستہ اپنے تکلیف دہ ماضی سے لاعلم رکھنے کا فیصلہ بہت پہلے ہی کر لیا تھا جبکہ ایک فیصلہ لوحِ محفوظ میں بھی درج تھا جو وقت آنے پر سامنے آیا اور یوں آیا کہ اس نے جہز کے لاہور جانے والے جہاز کا رخ کراچی کی سمت کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے یاسمین کو پاکستان جانے کی اجازت دے کر اچھا نہیں کیا عمر! اگر وہاں کسی کو اس کی سن گن مل گئی تب۔۔۔ تب کیا ہو گا عمر۔۔۔ تب کیا ہو گا؟" اندیشوں سے پُر یہ گلوگیر آواز، ان کے کمرے کے باہر موجود جہز کو بری طرح ٹھٹکا گئی۔۔۔

اسے عمر نے پاکستان جانے کی اجازت صرف لاہور جانے اور وہیں تک محدود رہنے کے حکم کے ساتھ دی تھی۔۔۔ اور جہز کا اس وقت اس حکم کی نافرمانی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ تینوں پہلے عالیہ کے بھائی کی شادی اٹینڈ کریں گی، اس کے بعد حنا جمالی اپنے گھر والوں سے ملنے چلی جائے گی اور وہ دونوں واپس یہیں آ جائیں گی۔۔۔ اس وقت وہ بہت پرجوش سی اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔ تب ہی ایک سوٹ کے متعلق مشورہ کرنے وہ سوٹ اٹھائے ماروی کے کمرے...

کی جانب آرہی تھی کہ اس کے کانوں نے اس کے والدین کے درمیان ہوتی یہ غیر معمولی گفتگو سنی اور اس کے قدم وہیں ٹھہر گئے۔

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھا قدرے بے پروائی سے بولا۔ "وہ لاہور جائے گی' تمہارے گوٹھ نہیں جو تم اس قدر پریشان ہو رہی ہو۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" وہ گھبرا کر رو پڑی' مجھ میں اب کچھ بھی کھونے کا حوصلہ موجود نہیں ہے عمر! پہلے ہی تقدیر مجھ سے محبت کے بدلے میرا ہر رشتہ چھین چکی ہے۔" اس کے لفظ نہیں گویا دل میں گڑے کانٹے تھے جو وہ باہر نکال رہی تھی۔

"قسمت نہیں۔" عمر کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ "تمہارے بھائی سانول اور چچا نے چھینے ہیں تم سے سارے رشتے' بلکہ رشتوں پہ ہی کیا موقوف' وہ تو ہماری جانوں کے بھی درپے تھے.... بھلا ہو اس مومل کا جس نے بروقت ہمیں آگاہ کر دیا تھا۔"

"ہاں مومل!" وہ اس نام پر تڑپ ہی تو اٹھی تھی۔ "میری پیاری سہیلی مومل' نجانے آج کس حال میں ہوگی۔ ادا سانول کی اصلیت جاننے کے بعد اس نے انہیں اپنایا ہوگا بھی یا نہیں؟" ہاں دل سے اسے اپنا تو وہ واقعی نہیں سکی تھی' البتہ شادی ضرور کر لی تھی کہ اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ تھا نہ انکار کا اختیار۔

اس کے تڑپنے پر' عمر نے اس کے نزدیک تر آکر اس کے گرد اپنا حصار محبت قائم کرتے ہوئے عجیب یاسیت سے کہا.... "تمہیں میری وجہ سے اپنے بہت پیاروں سے جدا ہونا پڑ گیا ماروی' نہ میں تمہارے گوٹھ آتا' نہ تم سے محبت ہوتی اور نہ ہی ہمیں یہ دن دیکھنا پڑتا۔"

"خود کو الزام نہ دیں سائیں۔" وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا کچھ قصور نہیں یہ سب ایسے ہی ہونا لکھا تھا۔"

"مگر تمہیں تو اپنوں سے جدائی کا غم لگ گیا نا' نجانے ہمارے بعد وہاں کیا صورت حال رہی ہوگی؟ اگر کسی طرح معلوم ہو سکتا تو میں تمہیں وہاں لے جا کر سب سے ملوانے کی کوشش ضرور کرتا۔"

"نہ سائیں۔" وہ دہل کر بولی۔ "آپ میرے لوگوں کو جانتے نہیں ہیں اگر وہاں دشمنی ہو جائے تب وہ لوگ نسلوں تک نبھالتے ہیں' اس وقت تو قدرت نے ہماری جان بچالی تھی مگر ضروری نہیں ہر بار یہ اتفاق ہو .... یہ تو بس یونہی کبھی کبھار میرے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے.... انسان جس دھرتی پہ جنم لیتا ہے نا سائیں' اس دھرتی سے اس کا رشتہ' خونی رشتوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ چاہے درمیان میں جتنے بھی فاصلے در آئیں' یہ تعلق ہمیشہ تازہ اور جوان ہی رہتا ہے.... حنا بٹی کو دیکھتی ہوں تو میرا دل خود بخود اس کی جانب کھنچنے لگتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا.... وہ ہمارے حیدر آباد سے ہے سائیں.... اور ہمارا گوٹھ اس سے تھوڑے فاصلے ہی پر تو ہے۔"

"جانتا ہوں ماروی' بہت شرمندہ ہوں میں تم سے۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں اسے تھپکنے لگا.... تو اس کے بہتے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"نجانے زندگی کو ہمارے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک روا رکھ کر کیا ملتا ہے؟" اس سوال کا جواب تو بہر حال دروازے کے اس پار اس انکشاف کے زیر اثر حق دق کھڑی جیز کے پاس نہیں تھا۔ ہاں مگر ماں کے بہتے' بے بس آنسوؤں کے لیے اس نے کچھ کرنے کا بہر طور مصمم ارادہ اسی وقت کر لیا تھا۔ بس اب حنا اور عالیہ سے روانگی کے پلان میں معمولی سی تبدیلی کے لیے اصرار کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہر عمر اور ماروی کا مقدر جدائی نہیں ہوا کرتی۔ سجاول! جو کہانی کچھ دن پہلے تم نے مجھے سنائی تھی۔ اس کا بقیہ حصہ آج میں تمہیں سنانے کے بعد پوچھتی ہوں کہ اب کہو سجاول شاہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

وہ ماضی سے پھر حال میں لوٹ آئے تھے۔ وہی پارٹی

'وہی لوگ' وہی منظر... مگر نہیں شاید کہیں ذرا سا تغیر رونما ہوا تو تھا...
جیز کی طنزیہ نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔
"تم لوگ یہاں ایسے ہی کیوں کھڑے ہو بیٹا' کھانا تو لے لو۔" مصروف سی سندھل نے آکر انہیں ٹوکا تو ششدر کھڑا سجاول جیسے یکلخت ہوش میں آیا اور بنا کسی کی طرف متوجہ ہوئے پارٹی سے نکلتا چلا گیا...
جیز کے لبوں پر ایک شکست خوردہ تبسم اُبھرا... اس کا جواب اسے مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہہ رہے ہو سجاول!" مومل کے لرزیدہ ہاتھ سے شیشے کا گلاس چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ پارٹی سے سیدھا گھر آیا تھا۔ رات کے وقت مومل اسے دیکھ کر متعجب تو ہوئی مگر کوئی سوال نہ کیا۔
اسے بھی اس انکشاف کو ہضم کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ کچھ خود کو بھی سمجھانا تھا کہ بہرحال وہ اسی معاشرے کا فرد تھا جسے یہ جان کر جہاں حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا کہ وہ اس کی "مقتولہ پھوپھی" کی زندہ بیٹی ہے' وہیں اسے فطری طور پر رنج بھی پہنچا تھا کہ جانتا تھا کہ انہیں آج بھی یہ معاشرہ خندہ پیشانی سے ہرگز بھی قبول نہیں کرے گا۔
کسی کے "مزار" پر جا کر دیے جلانا اور بات ہے اور صاحب مزار کو بحیثیت "انسان" تسلیم کرتے ہوئے اسے تعظیم دینا قطعاً" مختلف... یوں ہی سوچوں میں غلطاں ساری رات گزر گئی مگر اسے یاسمین کے سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔
اور صبح مومل کے پوچھنے پر اس نے پہلی فرصت میں سب بتا دیا' جسے سن کر پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا ... مگر پھر جو وہ رونا شروع ہوئی تو دریا بھی جیسے اس سے منہ چھپانے لگا۔
"طبیعت بگڑ جائے گی آپ کی امی' کیوں رو رہی ہیں آپ اتنا۔" اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ وہ بوکھلا گیا۔
"تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے سجاول' میں اسے اپنے سینے سے لگا لیتی میرے بیٹے' وہ میری ماروی... ماروی کی بیٹی ہے... تمہیں سننے میں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی کہیں۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں استفسار کرنے لگی۔ مبادا وہ اقرار ہی نہ کر لے کہیں۔
"نہیں امی! ساری کہانی صاف صاف سنائی ہے اس نے مجھے۔"
"واہ رے اللہ سائیں!" اس کی متشکرانہ نگاہیں آسمان کی جانب اٹھیں' تیرا شکر ہے کہ تو نے سانول اور بابا سائیں کو قاتل بننے سے بچالیا اور ماروی کو محفوظ رکھا۔"
"تب پھر بابا اور نانا کو کس بات کی سزا ملی امی؟" وہ نافہمی سے اسے دیکھتا ہوا گہری رنجیدگی سے پوچھ بیٹھا۔
"شاید اپنی نیت اور قرآن پاک کی حرمت پامال کرنے کی۔" وہ جھرجھری لے کر بے ساختہ ملول لہجے میں بولی۔ "تم نہیں جانتے میرے بیٹے' سارے خاندان کو اپنے سامنے ختم ہوتے دیکھنا کس قدر تکلیف دہ تھا۔ اب تم نے مجھے ماروی کی زندگی کا مژدہ سنایا ہے تب اس کی بیٹی کو تمہیں فوراً" یہاں لے آنا چاہیے تھا۔" وہ بے قراری سے بولی۔
"یہ اتنا آسان نہیں ہے امی۔" وہ جھنجلا کر بولا "بہتر ہے جو کہانی برسوں پہلے ختم ہو چکی ہے' اسے لوگوں کے ذہنوں میں دوبارہ تازہ نہ کیا جائے۔"
"یہ کیسی بات کر رہے ہو۔" وہ پلو سے اپنی آنکھیں رگڑ کر تعجب آمیز خفگی سے بولی۔ "وہ بچی اتنی دور سے اپنی ماں کی خاطر یہاں آئی ہے' کیا ہم ایسے ہی اسے جانے دیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو گا۔" وہ قطعیت سے بولی۔
"کس کس کو جواب دیں گی آپ' ہمارے معاشرے میں آج بھی ماروی پھوپھو جیسی عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا۔
"جگہ ہی تو بنانی ہے بیٹا۔" وہ دھیمے مگر ناصحانہ انداز میں بولی۔ "جانتے ہو سائیں اللہ ڈنو کہا کرتے تھے کہ میں نے روشنی کا بیج یہاں بو دیا ہے۔ لوگو! اب اس بیج

کی آبیاری اور سخت موسموں سے اس کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ دن دور نہیں جب میری دھرتی سے جہالت ' فرسودہ رسم و رواج اور ظلم جیسے گہرے اندھیرے اپنا وجود ہمیشہ کے لیے کھودیں گے۔۔۔ اور بیٹا عملاً" کسی کو تو پہل کرنی ہو گی نا' تو یہ پہل تم ہی کیوں نہ کرو۔" وہ مضبوط اور پر تاثیر لہجے میں کہتی چلی گئی۔

اور جب نیک نیتی کے ساتھ سچی بات پُر اثر لہجے میں کی جائے تو وہ کیوں نہ دل تک پہنچے گی۔۔۔ یہ مومل جیسی باکردار' باہمت اور روشن خیال مائیں ہی ہیں کہ جن کے بطن سے معجزے جنم لیا کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆
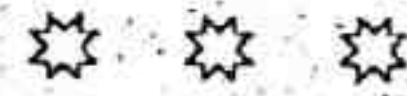
"اوہ۔۔۔ تو دراصل یہاں بصد اصرار آنے کے پیچھے یہ مقصد کارفرما تھا' مگر جیز' اتنی بڑی بات کا ذکر بھی تم نے ہم سے کرنا ضروری نہ سمجھا۔" جی بھر کے حیران ہونے کے بعد حنا شاکی لہجے میں بولی پارٹی کے بعد سے اس کی مسلسل خاموشی اور افسردگی سب ہی نے نوٹ کی تھی۔

حنا کے پوچھنے کی دیر تھی' جیز اتنی دلبرداشتہ ہو رہی تھی کہ اس نے بلاتاخیر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ ظاہری بات ہے' وہ لوگ اس کے یوں رونے پر گھبرا کر ماجرا پوچھنے لگیں۔۔۔ جو اس نے سسکیوں کے درمیان کہہ سنایا۔

"میں نہ کہتی تھی۔" ایلی نے داد طلب نگاہوں سے حنا کی جانب دیکھ کر فخر سے کہا۔ "ہو نہ ہو' مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے جیز کے رویے میں۔ ٹھیک کہتی ہو تم حنا' کم از کم اسے ہمیں تو یہ سب پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا' آخر دوست ہیں ہم اس کے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"میں ڈر گئی تھی۔" اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ "کہ سچائی جاننے کے بعد کہیں تم لوگ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے کر آنے سے منع ہی نہ کردو۔۔۔ اور میں یہاں صرف ایک بار ہی مگر ضرور آنا چاہتی تھی۔ میں نے سنا تھا اپنی مما کو یہاں والوں کے لیے تڑپتے ہوئے' میں بس یہاں آکر ان سب کا احوال جاننا چاہتی تھی' اتنا تو میں کرہی سکتی تھی نا اپنی مما کے لیے۔۔۔ مگر جب سجاول نے بتایا کہ وہ مما کے بھائی کا بیٹا ہے تو میرے ذہن نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔۔۔ میں سمجھی وہ جو براڈ مائنڈڈ ہے' ویل ایجوکیٹڈ ہے اپنے علاقے میں چینج لانے کے لیے پرعزم ہے' وہ شاید میرا ساتھ دے گا۔۔۔ مگر دیکھ لو۔۔۔ وہ بھی عام لوگوں جیسا نکلا۔" اس نے دکھ کی انتھاہ گہرائی میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"نہیں جیز بیٹے!" ان کے عقب سے سندھل کی مخصوص میٹھی اور پرسکون آواز گونجی۔

وہ چونک پڑی۔ سندھل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔۔۔

"کبھی کبھار کسی کی خاموشی کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو ہم اخذ کرلیتے ہیں۔۔۔ اسے شاید کچھ وقت درکار تھا ۔۔۔ مگر وہ واپس آگیا ہے۔۔۔ اور اس بار وہ اکیلا نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

مومل سے جیز کی ملاقات کا جذباتی منظر دیکھ کر وہاں موجود ہر آنکھ اشکبار تھی۔۔۔ مومل بار بار اس کے صبیح چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر جیسے یاروی کو محسوس کر رہی تھی۔۔۔ وہ رو رو کر تھک چکی تھی مگر پھر بھی اسے اپنے ساتھ لپٹائے' سندھل کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی تھی۔۔۔ اور جیز کے محسوسات بھی کچھ مختلف نہ تھے۔ وہ اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔ اور آج ملی تو یوں لگا جیسے ہمیشہ سے اسے جانتی ہو۔

"بس اب آپ لوگ شکرانے کے نوافل رب کے حضور ادا کیجیے کہ اس نے انہونی کو ممکن کرکے آپ لوگوں کو جیتے جی ملوا دیا۔" مومل کے جذبات کچھ قابو میں آئے تو سندھل نے مسکرا کر کہا۔

سوہنی ٹیبل پر چائے اور اس کے لوازمات رکھ رہی تھی۔ ایلی بڑی رقت جبکہ حنا دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔۔۔ البتہ سجاول

چپ چاپ سا بیٹھا۔

"کیوں نہیں لوی۔! میں نے تو گھر ہی پر ادا کر لیے تھے۔ اللہ سائیں نے دن بھی تو اتنی خوشی کا دکھایا ہے' میں نے تو کبھی خواب میں بھی اس ملاقات کا تصور نہیں کیا تھا۔" وہ اپنے کندھے سے لگی جیز کا سر تھپکتے ہوئے بولی۔

"زندگی اسی کا نام ہے۔ جو خواب میں بھی سوچا نہ ہو' وہ تعبیر کی صورت سامنے آجاتا ہے۔" سندھل نے نجانے کیا سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں یاسمین!" موہل نے بے تابی سے کہا۔ "بس اب تم فوراً" میری بات میری سہیلی' میری ماروی سے کروادو تو مجھے قرار آجائے۔"

"میں!" وہ یکدم بری طرح گڑبڑا کر اس سے الگ ہوئی۔ "مگر میں کیسے بتاؤں۔ انہیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ میں ان کے علم میں لائے بغیر یہاں چلی آئی ہوں۔" وہ خائف ہو کر پریشانی سے بولی۔

"بتانا تو تمہیں پڑے گا جیز!" اب کی بار خاموش بیٹھے سجاول نے لب کشائی کی۔ "جب اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے تمہیں ڈر محسوس نہیں ہوا تو اب کیوں جھجک رہی ہو۔"

"میں واپس جا کر ساری تفصیل انہیں سامنے بٹھا کر بتانا چاہتی ہوں آنٹی!" اس نے موہل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسے تو انہیں شدید دھچکا لگنے کا اندیشہ ہے۔" وہ جھوٹ بول کر یہاں آنے پر اب جا کر صحیح معنوں میں پشیمان اور فکر مند ہو رہی تھی۔

"نہیں بیٹا نہیں۔" موہل یکدم دوبارہ رو پڑی۔ "اب مجھے اور انتظار مت کرواؤ' ٹھیک کہتے ہیں سیانے 'مرے ہوؤں پر تو صبر آجاتا ہے' یہ تو مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ آج تک مجھے ماروی کے یوں بچھڑ جانے پر صبر کیوں نہیں آیا تھا۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

اور اسی لمحے اس کی دگرگوں حالت دیکھتے ہوئے جیز نے اپنی زندگی کا ایک اور مشکل کام بڑی آسانی سے سرانجام دینے کے لیے خود کو فی الفور ہی تیار کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مما! مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ مگر پہلے آپ وعدہ کریں' آپ بالکل نارمل ہو کر سنیں گی ساری بات اور مجھ سے ناراض بھی نہیں ہوں گی۔" جیز نے فون ملا کر علیک سلیک کے بعد کہا تو ماروی اس کے غیر معمولی انداز پر ٹھٹک گئی تاہم خود پر قابو رکھ کر بولی۔

"ایسی کیا بات ہو گئی جیز' کہیں وہ بریسلیٹ تو نہیں گم کر بیٹھی ہو' جو تمہارے ڈیڈ نے مجھے ہماری دسویں ویڈنگ اینی ورسری پر دیا تھا' جو ضد کر کے لے گئی ہو تم مجھ سے۔" وہ واقعی یہی سمجھی تھی۔

"نہیں مما' یہ بات نہیں ہے۔" اس کے آنسو بہنے لگے۔ کیسے بتائے وہ؟ الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اسے بہرحال کہنا تو تھا کہ ڈرائنگ روم میں براجمان موہل منتظر تھی۔ اسے ماروی "مر جانے کے بعد" دوبارہ ملی تھی۔ اس کی کیفیت کا تو اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔

"مما! کیا آپ موہل آنٹی سے بات کرنا چاہیں گی۔" اس نے اس بار دل کڑا کر کے' بنا بات گھمائے پھرائے فوراً" کہہ دیا اور اس کے بعد اپنے لب چبانے لگی۔

"موہل؟" ماروی جیسے ہل کر رہ گئی۔ "کون موہل؟" اسے لگا جیسے اس کی سماعت نے اسے دھوکا دیا ہو۔

"موہل' آپ کی سہیلی مما' آپ کے چچا سائیں کی بیٹی' آپ کے ادا سانول کی بیوی۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"کیا بول رہی ہے یہ؟" یکدم ہی ماروی کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ تیورا کر زمین پر آرہی۔ اور سامنے صوفے پر کوئی میگزین دیکھتا عمر اس کے یوں گرنے پر گھبرا کر اس کی جانب بڑھا تھا۔

☆ ☆ ☆

دنیا کے کسی بھی قلم سے نکلے الفاظ اس کیفیت کا احاطہ نہیں کر سکتے جو اس لمحے کپکپاتی آواز میں موہل کے ماروی کو مخاطب کرنے پر اس پہ طاری ہو گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی' ہنس رہی تھی۔ پھر رو رہی تھی۔ گویا

کوئی دیوانگی سی دیوانگی تھی اور خوشی ہو یا غم دونوں کی زیادتی، بجز انسانی عقل سلب کرنے کے اور کرتی بھی کیا ہے؟ عمر، جیز کی اس حرکت پر اس سے سخت ناراض تھا، مگر اب اس نے آنسو بہاتے ہوئے اپنے اس عمل کے محرکات کے متعلق اسے بتا کر اس سے معافی مانگی تب وہ کچھ نرم پڑا اور جب اس نے اپنے اسمارٹ فون کی اسکرین پہ دکھائی دیتی مومل کو دیکھتے ہوئے ماروی کی حالت دیکھی۔ تب اس نے جیز کو جیسے مکمل طور پر معاف کر دیا لیکن وہ اب بھی جیز کے لیے فکر مند اور خوف زدہ تھا۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں تھا مومل کہ میں اس زندگی میں تجھے کبھی دوبارہ بھی دیکھ پاؤں گی۔" وہ اپنے فون کی اسکرین پہ دکھائی دیتا مومل کا چہرہ چھو کر بولی۔

سوائے جیز اور سجاول کے، باقی لوگ ڈرائنگ روم سے فی الحال باہر چلے گئے تھے۔

"اور میں نے تو کبھی سپنے میں بھی اس ادھوری ملاقات کا تصور نہیں کیا تھا ماروی! کہ ہمارے نزدیک تو زندہ ہی کب رہی تھی۔" وہ اپنی ہچکیوں پر قابو پا کر بولی۔

"میں پل پل تڑپتی رہی تم لوگوں اور اپنی دھرتی کے لیے... یہ تو دور جا کر ہی مجھ پر کھلا کہ اپنی مٹی کی محبت بھی انسان کے خون کے ساتھ اس کے جسم میں گردش کرتی ہے، مگر میں تو آج بھی وہاں آنہ سکوں گی... بس اب کچھ تدبیر کر کے تو جلد از جلد مجھ سے ملنے یہاں چلی آ۔" وہ یاسیت سے بولی تو مومل معنی خیزی سے مسکرائی۔

"یہ تجھ سے کس نے کہا کہ تو یہاں نہیں آسکے گی ماروی، تیری یاسمین نے تیری واپسی کی راہ ہموار کر دی ہے پگلی، اور وہ اکیلی نہیں ہے میرا سجاول اس کے ساتھ ہے۔" وہ نثار ہوتی نظروں سے دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے سجاول اور اس کے بعد جھینپی ہوئی جیز کو دیکھ کر بولی تھی۔

✲ ✲ ✲

اور یوں جیز کا یہ مہم جویانہ سفر کہ جس کی کامیابی کا خود اسے بھی یقین نہ تھا، بخیر و خوبی اپنی منزل کو پہنچا۔

سندھل کے لش گرین اونچے درختوں اور کھلتے گلابوں والے لان میں دوپہر اب شام میں تبدیل ہونے کو تیار کھڑی تھی... اور اندر لاؤنج میں رائل بلیو پاجامہ فراک پر اجرک اوڑھے تیار جیز اور اس کی سہیلیاں بھی کھڑی تھیں۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے...

"آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔" جیز، آنٹی سندھل سے محبت بھرے لہجے میں مخاطب تھی۔

حنا اور عالیہ ساتھ ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ ان کے عقب میں کھڑی سوہنی ان لوگوں سے مختلف تحائف پا کر مسرور دکھائی دیتی تھی... ان کے پیروں کے پاس دھرے سوٹ کیس جو آنٹی سندھل کا ڈرائیور ماجھو جو صحت یاب ہو کر واپس کام پر آچکا تھا۔ اٹھا اٹھا کر گاڑی میں رکھنے جا رہا تھا۔

"کشادہ دلی سے مہمان نوازی ہماری اچھی روایتوں میں سے ایک روایت ہے بیٹی۔" سندھل متانت سے بولیں۔ "یوں شکریہ بول کر شرمندہ مت کرو۔"

"سامان رکھ دیا ہے ادی۔" تبھی ماجھو نے آکر اطلاع دی تو ایلی اور حنا، آنٹی سندھل سے الوداعی معانقہ کرنے لگیں... جبکہ جیز کا دل نجانے کیوں یکدم بجھ سا گیا۔

وقت رخصت آن پہنچا تھا اور تاحال سجاول کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ کل رات مومل کو چھوڑنے گھر گیا تھا، وہ تو جیز کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر جیز نے یہ کہہ کر کہ وہ بہت جلد ماروی کے ساتھ وہاں آئے گی، نرمی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کی لاہور کے لیے آج شام کی فلائٹ تھی اور اس کے جذبات کی صداقت اپنی جگہ مگر وہ ایلی کا دل نہیں توڑ سکتی تھی، وہ اس کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی اور کل سے اس کے بھائی کی شادی کی تقریبات شروع ہونے والی تھیں۔

وہ یوں ہی بے دلی سے سندھل سے رخصت ہو کر گاڑی میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں آبیٹھی۔ حنا اور ایلی

پہلے ہی بیٹھ چکی تھیں۔ گاڑی چلنے کو تیار تھی کہ تب ہی۔۔۔ تب ہی جیز نے دیکھا کہ ماجھو کو اتار کر اس کی جگہ ہشاش بشاش سا سجاول آبیٹھا ہے۔ آن واحد میں اس کا چہرہ کھل سا گیا اور وہ جو اک مردنی سی اس کے وجود پر چھا گئی تھی وہ کہیں دور جا سوئی۔

"سو سوری لیڈیز' ذرا سا لیٹ ہو گیا۔" اس نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کوئی گل نہیں بھائی جان' آپ نہ بھی آتے تو کام چل جانا تھا' آپ کون سے ڈرائیور ہو۔" ایلی خوش اخلاقی سے بولی۔

"ہمارا تو واقعی چل جاتا ایلی!" حنا کن اکھیوں سے جیز کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر معنی خیز انداز سے بولی "مگر شاید ادی جیز کے لیے مشکل ہو جاتی۔"

"ہاہاہا۔" گاڑی زن سے آگے بڑھاتے ہوئے سجاول کا جاندار قہقہہ گونجا۔

"آپ خاصی عقلمند ہیں حنا جمالی۔" وہ بولا۔ اس نے بیک ویو مرر سے دکھائی دیتا جیز کا جیسے اپنا کوئی راز افشا ہو جانے پر جھلایا چہرہ دیکھ کر خاصا لطف لیا تھا۔

"ہیں۔۔۔" ایلی باری باری سب کے چہرے دیکھ کر ہونق پن سے بولی "یہ کیا معاملہ ہے' کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"معاملہ یہ ہے پیاری ایلی۔" حنا مسلسل معنی خیز انداز سے مسکرا رہی تھی۔ "کہ یاسمین علی خان نے مکمل کہانی ہمیں اب تک نہیں سنائی ہے۔"

☆ ☆ ☆

شکوہ شاید اس کا بجا ہی تھا مگر جیز تو خود اب تک متذبذب تھی۔ سجاول کے حوالے سے وہ انہیں کیا بتاتی؟

کراچی ایئرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں ایلی اور حنا سامان لے کر کسٹم کروانے جا چکی تھیں۔ اور باہر کھڑا سجاول اپنے سامنے موجود جیز سے مخاطب تھا۔

کیا تمہیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں آیا؟"

"مجھے ڈر ہے۔" وہ آنکھوں میں بے یقینی لیے بولی۔ "تم لوگوں کا سامنا نہیں کر سکو گے۔"

"اس ڈر کو دل سے نکال کر محبت کو آنے دو جیز۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "اور یوں بھی امی کہتی ہیں کہ چراغ دل روشن کرنے کے لیے محبت کے راگ چھیڑنے پڑتے ہیں۔ اور جب دل روشن ہو جائیں تو راستوں کی ظلمت چھٹ جایا کرتی ہے گو کہ یہ ایک مشکل کام ہے۔۔۔ مگر ناممکن تو نہیں۔" وہ نگاہوں میں جگنو لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور اس لمحے جیز کو لگا جیسے اسے اعتبار کرتے ہی بنے گی۔۔۔

"تب پھر ٹھیک ہے' وہ متبسم لہجے میں بولی۔ "اب تم انتظار کرو میری واپسی کا' جو یقیناً ہمیشہ کے لیے ہو گی۔"

اس کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی تھی' جھلائی ہوئی حنا اسے اندر سے مسلسل اشارے کر رہی تھی اور اس کے سامنے کھڑے' لمبے اونچے سجاول کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"فی امان اللہ۔۔۔ میں سندھو کنارے تمہارا منتظر رہوں گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ محبت تمہیں واپس ضرور لے کر آئے گی۔" اس نے جدائی کے خیال سے رنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ جیز بھاری دل سے سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔۔۔

اس نے ایک دریا پار کر لیا تھا مگر اب اسے ایک اور دریا کا سامنا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ یہ دریا بھی آسانی سے پار کر جائے گی۔

کیونکہ اب وہ تنہا نہیں تھی!

عائشہ رباب

سرخ جوڑا

سرخ رنگ کے جوڑے پر ڈھیر سارے سنہری ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے جوڑے کو پھیلایا اور پیار سے خود میں بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے باری باری اپنے تینوں جوڑوں کو ایک بار پھر پھیلا پھیلا کر دیکھا۔ دیکھ دیکھ کر اس کا دل نہیں بھر رہا تھا اور وہ لمحہ لمحہ گن کر گزار رہی تھی کہ کب وہ انہیں پہنے۔ سارا سال مزدوری کر کے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر یہ عید کا ہی تو موقع ہوتا ہے جب اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کیا جائے۔ اس بار عید کے لیے اس کے تین جوڑے بنے تھے اور اس میں سرخ رنگ بھی شامل تھا۔ ہر لڑکی کی طرح اس کا بھی پسندیدہ رنگ' اس کی عید' عید سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"سی!" روٹی ڈال لے' اذان کا وقت ہو رہا ہے۔ اماں کی آواز پر وہ چونکی۔ جلدی جلدی سارے کپڑے سمیٹ کر رکھے' تندور پر روٹی لگائی اور افطاری کی ایک پلیٹ بنا کر باہر نکل آئی۔ محلے کے تمام گھروں میں افطاری بھجوائی جا چکی تھی۔ اب یہ کس کے گھر دی جائے؟ زیادہ سوچ بچار میں پڑے بغیر وہ پڑوس میں ہی چلی آئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے بھی زیادہ تکلف نہ برتا اور اندر چلی آئی۔

"اماں... کل آخری روزہ ہے۔ میرے ابھی تک کپڑے نہیں بنے۔" حاجرہ کی آواز پر وہ صحن میں ہی رک گئی۔

"تو نے لال اوڑھنی کا وعدہ کیا تھا' وہ بھی نہیں لائی۔" سی نے ذرا سا اندر جھانکا۔ حاجرہ' خالہ کے پاس رونی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

"دیکھ حاجرہ! تنگ نہ کر۔ تیرے ابا سے کہوں گی' وہ لا دے گا۔" خالہ نے رخ پھیر لیا اور تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔ اس نے صحن میں پڑے لوہے کی بالٹی پر کھٹکا کیا تو دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے کچھ بھی ظاہر کیے بنا افطاری دی اور بجھے دل کے ساتھ واپس آ گئی۔

☼ ☼ ☼

چاند نظر آ گیا تھا۔ پورا محلہ مبارک باد سے گونج اٹھا تھا۔ ہر گھر میں افراتفری سی مچ گئی تھی۔ افطاری کے بعد ہی اماں کل کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ ضروری کام نپٹا کر اماں چوڑیاں پہننے مارکیٹ جانے لگیں۔ تو اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اسے بھی مہندی لگوانا تھی۔ وہ بے دلی سے ساتھ چلی آئی۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بار بار حاجرہ کا اداس چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا۔ وہ جانتی تھی حاجرہ کے گھر کے مالی حالات کافی خراب ہیں۔ کچھ ہفتوں پہلے خالو بہت بیمار ہو گئے تھے۔ جمع جتھا سب علاج پر لگ گیا۔ خالہ کا ہاتھ آج کل بہت تنگ تھا۔ ایسے میں نیا جوڑا۔ سی کو پتا تھا' خالہ نے حاجرہ کو صاف ٹالا ہے۔ یہ ہی آگہی اسے بار بار بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ جتنی خوشی اسے عید کی تھی' سب ماند پڑ گئی۔ اماں نے بھی اس کی بے توجہی محسوس کر کے اسے ٹوکا۔ لیکن وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ وہ چوڑیاں خرید کر' مہندی لگوا کر واپس آئی تو سارا راستہ یہ ہی سوچتی رہی کہ اپنے خیالات اماں تک کیسے پہنچائے۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔" جلدی جلدی کام نپٹاتی اماں کو اس نے بڑے ست انداز میں مخاطب کیا۔

"کل عید ہے۔" اماں نے اسے دیکھا۔ یہ سوال تھا نہ جواب' پھر کیوں ایسے کہہ رہی ہے؟ اماں نے جواب نہیں دیا۔

"کل سب نئے کپڑے پہنیں گے۔ بہت مزا آئے گا۔ میں بھی نئے کپڑے پہنوں گی۔" اماں نے اس کی بنا سر پیر کی تقریر پر اسے کوفت سے گھورا۔

"مسی! کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیوں بکواس کیے جا رہی ہے؟" اماں نے اسے ٹوکا۔

"اماں!" اس نے تھوڑا توقف کیا اور اماں کے مقابل بیٹھ گئی۔

"حاجرہ کے کپڑے نہیں بنے۔" اس نے نظریں نہیں اٹھائیں۔

"میرے تین جوڑے بنے ہیں۔ اس کا ایک بھی نہیں بنا۔ اسے لال رنگ بہت پسند ہے۔ میں اپنا لال جوڑا اسے دے دوں۔" تمام باتیں جلدی جلدی کہہ کر اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ اماں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

"جب نیکی کا سوچا ہے تو دیر کس بات کی۔ جا دے آ اسے۔ اس کا بھلا ہو جائے گا۔ اللہ تیرا بھی بھلا کرے۔" اس کے لبوں پر دلنشین سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اماں کے الفاظ نے جیسے اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ جھٹ سے کمرے کی طرف بھاگی اور لمحے بھر میں سرخ جوڑا لیے دروازہ پار کر گئی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں ہو چکا تھا اور آسمان کے سارے ستارے اس کی آنکھوں میں تھے۔

☼

ناولٹ

آدھی رات کے وقت فون کی تیز گھنٹی نے اس کی نیند میں خلل ڈالا۔ بے زاری کے احساس کے ساتھ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون اٹھایا۔ اسکرین پہ جگمگاتا نام دیکھ کروہ چونکی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو۔'' وہ بے چینی سے بولی۔

''فلیز!۔'' اس نے مجھے دھوکا دیا۔ ''دوسری طرف سے درد بھری روتی آواز سن کر وہ بری طرح گھبرائی۔

''منار؟'' اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

''اس نے مجھے دھوکا دیا فلیز!۔ مجھے استعمال کیا۔

گاڑی اس عالی شان بنگلے کے داخلی دروازے کے سامنے آکر رکی۔ ذاکر اشفاق اور زرمین ناز اس کے استقبال کے لیے دروازے پہ کھڑے تھے۔ وہ گاڑی سے نکل کرباہر آئی تو دونوں نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور باری باری خود سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر وہ ان دونوں کے ہمراہ اندر کی جانب چل دی۔ اندر ہال میں ذاکر اشفاق نے اسے اپنے برابر صوفے پہ بٹھایا اور زرمین ناز نے ان کے مقابل صوفے پہ بیٹھ کر ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

''آخر کار تین سال بعد میری بیٹی مجھ سے ملنے آہی

یلیح الجمال

منار

اسے مجھ سے پیار نہیں تھا۔ سب فریب تھا۔ جھوٹ تھا۔'' منار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کون؟.... کس کی بات کررہی ہو؟'' اس نے الجھن کے ساتھ سوال کیا۔

منار کا رونا اسے بے چین کرگیا تھا کہ اچانک کال کٹ گئی۔ پریشانی میں اس نے واپس کال ملائی۔ گھنٹیاں گئیں مگر کال ریسیو نہ کی گئی۔ ایک بار کی ناکامی کے بعد اس نے پھر سے کال ملائی۔ پھر سے وہی صورت حال۔ اس نے فون سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ منار اس وقت فون نہیں اٹھا رہی تھی تو اب صبح ہی اس سے بات ہوسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

گئی۔''

ذاکر اشفاق کے لہجے میں ایک اطمینان اور تفاخر کا احساس تھا۔

وہ جبراً'' بھی نہ مسکرا سکی۔ تین سال بعد اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے ذہن میں تین سال پہلے کے مناظر تازہ ہوگئے تھے۔ زرمین نے اس کے چہرے پہ پھیلتی تاریکی دیکھی تو اس کا دھیان بنانے کے لیے بولیں۔

''ممی کیسی ہیں تمہاری؟''

''ٹھیک ہیں۔ احسان انکل بہت خیال رکھتے ہیں ممی کا۔'' اس نے زرمین کو متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ذاکر اشفاق اپنے سامنے اپنی پہلی بیوی کے

دوسرے شوہر کے ذکر سے تھوڑے بے سکون ہوئے۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس سے پوچھنے لگے۔

"سفر تو اچھا رہا ناں! کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی راستے میں؟"

"نہیں ڈیڈی! سب ٹھیک تھا۔ بس ممی مجھے یہاں بھیجتے ہوئے اداس اور فکر مند تھیں۔"

وہ اور ذاکر اشفاق بخوبی سمجھتے تھے کہ اس کی ممی کی فکر مندی کے پیچھے وجہ کیا تھی۔ لیکن اس ذکر سے گریز کرتے ہوئے بولے۔

"پہلی بار وہ تمہیں خود سے دور کر رہی تھی، فکر مند تو ہو گی۔ لیکن اب تم آ گئی ہو۔ یہاں رہو گی تو اس کی تمام فکریں خود بخود دور ہو جائیں گی۔"

اس نے ذاکر اشفاق کے گریز کو محسوس کیا اور جان بوجھ کر بولی۔

"منار کے ساتھ جو ہوا۔ اس کے بعد سے ان کا آپ پر سے بھروسا اٹھ گیا ہے۔ وہ مجھے بار بار تاکید کر رہی تھیں۔"

"ہوں، کچھ پیو گی؟ چائے منگواؤں یا جوس؟"

ذاکر اشفاق نے پھر سے اس موضوع سے بچتے ہوئے اس سے پوچھا۔ مگر وہ اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹی۔ "آپ اس کے ذکر کو اوائڈ کیوں کر رہے ہیں ڈیڈی؟" ساتھ ہی سوالیہ نظر زرمین ناز پہ ڈالی جو اپنی جگہ چور سی بنی لب کاٹ رہی تھیں۔

ذاکر اشفاق نے اسے غور سے دیکھا اور سمجھاتے ہوئے بولے۔

"فلیز! منار کی موت کس طرح ہوئی۔ تم جانتی ہو۔ ہمارے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس ذکر کو نہ چھیڑا جائے۔"

"لیکن میں بات کرنا چاہتی ہوں ڈیڈی! منار نے خودکشی کیوں کی تھی؟"

"ہمیں کچھ خبر نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔" ذاکر اشفاق کمزور سی آواز میں بولے۔

بتانے سے زیادہ ان کا انداز دفاعی تھا۔ وہ انہیں بے اعتباری سے دیکھتی رہ گئی۔ ایک جوان بیٹی نے اچانک خودکشی کر لی تھی اور باپ تین سال بعد بھی کہتا تھا کہ اسے کچھ خبر نہیں۔ اس لاعلمی پہ کوئی باپ ایسے خاموش اور مطمئن کیسے ہو سکتا تھا؟"

ذاکر اشفاق نے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں یہ بے اعتباری دیکھی تو پھر سے صفائی پیش کرنے لگے۔

"دیکھو فلیز! تم جانتی ہو کہ منار کا رویہ میرے اور زرمین کے ساتھ کیسا تھا۔ وہ میری اور زرمین کی شادی سے خوش نہیں تھی۔ بہت خفا تھی مجھ سے اور زرمین کو تو وہ قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس کی مجھ سے ناراضی کبھی ختم نہیں ہوئی۔ اس نے کبھی مجھے اپنے نزدیک آنے دیا نہ کبھی مجھ سے اپنا کوئی مسئلہ، کوئی بات شیئر کی۔ ہم کچھ نہیں جانتے تھے کہ اس کی زندگی میں کیا چل رہا ہے۔ اس لیے ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ اس کی موت ایک ان سولوڈ مسٹری (راز) ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔"

باپ کا یہ جواب سن کر وہ خاموش تو ہو گئی مگر مطمئن نہیں۔ مشکوک نگاہوں سے زرمین ناز کی جانب دیکھا۔ ذاکر کے جواب پہ زرمین خاصی مطمئن اور پُراعتماد نظر آتی تھیں۔

"اور زرمین میڈم آپ!..... کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟"

اس کے سوال پہ زرمین نے کندھے اچکائے۔ "جیسا کہ تمہارے ڈیڈی نے کہا اور تم بھی جانتی ہو۔ منار نے تو کبھی مجھے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اپنے ہر معاملے سے وہ ہمیشہ مجھے لاتعلق اور بے خبر رکھتی تھی۔"

خیر اس میں تو کوئی شک نہ تھا۔ منار اس سے بھی یہی کہا کرتی تھی کہ "زرمین کو منہ نہ لگاؤ۔ اس کو کوئی بات بتاؤ۔" لیکن جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ زرمین اور ذاکر اشفاق اس سے کچھ چھپا رہے تھے۔ وہ

مزید کوئی سوال نہ کر سکی۔

☼ ☼ ☼

عائشہ اسپین میں پلی بڑھی تھی۔ ذاکر سے شادی کے بعد اس کی دو بیٹیاں ہوئیں۔ پہلی بیٹی کا نام ذاکر اشفاق نے منار رکھا۔ پھر دو سال بعد ان کی دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو عائشہ نے اپنی پسند سے اس کا اسپینش نام رکھا۔ فیلیز۔ یعنی خوشی یا مبارک۔ نام تو اس کا فیلیز رکھا گیا تھا لیکن دیسی لب و لہجے میں کثرت استعمال سے جلد یہ نام فیلیز سے فلیز بن گیا۔ جو بولنے میں زیادہ آسان تھا اور دیسی ناموں میں مکس بھی ہو جاتا تھا۔ یوں اسے سب فلیز ہی پکارنے لگے اور وہ خود بھی اپنا نام بتانے لائق ہوئی تو فلیز ہی بتاتی تھی۔

فلیز بارہ برس کی تھی جب اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی عائشہ اور ان کی طلاق ہو گئی۔ باہمی مشاورت سے یہی طے پایا کہ ذاکر کا گھر جس میں عائشہ اور ان کی بچیاں ہمیشہ سے رہتی تھیں۔ وہ گھر عائشہ کے پاس رہے گا اور ان کا اور فلیز کا خرچا بھی ذاکر کی ذمہ داری ہوگا۔ جبکہ بڑی بیٹی منار جو کہ اس وقت چودہ برس کی تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے گی اور اسکول کی چھٹیوں میں دونوں بہنیں ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے پاس اکٹھی رہیں گی۔ یوں ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ زیادہ تر منار ہی ماں کے پاس رہنے آتی۔ فلیز کم ہی اپنے باپ کی طرف جانا پسند کرتی تھی۔ منار کا زرمین اور ذاکر اشفاق کے ساتھ مستقل جھگڑا تھا اور وہ اسے بھی زرمین اور ذاکر اشفاق سے دور رہنے کا کہتی تھی۔ اور جو وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھ جاتی یا زرمین کے کسی سوال کا جواب بھی دے دیتی تو منار اس پر غصہ کرتی اور ناراض ہوتی تھی۔ جبکہ عائشہ کے گھر میں دونوں بہنیں بہت خوش رہتی تھیں۔ اس لیے زیادہ تر منار آتی تھی اور کبھی وہ بھی چلی جاتی تھی، کیونکہ بہر حال۔ اسے اپنے باپ کی یاد ستاتی تھی۔

آٹھ سال تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر اچانک منار کی موت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ دہشت زدہ رہ گئی اور عائشہ اپنے شوہر سے شاکی اور بدگمان کہ وہ اپنی بیٹی کا خیال نہ رکھ سکے۔ وہ ذاکر اشفاق پہ خاصی برہم ہوئیں اور زرمین ناز کو بھی منار کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ شروع میں انہوں نے زرمین ناز پر شک بھی کیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی موت پہ صبر کرلیا تھا۔ مگر منار نے خود کشی کیوں کی۔ یہ ایک معمہ ہی رہا۔ جس کے بارے میں جو تھوڑی بہت خبر اگر کسی کو تھی تو وہ صرف اسے۔ اور کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔ صرف اسے منار نے فون کر کے بتایا تھا کہ اسے کسی نے دھوکا دیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹرب اور دلبرداشتہ تھی۔ اسی رات منار نے خود کشی کرلی تھی۔ اس وقت وہ بیس برس کی تھی۔ ایک تو کم عمری اس پہ منار کی خود کشی نے اس کے دل میں دہشت بٹھا دی۔ وہ کسی کے سامنے ذکر نہ کر سکی کہ منار نے اسے فون کر کے کیا کہا تھا۔ منار نے خود کشی کیوں کی؟ اس سوال سے وہ اپنے طور پر کتراتی آئی تھی۔ اور منار کی موت کے دکھ اور خوف کا ہی اثر تھا کہ وہ، جو منار کی فوتگی پہ اپنے باپ کے گھر گئی تو پھر کبھی پلٹ کر اس طرف کا رخ نہ کیا۔ منار کے ذکر اور اس سے متعلق ہر چیز سے وہ کتراتی تھی۔ مگر.....

وقت گزر تا گیا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ وہ تو منار کی خود کشی کی وجہ جانتی تھی اس لیے چپ تھی۔ لیکن باقی لوگ کیوں اتنے خاموش تھے؟ منار کی موت کے تین سال بعد وہ تعلیم مکمل کر چکی تو عائشہ نے اس کی طرف سے بے فکر ہو کر دوسری شادی کرلی۔ کچھ عرصہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کے نئے شوہر کے گھر میں رہی جہاں عائشہ کی ایک بیوہ نند بھی رہتی تھی۔ وہ عائشہ سے خار کھاتی تھی اور اس کا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ جبکہ عائشہ اسے پرانے گھر میں تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ دوسری طرف ذاکر اشفاق عائشہ کی دوسری شادی کے بعد فلیز کے لیے خاصے فکر مند تھے کہ ان کی جوان بیٹی ایک غیر مرد کے گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟ جبکہ عائشہ منار کی موت کے بعد اب دوسری بیٹی کو ذاکر کے پاس بھیجنے سے بھی خائف

تھیں۔ مگر ذاکر اشفاق کا بڑھتا اصرار اور اپنی بیوہ نند کی بدسلوکی کے پیش نظر انہیں فلیز کو اس کے باپ کے پاس بھیجتے ہی بنی۔ یوں تین سال بعد فلیز اپنے باپ کے گھر میں آئی تھی اور یہ جاننے کے لیے بے چین اور متجسس تھی کہ منار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیوں اس نے خود کشی کی تھی اور وہ شخص کون تھا؟

☆ ☆ ☆

اس روز ہال میں دیوار کے ساتھ رکھے ٹیبل پہ رکھا شیشے کا گلدان گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ جس کا ایک بڑا سا ٹکڑا دور ـــ صوفوں کے پاس جا گرا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ چھٹی کا دن تھا تو ذاکر اشفاق زرمین اور وہ ہال میں آبیٹھے۔ وہ جوتے اتار کر صوفے پہ بیٹھی تھی۔ اس نے اودے رنگ کا خوب صورت سا لباس پہن رکھا تھا جو اس پہ بہت جچ رہا تھا۔ ذاکر اشفاق اور زرمین دونوں اس کی تعریف کر چکے تھے۔ اس کے فون پہ ماں کی کال آئی تو وہ جلدی میں ننگے پیر ہی چل پڑی تو اس کا پیر فرش پہ پڑے اس بڑے سے کانچ پر جا پڑا۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ دو مضبوط بانہوں نے اسے تھام لیا۔ اس نے پاؤں میں درد کی ٹیسیں سہتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ خوشبوؤں میں مہکتے ایک ہینڈسم جوان کو اپنے سامنے اور اتنے قریب پا کر وہ بے حد حیران ہوئی۔ آخر وہ کون تھا؟

اس نے اسے کھڑا کرنا چاہا مگر وہ اس کے بازوؤں سے پھسلتی فرش پر بیٹھنے لگی۔ وہ خود بھی اسے سہارا دیتے ہوئے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ وہ تو جب اس نے اپنا زخمی پیر سامنے کیا تو اس کے تلوے میں چبھا کانچ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

"کیا ہوا فلیز!" ذاکر اشفاق بھی اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھے۔ زرمین بھی ان کے برابر آکھڑی ہوئی تھیں۔

اس نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پاؤں سے کانچ نکالنا چاہا اور اس کے ساتھ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ خاصا بڑا کانچ کا ٹکڑا تھا اور کافی گہرائی تک اس کے پیر کے اندر دھنس گیا تھا۔ پیر سے نکلتا خون فرش پر پھیل رہا تھا۔

اس نے اس کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ اپنے باپ کی موجودگی میں اس کی اس جسارت اور اعتماد پہ وہ از حد حیران ہوئی۔ جبکہ ذاکر اشفاق یوں خاموش تھے جیسے یہ معمول کی بات ہو۔

اس کا پیر میز پر رکھ کر وہ قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

"نجمہ! جلدی سے فرسٹ ایڈ باکس لاؤ۔"

زرمین نے بلند آواز میں ملازمہ کو حکم دیا۔

"اوکے۔ اب میں تین تک گنوں گا، ٹھیک ہے؟"

اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے ذہنی طور پر تیار رہنے کو کہا۔ اس نے بھی ناچار سر ہلا دیا۔

ایک دو۔ تین۔ اس نے کھینچ کر کانچ نکال لیا۔ وہ ذہنی طور پر تیار تھی پھر بھی اس اچانک اور شدید تکلیف پہ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ ساتھ ہی وہ اپنا پیر کھینچ کر اٹھنے لگی، مگر ذاکر اشفاق نے اسے اٹھنے دیا، نہ اسے پیر کھینچنے دیا۔ اسی اثنا میں ملازمہ فرسٹ ایڈ باکس لے آئی۔ زرمین نے باکس میں سے مرہم نکالا۔

"زخم بہت گہرا ہے انکل! میں پٹی کر دیتا ہوں، لیکن آپ کو انہیں اسپتال لے جانا ہو گا۔" ذاکر اشفاق نے اس کی بات پر سر ہلایا۔ زرمین نے مرہم اسے پکڑایا تو اس نے جو نیپکن اس کے زخم پر رکھا ہوا تھا۔ ہٹا کر مرہم رکھا اور جلدی سے پٹی لپیٹ دی۔ اس کے فوراً" بعد ذاکر اشفاق فلیز کو اسپتال لے گئے۔

☆ ☆ ☆

پہلے وہ جب اپنے باپ کے ہاں رہنے آیا کرتی تھی تو منار کے کمرے میں ٹھہرتی تھی۔ یہ بھی منار کا اصرار تھا۔ اس طرح وہ ذاکر اشفاق اور زرمین کو جتاتی تھی کہ فلیز پہ اس کا حق زیادہ ہے۔ اور اب وہ مستقل طور پر اس کمرے کی تنہا مالک تھی۔ ابھی دو منٹ پہلے ہی ذاکر اشفاق اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ بیڈ کے قریب لا کر رکھی کرسی ابھی تک اس کے بیڈ کے قریب رکھی تھی۔ وہ خود اپنا پٹی میں لپٹا پاؤں پسارے بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ چونکی۔

"کم اِن۔" اس وقت وہ کسی ملازمہ کی آمد کی توقع کر سکتی تھی۔ دروازہ کھلا اور کل والا ہینڈسم جوان ہاتھوں میں پھول لیے اندر آیا۔

"السلام علیکم!" وہ اسے دیکھ کر جھٹ سے سیدھی ہو بیٹھی۔

"وعلیکم السلام"

"میں آپ کا حال پوچھنے آیا تھا۔ اب آپ کا زخم کیسا ہے؟" کہتے ہوئے وہ قریب آیا۔

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس نے پھول اس کی طرف بڑھائے جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیے۔ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھیے۔"

"ہمارا اب تک باقاعدہ تعارف نہیں ہو سکا۔ میں مشارق کیف ہوں۔ زرمین میری پھپھو لگتی ہیں۔"

"اوہ۔" وہ اب سمجھی کہ وہ کون تھا اور کیسے آزادانہ ان کے گھر میں گھوم رہا تھا۔

"میرا نام فلیز ہے۔" اس نے جواباً اپنا تعارف پیش کیا جس پہ مشارق ہلکا سا مسکرایا۔

"جانتا ہوں۔" ظاہر سی بات تھی۔ وہ حیران نہ ہوئی۔ پوچھنے لگی۔

"آپ یہیں پہ ہوتے ہیں؟" اس کے سوال پہ مشارق کی آنکھوں میں الجھن ابھری تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے، پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔" مشارق سمجھ گیا کہ وہ کیا جاننا چاہتی ہے۔ سر ہلا کر بولا۔

"میں یہاں کوئی چار سال پہلے آیا تھا۔ پھر میں امریکا چلا گیا۔ وہاں دو سال گزارے اور سال ہو چکا ہے مجھے واپس آئے ہوئے۔" مشارق نے بتایا تو وہ ذہن میں جمع تفریق کرنے لگی۔

"پھر تو آپ منار کو بھی جانتے ہوں گے۔" اس کی قیاس آرائی پہ مشارق نے پھر سے الجھ کر اسے دیکھا۔

"منار، میری بہن۔" اس نے غائبانہ تعارف کرایا۔ مشارق نے نظریں جھکا لیں۔

"آں..." وہ ایک پل کو اٹکا۔ "ہاں۔" جیسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں مشکل کیا تھی جو وہ یوں اٹکا تھا۔ ساتھ ہی وہ حیرت سے بڑبڑائی۔ "اس نے کبھی مجھے بتایا نہیں۔"

تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی تو دونوں چونک گئے۔ دروازہ کھول کر زرمین نے اندر جھانکا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"پلیز کم اِن۔" اس نے بھی اخلاقاً خوش دلی سے کہا۔ زرمین کا رویہ ہمیشہ اس کے ساتھ اچھا تھا۔ وہ بھی منار کی موت کے حوالے سے زرمین کے لیے دل میں کوئی خیال نہیں رکھتی تھی۔ زرمین اجازت ملنے پر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ آئیں۔ اس نے ذرا سمٹ کر زرمین کو بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ زرمین اس کی مسہری کے کنارے ٹک گئیں۔

"تم دونوں کی آپس میں جان پہچان ہو گئی یا میں کرواؤں؟" زرمین نے بیک وقت دونوں سے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے ہیں اور اب میں اجازت چاہوں گا۔" مشارق نے کہا تو زرمین کے ساتھ وہ بھی حیران ہوئی۔

"اتنے جلدی؟" زرمین نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے کچھ کام ہے۔ میں بس انہیں دیکھنے آیا تھا۔ چلتا ہوں پھر آؤں گا۔" مشارق کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا لہجہ سنجیدہ تھے۔ چہرے سے وہ بشاشت اور خوش مزاجی غائب تھی جس کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔" زرمین نے معمول کے انداز میں کہا۔

"اللہ حافظ۔" مشارق نے اس پہ ایک نظر ڈال کر کہا اور مڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد زرمین نے چہرہ اس کی جانب موڑا اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"بہت اچھی عادت ہے تمہاری۔ اپنی بہن سے بالکل مختلف۔ کاش وہ بھی تمہاری طرح نرم مزاج کی ہوتی۔" زرمین نے حسرت سے کہا۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ زرمین منار کی بدتمیزیوں پہ دکھی ہیں۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے زرمین میڈم!" اس نے کہا تو زرمین نے توجہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جیسے سوال کی اجازت دے رہی ہوں۔
"آپ نے ڈیڈی سے شادی کیوں کی تھی؟" وہ بارہ برس کی تھی جب ڈاکر اشفاق نے زرمین سے شادی کی تھی۔ اس شادی کے پیچھے کیا اسباب تھے۔ نہ وہ جانتی تھی اور نہ اس عمر میں اسے یہ جاننے سے دلچسپی تھی، مگر اب وہ ان کے بارے میں سوچ رہی تھی اور سوال کر رہی تھی۔ زرمین کو بیتا وقت یاد آگیا۔ وہ آزردگی سے بولیں۔
"ڈاکر سے پہلے میں شادی شدہ تھی۔ مگر میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے میری طلاق ہوگئی تھی۔ میری اسی کمی کی وجہ سے کوئی مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا جبکہ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ڈاکر میری پریشانی کو سمجھتے ہوئے مجھے سہارا دینے کو آگے آئے۔ انہوں نے مجھ سے شادی تو کرلی، لیکن عائشہ کو پہلے اعتماد میں نہیں لیا۔ جب شادی کر کے عائشہ کو مطلع کیا تو ظاہری بات ہے، وہ بھڑک اٹھیں اور ڈاکر انہیں قائل نہ کرسکے۔ نتیجتاً بات بننے کے بجائے مزید بگڑ گئی اور دونوں کی علیحدگی ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکر آٹھ سال تک اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھ کر بھی کبھی اپنی فیور میں نہ لے سکے۔ فاصلے اور تلخیاں بڑھتی گئیں اور آخر کار وہ اپنی بیٹی کو ہار گئے۔" زرمین نے تاسف اور ملال کے ساتھ کہا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔
"کیا آپ نے بھی کبھی کوشش نہیں کی؟" زرمین نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ زرمین کی آنکھوں میں شکست تھی۔
"اگر وہ اپنے باپ سے راضی ہو جاتی تو شاید میری بھی کسی بات کو کنسیڈر کرتی، مگر وہ اپنے باپ سے ہمیشہ روٹھی ہی رہی اور میرے وجود کو بھی کبھی تسلیم نہ کیا۔" زرمین نے کہا تو ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک گیا۔

☆ ☆ ☆

اس دن مشارق آیا ہوا تھا اور وہ بھی مشارق اور زرمین کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ زرمین کسی کام سے اٹھ کر اندر چلی گئیں تو اس نے اس سے گفتگو میں پہل کی۔
"مشارق! آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"
"مشرق کی جمع مشارق۔ عربی نام ہے۔" مشارق نے بتایا تو وہ کھو سی گئی۔
"عربی نام۔ منار کا نام بھی عربی تھا۔ منار۔۔۔ یعنی نور کا ماخذ، نور کا منبع۔" مشارق کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ "وہ تم سے بہت مختلف تھی۔"
وہ چونکی۔ "کون؟"
"تمہاری بہن۔" مشارق نے کہا۔ "تم میں اور اس میں بہنوں والی مشابہت کے علاوہ کوئی بھی چیز مشترک نہیں۔ بالکل اپوزٹ تھی وہ تمہارا۔"
وہ بے معنی سا مسکرائی۔ "سب یہی کہتے ہیں۔ منار دل کی بری نہیں تھی۔ بس اپنے ماں باپ کی علیحدگی اور ڈیڈی کی دوسری شادی سے ناخوش تھی۔"
مشارق نظریں جھکائے خاموش رہا۔ اسے یاد آیا تو پوچھنے لگی۔
"اس کی ڈیتھ کے وقت آپ یہاں نہیں تھے۔" مشارق نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور انتہا درجے کی سنجیدگی سے بولا۔
"نہیں۔ اس کی ڈیتھ سے ایک ہفتہ قبل میں امریکا چلا گیا تھا۔" مشارق اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر خود پہ قابو پانے میں لیے۔ پھر مزید گویا ہوا۔ "اس کی موت بہت غیر متوقع اور ڈسٹربنگ نیوز تھی۔ بہت

دنوں تک میں یقین نہیں کرپایا تھا۔" مشارق اب بھی اس کی موت کے ذکر سے ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ جس کی بنا پر اس نے پوچھا۔

"کیا آپ دونوں میں دوستی تھی؟" اس کے سوال پہ مشارق فوراً" کچھ نہ بول پایا۔ خاموش نظریں جھکائے لب کاٹتا رہا۔ اسے لگا کہ شاید مشارق کی منار کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی تھی۔ مشارق نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی اتر آئی تھی۔

"نہیں' اسے مجھ سے نفرت تھی۔" بہت ہی غیر متوقع جواب تھا۔

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیونکہ میں زرمین کا بھتیجا ہوں۔"

مشارق نے وجہ بتائی تو وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ مشارق' زرمین اور ذاکر اشفاق۔ منار کے ذکر پر ان تینوں کے رویے ان کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم ہو جاتے تھے۔ جیسے منار کا ذکر انہیں کسی مشکل میں ڈال دیتا ہو۔ چہرہ کچھ اور بتاتا تھا' آنکھیں کچھ اور کہتی تھیں اور الفاظ کچھ اور ہی کہانی بیان کرتے تھے۔ اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر کوئی اس سے کچھ چھپا رہا ہے' مگر کیا؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر جب تک وہ فارغ رہی۔ ان ہی کے بارے میں سوچتی اور الجھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے ہوم ڈیکوریشن اور فلاور میکنگ کا کورس شروع کیا تو اس کا دھیان ان باتوں سے ہٹنے لگا اور وہ اس نئی زندگی کی عادی ہوتی گئی۔ زرمین میں کہیں کوئی ریا نظر نہیں آتی تھی۔ ڈیڈی بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور مشارق کے ساتھ اس کی ذہنی ہم آہنگی بھی دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ سب اچھا تھا۔ اس کے دل میں جو شکوک و شبہات شروع میں اٹھتے تھے۔ اسے جو سب کے رویے ناقابل فہم لگتے تھے۔ اب ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں پہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ اسے احساس ہی نہ ہوا اور ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ مشارق سے اس کی دوستی اب محبت میں بدل چکی تھی۔ شروع میں مشارق اظہار سے ہچکچاتا تھا' مگر اب اظہار بھی کر چکا تھا۔ اس نے بھی اپنا کوئی جذبہ اس سے مخفی نہ رکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼
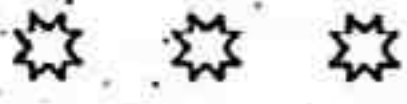
ان دنوں وہ شام میں کوکنگ کورس کی کلاسز لے رہی تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد مشارق اسے لینے آیا تھا۔ شام کے دھندلکے میں گاڑی اس کے گھر کے گیٹ پہ آکر رکی تو اس نے تعجب سے مشارق کو دیکھا۔

"اندر نہیں چلو گے؟"

"نہیں' تم جاؤ۔" مشارق نے منع کیا۔

"اوکے۔"

مشارق نے اندر آنے سے انکار کیا تو وہ سمجھ گئی کہ واقعی اسے جانا ہے۔ اس لیے اس نے زور نہ دیا اور سیٹ بیلٹ کھول کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے اس کی طرف سے رخ موڑا تو اس نے اسے پکار لیا۔

"فلیز!"

"ہاں!" اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ مشارق ذرا آگے جھک آیا۔ اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کی زد میں لیے جیسے اس کے نین نقوش کو ازبر کرنا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے کا احاطہ کیے بالوں کو نرمی سے چھو کر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"ایک بہت بڑے حادثے کے بعد میں پھر سے کسی پہ اعتبار کرنے لگا ہوں۔ کبھی میرا دل مت توڑنا۔"

جس طرح اس نے درخواست کی۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ مشارق کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت تو تھی' مگر دل ٹوٹنے کا یہ کیسا خوف تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں کھو رہی تھی۔ بمشکل اثبات میں سر ہلا کر ہوش سنبھالا' مڑ کر دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔ گھر کے اندر داخل ہوئی تو زرمین کو لان میں ٹہلتے پایا۔

"ہیلو آنٹی!" معمول کے انداز میں کہتی وہ آگے

بڑھی۔ جب تک منار زندہ تھی اس نے اسے منع کر رکھا تھا کہ زرمین سے کوئی رشتہ جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی طرح وہ بھی اسے زرمین میڈم کہتی تھی۔ مگر اب جب وہ زرمین کے ساتھ مستقل طور پر رہنے لگی تھی تو زرمین نے ہی اس سے کہا تھا کہ ایک ساتھ رہتے ہوئے یہ غیریت بھرا لقب استعمال کرنے کی بجائے "آنٹی" کہہ لو تو زیادہ مناسب ہو گا۔ تو شروع میں ان کی مان کر اور اب وہ دل سے اسے آنٹی کہتی تھی۔

"فلیز!" زرمین نے اسے آواز دے کر اندر جانے سے روک لیا۔ وہ ان کی طرف مڑی تو وہ اس کے قریب چلی آئیں۔

"مشارق چھوڑ کر گیا ہے تمہیں؟" زرمین نے اس سے پوچھا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ "جی ہاں۔"

اس کا جواب سن کر زرمین نے ایک پل کو سوچا پھر بولیں۔ "پہلے میں ذاکر سے بات کرنے والی تھی۔ پھر سوچا کہ تم سے پہلے پوچھ لینا زیادہ اچھا ہے۔" فلیز نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"مشارق..." زرمین اٹکی۔

"کیا تم اس کے لیے فیلنگز رکھتی ہو؟" زرمین کا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی اور اعتراف کر لیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے ماننے کی دیر تھی۔ زرمین نے جانے کیسی چھڑی گھمائی کہ "آناً فاناً" سب طے ہو گیا۔ اس کی اور مشارق کی شادی پہ کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ بشمول لڑکا اور لڑکی سب راضی تھے یوں بنا کسی تاخیر کے شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔ عائشہ بھی اس کی شادی میں شرکت کے لیے ان کے گھر رہنے آ گئیں۔ پہلے ایک گھریلو تقریب میں دونوں کا نکاح پڑھوایا گیا۔ اس کے بعد شادی کی رسومات شروع ہوئیں۔ اس کی مہندی کا فنکشن ہوٹل میں رکھا گیا جبکہ رخصتی گھر سے طے پائی تھی۔

اس رات اس کی اور فلیز کی مہندی تھی اور ہال میں گھومتے ہوئے اسے ایک اسٹور کے لٹکتے ہینگروں پر ایک اودے رنگ کا لباس دکھائی دیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ پہلی بار فلیز سے ہوئی ملاقات کا منظر اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا جب پہلی بار اس نے فلیز کو دیکھا تھا۔ تب اسی رنگ کے لباس میں تھی۔ بہت جچ رہا تھا اس پہ وہ رنگ۔ اس کا وہ روپ اس کی آنکھوں میں ایسا سمایا تھا کہ جب بھی اس کا ذکر یا خیال آتا تھا اس کے تصور میں فلیز کا وہی سراپا ابھرتا تھا۔

اس نے وہ سوٹ فلیز کے لیے خرید لیا۔ اور اپنی الماری میں رکھ دیا۔ اگلے دن فلیز دلہن بن کر اس کے گھر آ رہی تھی۔ اب یہ تحفہ وہ اسے اس گھر میں لانے کے بعد ہی دیتا۔

☼ ☼ ☼
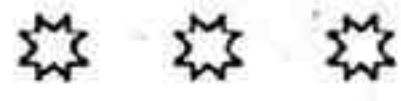
مہندی کی رسم بھگتا کر وہ لوگ رات گئے ہوٹل سے گھر لوٹے۔ نیند سے اس کی پلکیں بوجھل تھیں اور وہ ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے آئی۔ زیور اتارتے ہوئے جب اس نے کلائی سے سونے کا کنگن اتارا تو کنگن اس کے ہاتھ سے پھسلتا ۔ فرش پہ پہیے کی طرح گھومتا ہوا الماری کے نیچے چلا گیا۔ اسے سخت کوفت ہوئی۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھی اور ہاتھ نیچے لے جا کر کنگن ڈھونڈنے لگی۔ کنگن کے ساتھ ایک اور چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ اس نے وہ بھی کنگن کے ساتھ باہر کھینچ لی۔ دیکھا تو وہ ایک کارڈ تھا۔ جس پہ گرد جمی تھی۔ منار کی کوئی چیز اس کے ہاتھ لگی تھی۔ اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔ اس نے گرد جھاڑی۔ وہ ایک ویلن ٹائن کارڈ تھا۔ اس کا دل انجانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کارڈ کھولا۔ اس کارڈ میں منار اور مشارق کی ایک ساتھ تصویر چھپی ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ پتھرائی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ یقین نہ کر سکی کہ جو چہرہ اسے نظر آ رہا تھا وہ واقعی مشارق کا تھا۔ مشارق اور

منار؟.....

اپنی نظروں کو دھوکا قرار دیتے ہوئے اس نے کارڈ پہ تحریر خوش خط عبارت پڑھی۔ مشارق کی طرف سے بے پناہ عشق کا اظہار۔ منار کے لیے۔ ناموں کے ساتھ درج تھا۔ وہ یقین نہیں کرپارہی تھی' ورنہ حقیقت یہی تھی جو اس کے سامنے تھی۔ اتنا بڑا دھوکا..... اتنا بڑا فریب.....

کتنی ہی دیر ڈریسنگ روم میں بیٹھ کر رونے کے بعد وہ جانے کیسے خود کو گھسیٹ کر کمرے میں لائی تھی۔ جانے کیسے اس نے اپنی چیخوں کا گلا دبایا تھا اور کوئی بھی ہنگامہ کھڑا کرنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ مشارق جس سے اس نے محبت کی تھی۔ اس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ وہ شخص جس سے اس کا نکاح ہوچکا تھا اور اب شادی ہورہی تھی۔ وہی شخص اس سے پہلے اس کی بہن سے پیار محبت کا کھیل 'کھیل چکا تھا۔ اسے دھوکا دے چکا تھا۔ وہی اس کی بہن کی موت کا سبب تھا۔ اس کی بہن کا قاتل۔

اسے اب سب یاد آرہا تھا اور وہ سمجھ بھی رہی تھی۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو شروع کے دنوں میں منار کے ذکر پر زرمین اور مشارق کے ناقابل فہم رویے۔ ان کا گریز' مشارق نے بتایا بھی تھا کہ وہ منار کی موت سے ایک ہفتہ قبل امریکا چلا گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ امریکا کیوں گیا تھا۔ وہ منار کو ٹھکرا کر اسے دھوکا دے کر امریکا چلا گیا تھا۔ اس کی بے وفائی منار برداشت نہ کرسکی اور اس نے خودکشی کرلی۔

اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ منار زرمین سے اتنی متنفر کیوں تھی۔ زرمین جو بظاہر میٹھی بنتی ہیں۔ منار ان کا اصل روپ جانتی تھی۔ جبکہ ڈیڈی زرمین کی سنتے اور ان کی مانتے ہیں۔ اسی لیے منار زرمین اور ڈیڈی' دونوں سے دور رہتی تھی اور اسے بھی ان سے دور رکھتی تھی' لیکن محبت انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ اسی کا فائدہ اٹھایا تھا زرمین نے۔ اپنے بھتیجے کے ذریعے اسے محبت کے جال میں پھنسایا۔ ان دونوں نے مل کر اس کے ساتھ کھیل کھیلا اور جب منار ان کے بچھائے جال میں پھنس گئی۔ وہ محبت میں اندھی ہوکر مشارق پہ بھروسا کرنے لگی تو مشارق اسے ٹھکرا کر خود امریکا چلا گیا اور اب اس کے ساتھ بھی دونوں پھوپھی بھتیجے نے مل کر پھر سے وہی گیم کھیلا تھا۔ زرمین نے اپنائیت جتا کر اس کا دل جیتا۔ مشارق نے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسالیا اور اب' وہ اس سے شادی کرنے جارہا تھا۔ جانے کیا مقاصد تھے ان کے۔ جانے کیا عزائم تھے۔

ان ہی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے صبح ہوگئی۔ وہ خود کو بہت تنہا اور بے بس محسوس کررہی تھی۔ ڈیڈی سے بھی کوئی امید نہ تھی۔ جنہوں ہمیشہ زرمین پہ بھروسہ کیا اور انہیں خبر تک نہ ہوسکی کہ منار کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ اس کے معاملے میں زرمین کو غلط سمجھیں گے۔ اس کا اسے یقین نہیں تھا۔ ایسے میں صرف ایک اس کی اپنی ماں تھی جن پہ وہ بھروسہ کرسکتی تھی۔ جو اس کی سن اور سمجھ سکتی تھیں اور اس نے یہی طے کیا کہ وہ اپنی ماں کو سب بتادے گی۔ بھاگ جائے گی اس شادی سے۔ یہ فیصلہ کرکے اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے۔ حلیہ درست کیا اور جب وہ ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو اسی وقت عائشہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار اس کے کمرے میں آئیں۔

"فلیز! مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں تمہاری شادی میں شریک نہیں ہوسکوں گی۔ اس ڈائن نے پھر سے کوئی مسئلہ کھڑا کردیا ہے۔ احسان بہت برہم ہورہے ہیں مجھ پر۔ سختی سے ہدایت کی ہے کہ فوراً" سے پیشتر گھر واپس آؤ۔ مجھے جانا ہوگا فلیز۔ صورت حال بہت سنگین ہے۔ یااللہ! یہ کیا مصیبت پال لی ہے میں نے۔"

نہایت گھبرائی ہوئی اور پریشان عائشہ صرف اپنی ہی سنارہی تھیں۔ اسے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا اور جلدی جلدی اسے دعاؤں کے ساتھ پیار کرکے بے یارومددگار چھوڑ گئیں۔ اتنے بڑے صدمے کے بعد یہ

مایوسی اور بے بسی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ تنہا کوئی قدم اٹھانے کی ہمت بھی خود میں نہیں پا رہی تھی۔ ایسے میں اس نے کارڈ اپنے جہیز کے کپڑوں کے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور بے بسی سے اپنی زندگی کے بنتے تماشے کا نظارہ کرنے لگی۔

صدمہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے سنبھلنا ممکن نہ تھا۔ اگلے دو گھنٹوں کے اندر اندر اس کی حالت ایسی بگڑ گئی کہ وہ بیٹھنے کے لائق بھی نہ رہی۔ اس کا تیز بخار دیکھ کر سب پریشان ہو اٹھے۔ جبکہ گھر مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ ایسے میں وہ اسے رسموں کے ساتھ رخصت کر سکتے تھے نہ تقریب کینسل کر سکتے تھے۔ چنانچہ حالات اور اس کی طبیعت کے پیش نظر، بنا رسموں کے ہی اسے بخار کی حالت میں گاڑی میں بٹھا کر مشارق کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اگلے دن ولیمہ کی دعوت تھی مگر اس کا بخار کم ہونے کی بجائے اتنا بڑھ گیا کہ اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ولیمہ کی تقریب بھی کینسل کر دی گئی۔ تین دن وہ اسپتال میں پڑی بے ہوشی میں ممی، ممی پکارتی رہی۔ کیونکہ اس کا تمام لوگوں پر سے بھروسا اٹھ گیا تھا۔ صرف ایک اس کی اپنی ماں ہی تھی جو آج بھی اس کی اپنی تھی۔ جبکہ باقی سب نے اس کی اس حالت کو عائشہ کی اس اچانک واپسی پہ غم سے تعبیر کیا کہ وہ برداشت نہیں کر سکی کہ اس کی شادی کے موقع پر اس کی ماں کو فنکشن چھوڑ کر جانا پڑا۔ وہ اسپتال سے مشارق کے گھر واپس آگئی۔ بخار اتر گیا مگر اسے چپ لگ گئی۔ وہ کچھ بولتی تھی نہ سنتی تھی۔ بس غائب دماغی کی حالت میں ایک جگہ مجسمہ بنی بیٹھی رہتی تھی۔ مشارق یہی سمجھتا رہا کہ وہ ابھی تک اپنی بیماری کے اثر میں ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد بھی مشارق نے اپنے چہرے سے محبت کا نقاب نہیں ہٹایا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شادی جیسے بھی ہوئی اب وہ مشارق کے گھر اور اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ اب اس سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کے اور زرمین کے عزائم کیا ہیں؟ منار کے ساتھ تو صرف محبت کا کھیل کھیل کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس سے مشارق نے شادی کر لی تھی۔ کیوں؟ وہ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اس کے لیے جاننا ضروری تھا۔ جبکہ مشارق اور زرمین کا بھانڈا پھوڑنے سے کیا نتائج سامنے آئیں گے؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ ایسے میں بہتر یہی تھا کہ وہ ابھی انجان بنی رہے۔ انجان بن کر پتا چلائے کہ مشارق اور زرمین کے منصوبے کیا تھے اور ان کی اصلیت سامنے لانے سے اسے فائدہ ہوگا یا حالات اور بھی بگڑ جائیں گے؟ لہٰذا اس نے مشارق کا منار کو دیا وہ ویلن ٹائن ڈے والا کارڈ چھپا دیا۔

☆ ☆ ☆

اس صبح وہ ناشتے کے بعد ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھی تھی جب مشارق کہنے لگا۔

"ہماری شادی، ولیمہ کے پروگرام تو ٹریش (Trash) ہو چکے۔ لیکن ہنی مون ابھی بھی باقی ہے۔ کیا کہتی ہو؟ کہاں چلیں؟"

"مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس نے بے زاری کے ساتھ صاف منع کیا۔ اس دھوکے باز، قاتل کے ساتھ تو وہ جنت میں بھی نہ جاتی۔

مشارق بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ ایسی حالت میں تمہارا کہیں جانے کا من نہیں کر رہا۔ لیکن ہم کسی لمبے سفر کے لیے نہیں نکلیں گے۔"

مشارق کی بات پہ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یاد ہے؟ ایک بار تم نے کہا تھا کہ ہم لوگ گھومنے کے لیے یو کے، یورپ، امریکہ ہر طرف کا رخ کرتے ہیں لیکن اپنا ملک کسی نے بھی نہیں دیکھ رکھا۔" مشارق نے اسے مہینوں پرانی بات یاد دلائی۔ "تو چلو! پاکستان گھومنے چلتے ہیں۔

"کشمیر چلتے ہیں۔ نیلم ویلی، ہنزہ، اسکردو، گلگت جہاں جہاں تمہارا من چاہے۔ ہر جگہ چلیں گے۔ اور

بائی ایئر جائیں گے تو چٹکیوں میں پہنچیں گے۔ لمبے سفر کی اذیت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اور ایسی جگہوں پہ جاکر تمہاری طبیعت بھی بہتر ہوجائے گی" وہ کہہ رہا تھا اور وہ اسے سن نہیں رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ اسے یوں خاموشی سے دیکھتا پاکر مشارق نے اسے پھر سے بلایا۔

"بولو نا!... اچھا پروگرام ہے ناں!؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اب بھی خاموش تھی۔ مشارق ذرا آگے کو جھک آیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رسان سے بولا۔

"فلیز! میں جانتا ہوں کہ اپنی ماں کے یوں شادی چھوڑ کر جانے سے تمہیں بہت دکھ پہنچا ہے۔ لیکن وہ بھی تو مجبور تھیں۔ جو مشکلات ان کے لیے پیدا کردی گئی تھیں' ایسے میں انہوں نے ایک بہتر قدم اٹھایا ہے۔ اور تم دل چھوٹا نہ کرو۔ کچھ عرصے بعد ہم ان کے شہر میں ایک بڑا سا فنکشن رکھ لیں گے۔ تاکہ وہ ہماری خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔ اور ان کے لیے کوئی پریشانی بھی نہ ہو۔" وہ اب بھی ویسے ہی خاموش تھی۔

"اب تو مسکرا دو پلیز... تم نہیں جانتیں کہ تمہاری خوشی میرے لیے کتنی اہم ہے۔ بہت چاہتا ہوں میں تمہیں۔ تمہارے چہرے کی یہ اداسی اور ویرانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"

"کیا تمہیں وہ کبھی یاد نہیں آتی؟"

اس نے خود کو کہتے سنا۔

"کون؟" مشارق سراپا سوال بن گیا۔

"منار۔" مشارق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا؟ کبھی بھی نہیں؟"

اس کے لیے یہ دل چیر دینے والا احساس تھا کہ ایک آدمی نے پہلے ایک لڑکی کو دھوکا دے کر اس کی جان لی اور اب اس لڑکی کی بہن سے عشق لڑاتے ہوئے اسے کوئی احساس' کوئی ندامت' کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ جبکہ دوسری طرف مشارق کو سکتہ ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ دیر وہ یوں ہی اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے چہرے پہ افسوس اور شرمندگی کے تاثرات ابھرے۔

"آئم سوری۔" میں بھول گیا تھا کہ اپنی شادی کے موقعے پر تم اپنی بہن کو بھی مس کررہی ہوگی۔" پھر لہجہ بدل کر سمجھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ تمہاری بہن تھی ناں! تمہارا اس سے خون کا رشتہ تھا۔ اس لیے وہ تمہیں اتنی شدت سے یاد آرہی ہے۔" مشارق جو سمجھ سکا تھا اسی کے مطابق کہا۔

"اور تمہیں؟ تمہیں بالکل بھی یاد نہیں آتی؟... کیا اتنی بری تھی وہ؟" اس نے شدید دکھ کے ساتھ پوچھا۔ مشارق زچ سا ہوگیا۔

"فلیز جان! کیوں اسے یاد کرکے رو رہی ہو؟ اس سے کیا حاصل ہوگا؟ بس دعا کیا کرو اپنی بہن کے لیے۔"

کیسا بے حس آدمی تھا۔ خود قتل کرکے دوسروں سے کہتا تھا کہ وہ مقتول کے لیے دعا کریں۔ اس کے دل میں زہر بھر گیا۔

"تم اس کا نام کیوں نہیں لیتے؟"

پہلی بار مشارق کے تاثرات بدلے۔ مطمئن اور پر اعتماد چہرے پر ملال اور تکلیف کے سائے لہرائے۔ جسے اس نے چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر اس نے بھانپ لیا۔ مشارق کے مطمئن ضمیر کو کچوکا لگا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو خاصا سکون ملا۔ اپنی سوالیہ نظریں وہ مشارق کے چہرے پر گاڑے ہوئے تھی۔ مشارق کے چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا' ایک جارہا تھا۔ بہت دیر تک وہ کچھ بول نہ سکا اور آخر کار جیسے ہار کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے وہ یاد آتی ہے۔ جب جب میں تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں۔ مجھے وہ یاد آتی ہے۔"

مشارق نے جیسے اپنی شکست تسلیم کی اور اس کے

بعد وہ رکا نہیں اور وہاں سے چلا گیا۔ اسے جان کر خوشی ہوئی اور اطمینان بھی کہ مشارق اس کی بہن کی جان لے کر اتنا بھی خوش اور مطمئن نہیں تھا۔ دل میں کہیں نہ کہیں احساس جرم تھا جو اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن ناچار وہ مشارق کے ساتھ ہنی مون کے لیے روانہ ہوگئی۔ مشارق کے ضمیر پر وہ کوڑے برسا رہی تھی۔ اب اس نے اسے یہ یقین بھی دلانا تھا کہ وہ مشارق کے منار سے دھوکے سے بے خبر ہے۔ اس لیے جہاز میں سفر کے دوران انجان بن کر سادگی سے پوچھنے لگی۔

"میں کل سے تمہاری بات سوچ سوچ کر الجھ رہی ہوں۔ تم نے کیوں کہا تھا کہ تم جب جب میرا چہرہ دیکھتے ہو تمہیں منار یاد آتی ہے۔" اس کی بات سن کر مشارق اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"کیونکہ تم دونوں میں بہت مشابہت ہے۔ اور کل تم بہت دکھی تھیں ناں کہ تمہاری بہن کو سب نے بھلا دیا ہے۔ اس لیے تمہیں بتایا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں خود بخود اس کا خیال آجاتا ہے۔"

"کس کا؟" اس نے برجستہ اور بھول پنے سے پوچھا۔

مشارق اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "آف کورس۔ تمہاری بہن کا۔"

اس نے بمشکل اپنی بے ساختہ امڈتی تلخ مسکراہٹ چھپائی۔ اسے اب یقین ہوگیا تھا کہ مشارق دانستہ منار کا نام نہیں لیتا۔ اور ہمیشہ کی طرح آج بھی منار کے ذکر پہ اس کا چہرہ اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ مشارق کو احساس جرم تھا۔ وہ یہ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو رہی تھی۔

"دھوکے باز۔" اس نے دل میں مشارق کے لیے کہا۔

☆ ☆ ☆

وہ مشارق کا احساس ندامت جان کر کچھ خوش اور مطمئن ہوگئی تھی اور مشارق نے جانا کہ وادی ہنزہ کی فضاؤں نے اس کی صحت پہ اچھا اثر ڈالا ہے اور وہ نارمل ہوگئی ہے۔ یہ دیکھ کر اس روز اس نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تو اس نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور نفرت سے چلائی۔

"دور رہو مجھ سے۔"

"کیا ہوگیا ہے؟ کس بات پر خفا ہو؟" مشارق نے اس سے پوچھا۔

"میں تمہیں نہیں چاہتی مسٹر مشارق کیف! میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔ اس کے اندر کا زہر الفاظ کی صورت زبان سے نکلا۔ مشارق ہکا بکا اسے دیکھنے لگا۔ فلیز کے الفاظ ناقابل یقین تھے۔

"پلیز فلیز! مجھے ایسا مذاق بالکل بھی پسند نہیں ہے۔"

انتہائی کرب سے کہتا مشارق پھر سے اس کے قریب آیا تو وہ پھر سے اسے پیچھے دھکیل کر بولی۔

"یہ مذاق نہیں ہے مشارق کیف! مذاق وہ تھا جو میں ایک سال سے تمہارے ساتھ کر رہی تھی۔ تم سے ہنس کر چار باتیں کیا کرلیں۔ تم نے نجانے کیا کیا سوچ لیا... کان کھول کر سن لو مشارق کیف! مجھے تم سے اور تمہاری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے لیے تم صرف زرمین ناز کے بھتیجے ہو۔ وہ زرمین ناز جس نے میری ماں کا گھر توڑا۔ ہماری ہنستی بستی فیملی کو تباہ کیا۔ ہماری زندگیوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔ اس زرمین ناز کے بھتیجے کے لیے میرے دل میں کچھ نہیں ہے سوائے نفرت کے۔ مجھے تم سے کبھی محبت نہیں تھی۔ نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکتی ہے۔ سمجھے تم؟"

وہ جاننا چاہتی تھی کہ مشارق کا اس پہ کیا رد عمل ہوگا۔ وہ عاشق کا چولا اتار کر اصلیت پر اتر آئے گا یا کوئی اور انداز اختیار کرے گا۔ مگر مشارق حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو مشارق کچھ نہ

بولا۔ دھواں دھواں چہرہ لیے خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس کا یہ قدم اس کے لیے غیر متوقع اور ناقابل فہم تھا۔ پھر بھی اسے یہ دیکھ کر سکون ملا کہ آج مشارق نے بھی ٹھکرائے جانے کا مزا چکھ لیا۔ اب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ منار پہ کیا گزری تھی جب اس نے اسے ٹھکرایا تھا۔

وادی نیلم کی پہلی صبح۔ اس کی آنکھ مشارق سے پہلے کھل گئی۔ اس نے اپنا اودھے رنگ کا لباس نکالا اور واش روم میں گھس گئی۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل کر وہ واپس کمرے میں آئی۔ ایسے ہی کھڑکی کے پردے ہٹائے تو معلوم ہوا کہ باہر پوری وادی پہ سفید برف کا دبیز کارپٹ بچھا ہے۔ رات بھر شاید برف باری ہوتی رہی تھی اور ابھی بھی ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے برف بہت پسند تھی۔ اتنی ساری برف اور اتنا حسین منظر دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہوئی کہ اس خوشی میں باقی سب کچھ بھول گئی۔ ہر غم، ہر فکر سے آزاد ہو کر اس نے جلدی جلدی جیکٹ پہنی، جرابیں چڑھا کر جوتے پہنے۔ سر پہ ٹوپی اور گلے میں گرم مفلر اور ہاتھوں پہ دستانے پہن کر باہر نکل گئی۔

ہوٹل سے تھوڑی دور جا کر اس نے بازو پھیلائے اور برف پہ گول گول گھومنے لگی۔ بچپن سے اس کی خواہش تھی کہ ایسی برف ہو اور وہ ہو۔ پھر وہ اس برف میں خوب کھیلے اور اس سے سنو مین بنائے۔ لیکن کبھی اسے ایسی برف نہیں ملی تھی اور کبھی برف تھی تو موقع نہیں ملا تھا۔ آج قسمت اس پہ مہربان ہوئی تھی۔ برف بھی تھی۔ وہ بھی تھی اور موقع بھی تھا۔ جتنا چاہتی وہ اس برف میں کھیل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ منچلے، کچھ بچے باہر نکلے، سنو بال فائٹ کر رہے تھے۔ وہ ان سے ذرا دور جا کر اپنا سنو مین تیار کرنے لگی۔ برف کا گولہ بناتے ہوئے اس کے دستانے بھیگ گئے۔ مگر وہ اپنے شوق کے آگے اتنی ٹھنڈک برداشت کر سکتی تھی۔ اس لیے اسے نظر انداز کیے وہ اپنے کام میں مشغول رہی۔ جب اس نے دوسرا گولہ بنا کر پہلے گولے پر رکھا۔ تب مشارق بھی جیکٹ، دستانے اور ٹوپی وغیرہ پہنے اپنے آپ کو سردی سے بچائے وہاں آن پہنچا۔ اس نے اسے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا۔

"تم مجھے بتائے بنا نکل آئیں۔ میں پریشان ہو گیا تھا۔" مشارق نے پاس آ کر کہا۔

"مجھے تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" برف کے گولے کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے بے رخی سے کہا۔

اس کے سنو مین کا دھڑ تو تیار ہو گیا تھا۔ اب سر کے لیے ایک اور مگر چھوٹا گولہ بنانا باقی تھا۔ سنو مین کے اردگرد کی برف وہ سنو مین کا دھڑ بنانے میں استعمال کر چکی تھی۔ اب سر بنانے کے لیے اسے ذرا آگے جانا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک گئی۔ اسے کیا ہو رہا تھا؟ کچھ ایسا، جیسا اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے جسم سے زندگی ختم ہو رہی تھی۔ عام حالات میں ہم کبھی اپنے جسم کے کسی خلیے کو ایکٹو محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اب سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر رکنے لگے تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے جسم کا روم روم ہمہ وقت سرگرم رہتا تھا۔ کسی مشین کی طرح، مسلسل اور اب اچانک سے سب نے جیسے ہڑتال کا اعلان کر دیا تھا۔ سب کام چھوڑ کر رکتے جا رہے تھے۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تھمنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے زبردستی اپنے وجود کو زندہ رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس کا دماغ بھی اب منجمد ہو رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کا دل اور دماغ دونوں بند ہو رہے ہیں۔ اس کی جان نکلنا چاہتی ہے۔

مشارق کے ہاتھ اس کے شانوں پر آ ٹکے۔ بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اس نے اپنے سامنے مشارق کا چہرہ دیکھا۔

"مشارق!" اسکے لبوں سے سرگوشی نکلی اور وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

"فلیز!... فلیز!" بانہوں سے نکلتی فلیز کو

سنبھالتے ہوئے مشارق انتہائی گھبراہٹ اور بے چینی سے اسے پکارنے لگا۔

"فلیز۔۔۔ دیکھو! بے ہوش نہ ہونا۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ دیکھو مجھے۔"

وہ اسے آنکھیں کھلی رکھنے کی سختی سے تنبیہہ کررہا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ مگر اس کا دماغ برف بن رہا تھا۔ آنکھیں کھلی رکھنا اسکے لیے ناممکن تھا۔ مشارق اسے اٹھا کر واپس ہوٹل کے کمرے میں لے گیا۔ اسے انگیٹھی میں جلتی آگ کے سامنے کارپٹ پہ لٹایا۔

"فلیز! آنکھیں کھولو۔ دیکھو۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا تمہیں۔"

مشارق زندگی میں پہلے کبھی اتنی گھبراہٹ اور خوف میں مبتلا نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس وقت۔ اس نے فلیز کے بھیگے ہوئے دستانے' اس کی جیکٹ اور ویلنگٹنز اتارے۔ پھر بھاگ کر باتھ روم میں باتھ ٹب کا نل کھول کر بھاگتا ہوا واپس اس کے پاس آیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فلیز کسی بھی سیکنڈ جان سے جاسکتی ہے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو رگڑتے ہوئے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ کیونکہ اس کی آنکھیں بند اور جسم بے جان تھا۔ جبکہ فلیز۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ مرچکی ہے یا مررہی ہے۔ لیکن مشارق کی آواز سے اسے ادراک ہورہا کہ اس کے احساسات ابھی زندہ ہیں۔ ورنہ تو اس کا پورا جسم مردہ ہوچکا تھا۔

اسے پکارتے ہوئے مشارق نے ایک بار پھر اسے اٹھایا اور باتھ روم میں لے جاکر باتھ ٹب میں لٹا' دیا۔ باتھ ٹب ابھی صرف آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس لیے ٹب کا نل کھلا رکھ کر ہی اس نے شاور ہاتھ میں لے لیا اور شاور سے بھی گرم پانی فلیز پہ ڈالنے لگا۔ پانی کی گرمائش نے واقعی اس کے مردہ جسم میں زندگی لوٹانا شروع کردی۔ جیسے اس نے اپنے جسم کے ایک ایک خلیے کو رکتے محسوس کیا تھا۔ اب وہ جیسے ہوش میں آکر پھر سے کام کرنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس کا جسم اتنا گرم اور متوازن ہوگیا کہ اس نے آنکھیں کھول لیں۔ مشارق کی سانسیں اٹکی ہوئی تھیں۔ اب جو اسے آنکھیں کھولتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

"تم ٹھیک ہو ناں!"

وہ آنسو جو فلیز کو کھونے کے ڈر سے اس کی آنکھوں میں جمع ہوئے تھے سجدہ شکر بجالائے اور اس کی پلکوں سے گر گئے۔ اور وہ اسے یک ٹک دیکھے گئی۔ وہ مررہی تھی اور مشارق نے اسے بچایا تھا۔ کیوں؟۔۔۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ٹھیک ہے۔ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ مشارق کسی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرسکتا ہے۔ لیکن اس کی جان بچانے کے لیے اتنی تگ و دو' اتنی سرتوڑ کوشش' اور اتنی فکر؟۔۔۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

ٹب سے باہر پنجوں کے بل فرش پہ بیٹھے مشارق کے دل کو ڈھارس ہوگئی کہ وہ لوٹ آئی ہے۔ اس نے اٹھ کر شاور بند کرکے واپس ہولڈر میں لگایا۔ ٹب ابھی بھی پانی سے پورا بھرا نہیں تھا۔ اس لیے ٹب کا نل بند نہ کیا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔"

مشارق کہہ کر باتھ روم سے نکل گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے جسم کی گرمی لوٹ چکی تھی۔ صرف دماغ' سینہ اور پیروں کی انگلیوں میں ابھی تک ٹھنڈک باقی تھی۔ یہ باقی سردی بھی جانے کے انتظار میں اس نے آنکھیں موندلیں۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے اس کے دل میں دہشت بٹھادی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر اتنی حسین اور دلفریب دکھنے والی برف دراصل کتنی سفاک قاتل ہے۔ جب حملہ کرتی ہے تو شکار کو دفاع کے لائق بھی نہیں چھوڑتی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مشارق باتھ روم میں واپس آیا۔ اسے آہٹ سنائی دی لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ جیسی تھی ویسے ہی پڑی رہی۔

"فلیز!" مشارق نے پکارا تو اس نے اس کی طرف سر گھما کر آنکھیں کھولیں۔
مشارق کو اسے زندہ دیکھ کر تسلی ہوئی۔ ہاتھ میں پڑا مگ اس کی طرف بڑھایا۔
"یہ لو۔ ہاٹ چاکلیٹ پیو۔ اس سے تمہارے جسم اور دماغ کو گرمی پہنچے گی۔"
مشارق نے کہا تو اس نے چپ چاپ ہاتھ پانی سے نکال کر مشارق کا بڑھایا ہوا مگ تھام لیا۔

✲ ✲ ✲

ان کا نام نہاد ہنی مون ٹرپ بھی پورا ہوا اور وہ مشارق کے ساتھ اس کے گھر واپس لوٹ آئی۔ مشارق اس کی بے رخی پہ جیسے خاموش تھا۔ اس سے اس کے حوصلے اور بڑھے تھے۔ اسے لگا کہ وہ مشارق کو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ مگر ابھی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ حقیقت کو مخفی رکھ کر وہ کوئی ٹھوس وجہ نہیں بتا سکتی تھی جس کی بنا پر ذاکر اشفاق اس کی بات مانتے اور اس کا ساتھ دیتے۔ اور اگر وہ انہیں اپنی طرف سے بدظن کر دیتی تو زرمین اور مشارق کا پلڑا بھاری ہو جاتا۔ پھر اس کا انجام بھی وہی ہوتا جو منار کا ہوا تھا۔ زرمین اور مشارق شاید اس لیے کھل کر اس کے سامنے نہیں آ رہے تھے کیونکہ اسے ذاکر اشفاق کی حمایت حاصل تھی۔ جب تک ذاکر اشفاق اس کے ساتھ تھے۔ یقیناً" اس پہ ہاتھ ڈالنا زرمین اور مشارق کے لیے آسان نہیں تھا۔ ایسے میں اس کے پاس کوئی

چارہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ کچھ اور عرصہ وہاں رہ کر کوئی ٹھوس بہانہ تلاش کرتی جس کی بنا پر وہ اسے چھوڑ کر جا سکتی۔
مہینے گزر گئے۔ لیکن مشارق نے کوئی جواز اس کے ہاتھ نہ آنے دیا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ خاموش، اداس، اور پریشان۔ مگر اس کی طرف سے مکمل باخبر۔ اس کی پرواہ کرتا، اس کا خیال کرتا اور ہر ضرورت مہیا کرتا۔ ایسے میں اس کا ذہنی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اگر اسی طرح چلتا رہتا تو شاید سالوں گزر جاتے اور اسے کوئی

جواز نہ ملتا۔ جبکہ اس دھوکے باز شخص کے ساتھ گزرتا ایک ایک لمحہ اس کی گھٹن بڑھاتا جا رہا تھا۔ سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔ اور وہ کسی سے اپنی تکلیف اور پریشانی کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف ایک ماں تھی جس پہ وہ بھروسا کرتی تھی لیکن ان کی اپنی پریشانیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کی مشکلات کے پیش نظر وہ ان سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایسے میں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے مصلحت کا دامن چھوڑا اور مشارق کے سر پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس وقت مشارق اپنے کمرے میں شیشے کی کھڑکی کے سامنے کھڑکی کے فریم پہ ہاتھ ٹکائے کھڑا باہر دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہا تھا۔
"مجھے طلاق چاہیے۔" اچانک فلیز کی عقب سے آواز آئی تو وہ چونکا۔ مگر حیران نہ ہوا۔ جیسا فلیز کا رویہ تھا اور جس نفرت کا اظہار وہ کر چکی تھی۔ اس کے بعد تو وہ کسی بھی وقت اس مطالبے کی توقع کر رہا تھا۔ سو آرام سے اس نے فریم سے ہاتھ ہٹائے اور اس کی طرف مڑا۔
"کیوں؟ کیا شکایت ہے تمہیں مجھ سے؟"
اس کے سیدھے سے سوال پہ فلیز نے پہلے اپنا غصہ دبایا۔ پھر اسی روکھے لہجے میں بولی۔
"شکایت تم جانتے ہو۔ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ نہیں رہنا چاہتی میں تمہارے ساتھ۔"
مشارق اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا تو اس کا لہجہ جواب طلب تھا۔
"کیا یہی باتیں تم اپنے ڈیڈی کے سامنے کہہ سکتی ہو؟"
مشارق کے اس سوال کا وہ مطلب نہ سمجھی۔ الجھن سے اسے دیکھا تو وہ بھی پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔
"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اس طلاق کے نتیجے میں زرمین سفر نہیں کریں گی؟ ہماری طلاق کے بدلے ذاکر انکل زرمین کو پریشان نہیں کریں گے؟"
وہ اب سمجھی۔ تو مشارق کو یہ پریشانی تھی۔ جبکہ اس

کا ایسا کوئی ارادہ تھا نہ اس کا اس طرف دھیان گیا تھا۔

"میں ڈیڈی کو بتادوں گی۔ کچھ نہیں کہیں گے وہ تمہاری زرمین میڈم کو۔"

اسی بے زار آواز میں اس نے مشارق کو اطمینان دلایا۔ مشارق ایک بار پھر اسے دیکھنے لگا تھا۔ جیسے کچھ جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

"تم کیوں کر رہی ہو ایسا فلیز... آخر تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کوئی انسان اتنا کیسے بدل سکتا ہے؟ پورا ایک سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ بہت خوش تھے ہم۔ تمہاری آنکھوں میں میں نے اپنے لیے پیار دیکھا ہے۔ چاہ دیکھی ہے۔ کبھی بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے مجھے لگتا کہ تمہاری محبت کوئی دھوکا یا دکھاوا ہے۔ تم ایسی تو نہ تھی فلیز... پھر میں کیسے مان لوں کہ تم نے کبھی مجھ سے پیار نہیں کیا۔ وہ پورے سال جو کچھ ہمارے بیچ رہا' سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا۔ میں کیسے مان لوں؟"

وہ آج پہلی بار بولا تھا۔ پہلی بار اس کے سامنے اپنی تکلیف بیان کر رہا تھا۔ فلیز نے دھتکارتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے۔

"سب جھوٹ تھا۔ سب فریب تھا... اور میں اس فریب کو اور نہیں بڑھا سکتی۔ مجھے تم سے چھٹکارا چاہیے۔" مشارق ساکت کھڑا اسے دیکھے گیا۔ وہ منتظر رہی کہ وہ جواب میں کچھ کہے گا۔ کچھ دیر بعد مشارق بولا تو اس کی آواز میں عجب خوف تھا۔

"مجھے ایک سوال کا سچ سچ جواب دو۔ کیا تمہاری زندگی..." مشارق اٹکا۔ سانس کھینچ کر بولا۔ "آئی مین۔ تمہارے دل میں کوئی اور ہے؟ کسی اور کو چاہتی ہو تم؟"

مشارق کو یہ خیال کیوں آیا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ ناراض نظریں مشارق کے چہرے سے ہٹا کر دوسری جانب موڑ لیں۔

"نہیں۔"

مشارق نے اطمینان اور تشکر سے آنکھیں بند کیں۔ مزید کچھ بھی کہے یا پوچھے بنا وہ چپ چاپ وہاں سے چل پڑا۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

اس کے طلاق کے مطالبے سے مشارق کی پریشانی اتنی بڑھ گئی کہ اس نے زرمین کو اپنے حالات سے آگاہ کر دیا اور اس نے مشارق کو زرمین سے فون پہ بات کرتے سن لیا۔ جس سے اسے معلوم ہوا کہ زرمین ابھی تک ان کے معاملات سے بے خبر تھیں۔ جس سے دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ زرمین مشارق کی ساتھی نہیں تھیں۔ نہ ہی وہ کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ اگر وہ دونوں مل کر کوئی منصوبہ بنا رہے ہوتے تو زرمین کو تمام حالات کی خبر ہوتی۔ دوسرا' مشارق سچ مچ اس سے محبت کرتا تھا۔ سچ میں اسے چاہتا تھا اور اسی لیے اس سے شادی بھی کی تھی۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا۔ جس شام زرمین نے اس سے مشارق کے لیے اس کی پسندیدگی سے متعلق پوچھا تھا۔ اس سے پہلے مشارق نے اسے گھر چھوڑتے ہوئے ایک بات کہی تھی۔

"ایک بہت بڑے حادثے کے بعد میں پھر سے کسی پہ اعتبار کرنے لگا ہوں۔ کبھی میرا دل مت توڑنا۔"

اگر مشارق یہ بات اس وقت سے ایک سال پہلے کہتا' جب وہ نئی نئی اپنے باپ کے پاس مستقل رہنے آئی تھی اور ہر ایک پہ شک کر رہی تھی۔ تو وہ فوراً جان جاتی کہ وہ کس حادثے کا ذکر کر رہا ہے۔ منار کی خودکشی نے مشارق کو احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے جس لڑکی کو دھوکا دے کر اسے خودکشی پہ مجبور کر دیا تھا۔ اب اسی کی بہن سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کا خوف زدہ ہونا بنتا تھا۔ اسی لیے وہ اعتبار نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کسی روز اس کا راز کھل جائے گا اور تب فلیز اس سے نفرت کرنے لگے گی۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور یہی بات تھی۔ مشارق بھلے سے اس کے ساتھ مخلص تھا اور اس سے سچ میں محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ... وہ کیسے اسے قبول کر لیتی؟

کیسے بھول جاتی کہ اس شخص نے اس کی بہن کے ساتھ کیا کیا تھا؟

☆ ☆ ☆

مشارق کے بتانے کے بعد بھی زرمین ان کے معاملے پہ خاموش تھیں۔ انہوں نے ذاکر اشفاق کو کچھ بتایا تھا نہ خود ان پہ ظاہر کیا تھا کہ انہیں کسی بات کی کوئی خبر ہے۔ وہ اب بھی اس کے سامنے انجان بنی ہوئی تھیں، مگر اب وہ زرمین سے بدگمان نہیں رہی تھی۔ شاید زرمین ان کے ذاتی معاملے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لیے خاموش اور لاتعلق بنی بیٹھی تھیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تھا۔ اسی طرح خوش اخلاقی سے بات کرتی تھی اور اب اسے اور مشارق کو اپنے گھر ڈنر کے لیے بلایا تھا۔ بہانا یہ تھا کہ بہت عرصہ گزر گیا تھا گھر کے تمام افراد ایک ساتھ جمع نہیں ہوئے تھے۔ تو سب کو جمع کرنے کے لیے انہوں نے گھر پہ ایک چھوٹی سی ڈنر پارٹی رکھ لی۔ وہ اور مشارق اس پارٹی میں جانے کے لیے راضی تھے۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں راکنگ چیئر پہ دھیرے دھیرے آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ سوچ یہی رہی تھی کہ آج وہ مشارق سے اپنے رشتے کے خاتمے کا اعلان بھی کرے گی۔ زرمین اور مشارق ایک ٹیم نہیں تھے۔ مطلب کہ ڈیڈی اس کے اس فیصلے پہ خفا ہوتے تو بھی مشارق کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نہج پہ سوچتے ہوئے ایک خیال نے اسے چونکایا۔ جھولتی ہوئی کرسی اچانک رک گئی۔

”لیکن میں اب بھی کیوں خاموش ہوں؟ پہلے تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ زرمین اور مشارق کے عزائم کیا ہیں، لیکن اب تمام حقیقت کھل کر میرے سامنے آچکی ہے۔ میں جان چکی ہوں کہ مشارق کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ وہ مغلوب ہے اور میں غالب ہوں۔ شاید زرمین بھی نہیں جانتیں کہ مشارق نے منار کے ساتھ کیا کیا تھا۔ یہی صحیح وقت اور موقع ہے۔ مجھے اس کا راز افشا کردینا چاہیے۔ آج گھر جا کر ڈیڈی اور زرمین کے سامنے مشارق کے چہرے سے نقاب ہٹادوں گی۔ بتادوں گی انہیں کہ مشارق منار کا قاتل ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کے بعد ڈیڈی ویسے بھی مجھے ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہنے دیں گے۔ میری تمام پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ مشارق کو بھی اس کے گناہوں کی سزا ملنے کا وقت آگیا ہے۔“

اس نے سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ تو آج شام کی معمولی سی ڈنر پارٹی ایک بڑی پارٹی بننے جارہی تھی۔ مشارق کے کالے کرتوتوں سے نقاب اٹھنے جارہا تھا۔ اتنا اہم موقع تھا۔ اس کی تیاری اتنی ہی خاص ہونی چاہیے تھی۔ وہ تیار ہونے کی غرض سے ڈریسنگ روم میں آئی۔ جہاں پہ اس کا ایک نہایت خوب صورت اودے رنگ کا لباس ہینگر پہ ٹنگا تھا۔ یہ لباس اس نے حال ہی میں خریدا تھا اور اب تک نہیں پہنا تھا۔ آج کی پارٹی کے لیے بالکل مناسب تھا اور صرف یہی نہیں۔ اس نے میچنگ جوتے اور جیولری بھی نکال لی۔ میک اپ کرکے خوب صورت سے بال بھی بنائے اور اس کی تیاری کا آخری اور سب سے اہم مرحلہ تھا وہ ویلن ٹائن ڈے والا کارڈ جو مشارق نے منار کو دیا تھا۔ اس نے وہ کارڈ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس کارڈ کا اس کے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ ورنہ اگر مشارق منار کے ساتھ تعلق سے صاف مکر جاتا تو کوئی بھی اس کی کسی بات کا یقین نہ کرتا۔ زرمین بھی بنا ثبوت کے مشارق کا ہی بھروسہ کرتیں اور اسی کا ساتھ دیتیں۔

☆ ☆ ☆

مشارق گھر کے داخلی دروازے پہ کھڑا چوکیدار کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ وہ بالکل عام کپڑوں اور عام حلیے میں تھا اور اسی حال میں اسے ڈنر پہ جانا تھا، لیکن بات کرتے کرتے اس کی نظریں ہی فرسٹ فلور کی جانب اٹھیں تو فلیز کو سیڑھیوں کے اوپر کھڑا دیکھ کر وہ اس پر سے نگاہیں ہٹانا بھول گیا۔ فلیز کی تیاری

ضرورت سے زیادہ تھی مگر وہ ہوش اڑانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ اوپر سے اس کا اودے رنگ کا لباس۔ اس رنگ میں وہ اسے ویسے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ اور فلیز وہاں کھڑی اپنے اندر حوصلہ مجتمع کر رہی تھی۔ ارادہ تو اس نے کرلیا تھا، لیکن اب عمل در آمد کا وقت آیا تھا تو اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ یقیناً" وہ جو قدم اٹھانے جارہی تھی، وہ بہت بڑا تھا۔

مشارق اسے دیکھتا ہوا وہیں بت بن جاتا اگر جیب میں رکھے فون کی گھنٹی اسے نہ چونکاتی۔ اس نے فلیز سے نظریں ہٹائیں اور جیب سے فون نکال کر دیکھا۔ زرمین کی کال تھی۔ وہ فون ہاتھ میں لیے چوکیدار کی جانب واپس پلٹا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں نے جو کہا ہے ان باتوں کا دھیان رکھنا۔" تنبیہہ کے ساتھ چوکیدار کو رخصت کیا اور فون کان سے لگایا۔

"ہاں زرمین پھپھو!"

"میں نے سوچا کہ کنفرم کرلوں کہ فلیز اور تم دونوں ایک ساتھ آرہے ہو نا! کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔" زرمین نے ایک اندیشے کے تحت پوچھا۔

"ہاں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم دونوں نکل ہی رہے ہیں۔"

اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ زرمین خوش ہوئی۔

"گڈ۔ ہمت نہیں ہارنا مشارق! ہم اسے توجہ اور

فلیز کی بلند چیخ پر وہ ہڑبڑا کر پلٹا۔ دیکھا فلیز سیڑھیوں پر لڑھکتی آرہی تھی۔

"فلیز!" وہ چلایا۔ ہاتھ سے فون گر گیا اور وہ اس کی سمت بھاگا۔ اس کے سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے فلیز آخری سیڑھی سے لڑھک کر فرش پہ اوندھے منہ آگری۔ اس کے قریب گھٹنے ٹیک کر اس نے فلیز کو شانوں سے پکڑ کر ـــــ سیدھا کیا۔ فلیز کی آنکھیں بند تھیں اور لگتا تھا جیسے وہ مرچکی ہے۔ اسے بانہوں میں بھرے اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

"فلیز! فلیز!" وہ دیوانوں کی طرح اسے پکار رہا تھا۔ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فلیز کو کھودینے کے ڈر سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

فلیز نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔ درد اور شدید درد کے سوا اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس تکلیف کے عالم میں سوائے مشارق کے اس کے پاس کوئی دوسرا نہیں تھا۔

"مشارق!"

اس کے لبوں نے جنبش کی اور ساتھ ہی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ وہ ہوش بھی کھو بیٹھی۔

فلیز نے صرف اس کا نام لیا تھا، لیکن اس سرگوشی میں بھی ایک مکمل التجا تھی۔ بالکل ویسی جیسی اس نے نیلم ویلی میں کی تھی جب اسے ہائپو تھیرمیا (Hypothermia) کا اٹیک ہوا تھا۔ (ہائپو تھیرمیا۔ وہ حالت جس میں جسم کا درجہ حرارت خطرناک حد تک گر جاتا ہے۔) جیسے کہہ رہی ہو۔ "مشارق! مجھے بچالو۔" "مشارق! میں مر رہی ہوں۔" مشارق اس کا مسیحا ہو جیسے اور یہ التجا مشارق کی گھبراہٹ اور خوف بڑھا گئی۔

"ہاں بولو فلیز! میں سن رہا ہوں فلیز! آنکھیں کھولو۔"

فلیز کو جھنجھوڑتے ہوئے اس نے فلیز کے سر کے نیچا رکھا اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ پورا خون سے بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر اس کے بدن میں برف کی سی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

اسے لگا تھا کہ اس کی موت آچکی ہے، مگر مشارق نے ایک بار پھر اسے جانے سے روک لیا تھا۔ اس کے سر پہ گہری چوٹ آئی تھی اور دایاں ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ اسپتال اور گھر واپس آنے کے بعد بھی مشارق نے جو اس کی تیمارداری کی اور اس کا خیال رکھا۔ وہ اس کی دل سے ممنون ہوگئی۔ زرمین اور ڈیڈی نے بھی بہت خیال

کیا تھا۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھے' لیکن جس کی فکر اور خیال کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس کی اپنی ماں تھی۔ جو اس وقت بھی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہ صرف دوبار اسپتال میں اس سے ملنے آئی تھیں۔ ان کی مشکلات اور مجبوریاں ابھی بھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ ایسے میں اس کے پاس صرف مشارق تھا جو چوبیس گھنٹے اس کا خیال رکھ رہا تھا۔

فلیز کے سر کے ٹانکے کھل چکے تھے اور اب مشارق نے اس کے لیے خاص طور سے چھٹی کی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ کا پلاستر اتروانا تھا۔ پلاستر اتروا کر گھر واپسی پہ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ آخر کار فلیز مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی۔ دونوں کمرے میں آئے تو مشارق نے رک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

"اب تمہارا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔ الحمدللہ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا کہ یہ ٹوٹا تھا۔"

"ہاں۔" وہ بھی مسکرائی۔ "اب تمہیں مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود کھا سکتی ہوں۔" فلیز نے جس ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ مشارق اس خوشی میں بہہ گیا۔

"وہ تو میں پھر بھی زندگی بھر تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانا چاہوں گا۔" کہہ کر مشارق اتنا قریب ہوا کہ وہ سمٹنے لگی۔ مشارق نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے ہلکا سا احتجاج کیا جو مشارق نے نظر انداز کر دیا۔ اس کی پیشانی سے اپنی پیشانی ٹیک کر سرشاری کے عالم میں بولا۔

"اب تو ہمارے بیچ کی تمام دوریاں اور غلط فہمیاں مٹ چکی ہیں ناں جان!" مشارق نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی برداشت جواب دے گئی۔

"میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے۔" وہ چلائی اور خود کو چھڑوا کر زور سے مشارق کو پیچھے دھکیلا۔ مشارق ہکا بکا رہ گیا جبکہ وہ بپھری ہوئی تھی۔

"میں نے اخلاقاً ـــــ تم سے نرمی سے بات کیا کر لی' جانے کیا مطلب سمجھ لیا ہے تم نے۔ کون سی غلط فہمیوں کی بات کرتے ہو؟ مجھے کوئی غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ تمہارے گناہوں کے ثبوت ہیں میرے پاس۔"

"گناہ؟" مشارق ششدر رہ گیا تھا۔ فلیز کو اس کی اس سادگی اور بے ضمیری سے گھن آئی۔

"کیا چیز ہو تم ـــ؟ کس قسم کے انسان ہو؟ تمہاری آنکھ میں ذرا بھی شرم نہیں ہے؟ کوئی احساس نہیں ہے؟ مجھ سے نظریں ملا کر بات بھی کیسے کر سکتے ہو تم؟ میرا سامنا کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی گلٹ فیل نہیں ہوتا؟"

"کس گلٹ کی بات کر رہی ہو؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟" مشارق حیران تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور وہ شاکی۔

"کیا اپنے گناہوں کو بھولنا اتنا آسان ہوتا ہے مشارق کیف!ـــ؟" اس نے انتہائی دکھ سے سوال کیا۔ سرہلاتے ہوئے بولی۔ "یاد تو تمہیں سب ہے' لیکن تمہیں لگتا ہے کہ مجھے کسی چیز کی خبر نہیں ہے۔" مشارق ابھی تک دنگ تھا اور وہ بلی تھیلے سے باہر لے آئی۔

"ایک بہت بڑے حادثے کے بعد میں پھر سے کسی پہ اعتبار کرنے لگا ہوں۔ کبھی میرا دل مت توڑنا۔" اس نے اس کے الفاظ اس کے سامنے دہرائے۔ سرہلاتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولی "سب خبر ہے مجھے کہ کس حادثے نے تمہیں اندر تک ہلا دیا تھا۔ تم نے منار کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس کے ساتھ جھوٹی محبت کا کھیل کھیلا۔ اسے استعمال کیا اور پھر اسے ٹھکرا دیا۔ تمہاری بے وفائی میری بہن کی موت کا سبب بنی۔ میں سب جانتی ہوں مسٹر مشارق کیف! مجھے سب خبر ہے۔" مشارق پتھر کا مجسمہ ہوا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اس کے حواسوں پہ مزید بجلیاں گراتے ہوئے بولی۔

"اس رات خودکشی سے پہلے منار نے مجھے فون کیا تھا۔ سب بتا دیا تھا اس نے مجھے تمہارے بارے میں۔ کیسے تم نے اسے محبت کا جھانسا دیا۔ کیسے اس کے

ساتھ کھیل کھیلتے رہے۔ سب کچھ' سب کچھ بتا دیا تھا اس نے۔" مشارق اب سمجھا کہ اسے یہ سب باتیں کہاں سے پتا چلی تھیں۔ پھر بھی وہ حیران تھا۔ ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس نے تم سے کہا کہ یہ سب میں نے کیا ہے اس کے ساتھ..... ؟ میرا نام لیا اس نے؟" مشارق کو یقین نہ آیا کہ منار اس پہ اتنا بڑا الزام بھی لگا سکتی ہے۔ دونوں ہاتھ اپنی کمر پہ رکھ کر اس نے سوچا۔ پھر سر اٹھایا۔ وہ اب خود کو سنبھال چکا تھا۔ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

"وہ میں نہیں تھا۔"

فلیز یہ سن کر تمسخر سے مسکرائی۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم اپنے گناہوں سے صاف مکر جاؤ گے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ ابھی دکھاتی ہوں میں تمہیں۔"

وہ پلٹی اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ مشارق ایک ہاتھ کمر پہ ٹکائے اور دوسرے میں سر کے بال جکڑے سوچنے لگا کہ ایسی کیا چیز تھی فلیز کے پاس۔ فلیز جلد واپس آئی اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ مشارق کی طرف اچھالا۔

"یہ رہا تمہارے گناہوں کا ثبوت۔ دیکھو اسے اور بتاؤ۔ کیسے انکار کرو گے تم منار سے اپنے تعلق کو۔ کیسے جھٹلاؤ گے اس سچائی کو؟" وہ اسے چیلنج کر رہی تھی۔

ادھر مشارق نے نیچے بیٹھ کر فرش پہ گرے کارڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ بیتے لمحے' وہ تمام اذیتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ اس کا دل سینے پہ ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ لب کپکپا رہے تھے۔ وہ اس کارڈ کو پہچانتا تھا۔ اسے یاد تھا یہ کارڈ اس نے کیسے بنوایا تھا۔ اس پہ کیا لکھا تھا۔ اپنی غیر ہوتی حالت کے ساتھ اس نے کارڈ اٹھا کر کھولا۔ اس کے کان بند ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فلیز نے اسے بے بس اور اپنے گناہوں پہ نادم ہو کر روتے پایا تو اس کا اشتعال اور بڑھا۔

"اب بولتے کیوں نہیں؟ کہہ دو کہ یہ سب بھی جھوٹ ہے۔" مشارق نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کی پشت سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کارڈ تمہیں کہاں سے ملا؟" اس نے سوال کیا۔

"کہیں سے بھی ملا ہو۔ تمہاری سچائی تو سامنے آ گئی ناں!"

"وہ میری دی ہوئی چیزوں کو کچرے میں پھینک دیتی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ کارڈ اس نے سنبھال کر کیوں رکھا۔" مشارق خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کی آواز میں دکھ تھا۔ جسے اس نے اپنے غصے میں نظرانداز کیا۔

"تو تم مان گئے ناں کہ تمہارا اس کے ساتھ تعلق تھا۔ تم نے اسے محبت کا فریب دیا تھا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"میں نے فریب نہیں دیا تھا بلکہ تمہاری بہن نے مجھے دھوکا دیا تھا۔" مشارق تڑپ کر احتجاجاً چلایا۔

"منار..... منار تھا اس کا نام۔" وہ غصے سے حلق کے بل چلائی۔ مشارق منار کا نام نہیں لیتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اس کے وجود سے انکار کرتا تھا اور یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"جانتا ہوں۔" مشارق پھر تڑپا۔ "جانتا ہوں کیا تھا اس کا نام..... لیکن نہیں لے سکتا۔" مشارق نے بے بسی سے کہا۔ رکا۔ خود کو سنبھالا۔ پھر ہارے ہوئے لہجے اور آنسوؤں سے بوجھل آواز میں بولا۔ "بہت محبت کرنے لگا تھا میں اس سے۔ بہت پیار سے پکارتا تھا اس کا نام۔ اس کا نام مجھے محبت کا احساس دلاتا تھا۔ اس کا نام لیتا تھا۔ تو جی اٹھتا جیسے..... چار مہینے..... چار مہینے تک اس کے پیار میں پاگل ہوتا رہا میں۔ مگر..... اس نے میرا دل توڑا۔ مجھے ٹھکرا دیا۔ کہا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ وہ صرف میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میرا دل توڑنے کے لیے اس نے میرے ساتھ پیار کا ناٹک کیا تھا۔ بدلہ لیا تھا مجھ سے اپنے ماں باپ کی علیحدگی کا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔ "یہ باتیں

اس نے مشارق سے کہی تھیں۔ اور وہ جھوٹا اور فریبی انسان وہی باتیں منار کا نام لے کر اس کے سامنے دہرا رہا تھا۔ اس کے انکار پر مشارق کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔
"جانتا ہوں کہ تم نہیں مانو گی۔ لیکن سچ یہی ہے، یہی وجہ ہے جو میں اس کا نام نہیں لے پاتا۔ کیونکہ اب اس کا نام مجھے خوشی نہیں دیتا بلکہ ان تمام اذیتوں اور تکلیفوں کو تازہ کرتا ہے جو اس نے مجھے دیں۔ اس کے دیے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ نہیں لے پاتا میں اس کا نام۔"
مشارق نے اپنی لاچاری بیان کی۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔
"آپ کسی کو دل و جان سے چاہیں.... اور وہ آپ کے سامنے کسی اور کو لا کر کھڑا کرے اور کہے کہ تمہارے ساتھ تو صرف ایک ناٹک تھا۔ اصل محبت تو میں اس سے کرتی ہوں تب انسان کے دل پہ کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ ہے تمہیں؟" مشارق نے اس سے پوچھا۔ تلخی سے مسکرا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"نہیں، تم کیا جانو۔ تم نے کبھی کسی کو چاہا ہو تو تمہیں احساس ہو۔"
اس سے برداشت نہ ہوا اور منہ پھیر لیا۔ جسے اس نے چاہا تھا وہی اس سے کہہ رہا تھا کہ اس نے کبھی کسی کو چاہا نہیں۔
مشارق نے اس کے منہ پھیرنے کو کچھ اور سمجھا۔ بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم میری کسی بات کا اعتبار نہیں کر رہیں۔ کیونکہ یہی دھوکا تم نے بھی مجھے دیا ہے، لیکن یقین جانو۔ تم سے پہلے تمہاری بہن بھی میرے ساتھ یہی سلوک کر چکی تھی۔ اسی لیے میں تم پہ اعتبار کرنے سے ڈرتا تھا، مگر مجھے لگا کہ تم سچی ہو۔ تمہاری محبت سچی ہے۔ زرمین نے بھی کہا کہ تمہارا مزاج اپنی بہن سے بہت مختلف ہے، لیکن ہم غلط تھے.... تم نے بھی میرے ساتھ وہی کیا جو تم سے پہلے تمہاری بہن نے کیا تھا۔ ایک نے میرے دل کا خون کیا اور دوسری نے میری زندگی برباد کر دی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ مرنے سے پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ مجھے بتایا تھا کہ تم نے اسے دھوکا دیا ہے۔ تمہاری اسی بے وفائی کی وجہ سے اس نے خودکشی کی۔" وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔
"فار گاڈ سیک، وہ میں نہیں تھا فلیز!" مشارق زچ ہوا۔ "میں نہیں جانتا اس نے تمہارے سامنے میرا نام کیوں لیا؟ شاید وہ جاتے جاتے بھی تمہارے دل میں میرے اور زرمین کے لیے نفرت ڈال کر جانا چاہتی تھی۔ ورنہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اپنی خودکشی سے چھ مہینے پہلے ہی وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال چکی تھی۔ وہ جس ماڈلنگ ایجنسی میں جاتی تھی۔ وہیں کوئی ایڈ فلم میکر تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس سے اس کا تعلق ہر حد پار کر چکا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور یقیناً اس نے اسے دھوکا دیا ہو گا جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی۔"
"تم بہتان لگا رہے ہو میری بہن پہ...." وہ یہ نہیں مان سکتی تھی۔
"بہتان نہیں ہے یہ۔ حقیقت ہے۔ وہ حقیقت جو میں اپنے سامنے بھی کبھی نہ دہرا سکا۔ آج تمہارے سامنے کہہ رہا ہوں تو حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں بھلا تمہاری بہن کے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا جو وہ میری وجہ سے خودکشی کرتی؟ میری محبت کو وہ چھ مہینے پہلے لات مار کر جا چکی تھی۔ میں نے تمہارے گھر جانا تک چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی نہ سنبھل سکا تو امریکا چلا گیا۔
ان چھ مہینوں میں وہ کیا کرتی رہی۔ اس ایڈ میکر کے ساتھ اس کے تعلق میں کیا کیا ٹوئسٹ آئے مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ یقیناً وہ آدمی اسے استعمال کر رہا تھا اور فائنلی اس پہ اس کی حقیقت کھل گئی ہو گی اس لیے اس نے خودکشی کی۔ میرا تمہاری بہن کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو خود اس کا وکٹم تھا۔" مشارق کسی طور نہیں مان رہا تھا اور ایسی باتیں سامنے لا رہا تھا جن کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔ ایسے میں سچائی پرکھنا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس ایڈ فلم میکر کا پتا بتاؤ۔ میں خود اس سے پوچھوں گی۔"

"وہ...." مشارق اٹکا۔ "اس کے پیچھے پولیس پڑ گئی تھی۔ وہ ملک چھوڑ کر بھاگ چکا ہے۔"

اسے شدید جھنجلاہٹ ہوئی۔ جھوٹ' جھوٹ' جھوٹ اور سفید جھوٹ۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا مشارق کے بتائے قصوں میں۔ خود کو بچانے کے لیے وہ جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ اس کی مری ہوئی بہن پہ تہمت لگا رہا تھا۔ وہ سب سمجھ گئی اور اس چھت تلے رکنا اس کے لیے محال ہو گیا۔ مزید کچھ بھی کہے سنے بنا اس نے مڑ کر دیوار کے ساتھ رکھے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور نکل کھڑی ہوئی۔

"فلیز! کہاں جا رہی ہو۔ فلیز!" مشارق اسے پکارتا اس کے پیچھے لپکا مگر وہ نہ رکی۔

☼ ☼ ☼

جب وہ ذاکر اشفاق کے بنگلے پہ پہنچی۔ اس کی ذہنی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی۔ قسمت سے زرمین اور ذاکر اشفاق اسے ہال میں ہی بیٹھے نظر آ گئے۔ اسے یوں اچانک اور تنہا آتے دیکھ کر وہ دونوں چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"فلیز! تم اکیلی کیسے گئیں؟ ڈرائیور لایا ہے یا مشارق چھوڑ گیا ہے؟" زرمین نے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ زرمین کو نظرانداز کرتی تیزی سے چلتی' بنا رکے باپ کے سینے سے جا لگی اور رو پڑی۔

"فلیز! بیٹا کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے نا؟" ذاکر اشفاق نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ڈیڈی! کمرے میں چلیں۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔" اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ذاکر اشفاق نے گھبرا کر زرمین کی جانب دیکھا۔ زرمین بھی فلیز کو یوں روتا دیکھ کر پریشان اور گھبرائی ہوئی تھیں۔ ذاکر اشفاق فوراً سے پیشتر اسے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے پیچھے زرمین کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے مڑی۔

"ڈیڈی! میں مشارق کو چھوڑ آئی ہوں۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" اس نے کہا تو آگے چلتے ذاکر اشفاق ایڑیوں کے بل اس کی جانب گھومے اور زرمین اس سے دو قدم پیچھے ہی اپنی جگہ پہ تھم گئیں۔

"کیا؟ مگر کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" متحیر سے ذاکر اشفاق نے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں ڈیڈی! مجھ سے پہلے مشارق نے منار کے ساتھ بھی افیئر چلایا تھا۔" اس کا کہنا تھا کہ ذاکر اشفاق اور زرمین بری طرح سے چونکے۔ وہ بنا رکے بولتی گئی' مشارق کے منار کو دیے گئے دھوکے' خودکشی سے پہلے منار کی اسے کی فون کال اور منار کے لیے مشارق کا لکھا ویلن ٹائن کارڈ اس پہ چھپی ان دونوں کی تصویر۔ اس نے سب کے بارے میں بتا دیا۔ ذاکر اشفاق تو ذاکر اشفاق۔ زرمین بھی کچھ نہ بولیں۔ دونوں خاموشی سے اسے سنتے رہے۔

"اور وہ نیچ انسان! جانتے ہیں ڈیڈی! آج جب میں نے اس سے اس بارے میں سوال کیا۔ تو وہ صاف مکر گیا۔ کہتا ہے کہ منار کو دھوکا دینے والا وہ نہیں بلکہ وہ ایڈ فلم میکر تھا' جس کے پاس منار ماڈلنگ کے لیے جاتی تھی۔" اس کا کہنا تھا کہ ذاکر اشفاق اور زرمین دونوں چونک گئے۔ بیک وقت بولے۔

"مشارق کو رضاحیات کے بارے میں پتا ہے؟" وہ ان کے اس ری ایکشن پہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"کون رضاحیات؟" اس نے پوچھا۔

"وہی ایڈز میکر جس کے پاس منار جاتی تھی۔" ڈیڈی نے اس کا غائبانہ تعارف کرایا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے تو دکھ اس تہمت کا تھا۔ درد کے ساتھ باپ کو شکایت کرتے ہوئے بولی۔

"ڈیڈی! وہ منار پہ تہمت لگا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ منار کے اس آدمی کے ساتھ تعلقات تھے۔ اپنے کیے پہ اسے ذرا بھی پچھتاوا یا شرمندگی نہیں ہے۔" وہ اب مشارق کی برائی کر رہی تھی۔ ذاکر اشفاق نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس سے پوچھ نہیں لیا۔ منار نے رضا حیات کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔"

ڈیڈی کے منہ سے نکلے الفاظ سن کر وہ دنگ رہ گئی۔

ڈیڈی نے اس کی کسی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ وہ مشارق کا دفاع کر رہے تھے۔ وہ پہلے حیران ہوئی۔ پھر زرمین کی جانب دیکھا۔ اس کے آنے سے قبل مشارق نے زرمین کو فون کر کے بتا دیا تھا اور زرمین نے ذاکر اشفاق کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ فوراً" وہ یہی سمجھی۔ ذاکر اشفاق کی جانب رخ واپس گھمایا۔

"یہ جھوٹ ہے ڈیڈی۔۔۔! ان سے کہیں کہ اگر ایسا ہے تو اس بات کا ثبوت لائیں۔" ہاتھ سے اشارہ زرمین کی جانب کیا۔ زرمین کو اب احساس ہوا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔ زرمین کا منہ کھل گیا اور ہاتھ کھلے منہ پہ جا ٹکا۔ ڈیڈی کی نظریں بھی اس کے اشارے پہ بلا ارادہ زرمین کی جانب اٹھیں۔ پھر واپس اس کی جانب دیکھ کر بولے۔

"ثبوت چاہیے تمہیں۔۔۔ میں دیتا ہوں تمہیں ثبوت۔" ڈیڈی کہہ کر مڑے۔ دیوار گیر الماری تک گئے۔ سیف کھول کر اس میں سے ایک اے فور سائز کا لفافہ نکالا اور واپس اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"یہ ہیں ثبوت۔" ڈیڈی نے لفافے میں سے کاغذات، تصویریں اور ایک سی ڈی نکال کر اس کے سامنے لہرائی۔ پھر سب اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

"یہ وہ تصاویر، ٹیکسٹ میسجز کے پرنٹس، کارڈز اور وہ رقعے ہیں جو منار نے رضا حیات کو لکھے تھے۔

اس سی ڈی میں منار اور رضا حیات کے ویڈیو کلپس ہیں۔ اور۔۔۔" ذاکر اشفاق نے لفافے میں سے ایک کلیئر پلاسٹک کی باریک سی فائل نکالی۔

"یہ منار کی پریگنینسی رپورٹ۔" انہوں نے وہ فائل بھی اس کے قدموں میں ڈال دی۔

"سب خود دیکھ لو، پڑھ لو اور بتاؤ۔ ہے کوئی جھوٹ اس میں؟" وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کی نظریں اپنے قدموں میں پڑے ان کاغذات اور تصویروں پہ گڑی تھیں۔

"اپنی زندگی میں منار نے ہمیں بھی کچھ پتا نہیں چلنے دیا کہ وہ کس سے ملتی ہے، کیا کیا کرتی ہے۔ صرف مشارق کے ساتھ اس کے تعلق کی خبر تھی۔ کیونکہ مشارق نے زرمین کو اس بارے میں بتایا تھا۔ وہ بھی صرف ایک فریب تھا۔ منار نے صرف مشارق کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ منار نے خودکشی کیوں کی تھی، کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ تو جب اس کی موت کے بعد رضا حیات مجھے منار کی تصاویر اور ویڈیوز بھیج کر بلیک میل کرنے لگا تو مجھ پہ حقیقت کھلی۔ تم جانتی ہو وہ ویڈیوز اور تصاویر کیسی تھیں؟"

ذاکر اشفاق نے اس سے سوال کیا اور شرم سے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ فلیز یہ سن کر حیران تھی۔

"تب میں نے منار کے کمرے کی تلاشی لی۔ مجھے اس کی پریگنینسی رپورٹ اور وہ فون ملا جو اس نے ہم سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ اس میں موجود ٹیکسٹ میسجز سے ساری حقیقت کھلی۔ منار نے اسے گھر کے حالات کے بارے میں سب بتا رکھا تھا۔ اس کی مجھ سے ناراضی، زرمین کے لیے نفرت اور مشارق کے ساتھ جو کھیل کھیلا تھا۔ سب اس کے کہنے پہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ آدمی صرف اسے استعمال کر رہا تھا۔ صرف اس کا فائدہ اٹھا رہا تھا اور جب اسے پریگننٹ کر کے چھوڑ دیا تو منار کے پاس کوئی راستہ نہ بچا سوائے خودکشی کے۔" وہ سمجھتی تھی کہ منار کی خودکشی کا راز صرف اُسے معلوم ہے اور اگر کوئی مکمل طور پر انجان ہے تو وہ اس کا باپ ہے۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں تھی اور ذاکر اشفاق سب سے زیادہ جانتے تھے، جو کہہ رہے تھے۔

"تب میں نے رضا حیات کے بارے میں بھی تحقیق کروائی۔ اس کے بارے میں تمام معلومات اکٹھی کرائیں اور پولیس کو اس کی رپورٹ کر دی۔ اور اس سے پہلے میں نے اس کے آفس سے منار کی تمام نشانیاں مٹوا دیں تاکہ منار کی کوئی چیز منظر عام پر نہ آئے۔ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا اور میں نے یہ ثبوت سنبھال کر رکھے ہیں تاکہ جب کبھی بھی وہ واپس آئے گا

اور کچھ نہیں تو میں تو اس سے اپنی بیٹی کے خون کا حساب ضرور لوں گا۔"

ذاکر اشفاق نے بتایا تو اس کے ذہن میں سب واضح ہو گیا کہ کب کیوں کیا اور کیسے ہوا۔ وہ ذاکر اشفاق اور مشارق۔ تینوں اپنی اپنی جگہ منار کی موت کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی دوسرے کو کوئی خبر نہیں۔

"اور تم فلیز۔" ذاکر اشفاق کو اب اس سے شکایت ہوئی۔

"اگر تمہیں منار نے مرنے سے پہلے کال کر کے کچھ کہا تھا تو مجھ سے اس بارے میں بات کیوں نہ کی۔۔۔؟ بلاوجہ اس بے قصور انسان کو مجرم سمجھتی رہیں جس سے اصل میں منار نے اپنے ماں باپ کی علیحدگی کا انتقام لیا تھا۔"

اسے مشارق کے ساتھ کی گئیں اپنی زیادتیاں یاد آرہی تھیں۔ اسے سخت ندامت ہوئی۔

"لیکن ڈیڈی! مشارق اور منار کے درمیان کبھی کوئی تعلق بھی رہ چکا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا؟" اس کی شکایت بجا تھی۔ ذاکر اشفاق الٹا اس سے پوچھنے لگے۔

"کیا بتاتا؟ اپنی مری ہوئی بیٹی کی برائی کرتا؟ کہ کیسے وہ ایک غیر آدمی کے کہنے میں آکر یہ سب حرکتیں کرتی تھی۔۔۔؟ یا یہ کہتا کہ جس سے تم شادی کرنے جا رہی ہو اس کا پہلے تمہاری بہن کے ساتھ ایک بے بنیاد اور بے معنی سا تعلق تھا۔ اس میں ایسا کیا تھا بتانے والا؟

اور کیا فرق پڑتا یہ بتانے سے؟ حالانکہ مشارق تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کیا تھا کہ جن باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ان کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی ایسا واقعہ تو نہ تھا کہ تم دونوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا۔ بس تمہاری خوشی ویسی مکمل اور خالص نہ رہتی۔۔۔ تمہاری خوشیوں میں بال نہ آئے اس لیے تم سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مرنے سے پہلے منار تمہیں فون کر کے تم سے کچھ کہہ چکی ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہوتا تو میں سارا معاملہ کلیئر کر دیتا۔"

ان تمام تکلیف دہ حقائق کو دہرانے کے بعد ذاکر اشفاق بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ تمام باتیں صاف ہو چکی تھیں۔ اب ان سے مزید نہ رکا گیا اور وہ کمرے سے نکل گئے۔ وہ ہاری ہوئی سی اپنے قدموں پہ بیٹھ گئی۔ منار کی موت ۔۔۔ کے پیچھے ایسے تلخ حقائق تھے جنہوں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صدمے کے سے عالم میں اس نے سامنے پھیلی ان تصاویر اور کاغذات کو دیکھا۔ پھر ایک کاغذ اٹھایا۔ وہ منار کے ٹیکسٹ میسجز کا پرنٹ تھا۔ رضا حیات کو منانے کے لیے منار کے منتوں بھرے ٹیکسٹ۔ اس آدمی نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اسے استعمال کیا تھا۔ اور اسے بھی فون کر کے اس نے یہی کہا تھا۔ اس نے اسے نام نہیں بتایا تھا۔ پھر کیسے اس نے سمجھ لیا کہ وہ صرف مشارق ہی ہو سکتا تھا کوئی اور نہیں۔

"ایک بہت بڑے حادثے کے بعد میں پھر سے کسی پہ اعتبار کرنے لگا ہوں۔ کبھی میرا دل مت توڑنا۔"

اسے مشارق کی وہ التجا یاد آئی۔ اور اس نے مشارق کا دل توڑا تھا۔ بار بار۔

اس کاغذ کو مٹھی میں دبوچ کر وہ بے طرح رو دی۔ اس کے شانے پہ ہلکا سا دباؤ پڑا تو اس نے سر اٹھایا۔ زرمین اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ نرمی سے بولیں۔

"فلیز! رشتہ کوئی بھی برا نہیں ہوتا بیٹا! یہ تو انسان کی اپنے اندر کی برائی ہوتی ہے، جو رشتوں کا چہرہ بگاڑ دیتی ہے۔ اور سب انسان ایک سے تو نہیں ہوتے۔۔۔

سوتیلی مائیں سوتیلے بچوں کی دشمن ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کا مقابلہ اپنے بچوں سے کرتی ہیں۔ جبکہ میری کوئی اولاد نہیں۔ ذاکر کے اور میرے بہن بھائیوں کے بچے ہی میرے بچے ہیں۔ زرمین اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہی تھیں۔ اس کے غم سے بھرے دل میں احساس ندامت جاگا۔

"زرمین! آئم سوری۔"

وہ جھٹ سے زرمین کے گلے لگ کر مزید شدت سے رونے لگی۔ اس نے منار کی طرح زرمین کو زرمین

میڈم نہیں کہا تھا۔ پہلے کی طرح زرمین آنٹی نہیں کہا تھا۔ بلکہ مشارق کی طرح اسے زرمین کہہ کر پکارا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مشارق اپنی محبت اور اپنائیت جتانے کے لیے اسے پکارتا تھا۔ زرمین سرشار سی ہو کر اس کی پیٹھ سہلانے لگیں۔ منار کے دل سے تو وہ کبھی بغض نہیں نکال سکی تھیں مگر انہوں نے فلیز کا اعتماد جیت لیا تھا۔

☆ ☆ ☆
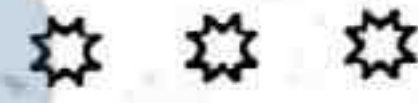
شام کے پانچ بج رہے تھے جب وہ گھر واپس آئی۔ معلوم ہوا مشارق گھر پر نہیں تھا۔ اس نے فکرمند ہو کر زرمین کو کال کی۔

"فکر نہ کرو۔ میں اسے ڈھونڈتی ہوں۔ اسے کہوں گی کہ وہ جہاں بھی ہے فوراً گھر جائے۔"

زرمین نے اسے تسلی دی تو وہ جلدی سے بولی۔

"لیکن زرمین! اسے میرا نہ بتایئے گا پلیز۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔"

زرمین بنا کوئی سوال کیے بولیں "ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ اور تم سے بھی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں فلیز!"

"جی کہیے۔" اس نے کہا۔

"اس کے سامنے منار کا نام نہ لیا کرو۔ منار اس کی محبت تھی۔ جس سے اسے سوائے اذیت کے اور کچھ نہیں ملا جبکہ تم اس کی خوشی ہو۔" اس نے سر ہلایا۔ وہ اب یہ بات سمجھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

پریشان حال مشارق زرمین کے سمجھانے بجھانے اور حوصلہ دینے پر گھر لوٹا۔ فلیز کی گاڑی کھڑی دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا کہ فلیز گھر واپس آچکی ہے۔ زرمین نے اسے بتایا تھا کہ فلیز نے گھر جا کر اپنے باپ سے اس کی شکایتیں کی تھیں۔ اس کے بعد باپ بیٹی کس نتیجے پر پہنچے اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ ذاکر اشفاق جانتے تھے کہ منار کا مجرم وہ نہیں تھا۔ پھر بھی اپنی مرحوم بیٹی پہ لگائی گئی تہمتوں پہ ان کا ردعمل کتنا شدید ہو سکتا ہے۔ اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ شاید اسی بارے میں باز پرس کرنے فلیز انہیں ساتھ لے کر آئی تھی۔ ورنہ وہ خود اتنی جلدی واپس کیسے آتی؟ وہ پریشان ہونے لگا کہ ذاکر اشفاق کے سوالوں کے جواب کیسے دے گا۔ اپنی صفائی بیان کرنے کے لیے اس نے فلیز کو تو بتا دیا تھا مگر اب خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے ایک مری ہوئی لڑکی کے کردار پہ بار بار کیچڑ نہیں اچھال سکتا تھا۔ اور اگر خاموش رہتا تو اس کا گھر ٹوٹ جاتا۔ اسی مشکل میں گھرا وہ گھر کے اندر آیا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا اور ملازمہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔ پاس آکر بولی۔

"فلیز میڈم اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"کون ہے ان کے ساتھ؟" اس نے ملازمہ سے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔" ملازمہ کے جواب پہ وہ الجھ گیا۔ فلیز واپس کیوں آئی تھی؟ اور اس کا انتظار کیوں کر رہی تھی؟

وسوسوں میں گھرا وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ پورے کمرے میں سرخ گلابوں کا کارپٹ بچھا تھا۔ جگہ جگہ موم بتیاں جلا کر سجایا کمرہ گلابوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ اس کایا پلٹ پہ حیران رہ گیا۔ کمرا چونکہ خالی تھا تو وہ دروازہ بند کرتا حیران سا دو قدم چل کر آگے آیا۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ خوب صورتی سے سجی اودے لباس میں ملبوس فلیز اس کے سامنے آئی وہ اس لباس کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ وہی لباس تھا جو اس نے فلیز کے لیے لیا تھا مگر کبھی اسے دے نہ سکا تھا۔ اسی طرح ڈبے میں بند اس کی الماری میں دھرا تھا۔ اور آج فلیز نے پہن لیا تھا۔ فلیز کچھ نروس اور شرمندہ سی دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب آرکی۔

"دیکھو! میں نے تمہارا لایا ہوا ڈریس پہنا ہے۔ اچھا لگ رہا ہے ناں؟"

لہجے میں بشاشت لانے کی کوشش تو کی تھی مگر احساس ندامت آڑے آرہا تھا۔ اس پہ خوف بھی کہ جانے مشارق اسے معاف کرے گا یا نہیں، اس کا

اعتماد متزلزل کر رہا تھا۔

مشارق ضبط کی کوشش میں نچلا ہونٹ چبانے لگا۔

فلیز کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔ اسے ذاکر اشفاق اور زرمین نے یقین دلا دیا تھا کہ منار کی موت کا ذمے دار وہ نہیں تھا۔ زرمین نے جان بوجھ کر یہ بات اس سے چھپا کر اسے گھر بھیجا تھا تاکہ فلیز اسے یہ سرپرائز دے سکے۔

"ہاں۔ مگر۔" وہ بھی کچھ ہچکچایا بولتے ہوئے اٹکا۔ پھر اس سے درخواست کرتے ہوئے بولا۔ "تم یہ لباس فوراً" تبدیل کر دو فلیز!"

فلیز نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیا وہ اسے معاف کرنے کو تیار نہ تھا؟

"کیونکہ یہ رنگ بہت ان لکی ہے۔ تم جب بھی یہ رنگ پہنتی ہو، تمہارے ساتھ کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔"

مشارق نے اپنی بات مکمل کی تو اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ تو اس لیے کہہ رہا تھا مشارق۔ جب پہلی بار وہ اور مشارق آمنے سامنے ہوئے تھے۔ وہ اودے رنگ کے لباس میں تھی اور اس کے پاؤں میں کانچ چبھ گیا تھا۔ دوسری بار جب اس نے مشارق کی موجودگی میں وادی نیلم میں یہ رنگ پہنا تھا تو اسے ہائپو تھیرمیا ہو گیا تھا۔ اور تیسری بار وہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ مشارق کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا کہ وہ جب بھی یہ رنگ پہنتی ہے اس کے ساتھ حادثہ پیش آجاتا ہے۔ فلیز اس کی کیفیت سمجھ گئی اور بولی۔

"تم کہتے ہو کہ یہ رنگ ان لکی ہے۔ جبکہ میں تو اسے لکی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میں جب بھی یہ رنگ پہنتی ہوں، خود بخود تمہاری بانہوں میں آجاتی ہوں۔"

فلیز کی بات بھی درست تھی۔ پہلی بار جب وہ پاؤں میں کانچ چبھنے سے گرنے لگی تھی تب مشارق نے اسے تھاما تھا۔ دوسری بار ہائپو تھیرمیا کی وجہ سے وہ گرنے لگی تھی۔ تب بھی اس نے اسے بانہوں میں اٹھا لیا تھا۔ اور تیسری بار بھی وہ سیڑھیوں سے گر کر اس کی بانہوں میں آئی تھی۔ فلیز کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی اور مشارق یہ سن کر بے ساختہ مسکرایا۔

فلیز اب نہ رہ سکی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے قدموں میں بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مجھے معاف کر دو مشارق! میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تمہارا دل دکھایا۔ میں نے تم سے سچا پیار کیا تھا۔ میری محبت فریب نہیں تھی۔ لیکن جب مہندی کی رات مجھے تمہارا وہ کارڈ ملا تو میں غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔"

اس کے قدموں سے لپٹ کر روتے ہوئے اس نے ساری بات کہہ دی۔ مشارق کے دل سے تمام سوال، تمام درد مٹ گئے۔ اس نے جھک کر روتی ہوئی فلیز کو شانوں سے تھاما تو فلیز نے رونا بھول کر اچانک سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

پیر میں کانچ چبھتے وقت، ہائپو تھیرمیا کے وقت، سیڑھیوں سے گرتے وقت اور آج بھی۔ جب جب وہ تکلیف میں ہوتی تھی، یہی مسیحا اس کے سامنے، اس کے قریب ہوتا تھا۔

"مشارق!"

اس کے لب ہلے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے پہلے دو بار اس نے اسے پکارا تھا۔ صرف اس ایک پکار میں اس کی مکمل التجا تھی۔

"میرے مسیحا! میں تکلیف میں ہوں۔ مجھے بچالو۔"

مہربان مسکراہٹ کے ساتھ اس کے مسیحا نے اسے اوپر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پہ ٹھہرے آنسو اپنے ہاتھوں سے چنے تو وہ بڑھ کر اس کی بانہوں میں سما گئی۔

اس نے کہا تھا کہ وہ جب بھی یہ رنگ پہنتی ہے۔ خود بخود اس کی بانہوں میں آجاتی ہے۔ درست کہا تھا اس نے، وہ اس کی بانہوں میں آگئی تھی۔ اس نے گہرے اطمینان اور مکمل خوشی کے ساتھ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ کیوں کہ فلیز اس کی خوشی تھی۔

رابعہ افتخار

چاند کو دیکھ کر

گھر میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ رمضان المبارک کی آمد آمد تھی، ہر کسی کو اپنے اپنے حساب سے شاپنگ لسٹ بنوانی تھی۔ وہ دادی کے پاس بیٹھی سارے گھریلو سامان کی لسٹ بنانے میں مصروف تھی جب تائی چلی آئیں۔

"سنو صبا.... وہ پانچ کلو میدہ بھی لکھ دو.... ہانیہ روز میدے کا پراٹھا کھاتی ہے ناسحری میں اور وہ.... صندل اور الائچی کے شربت لکھنا مت بھولنا.... ہائے ہائے اتنی گرمی ہے خدا کی پناہ...." وہ آرام سے دادی کے پاس تخت پر بیٹھ گئیں۔

"تائی میں نے لکھ دیا ہے۔ وہ بادام کی کھجور کے پیکٹ لکھوں یا الگ سے بادام لکھ دوں، گھر میں بنالیں گے کھجور۔"

"آئے ہائے رہنے دو.... جو بازار سے بادام والی کھجور ملتی ہے نا! اس کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے.... یہ لمبی لمبی کھجور اور بڑا بڑا بادام۔"

وہ دادی کی گود سے سبزی کی ٹوکری لے کر خود بنانے لگیں۔

"سنو ذرا! ایوب کے کمرے میں جاؤ اور اس سے پوچھو کہ اسے تو کچھ نہیں منگوانا۔" انہیں اپنے بڑے بیٹے کا خیال آیا۔

"جی تائی۔" وہ پاؤں میں چپل اڑس کر ایوب سلیمان کے کمرے کی طرف چل دی، اس نام سے دل کی دھڑکن نہ جانے کیوں بڑھ جاتی تھی اور ایسا تب سے تھا جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی، تب اسے ایوب نامی لمبے سے لڑکے سے ڈر لگتا تھا اور اب دل کے دھڑکنے کا سبب کچھ اور تھا۔

دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو وہ کمپیوٹر پر کوئی کام کرنے میں مصروف تھا، کام تو اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دادا جان کے بزنس کو تایا جان اور بابا نے سنبھالا اور ایوب نے اسے ترقی کی بلندی پر پہنچا دیا۔

"ایوب بھائی....! وہ تائی امی پوچھ رہی ہیں کہ رمضان کی لسٹ بنا رہے ہیں کچھ چاہیے آپ کو؟؟"

"ہوں...." وہ اس کی آواز پر چونکا۔ ہلکے رنگوں کے پرانے سے سوٹ میں جو شاید ہانیہ کا ہی تھا، وہ بہت سادہ مگر معصوم لگ رہی تھی۔

"ہاں....! نہیں کچھ نہیں.... تمہیں پتا ہے میں سب کچھ کھالیتا ہوں.... سنو...." اس نے کام سے سر اٹھا کر بہت غور سے اسے دیکھا۔

"تمہیں کچھ پسند ہے؟؟"

"نہیں....! آپ کو پتا ہے میں بھی سب کچھ کھالیتی ہوں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر نکل گئی۔

اس گھر میں بہت افراد تھے، دادی، تایا ابو، تائی امی، ایوب بھائی، زہرہ آپا، فریدون، ہانیہ، بابا، امی اور پھر امی کے چلے جانے کے بعد ماما آگئیں.... ماما کی گود میں انوشے آئی تو صبا کہیں پس منظر میں ہی چلی گئی، پھر بابا اور ماما انوشے کو لے کر انگلینڈ چلے گئے اور وہ وہیں ددھیال میں ہی رہ گئی۔ شروع شروع میں بابا اس کے نام پر رقم بھیجتے رہے پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ انوشے بڑی ہو گئی تھی اور اس کی پڑھائی کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے صبا کے لیے

رقم بھیجنی بند کردی۔ لاشعوری طور پر ہی، لیکن گھر کے افراد کا رویہ بھی اس کے ساتھ ویسا نہ رہا، جیسا امی اور بابا کی موجودگی میں تھا۔ وہ تین سال کی تھی جب امی اور بابا نے اسے یتیم خانے سے گود لیا تھا، تب سے وہ ایوب سلیمان کی شخصیت سے متاثر تھی۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ذہین طالب علم تھا۔ دراز قد، صحت مند، متناسب جسامت، بھاری آواز اور اس پر سنجیدگی۔ وہ جیسے جیسے عمر کی منازل طے کرتا گیا اس کی شخصیت کا یہ تاثر اور بھی سحر انگیز ہوتا گیا۔ صبانور کو پتا ہی نہ چلا کہ کب ایوب سلیمان نے زندگی میں سب سے اہم مقام حاصل کرلیا۔

☆ ☆ ☆

سب لوگ ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ رویت ہلال کمیٹی کچھ ہی دیر میں چاند کے نظر آنے یا نہ آنے کے بارے میں اعلان کرنے والی تھی۔ وہ سب کے

لیے چائے بنا کر لائی جب چاند کے نظر آنے کی خبر چلنے لگی، خوشی کی لہر دوڑ گئی، سب ایک دوسرے کو رمضان کی مبارک باد دینے لگے۔

"سنو صبا... صالحہ سے پوچھ کر سحری کے لیے آٹا بھی گوندھ دو اور خاگینہ بھی تیار کر کے رکھ دو... وہ فریدون اور ہانیہ تو قیمہ ہی کھائیں گے، ہری مرچ ڈال کر قیمہ بھی یاد سے بھون دینا... سنو... دہی بھی گھر پہ ہی جما دو... سحری تک تیار ہو دہی۔" دادی کا ہدایت نامہ شروع ہو گیا اور وہ جی اچھا کہہ کر کام میں لگ گئی۔

تمام کام نبٹاتے، وقت کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ تمام سامان فریج میں رکھ رہی تھی، جب کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ ایوب سلیمان سر پہ نماز کی ٹوپی رکھے دروازے میں کھڑا تھا۔

"تراویح پڑھ کر آ رہا ہوں، تمہیں کچن میں دیکھا تو چلا آیا... کوئی ہیلپ کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"جی نہیں، بہت شکریہ۔" اس کا دل تو ایوب سلیمان کو دیکھ کر عجیب ہی لے پہ دھڑکنے لگتا تھا۔

"میں فارمیلیٹی نہیں نبھا رہا ہوں سچ میں پوچھ رہا ہوں۔" وہ دو قدم آگے بڑھ کر فریج کا جائزہ لینے لگا۔ ہر شے تیار کر کے ایر ٹائٹ جار میں محفوظ کر کے اس نے قرینے سے فریج میں رکھ دی تھی۔

"ایک بات تو ماننی پڑے گی صبا... تمہاری امی کوئی بہت ہی سلیقہ شعار خاتون ہوں گی۔" وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا مگر اس کی اس تعریف نے اس کے چہرے کا رنگ ہی تبدیل کر دیا۔

"اوہ...! آئی ایم سوری...!"

"نہیں، جو سچ ہے وہ تو ہے اور وہ جو کوئی بھی تھیں، آپ نے ان کی تعریف ہی کی ہے اور ماں کی تعریف کسے بری لگتی ہے چاہے میں نے انہیں نہیں دیکھا، مگر وہ میری ماں تو ہیں۔" وہ آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکی۔

"ہوں... چلو اگر موڈ ہو تو دو کپ چائے بنا لو، لان میں جا رہا ہوں میں۔" وہ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

اس نے ایک کپ چائے بنائی اسے دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ایوب جانتا تھا وہ بہت لیے دیے رہتی تھی، اس کے اور فریدون کے ساتھ تو پھر بات چیت کر لیتی تھی، اگر کوئی اور آ جاتا تو خود کو کچن کی حد تک محدود کر لیتی۔ وہ بہت با کردار اور با سلیقہ لڑکی تھی۔

☆ ☆ ☆

چپس کے فرش پر سرف پھینک کر جھاڑو سے رگڑ رگڑ کر فرش دھوتے ہوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا، وہ مڑی تو ایوب کو دیکھ کر ڈر گئی۔

"آج پہلا روزہ ہے، گرمی ہے اور تم کام کر رہی ہو، روزہ رکھ کر بلکہ سب کو سحری کروا کر تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ایوب بھائی، میں ٹھیک ہوں... مجھے کام میں مزہ آتا ہے اور ویسے بھی اگر کام نہیں کروں گی تو اور کیا کروں گی؟" وہ وائپر لگاتے ہوئے بولی، پانی کا پائپ اس نے دائیں طرف لگی بوگن ویلیا کی کیاری میں پھینک دیا، پیاسی زمین سیراب ہونے لگی۔ ایوب نے بہت غور سے زمین میں پانی جذب ہوتے دیکھا۔ اس لڑکی کا دل بھی تو بالکل اس زمین جیسا تھا نا... پیاسا، محبت کو ترسا ہوا۔

"مگر تم بہت زیادہ کام کرتی ہو صبا... اپنی صحت دیکھو پہلے..."

"بہت گندہ ہو رہا تھا کار پورچ... آپ سب کی موٹر سائیکلیں اور تایا ابو کی گاڑی کے ٹائرز سے اتنا گندہ لگ رہا تھا فرش۔"

"تم خود کو ملازمہ بناؤ گی تو سب بھی تمہیں ملازمہ ہی سمجھیں گے۔ تمہارا بھی حق ہے صبا... جیسے ہانیہ اور انوشے کا حق ہے۔"

"حق؟" وہ وائپر چھوڑ کر ایوب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کیسا حق ایوب بھائی...! میں تو آپ لوگوں کا خون نہیں ہوں، میں تو کسی کی کچھ نہیں لگتی... ایک خلا کو پر

کرنے کے لیے میں اس گھر میں آئی۔۔۔ ایک عمارت کی اینٹ کم تھی‘ میں وہ اینٹ بن کر آئی۔۔۔ جب عمارت ہی نہ رہی تو۔۔۔ اور ابو کو تو مل گئی نا انوشے۔۔۔ ان کا اپنا خون۔۔۔“ وہ اس طرح سوچتی تھی‘ ایوب کے دل کو کچوکا لگا۔

”تم ہماری اپنی ہو صبا۔“

”آپ سمجھتے ہیں‘ یہ آپ کا بڑا پن ہے ایوب بھائی ورنہ اپنا خون تو اپنا ہی ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ابو انوشے کے پاس نہیں‘ یہاں میرے پاس ہوتے۔۔۔ انہیں ابو کہہ کر بلانا میں نے پہلے شروع کیا تھا‘ باپ ہونے کا احساس میں نے دلایا تھا۔۔۔ چھوڑیں ایوب بھائی۔۔۔ آبلے مت پھوڑیں‘ آبلہ پھوٹ جائے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔“

”خوش رہا کرو صبا۔۔۔“ ایوب کا دل تھم سا گیا۔ دل میں عجیب سا درد جاگا اس لڑکی کے لیے۔

”یہ سب خوش رہنے کے لیے ہی تو کرتی ہوں‘ زندگی کا حصہ ہیں یہ کام میرے لیے۔“

”اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو ٹھیک ہے‘ میں نہیں روکوں گا مگر خوش رہنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔“ وہ بات مکمل کرکے آگے بڑھ گیا۔

صبا نے اس کی چوڑی پشت کی سمت دیکھا۔۔۔ وہ کیوں اتنی فکر کر رہا تھا اس کی۔

سارے گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد اس نے استری لگائی۔ سب کے کپڑے استری کرکے ہینگر کیے پھر کچن میں گھس گئی‘ افطاری کے لیے بھی سب کی اپنی اپنی فرمائش تھی۔ کسی کو دہی بڑے پسند تھے تو کسی کو فروٹ چاٹ‘ کسی نے چکن رول کھانے تھے تو کسی نے کباب۔ ہر کسی کی پسند کا خیال رکھنا تھا۔ تائی امی اور ہانیہ تو سو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ افطاری سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی اٹھیں گی۔

عصر کی نماز ادا کرکے دادی ماں کا پرہیزی کھانا بھی تیار کردیا۔ وہ برآمدے کے تخت پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی جب ایوب اس کے پاس آ رکا۔۔۔ اس نے رکوع پورا کرکے قرآن پاک کو سینے سے لگایا اور نظر اٹھا کر دیکھا۔

”تم اللہ کے کتنے نزدیک ہو صبا۔۔۔ بالکل معصوم۔۔۔ سب کو خوش رکھتی ہو۔ وہ تم سے بہت خوش ہوگا۔۔۔ تم اپنے حصے کی خوشیاں کیوں نہیں مانگ لیتیں۔“

”مانگتی ہوں۔۔۔ جب وقت آئے گا اور نصیب میں ہوں گی تو مل جائیں گی ورنہ مجھے کوئی گلہ نہیں۔۔۔ میں ایسے بھی خوش ہوں۔“ وہ ایسی ہی تھی صابر و شاکر‘ ایوب سلیمان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور وہ چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

عصر سے کچھ دیر پہلے چپس کے دھلے دھلائے چمکیلے فرش پر کرسیاں بچھا کر درمیان میں میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ سجا کر وہ باورچی خانے میں گھس گئی‘ گھر کے افراد کے حساب سے افطاری کی تیاری ابھی سے کرتی تو وقت پر فارغ ہوتی۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے اس نے ایوب کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا‘ موبائل اس کے کان سے لگا تھا‘ چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید گرمی کا روزہ ہے اور روزہ ہی لگ رہا ہے۔ اس نے ایوب کی پسند کے چکن سموسے بنانے کی تیاری شروع کردی‘ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا‘ صاف ستھرے اور خوشبودار ماحول کا اثر تھا کہ موبائل کان سے ہٹاتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی‘ پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے زور زور سے اسے آواز دینا شروع کردی۔

”صبا۔۔۔ صبا۔۔۔“

”جی! جی ایوب بھائی۔۔۔“

”اُفوہ۔۔۔!“ اس کے ایوب بھائی کہنے پر وہ پہلی بار اندر ہی اندر چڑا تھا۔

”افطاری میں میرے لیے کیا بنا رہی ہو؟“ اس سے بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

”چکن سموسہ اور دہی بڑے۔“ اس نے بتایا۔

”ہوں‘ ٹھیک ہے۔۔۔ سنو صبا!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے پھر مسکرانے لگے۔

"وہ میرا دوست ہے آفاق... اس کی والدہ آنا چاہ رہی ہیں ہانیہ کے لیے... تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ شاید اسی لیے خوش تھے کہ بہن کے لیے اتنے اچھے گھرانے کا رشتہ آیا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں' آپ کو بہتر اندازہ ہوگا' بھائی ہیں آپ ہانیہ کے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں تم بھی تو لڑکی ہو اور ایک لڑکی اپنی شادی کے لیے کس طرح کے لڑکے کو پسند کرتی ہے' اس کا مجھے کیا اندازہ' تم بتاؤ نا... آفاق کو دیکھا ہے نا تم نے... پڑھا لکھا ہے' اچھی جاب ہے' اپنی ذاتی رہائش ہے' فی الحال اس کے پاس موٹر سائیکل ہے' مگر ایک دو مہینے تک گاڑی لینے کا ارادہ ہے اس کا۔"

"ہر کسی کا معیار مختلف ہوتا ہے ایوب بھائی' مجھے کیا پتا کہ ہانیہ کو کیسا شوہر چاہیے... اگر آپ مجھ سے ایک لڑکی کی خواہش اور پسند پوچھ رہے ہیں تو مجھے تو بس وہ چاہیے جو مجھے اپنا نام دے اور رہنے کے لیے چھت... مجھے یہ ڈر نہ ہو کہ میرا کوئی نہیں...." یہ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ایوب نے دیکھا' کتنی محرومی تھی ان آنکھوں میں' واقعی آج تک صبا اپنا پورا نام نہیں لیتی تھی' پڑھائی کے لیے فارم پر بھی چاچو کا نام سرپرست کے خانے میں ہی لکھا جاتا تھا۔

"صبا... صبا... صبا ایوب۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے اس کے نام کو مکمل کیا تھا اور پھر زیر لب مسکرایا تھا۔

"ایوب بھائی! ہانیہ کے لیے رشتہ آرہا ہے یہ تو خوشی کی بات ہے پھر مجھے ایسا کیوں لگا کہ آپ پریشانی میں فون سن رہے تھے۔" وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں... وہ آفاق نے جب رشتے کی بات چھیڑی تو میں سمجھا کہ وہ تمہارے لیے... آنا چاہ رہے ہیں۔"

اس کی بات پر صبا نے حیرت سے ایوب کی طرف دیکھا۔

وہ اتنا مکمل شخص اسے اپنے سامنے اتنا ادھورا کیوں لگ رہا تھا' کیوں اس کے چہرے پر صبا کو دیکھ کر عجیب سے رنگ چمکنے لگتے تھے۔

"میں... کام کے سلسلے میں باہر جارہا ہوں... افطاری سے کچھ دیر پہلے آجاؤں گا' تم جاؤ کچن میں۔" وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر نکل گیا۔ صبا کتنے ہی لمحے اس کی بات پر غور کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کی دیواروں پر آویزاں قل کے فریم کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا' تائی موبائل ہاتھ میں لیے دادی کے سرہانے کھڑی تھیں' معاملہ گمبھیر لگ رہا تھا۔

"انوشے اور ایوب؟" دادی کا لہجہ سوالیہ تھا۔

اس کے قدم میز پر لڑکھڑائے۔ تائی نے مڑ کر اسے دیکھا اور دوبارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس کی سانس جیسے ساکن ہوگئی' خوابوں کے پرندے کہیں فضاؤں میں ہی معلق ہوگئے۔

"ایوب سے پوچھنا پڑے گا' بہت فرق ہے ایوب اور انوشے میں... آٹھ نو برس کا... پھر ایوب کا مزاج ملا جلا ہے' کبھی سنجیدہ تو کبھی بے تکلف... اور وہ انوشے... اکھڑ مزاج...." تائی بڑبڑاہٹ کے انداز میں بولیں' وہ چاہ رہی تھیں کہ دادی فون پر ہی انکار کردیں۔

وہ کپڑا لے کر چھلانگ لگا کر میز سے اتری اور بے حس و حرکت تائی کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

"برداشت نہیں ہوا میری ہانیہ کا رشتہ' غلطی میری ہی ہے ابھی رشتہ ڈھنگ سے گھر آیا نہیں' میں نے ڈھنڈورا پیٹ دیا' اب اتنی جلدی انوشے کے لیے اور کون ملتا... نظر آگیا میرا ایوب۔" تائی ماتھا پیٹنے لگیں' دادی بھی فون بند کرکے گہری سوچ میں تھیں۔

"ایسا کچھ غلط بھی نہیں' بہو گھر کی بیٹی ہے اور گھر کا بیٹا' اگر رشتہ ہوجائے تو؟" دادی کا ووٹ انوشے کے حق میں تھا۔

"اماں! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ایوب سے پوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی' میرے میکے میں بھی بہت لڑکیاں

ہیں، خوب صورت اور پڑھی لکھی... دوسری بات یہ کہ صبا... ان کی لے پالک بیٹی ہے، ہماری نہیں۔ انوشے سے پہلے اس کے فرض سے فارغ ہوں، آکر مناسب طریقے سے اس کے لیے رشتہ دیکھیں اور رخصت کریں۔ جب تک گود خالی تھی اس سے دل بہلایا، اپنی اولاد ملی تو یہاں ہمارے دم پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ارے ہمیں کیا پتا کس کی اولاد ہے، کیا نام نسب ہے... کیسے بیاہ دیں اور کس سے؟"

ان کی زبان سے پہلی بار وہ اپنے بارے میں اس طرح کے الفاظ سن رہی تھی۔

"اور تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ جاؤ، دیکھو باہر کتنا کام ہے؟" وہ اس کی طرف مڑیں، اس نے باہر جانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

آنکھیں آسمان پر ڈوبتے ابھرتے تاروں کو دیکھنے میں مصروف تھیں۔ دل کی دنیا ابھی بسی ہی کہاں تھی کہ اجڑ چلی تھی، یوں جیسے کسی کی نظر لگ گئی ہو۔ خوابوں کو، خواہشوں کو۔ محبت کی طرف اٹھنے والے پہلے قدم کے بعد ہی "نوانٹری" کا بورڈ لگا دیا گیا تھا۔

"ایوب سلیمان" کسی ممنوعہ علاقے کی طرح دکھائی دینے لگا تھا اور پھر اس کی حیثیت ہی کیا تھی ایسے اونچے خواب دیکھنے کی... کون تھی وہ؟ یتیم خانے سے لائی گئی ایک لاوارث بچی جسے وقتی طور پر کھلونا سمجھ کر دل بہلایا گیا اور وہ ایوب سلیمان... وہ تو اس گھر کا فرد تھا، اس گھر کا وارث... بڑا پوتا جو کماؤ بھی تھا اور سب سے پُراثر شخصیت کا مالک بھی... وہ چاند تھا اور صبا... صبا خاک کے ذروں سے بھی ارزاں... وہ انوشے کے لیے ہاں کر دے گا... یہ سوچ کر ہی اسے دھچکا لگا تھا اس نے ہانیہ کو کہتے سنا تھا۔

"ایوب بھائی! امی اور خاص طور پر دادی کے سامنے انکار کر ہی نہیں سکتے... اور کریں گے بھی کیوں... کس کے لیے... ان کے پاس انوشے سے اچھی چوائس ہو ہی نہیں سکتی۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے، کچھ کھو جانے کا احساس تھا، ابھی اس نے پایا ہی کیا تھا۔ ابھی تو ایک نئے احساس کا وجود تھا جس نے کسی پودے کی طرح بیج سے سر نکالا تھا۔

"صبا... صبا۔" کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا، وہ ہانیہ تھی... وہ آنکھیں صاف کرتی باہر آئی۔

"کوئی ہوش ہے تمہیں کیا وقت ہو چلا ہے؟ سحری بنانی ہے جلدی کرو... امی کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔"

وہ گھبرا گئی، جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور پھر گھر کے کاموں میں پڑی تھی، ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ شرمندہ تھی۔ وہ وضو کر کے جلدی سے کچن میں گھس گئی۔

"آپ آرام کریں تائی امی، میں کر لیتی ہوں۔" وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

"ہوں... ایسا کون سا سوگ منا رہی تھی کہ ہوش ہی نہیں رہا۔" وہ جاتے جاتے بڑبڑاہٹ کے انداز میں بولیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، ایوب، دادی کے پاس بیٹھ رہے تھے، وہ کیا کہتی کہ اس کا روگ کیا ہے؟

"بھئی بہو...! میرا خیال ہے کہ انوشے اپنے ماں باپ (آفتاب اور شازیہ) کے ساتھ آ جائے... یہاں کا ماحول دیکھ لے تو پھر بات آگے چلائیں، اتنی جلد بازی نہ کریں اور پھر ابھی ہانیہ کے رشتے کی ہاں بھی کرنی ہے پہلے اس فرض سے فارغ ہو جائیں۔" دادی نے سحری کے بعد بات چھیڑی۔

وہ جو برتن سمیٹ رہی تھی، ایوب کی طرف دیکھنے لگی۔ فریدون نے اس کی سمت دیکھا، شاید وہ اس کی چوری پکڑنا چاہ رہا تھا۔ وہ برتن لے کر اندر بڑھ گئی۔

"کیا مطلب اماں؟ آپ نے انکار نہیں کیا شازیہ کو؟"

"نہیں...! اور ویسے بھی ایوب کی عمر ہے اب شادی کی، ماشاء اللہ سے اکیس برس کا ہو گیا ہے اور کتنی دیر کرو گی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں مگر... اور پھر یہ صبا... اس کے

بارے میں کیا سوچا ہے انہوں نے؟" تائی کی بات پر اس کے قدم وہیں رک گئے۔ ایوب کی نظریں اٹھیں۔

"دیکھئی بہو! صبا کی حقیقت سے اپنے پرائے سب واقف ہیں... کسی اچھے گھرانے سے تو رشتہ آنے سے رہا... ہاں اگر آبھی گیا تو ہم سب کی ذمہ داری ہے... آفتاب تو چاہتا ہی نہیں تھا بچہ گود لینا' یہ تو اللہ بخشے بہو کو... اپنی محرومی دور کرنے کے لیے میاں سے لڑ جھگڑ کر یہ بچی لے آئی... خود اللہ کو پیاری ہوئی تو آفتاب کی عمر ہی کیا تھی اس نے شازیہ سے بیاہ کیا تو خدا نے اپنی بچی دے دی... ہمارا جی نہ چاہا صبا کو دوبارہ یتیم خانے بھیجنے پر' کیا کرتے سر پر ہاتھ رکھ دیا... اب اکیلے آفتاب کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہے۔" دادی جو کہہ رہی تھیں سچ تھا وہ ایک پل میں کتنی فالتو سی ہوگئی تھی۔ ایوب کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔

"میں نے ایوب سے بھی بات کی ہے' کہتا ہے پہلے چاچو' چاچی اور انوشے کو آنے تو دیں۔" دادی کی بات پر فریدون کی نظریں ایک بار پھر اس کی طرف اٹھی تھیں' وہ دوبارہ کچن میں روپوش ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

شام کا وقت تھا' آج افطاری میں اہتمام معمول سے کچھ زیادہ تھا۔ ہانیہ اور آفاق کا رشتہ پکا ہو رہا تھا' نکاح یا منگنی کا فیصلہ عید کے بعد پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ دادی کا خیال تھا کہ تب تک آفتاب اور شازیہ بھی آجائیں گے اور ایوب اور انوشے کے سلسلے میں بھی وہ کوئی فیصلہ کرلیں گی تو دونوں رسمیں اکٹھی ہو جائیں گی۔

وہ لان کے گھسے ہوئے بدرنگ جوڑے میں ملبوس' بالوں کا جوڑا بنائے کچن میں سب کی پسند کے مشروبات بنانے میں مصروف تھی جب ایوب گھر میں داخل ہوا۔ کچن کی کھڑکی کھلی تھی۔ جس کے دھلے دھلائے فرش پر کرسیاں ترتیب سے بچھی تھیں۔ میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ ایوب نے کبھی اسے ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا' ہمیشہ ہانیہ اور زہرہ آپا کے کپڑے ہی استعمال کرتی تھی۔ آج بھی زہرہ آپا اس کے لیے اپنے استعمال شدہ کپڑوں کا شاپر اٹھا لائی تھیں۔

ہانیہ اور آفاق کا رشتہ پکا ہوگیا' افطاری کے بعد دعا کردی گئی اور رسم عید کے بعد رکھی گئی۔ یہ خبر جب باہر والوں کو سنائی گئی تو انہوں نے ایوب اور انوشے کی بات پھر سے چھیڑ دی۔

"جو بھی ہے... ہوگا تو وہی جو ایوب چاہے گا' آخر اس گھر کا سب سے ذہین' وجیہہ اور کماؤ لڑکا ہے' پھر میں اس کی ماں ہوں' کچھ حق ہے میرا... ارمان ہیں میرے۔" تائی نے منہ بسورا۔

"ہاں تو فریدون پہ کرلینا یہ ارمان پورے۔" دادی نے خفگی سے گھورا۔

"دیکھ بہو! انوشے پڑھی لکھی ہے' خوب صورت ہے' آج کل کے طور طریقے جانتی ہے' سب سے بڑھ کر باہر سے آرہی ہے۔ خوب دولت کمائی ہے اس کے باپ نے' سب کچھ اسی کا تو ہے۔ آج کل کے لڑکے یہی چاہتے ہیں۔"

"آپ نے میرے ایوب کو بھی ایسا سمجھ لیا۔" تائی کا غصہ دیدنی تھا۔ وہ برتن سمیٹنے لگی۔

☆ ☆ ☆

نہ جانے کیوں کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا' وہ عصر کی نماز ادا کرکے باہر برآمدے میں آبیٹھی رمضان المبارک کی وجہ سے عموماً اس وقت گھر کے سب افراد سو رہے ہوتے تھے۔ ایوب اور فریدون اپنے اپنے کام پر ہوتے تھے۔ وہ یونہی تخت پر بیٹھی لایعنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

"یہ اس وقت کون ہوسکتا ہے؟" وہ پاؤں میں چپل اڑس کر باہر کی طرف بڑھی۔

گیٹ کے باہر گاڑی کی آواز تھی' یہ تو ایوب کی گاڑی کی آواز تھی۔ اس نے گھبرا کر گیٹ کھول دیا... شاید طبیعت خراب ہو گئی ہو... گیٹ کھولنے پر اسے فریدون کا چہرہ نظر آیا جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ برابر والی سیٹ پر نظر پڑی تو دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا' ہاتھ پاؤں میں پسینہ آنے لگا... پیچھے بھی جو دو نفوس بیٹھے تھے' ان کی نظریں اس کے وجود پر تھیں۔

"السلام علیکم ابو!" نہایت مودب انداز میں سلام کیا تھا اس نے' انہوں نے اس کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور اندر بڑھ گئے۔ انوشے اور ماما نے تو لمحہ بھر رکنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

"یہ یوں اچانک؟" وہ فریدون کی طرف مڑی۔

"خطرہ! ان کو تم سے اور تمہیں ان سے... صبا' ان کے اور تمہارے درمیان ایوب نامی علاقہ ہے جسے فتح کرنے کی جنگ ہے۔" فریدون نے مسکراتے ہوئے کہا' اس نے سر جھکا لیا۔

"جنگ وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس ہتھیار ہوں... میں تو خالی ہاتھ ہی نہیں... خالی دامن اور خالی دل بھی ہوں۔" وہ رو پڑی۔ فریدون اس کی نظروں سے سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کے بھائی کو پسند کرتی ہے۔

"سب کچھ ایوب پر منحصر ہے... تم اس سے کھل کر بات کیوں نہیں کرتیں؟" فریدون کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"کیا...؟" اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے... فریدون تو نجومی نکلا۔

"یہی کہ تم ایوب نامی علاقے کو فتح کرنا چاہتی ہو' حکومت کرنا چاہتی ہو۔"

"میں اتنے اونچے خواب نہیں دیکھتی فریدون اور کہنے کی جرات نہیں... وہ پتا نہیں کیا سمجھیں... مجھے تو بس رہنے کو ٹھکانہ چاہیے۔" اس نے آنسو صاف کیے۔

"غلط' بالکل غلط... رہنے کو تو ٹھکانہ میں بھی دے سکتا ہوں' مگر جانتا ہوں کہ تمہیں اس گھر کے علاوہ کہیں' کسی کے دل میں بھی رہنے کی جگہ چاہیے اور وہ دل ایوب سلیمان کا ہی ہے۔" وہ اس کا دل پڑھ رہا تھا' وہ صفحے پڑھ رہا تھا اس کے دل کی کتاب کے جو شاید خود اس نے بھی نہ پڑھے تھے۔

"صبا... کہاں رہ گئی! افطار کا انتظام کرو... میرا بیٹا آیا ہے... میری انوشے آئی ہے۔" دادی کی آواز پر وہ برق رفتاری سے اندر بڑھی تھی۔

افطاری میں یہاں سے وہاں تک دستر خوان بچھا تھا... وہ تھوڑی سے افطاری کر کے اٹھ گئی۔ ماما نے بات چھیڑ دی۔

"ہم لوگ انوشے کی خاطر آئے ہیں... کرنے کو تو میں اس کا رشتہ وہاں بھی کر سکتی تھی' مگر مجھے شروع سے ایوب ہی پسند تھا اپنی انوشے کے لیے۔" ان کی بات پر ایوب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

اس نے "اس" کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں وہ کچن کے دروازے سے چپکی کھڑی تھی کیا کچھ نہیں تھا ان نظروں میں... وہ ان نظروں کی حدت سے پگھل گئی۔

"انوشے بھی ایوب کو پسند کرتی ہے' وہاں ہم نے ایوب کی تصویر بھی لگا رکھی تھی' جو کوئی پوچھتا تھا ہم یہی کہتے تھے کہ انوشے کا منگیتر ہے۔" انہوں نے بات جاری رکھی۔

"ہتھیار ڈال دو گی تو کیسی جنگ؟ وہ قابض ہو جائے گی اور تم... کشتیاں جلا کر جنگ کا آغاز کرو صبا... واپسی کا کوئی رستہ نہ چھوڑو... ہاں ان کی واپسی کی ٹکٹ آسانی سے ہو جائے گی۔" فریدون اس کی مدد کے بہانے آیا تھا' لمحہ بھر کو اس کے پاس رکا' ماما کی نظروں نے عجیب انداز سے اس منظر کو دیکھا تھا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر صبا کو بھی تو گود لیا تھا' بیٹی بنا کر لائے تھے' پہلے اس کے بارے میں کچھ سوچ لیں۔"

"بھابھی! ٹھیک ہے میں نے صبا کو گود ضرور لیا تھا' مگر انوشے کے بعد ضرورت نہیں رہی... جب انسان کے پاس اپنی چیز آجائے تو وہ ادھار کی یا مانگے کی چیز واپس کر دیتا ہے اور ویسے بھی اصل فائدہ تو آپ لوگوں نے اٹھایا' ملازمہ نہیں رکھنی پڑی... ایسے کل وقتی

ملازمہ رکھنی پڑتی تو میں دیکھتا کیسے پوری پڑتی آپ کی۔" وہ بول رہے تھے اور اندر کچھ ٹوٹتا ہی جارہا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے کچھ پکڑنا چاہا تو ایوب نے اسے تھام لیا۔۔۔ اس کی شرٹ سے اٹھتی مہک اور فریدون کی باتوں نے دل کی دھڑکنوں کو الگ ہی راہ سجھا دی تھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔۔۔ وہ اسے شانوں سے تھامے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"یعنی! اس کی شادی ہمارے ذمے ہے!" تائی نے حیرت سے پوچھا۔

"مل کر کرلیں گے سب۔۔۔ کوئی رشتہ دیکھ لیں۔۔۔ اس کے لیے تو کوئی بھی چلے گا اور ویسے بھی بھابھی اپنے بیٹوں پر بھی نظر رکھیں۔ مجھے تو اس کے لچھن اچھے نہیں لگتے اور پھر کیا پتا کس کا خون ہے۔۔۔؟ نہ ماں کا پتا نہ باپ کا۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ کسی ڈرائیور یا واچ مین وغیرہ سے دو بول پڑھوا کر رخصت کریں۔۔۔ آپکا فریدون بچ جائے گا۔۔۔ بہت آگے پیچھے رہتی ہے اس کے۔۔۔ میں نے دو گھنٹے میں دیکھ لیا آپ چوبیس گھنٹے نظر کے سامنے نہ دیکھ سکیں۔" وہ زہر اگل رہی تھیں، فریدون کے بارے میں۔ اس نے گھبرا کر ایوب کو دیکھا۔ اس کے شانوں پر ایوب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"پانی پی لو تم۔۔۔" وہ اسے گلاس تھما کر باہر نکل گیا۔ کہیں ایوب نے ان کی باتوں سے کچھ غلط تو نہیں سمجھ لیا۔۔۔ نہیں! فریدون میرا بھائی ہے۔۔۔ دوست ہے۔۔۔ وہ فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"جب انسان کے پاس اپنی چیز آجائے تو وہ ادھار کی چیز یا مانگے کی چیز واپس کردیتا ہے۔" ایک برچھی سی اتر گئی دل میں۔۔۔

"آپ کا فریدون بچ جائے گا۔" اس کے کردار پر کیچڑ اچھالی گئی۔

"نہ ماں کا پتا نہ باپ کا۔" یہ گالی تھی۔۔۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

وہ جو کوئی بھی تھے یقیناً "بہت مجبور رہے ہوں گے۔ یقیناً" کوئی راستہ نہیں ہوگا ان کے پاس۔۔۔ اور میری ماں یقیناً" بہت سلیقہ شعار اور باحیا عورت ہوگی اسی لیے تو میں اتنے سارے کام خوشی سے کرتی ہوں اور محبت کرنے کے باوجود کبھی ایوب کو بتا نہیں سکی۔ انہیں کوئی حق نہیں میرے ماں باپ کو گالی دینے کا۔ اگر ان کی جگہ انہوں نے مجھے پالا ہے تو صلہ بھی دے دیا میں نے ان لوگوں کی چاکری کرکے۔۔۔ ایک فیصلہ کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

چند ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈال کر وہ نیچے آئی تھی، کچھ سوچ کر وہ پہلے ایوب کے کمرے کی طرف بڑھی پھر فریدون کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ دروازہ کھلا تھا وہ اندر داخل ہوئی' وہ ہمیشہ کی طرح موبائل پہ مصروف تھا۔

"کیا ہوا صبا؟"

"فریدون مجھے تھوڑے پیسے ادھار چاہئیں۔" اس کی بات پر وہ سیدھا ہوکے بیٹھا۔

"خیریت۔۔۔؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کبھی اس نے ایسا مطالبہ نہ کیا تھا۔

"تم مجھے دے رہے ہو یا نہیں۔۔۔؟"

"ہاں دے رہا ہوں! کتنے۔۔۔؟" اس نے والٹ نکالا۔

"پانچ سو۔"

"پانچ سو! کیا کروگی؟" اس کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

"یہاں سے یتیم خانے یا دارالامان کا کرایہ۔" وہ نوٹ پکڑتے ہوئے بولی۔

"کیا۔۔۔؟" وہ کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ کشتیاں جلا کر جنگ کرو۔۔۔ افطاری کے ٹائم ابو کی بیوی نے بہت غلط باتیں کیں، مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے تمہارے بارے میں جو غلط بات کی ایوب نے اس پر یقین کرلیا ہے تو پھر میں کس کے لیے کشتیاں جلاؤں؟ انہوں نے گالی دی مجھے میرے ماں باپ کی۔۔۔ اور تم نے سنا نہیں کہ انہوں نے کیا کہا۔۔۔ ابو نے۔۔۔ انہوں نے کہا کہ ادھار کی چیز۔۔۔ میں اسی لیے۔۔۔ واپس۔۔۔"

"اور ایوب کا کیا ہوگا؟ مجھے لگتا ہے کہ بھائی بھی تم

سے محبت کرتا ہے۔" فریدون نے مڑ کر واش روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

"وہم ہے تمہارا۔۔۔ کبھی نہیں کہا انہوں نے مجھ سے اور اب بھی انوشے کے حوالے سے گھر میں بات ہو رہی ہے تو خاموش ہیں' مخالفت نہیں کی انہوں نے۔" شکوہ زبان سے پھسلا' باہر شور سا ہوا۔

"ارے دیکھیں' دیکھیں۔۔! رات کے اس پہر کیوں گئی فریدون کے کمرے میں۔۔۔ بھابھی۔ پٹی بندھی تھی آپ کی آنکھوں پر۔"

لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ دونوں سمجھ گئے کہ باہر کیا شور مچنے والا ہے۔۔۔ وہ دونوں کٹہرے میں ہوں گے۔

"رمضان کا مہینہ اور شکل دیکھو میسنی کی۔۔۔ میں تو آتے ہی سمجھ گئی تھی۔ مہمانوں کا استقبال کرنے کے بجائے فریدون سے گپیں لڑانے کھڑی ہو گئی محترمہ۔۔۔" ماما کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے فریدون کو دیکھنے لگی۔

اسی وقت واش روم کا دروازہ کھول کر ایوب باہر نکلا۔۔۔ ٹراؤزر اور بنیان پر گلے میں تولیہ ڈالے' گیلے بالوں کے ساتھ وہ ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔ یعنی وہ یہیں تھا اسی کمرے میں۔

"یہ سب کیا ہے صبا۔۔۔؟" تائی اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ہانیہ اور انوشے کو باہر بھیج دیا گیا۔

"معصوم بچیاں ہیں۔۔۔ انہیں کیا پتا ایسی حرکتوں کا۔۔۔" اس کی مٹھی میں دبا پانچ سو کا نوٹ تائی کے تھپڑ سے نیچے گر گیا۔۔۔ تایا ابو نے پہلی مرتبہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھا۔

"پانچ سو! فریدون کی جیب سے نکلوائے ہیں تو نے کمینی۔" دادی کا یہ لہجہ۔۔۔ پہلی بار سن رہی تھی وہ' اور کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

"جی۔۔۔ کرائے کے لیے' لیے تھے صبا نے۔۔۔ واپس دارالامان جا رہی تھی۔" فریدون سے خاموش نہ رہا گیا۔ اس لمحے صبا کو صرف یہ فکر تھی کہ کہیں ایوب بھی اسے فریدون کے کمرے میں دیکھ کر غلط نہ سمجھ

"بولتی کیوں نہیں۔۔۔ چاہتی کیا ہے؟ کب سے چل رہا ہے یہ سب؟" تائی نے سر سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ پیچھے کھڑے ایوب سے ٹکرا گئی' اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔۔۔ کتنے رنگ تھے ان آنکھوں میں۔۔۔ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں؟ وہ ایک جھٹکے سے مڑا۔۔۔ فریدون کی کپڑوں کی الماری کھول کر قمیص نکالی۔۔۔ قمیص کے بٹن بند کر کے اس نے صبا کی کلائی تھام لی۔

"چلو۔۔۔"

"کہاں۔۔۔!" تقریباً" سب ہی چیخے تھے۔

"یتیم خانے۔۔۔ ادھار کی چیز واپس کر آئیں تو بہتر ہے۔" وہ اسے گھسیٹتا لے گیا۔

جو ڈر اس کے دل میں جاگا تھا وہ سچ نکلا۔۔۔ دنیا ختم ہو گئی۔۔۔ جینے کا مقصد دم توڑ گیا۔۔۔ ایوب نے بھی اسے غلط سمجھ لیا۔ وہ ہوش سے بیگانہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے گھسٹتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا تھا' افطاری بازار سے آتی تھی۔ چپس کے فرش پر درختوں کے پتے اور پرندوں کی گندگی پڑی رہتی۔۔۔ میز پر رکھا گلدان ویران تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا بار بار کچن کی کھڑکی کی طرف دیکھتا۔

بھائی! کیا واقعی اسے دارالامان چھوڑ آئے بہت محبت کرتی تھی وہ آپ سے۔۔۔ مجھے بھائی سمجھتی تھی اپنا۔۔۔ فریدون کا دل چاہا ایوب کا گریبان تھام لے مگر اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ اب اس کے بارے میں کوئی بات نہیں ہو گی۔

گھر میں عید کی شاپنگ عروج پر تھی۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ انوشے اور ایوب کی منگنی کی تیاری بھی چل رہی تھی۔۔۔ دادی کا خیال تھا کہ نکاح کر دیا جائے۔ سب لڑکیاں بازار جانے کے لیے تیار تھیں' زہرہ آپا نے مہندی لگوائی تھی۔ چاند رات متوقع تھی۔

فریدون نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کی عیدی لے کر

شہر کے ہر دار الامان میں جائے گا.... کہیں تو ملے گی نا!
"دسن!" ایوب نے اسے بائیک اسٹارٹ کرتے دیکھ کر آواز دی۔
"ہوں۔" وہی اکھڑا لہجہ۔
"گواہ بنے گا؟" کیسا سوال تھا.... وہ سمجھ گیا۔
دادی کا خیال تھا کہ عصر کے بعد ایوب اور انوشے کے نکاح کی تقریب گھر میں ہی رکھ لی جائے۔
"ہوں گے نا گواہ...."
"یہاں نہیں.... وہاں دار الامان میں.... میرے اور صبا کے نکاح کا گواہ۔" اس نے بم پھوڑا۔
"یہ کچھ سامان ہے.... میں نے خرید کر آفس میں رکھا تھا' یہ وہاں پہنچا دینا۔ اسے خبر نہ ہو دار الامان کی میڈم بہت اچھی عورت ہے' اسے کہنا کہ صبا کے لیے سرپرائز ہے اور سن یہاں بھی کسی کو خبر نہ ہو۔" وہ تو چھپا رستم نکلا تھا۔ فریدون نے اسے گلے لگالیا۔
"آپ اس پر شک نہیں کرتے نا بھائی! یہ کوئی مذاق تو نہیں؟" "مذاق میں کوئی اتنا خرچہ کرتا ہے' چالیس ہزار کا جوڑا لیا ہے اس کے لیے' ساری زندگی ہانیہ اور زہرہ کی اترن پہنتی رہی اب اپنے شوہر کی کمائی سے تو اپنا ذاتی جوڑا پہننے کا حق ہے اس کا۔" ایوب مسکرایا' فریدون نے اسے پھر گلے لگالیا۔
"اور یہاں گھر یہ....؟"
"واپسی کے ٹکٹ آسانی سے ہوجائیں گے۔" وہ مسکرایا اور انوشے کی آواز پر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

☼ ☼ ☼

چاند نظر آنے کی پوری اُمید تھی۔ ساری لڑکیاں عید کی تیاری کررہی تھیں۔ میڈم نے زبردستی اسے بھی مہندی لگوائی تھی۔ وہ تو ساری زندگی مہندی نہ لگانے کی قسم کھا بیٹھی تھی۔ ایوب کے نام کی مہندی لگتی تو بات بھی تھی۔ مہندی لگی تو ساری لڑکیاں چاند دیکھنے کے بہانے باہر نکل گئیں' وہ ہاتھوں میں لگی مہندی کو دیکھتی رہی.... کسی کے کھنکارنے پر سر اٹھایا۔

"ایوب!" دل کو کچھ ہوا۔
"میرے نام کی مہندی لگالی!" وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا' سینے پر ہاتھ باندھے۔
"اس روز آپ مجھے یہاں ان کے حوالے کرکے چلے گئے.... فریدون بے چارے کو مفت کی سننی پڑی ہوں گی۔" وہ رونے لگی۔
"نہیں' کچھ غلط ہوتا تو اسے باتیں سننی پڑتیں نا....! بھائی ہے وہ تمہارا۔"
"مطلب.... آپ.... آپ نے مجھے غلط نہیں سمجھا تو پھر.... مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے....؟" آنسو نکل پڑے۔
"تاکہ مانگے کی صبا کو واپس چھوڑ جاؤں اور اپنی صبا کو' اپنا بنا کر ہمیشہ کے لیے لے جاؤں.... پہلے تمہیں یہاں سے چاچو لے کر گئے تھے' ان سے سنبھالا نہ گیا تو ان کی صبا واپس چھوڑ گیا میں.... اب صبا ایوب کو لے کر جاؤں گا کوئی نکالنے کی ہمت نہیں کرے گا اور اگر نکالے گا تو ایوب اپنی بیوی کو کھلا بھی سکتا ہے اور رہنے کے لیے چھت بھی دے سکتا ہے۔" وہ گمبھیر لہجہ.... صبا کو لگا وہ خواب دیکھ رہی ہے۔
"اور محبت....؟"
"محبت کرتا ہوں اسی لیے تو لینے آیا ہوں' اسی لیے تو آفاق کے ہاں سے رشتہ آنے پر یہ سوچ کر پریشان ہوگیا تھا کہ کہیں کوئی تمہارا نام نہ لے دے.... تم تیار ہوجاؤ.... نکاح ہے ہمارا.... میں پہلے اپنے چاند کو دیکھنا چاہتا ہوں' دیکھنا چاہتا ہوں کہ صبا اپنے کپڑوں میں کتنی پیاری لگتی ہے' اپنے چاند کو دیکھ کر عید کا چاند دیکھوں گا۔" وہ قریب آکھڑا ہوا۔ اس کے حنائی ہاتھ تھام کر بہت محبت سے بولا۔
"میں ایوب سلیمان تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری عزت کی حفاظت کروں گا' تم سے مرتے دم تک محبت کروں گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے خوب محنت کروں گا' تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے' ہر دکھ جھیلوں گا کیونکہ محبت کرتا ہوں تم سے اور کرتا رہوں گا۔" وہ مہندی کی

خوشبو کو سانسوں کے اندر اتار رہا تھا اور وہ اس کے اندر چھپی اپنی محترم محبت کی مشکور ہو رہی تھی۔
"دہ یتیم خانے سے تمہارے امی ابو کا مکمل پتا کیا ہے میں نے پسند کی شادی کی تھی انہوں نے۔ تمہارے ابو کے گھر والے جاگیردار تھے.... دونوں کو جان کا خطرہ تھا اسی لیے تمہیں تحفظ کے خیال سے یتیم خانے میں بطور امانت رکھوایا، مگر دونوں کو مار دیا گیا، یہیں یتیم خانے کے باہر.... ان کے کفن دفن کا انتظام بھی ویلفیئر والوں نے کیا تھا۔ چاچو سب جانتے تھے اس کے باوجود.... ہوتے ہیں ایسے پتھر دل لوگ بھی۔"
"اور اگر ہمیں بھی مار دیا تو....؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔
"مار ہی نہیں سکتے.... چاچو کیا بھیجتے ہیں گھر؟ اور ابو تو اس گھر میں ریٹائرمنٹ کی زندگی جی رہے ہیں.... سب کے اخراجات پورے کرنے والا ایوب سلیمان مر گیا تو عیاشیاں کیسے ہوں گی؟" وہ ہنسا۔
صبا نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
"ہوں ہوں.... قاضی صاحب آگئے اور گواہ بھی۔" فریدون نے ہنکارا بھرا۔ وہ پیچھے ہو گئی۔
اسے دلہن بنایا گیا، نکاح ہوا.... دارالامان کی ساری لڑکیوں کو ایوب نے زبردست سی افطاری کروائی۔ گھر سے بار بار فون آرہے تھے۔ نکاح کا سارا انتظام ہو چکا تھا مگر دولہا غائب تھا۔ ادھر چاند نظر آیا ادھر ایوب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔
"کہاں تھے....؟ اتنی دیر لگا دی۔ انوشے کب سے تیار بیٹھی ہے۔"
"فریدون! انوشے ہماری کزن ہے، مہمان بھی اور عزت بھی.... یہاں عزت، بے عزتی کا سوال ہے، تو اس کی واپسی کے ٹکٹ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ہم وہ تو نہیں کر سکتے جو انہوں نے صبا کے ساتھ کیا۔ مگر ہمیں کیا پتا کہ انگلینڈ میں اس کا کردار۔" ایوب کی بات ادھوری رہ گئی، سب اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔
"آپ کہاں چلے گئے تھے ایوب بھائی۔ اور اب یہ سب کیا ہے؟" ہانیہ آگے بڑھی۔
"بھائی گھر کی چھت دینے کا وعدہ کر کے چھت نہیں چھینیں گے اور نہ ہی نام دینے کا وعدہ کر کے مکریں گے۔ صبا میری بہن ہے اور اپنی بہن کی خوشی کے لیے میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔" فریدون دلہن کے برابر میں بیٹھ گیا۔
"یہ کیا بکواس ہے؟" صبا کی ماما اور تائی ایک ساتھ بولیں۔
"اگر آپ انوشے کی شادی فریدون سے کرنا چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ آپ لوگ واپسی کے ٹکٹ کروالیں۔"
"یہ کیا بکواس ہے؟" چاچو دھاڑے۔
"یہ سچ ہے چاچو! آپ اس بچی کو اپنا بنا کر لائے اور پھر ایک بار پھر اسے لاوارث اور یتیم بنا کر چلے گئے۔ وہ جیسے بھی سہی مگر ہمارے گھر میں رہ رہی تھی۔ آپ لوگ آئے تو اس پر الزام بھی لگ گیا۔ اسے وہ گالی دے دی جس میں اس کا رتی بھر بھی قصور نہیں تھا۔ آپ نے اپنی لے پالک بچی بدنام اور ذلیل کر کے واپس بھجوا دی۔ اپنی بیوی کی زبان بند نہ کرا سکے آپ۔ کیونکہ صبا آپ کی بیٹی انوشے کی خوشیوں کے راستے کا کانٹا تھی۔"
"خیر، آپ کی صبا کو میں چھوڑ آیا تھا دارالامان۔ مگر اپنی بیوی کو لے آیا ہوں آپ سب سے ملوانے۔ صبا ایوب، چاہیں تو اسے قبول کر لیں ورنہ میرے پاس اسے دینے کو بہت کچھ ہے۔ نام بھی، دولت بھی اور چھت بھی۔"
اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ کھولا اور چادر میں سمٹی سمٹائی صبا کو اپنے ساتھ لگائے اندر لے آیا۔
"یہ ہے میری صبا ایوب۔ جسے اب کوئی نکال نہیں سکتا کیونکہ یہ میری بیوی ہے، کسی کی لے پالک بیٹی نہیں۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔
"جیتی رہو۔" تایا ابو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ باقی سب بھی شرمندہ دکھائی دینے لگے۔
"انوشے! تمہیں فریدون کے ساتھ نکاح پر کوئی

اعتراض ہے کیا؟" تائی نے انوشے کی طرف دیکھا۔
"نہیں آنٹی! آپ کے بیٹے تو رشتے نبھانا جانتے ہیں۔ ایک نے بھائی ہونے کا حق ادا کیا اور بہن کی خوشی کی خاطر مجھے اپنانے کو تیار ہو گیا اور دوسرے نے اپنی محبت کو باعزت مقام دیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر فریدون یہ سب کچھ صرف صبا کی خوشی کے لیے کر رہا ہے۔ شاید اس کی پسند یا مرضی کہیں اور ہو۔ بہت اچھی تربیت کی ہے آپ نے بیٹوں کی آنٹی۔" وہ سچے دل سے کہہ رہی تھی' انہوں نے فخر سے ایوب اور فریدون کو دیکھا اور پھر شرمندہ شرمندہ سی صبا کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔
"اب تو تم میرے ایوب کی دلہن بن کر آئی ہو۔ بہو ہو میری' آؤ۔" انہوں نے بازو کھول دیے۔ وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔
"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں ون وومن آدمی ہوں۔ بیوی سے محبت کرنے والا۔ بالکل اپنے بھائی کی طرح۔ تو پھر واپسی کے ٹکٹ صرف چاچو' چاچی کے کروانے ہیں۔" فریدون شوخ ہوا۔
"میری ایک شرط ہے۔" انوشے کی ماما کے دل کی اصل بات زبان پر آ گئی جس کی وجہ سے وہ ایوب کی خواہش مند تھیں۔
"کیا؟"
"بھائی صاحب! آپ ایوب کے بجائے فریدون کو بزنس میں چیئرمین بنائیں گے۔" وہ ہر صورت فریدون کو اور انوشے کو صبا سے برتر دیکھنا چاہتی تھیں۔
"منظور ہے۔" ایوب نے کھلے دل سے کہا۔ صبا اور تائی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"فکر مت کرو۔ تمہارا ایوب بچ میں چھپا رستم ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ میں ابو کے بزنس کی وجہ سے کامیاب بزنس مین ہوں۔ نہیں یار! میرا خود کا بھی کام ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا۔ میں بے وقوف نہیں ہوں کہ شراکت والے کام پر بھروسا کر کے بیٹھا رہوں۔ ابو کے کام میں میرے علاوہ فریدون' زہرہ آپا اور ہانیہ بھی حصے دار ہیں۔ میرے خود کے بزنس کا میں اکلوتا مالک ہوں بلاشرکت غیرے۔ اور یہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ گھر کے آدھے اخراجات میں خود اپنی جیب سے پورے کرتا ہوں۔ تمہارا پلڑا یہاں بھی بھاری ہے جانم۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ صبا مسکرا دی۔
انوشے اور فریدون کا نکاح ہوا۔ مبارک سلامت کا شور مچا۔ فریدون اپنے کمرے میں چلا گیا اور انوشے اپنے کمرے میں' رخصتی ایک سال کے بعد ہونا قرار پائی تاکہ انوشے کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے اور فریدون بھی فیکٹری کی باگ ڈور اچھی طرح سنبھال لے۔ سب نے صبا کے سر پر ہاتھ رکھا اور شرمندہ سے اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔
"چلیں۔" ایوب نے ہاتھ آگے کیا۔
"کہاں؟" اس کا دل دھڑکنے لگا۔
"میرے کمرے میں۔ میرا مطلب ہے اپنے کمرے میں۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ اس نے حنائی ہاتھ ایوب کے ہاتھ میں تھما دیا۔
نہ راہوں میں پھول بچھے تھے' نہ سیج سجی تھی نہ شادیانے بجے تھے پھر بھی وہ کسی ملکہ کی طرح ایوب سلیمان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پار عید کا چاند دید ہم ہو رہا تھا۔ اپنے چاند کو دیکھ کر اس چاند کو دیکھا تھا۔ قسم کھائی تھی' پوری کر دی۔
"اب عید ملو۔" اس نے دروازہ بند کر کے بازو وا کیے۔ وہ انگوٹھا دکھا کر آگے بھاگ گئی۔
"صبح نماز کے بعد عید ملیں گے۔" وہ شوخی سے ہنسی۔
"باقی سب کو' صبح ملیں گے۔ ہماری عید تو ابھی ہوئی ہے۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ اس کے بازوؤں میں سما گئی۔
شوہر کی مضبوط بانہیں کسی قلعے کے حصار کی طرح ہوتی ہیں۔ صبا نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس تحفظ کو محسوس کر کے ایوب کی لمبی عمر کی دعا کی تھی۔
عید کا چاند آمین کہہ کر نیند کے مزے لینے بدلیوں کی آغوش میں چلا گیا۔

نبیلہ عزیز

رقص بسمل
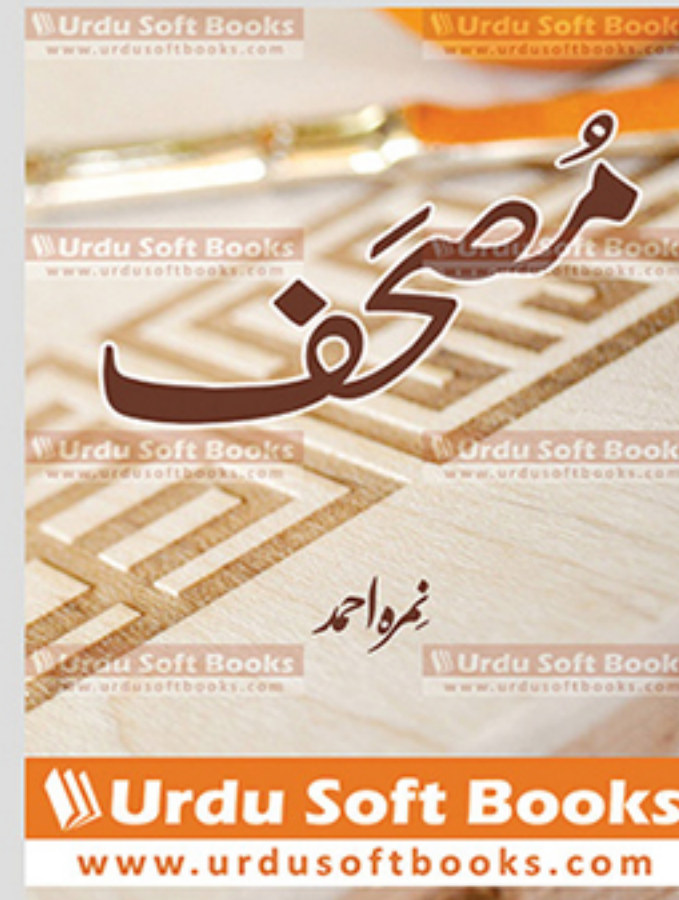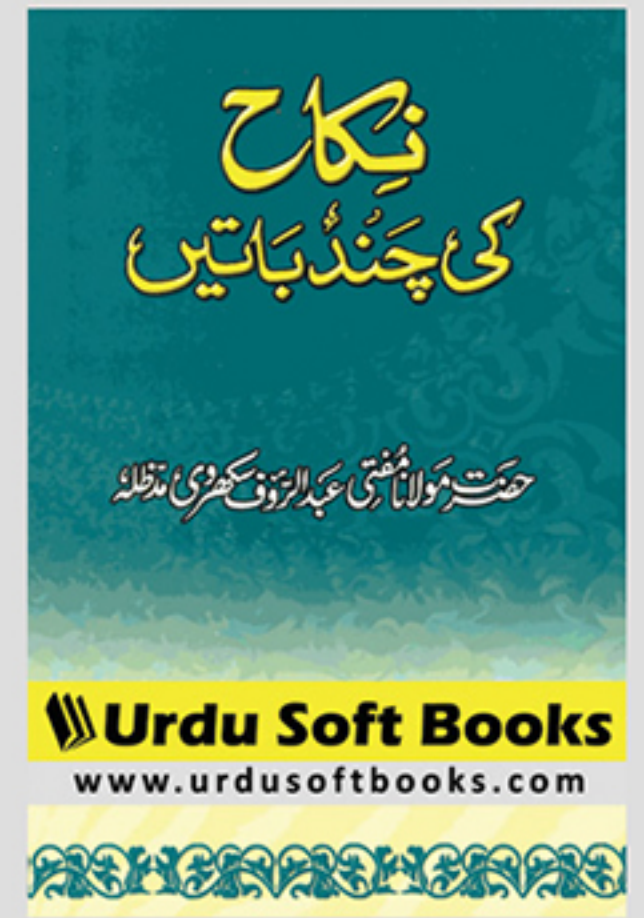
رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید، نادرا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا نادرا سے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی، وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے... عافیہ بیگم اور نادرا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا، سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پُرسوچ آنکھیں پٹپٹا رہی تھیں۔

"بتاؤ ولید! میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے... ہر حال میں..." نادرا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد، ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

اکتیسویں قسط

یوں جیسے اس کا بہت قیمتی کھلونا کھو گیا ہو، جو اسے واپس چاہیے تھا ہر قیمت اور ہر حال میں...

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کے قبیلے میں بڑے کڑے اصول پائے جاتے ہیں... یہاں جو کھو جاتا ہے، وہ واپس نہیں آتا، چاہے وہ مل بھی جائے۔ اور جو ٹوٹ جاتا ہے وہ دوبارہ نہیں جڑتا... چاہے لاکھ جتن کر لو...

اور اس کے اسی جتن پہ ولید اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا... خاموش۔ چپ چاپ۔
"بولو ولید! جواب دو... تم خاموش کیوں ہو؟" ماورا بہت بے صبر ہو رہی تھی۔
"میں کس کام میں ساتھ دوں؟ تیمور کو واپس محبت کی طرف لانے میں یا واپس گھر کی طرف لانے میں...؟"
ولید کا سوال ایسا تھا کہ ماورا ٹھٹک گئی تھی۔
"تم مجھ پہ طنز کر رہے ہو...؟"
"سوری...! میں طنز نہیں کر رہا... میں تو بس پوچھ رہا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟ آپ مجھ سے کس قسم کا ساتھ مانگ رہی ہیں؟" ولید نے اس سے بڑی تسلی اور بڑے تحمل سے پوچھا تھا۔
"تم اسے واپس گھر لے کر آؤ..." ماورا نے بہت تیزی سے کہا تھا۔
"کون سے گھر...؟" سوال پھر تیکھا تھا۔
"اس گھر میں۔ یہ گھر اس کا ہے۔" ماورا نے "یہ گھر اس کا ہے" پہ زور دیا تھا۔
"ہونہہ...! پہلے آپ یہ فیصلہ تو کر لیں کہ یہ گھر کس کا ہے... آپ کا یا اس کا؟" ولید طنز نہیں کر رہا تھا لیکن ماورا کو اس کی ہر بات طنز سے بھرپور محسوس ہو رہی تھی۔
"یہ گھر اس کا ہے آج بھی اور کل بھی کیونکہ اب ہم دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔"
"یہ گھر اس کا ہوتا تو وہ چھوڑ کر کبھی نہ جاتا..." ولید کا لہجہ بھی دوٹوک تھا۔
"وہ غصے میں گھر چھوڑ کر گیا ہے..." ماورا نے جواز دیا۔
"اس کے غصے کا مجھے پتا ہے... اپنا گھر وہ غصے میں بھی نہیں چھوڑ سکتا... اور ویسے بھی وہ بچہ نہیں ہے کہ غصے میں گھر چھوڑ کر چلا جائے... اس نے اپنی شکستگی کی انتہا پہ جا کے گھر چھوڑا ہے... اور مجھے اتنا اندازہ ہے کہ وہ اس گھر میں واپس نہیں آئے گا... کبھی بھی نہیں۔" ولید نے اپنے تجربے کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔
"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟" ماورا تڑپ کے بولی۔
"مائی ڈیئر سسٹر! دوستی اکیس سال کی ہو گی تو تجربہ بھی تو اکیس سال کا ہی ہو گا نا؟" ولید کہتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے... وہ مجھے اس طرح چھوڑ کے نہیں جا سکتا میں بھی جانتی ہوں اسے، وہ لوٹ کر میرے ہی پاس آئے گا۔" ماورا بہت نپے تلے سے الفاظ میں بول رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ولید سے زیادہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہو۔
"چلیں... اکیس سال سے ایک سال آپ کی محبت کا نکال لیتے ہیں... پھر بھی میرے پاس بیس سال کا تجربہ ہو گا... اور بیس سال کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔" ولید نے ماورا کے حوصلے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
"تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو...؟" ماورا کا لہجہ جیسے پل بھر کے لیے کمزور ہوا۔
"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ اس کے لوٹ آنے کی امید پہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہیں... جس کام کے لیے آپ مجھ سے مدد مانگ رہی ہیں، وہ کام آپ خود بھی کر سکتی ہیں... آپ خود اسے گھر لے کر آئیں... وہ نہ آئے تو میں آپ کا ساتھ دوں گا ہر طرح سے کیونکہ وہ میرا دوست ہے تو آپ میری بہن ہو... اور اس مشکل وقت میں، میں بہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" ولید نے بالآخر اسے سمجھاتے ہوئے تسلی دی تھی اور ماورا کو اس کی بات سن کر کچھ ڈھارس ہو گئی تھی۔

"لیکن مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے؟ میں اسے کیسے لے کر آؤں...؟" ماورا نے بے بسی سے کہا۔
"میں پتا کرلوں گا... آپ پریشان نہ ہوں۔" ولید نے اسے تسلی دی۔
"میں انتظار کرتی ہوں..." وہ اپنے اندر کی بے چینی کو چھپا نہیں پارہی تھی۔
"ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں... فون کروں گا۔" ولید نے ٹیبل سے چابی اٹھاتے ہوئے کہا... لیکن ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے رک گیا تھا۔
"ایک منٹ... ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گیا۔" وہ کہتے ہوئے واپس پلٹا۔
"کیا بات...؟" ماورا فوراً" متوجہ ہوئی تھی۔
"میری والی کو آپ نے گھر سے نکال دیا... یا وہ بھی گھر چھوڑ گئی؟" ولید نے بڑے لاابالی سے انداز میں استفسار کیا تھا۔
"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں... میں نے کسی کو بھی گھر سے نہیں نکالا... رضا حیدر کو بھی نہیں۔" ماورا کا لہجہ دو ٹوک تھا۔
"یعنی وہ خود گھر چھوڑ کے گئی ہے؟" وہ پرسوچ... انداز میں سرہلا کے بولا۔
"نہیں، اس نے خود گھر نہیں چھوڑا۔ رضا حیدر اسے زبردستی ساتھ لے کر گئے ہیں... اور مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ وہ لوگ اب کہاں ہیں؟ کہاں گئے ہیں...؟" وہ پریشانی سے بتا رہی تھی۔
"چلو... کوئی بات نہیں۔ جانے دو... وہ لوگ ویسے بھی گھومنے پھرنے کے شوقین ہیں۔ ہوسکتا ہے واپس دبئی چلے گئے ہوں۔" ولید نے مذاق اڑایا تھا۔
"ولید پلیز...!" ماورا نے جیسے اس کے مذاق پہ التجا کی تھی۔
"ٹینشن کیوں لیتی ہیں؟ آپ کے "ان" کے ساتھ ساتھ میری "وہ" بھی گئی ہے، جتنا نقصان آپ کا ہے۔ اتنا ہی میرا بھی ہے... بس ذرا اسٹرونگ رہیں جیسے پہلے تھیں... سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں تلاش کرتا ہوں جو بھی مل جائے۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور ماورا سرتھام کے بیٹھ گئی تھی۔
"تیمور! کہاں چلے گئے ہو؟ پلیز واپس لوٹ آؤ..." وہ یونہی سرتھامے بے ساختہ رو پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ آنکھیں بند کیے گاڑی سے ٹیک لگائے ریت پہ بیٹھا رات بسر کرچکا تھا۔ اور اب سورج کی کرنیں اسے اک نئے دن کے آغاز کی اطلاع دے رہی تھیں۔ اس کی کچی پکی ریت جیسی نیند سورج کی کرنوں سے آنکھوں کی مٹھی سے پھسل کر ریت پہ ہی بکھر گئی تھی۔
اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا... دور دور تک ساحل ہی نظر آرہا تھا... ویران... اداس... خالی... بالکل اس جیسا...!
اور یونہی دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں ریت چبھنے لگی تھی اور آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں۔
اس نے بے ساختہ چہرہ جھکا لیا تھا... ورنہ سچ مچ آنکھیں چھلک پڑتیں۔
"سب سے محبتیں کرنے کے بعد یہ صلہ ملا کہ میں آج اکیلا ہوں... کوئی ہمدرد بھی نہیں... کوئی دوست بھی نہیں... وہ بھی نجانے کہاں ہے؟ اس کا فون نمبر بھی نہیں... فون کیسے کروں اس کو؟ کیسے بتاؤں اس کو؟ میں محبت کے کاروبار میں ناکام ہوگیا... ہار گیا... سب کچھ ہار گیا... دل و جاں سمیت..." وہ دل ہی دل میں گلے شکوے

پروئے جا رہا تھا۔
"ولید....!" اس نے زیرِلب اس کا نام لیتے ہوئے اپنی جیبوں کو ٹٹولا تھا جیسے موبائل تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔
لیکن یونہی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے اسے یاد آیا کہ موبائل تو اس نے پھینک دیا تھا۔
"اوہ! اب کچھ نہیں ہو سکتا...." اس نے شکستگی سے کہتے ہوئے اپنی کوشش ترک کردی تھی۔
ایک سچ... ایک صبح... اس شہر کا نمبرون بزنس ٹائیکون تیمور حیدر.... آج صبح صبح نرم گرم بستر کے بجائے نرم گرم ریت پہ بیٹھا روتا ہوا پایا گیا... اس نیوز کی ہیڈ لائن بہت کمال کی بنتی ہے.... لیکن صد افسوس کہ....!"
ولید کی غیر سنجیدہ سی آواز اس کے بے حد قریب سے ابھری تھی اور تیمور نے اس کی آواز پہ یک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
ولید چار قدم کے فاصلے پہ کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"یہ نیوز میں اگر نہ بھی ترتیب دوں.... لیکن جانتے ہو کوئی اور تو ترتیب دے سکتا ہے ناں.... ؟ اب ہر کوئی تیمور حیدر کا دوست تو نہیں ہو سکتا ناں.... ؟" ولید نے ہلکے سے تمسخرانہ انداز میں اسے جتایا کہ وہ اس وقت کہاں بیٹھا ہے کوئی اور بھی اسے دیکھ سکتا ہے.... ایشو بن سکتا ہے۔
مگر تیمور حیدر کو اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کیا کر رہا ہے اور دیکھنے والے کیا کہیں گے۔ وہ اب ہر پروا سے لاپروا ہو چکا تھا۔ اب تو اپنی بھی خبر نہیں تھی۔
وہ ولید کی بات سن کر بھی خاموش رہا تھا اور ولید اس کا سرد سپاٹ سا چہرا دیکھ کر اس کے تاثرات بھانپ گیا تھا کہ وہ کس قدر گہرے صدمے سے دوچار ہے اور اس وقت اس کی کیفیت کیسی ہے؟ کیا احساسات ہیں اس کے اندر....!
اسی لیے ولید مزید کچھ کہنے کے بجائے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس کے برابر ہی ریت پہ آن بیٹھا تھا۔
اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دبایا تھا۔
"زندگی کے رنگ نرالے ہیں.... ہر رنگ دوسرے رنگ سے مختلف.... ساری زندگی بھی دیکھتے رہو تو ختم نہیں ہوتے.... اور ان ہی رنگوں کو دیکھتے دیکھتے انسان مر جاتا ہے۔" ولید اس کو سمجھانے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا۔
"میں بھی مر چکا ہوں....!" تیمور کی زخمی سی آواز فضا میں بکھری تھی اور ولید نے نفی میں سر جھٹکا تھا۔
"یہ مرنا کوئی مرنا نہیں ہے میرے دوست.... یہ تو زندگی کا ایک نیا رنگ ہے جو تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا.... تم صدمے میں اس لیے ہو کہ یہ رنگ زیادہ گہرا تھا.... زیادہ پُراثر تھا.... تمہاری آنکھوں کو جلا کے رکھ گیا ہے.... لیکن یہ تو ہمیشہ ہوتا ہے.... کوئی رنگ راحت بخشتا ہے اور کوئی رنگ اذیت دے جاتا ہے۔ کسی رنگ سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور کسی رنگ سے آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے ہیں.... بس انسان کو صبر اور حوصلے سے ان رنگوں کا سامنا کرنا چاہیے۔"
ولید اسے بہت اچھے سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"مجھے فلسفہ مت پڑھاؤ.... میری عقل، میری سمجھ مر چکی ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔" تیمور نے اسے سمجھانے سے اور لفظوں کی تمہید باندھنے سے روکا تھا۔
"وہ تو اسی روز مر گئی تھی جب تمہیں محبت ہوئی تھی.... عقل اور محبت ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں.... ایک آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے.... " ولید نے پھر اسے یاد دلایا۔

"ولید! پلیز... مجھے اکیلا چھوڑ دو... جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔" تیمور اپنے آپ سے بھی بیزار ہوا بیٹھا تھا۔ اسے یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں زہر لگ رہی تھیں وہ اب کچھ بھی سننا سنانا نہیں چاہتا تھا۔

"دیکھو! میں تمہاری فیلنگز سمجھ سکتا ہوں... لیکن۔"

"نہیں... ہرگز نہیں۔ میری فیلنگز کوئی نہیں سمجھ سکتا تم بھی نہیں کیونکہ جو میرے ساتھ ہوا ہے' وہ کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوا... محبت میں بے وفائی ہوتی ہے... محبت میں رسوائی ہوتی ہے... محبت میں مجبوری ہوتی ہے... محبت میں سودے بازی کبھی نہیں ہوتی... میرے ساتھ ہوئی ہے... میرے ساتھ...

اور... اور مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں بک گیا ہوں یا میں خرید اگیا ہوں... میں خود بکا ہوں یا اس نے مجھے خریدا ہے...؟ میری دولت نیلام ہوئی ہے یا میرا دل نیلام ہوا ہے؟ آخر میرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا... اور تم؟ تم آئے ہو لفظوں کی کتاب لے کر؟ ہونہہ... میں تمہارا پروگرام نہیں ہوں... جو تمہارے لفظوں کی ترتیب سے سنور جائے گا... میں انسان ہوں... انسان! مجھے احساس کی ترتیب چاہیے... مجھے سمجھاؤ مت... مجھے سمجھو... میری اذیت کو سمجھو ولید...!"

تیمور بات کرتے کرتے لب بھینچ گیا تھا اور اس کی حالت پہ ولید کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا' ولید نے بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر تھپکا تھا۔

"ڈونٹ وری... سب ٹھیک ہو جائے گا... تم بس برداشت سے کام لو... اس طرح سڑک پہ بیٹھنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا... اٹھو گھر چلو۔" ولید نے تحمل سے اسے تسلی دی۔

"گھر... کون سا گھر؟ ہمارا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے؟ کس گھر کی بات کر رہے ہو؟" تیمور نے جیسے لاتعلقی سے سر ہلایا اور ولید کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہی گھر... جو تمہارا تھا... تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا بلکہ تم دونوں کا۔ تمہارا اور ماورا بھابھی کا..." ولید جان بوجھ کر اس کے سامنے بات کو نارمل لے رہا تھا۔

"نہیں... وہ گھر ہمارا نہیں تھا... نہ ہی ہمارا ہے... وہ جس کا تھا' اسے واپس مل چکا ہے... بالکل ویسے ہی جیسے فریب اور فراڈ سے ہتھیایا گیا تھا ویسے ہی فریب اور فراڈ سے واپس لے لیا گیا ہے..." تیمور نے بڑی تلخی سے اندر کا زہر اگلا...

"میرے خیال میں اس نے تمہیں کوئی فریب نہیں دیا... نہ ہی کوئی فراڈ کھیلا ہے... پہلے روز تم اس پہ فدا ہوئے... تم اس کے پیچھے گئے... تم نے جاب آفر کی... تم نے پرپوزل دیا... یہاں تک کہ وہ تمہاری ہر آفر ٹھکراتی رہی... تمہاری ہر پیش رفت پہ روکتی رہی... مگر تم نہیں رکے... تم باز نہیں آئے... اس نے کہا۔ محبت نہیں ہے... تم نے کہا۔ نو ٹینشن' ہو جائے گی اور اسے جب محبت ہوئی... وہ یہاں سے سب کچھ چھوڑ کر جانے لگی... تم نے اسے تب بھی نہیں جانے دیا... اور اب جب وہ ہر طرح سے تمہاری ہو چکی ہے تو تم یہ تماشا کر رہے ہو...؟"

ولید نے ماورا کی سائیڈ لی تھی۔

"وہ میری نہیں ہوئی... دولت اس کی ہوئی ہے... اس کا عزم پورا ہوا ہے۔ اس کے عہد' اس کے ارادے پورے ہوئے ہیں... اس کے خوابوں کو تعبیر ملی ہے... رضا حیدر کو شکست دینا اس کا اولین خواب تھا' وہ خواب جو رضا حیدر کے بیٹے نے پورا کر دیا... خود اپنے ہاتھوں..." تیمور ماورا کو نہیں اپنے آپ کو کوس کر رہا تھا... کیونکہ اندھی محبت اس نے خود کی تھی۔

"اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو گا... اپنی اور اس کی زندگی برباد مت کرو... شادی کو دن ہی کتنے ہوئے

ہیں؟" ولید سمجھا سمجھا کے تھک رہا تھا۔

"کاش یہ شادی نہ ہوتی... کاش میں انجان ہی رہتا... کاش فریب فریب ہی رہتا۔" تیمور نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"چلو اٹھو... میرے گھر چلو... کچھ دیر ریلیکس کرو... پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے؟" ولید اسے وہاں سے اٹھانا چاہتا تھا' چاہے کسی بھی طرح سے!

"نہیں' مجھے کہیں نہیں جانا..." اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ عجیب بات ہے... کیا اب عمر یہیں گزارنی ہے؟ جوگی بن کے رہو گے؟" ولید نے خفگی سے کہا تھا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں یہیں رہوں گا یا میں جوگی بن گیا ہوں...؟" تیمور نے بڑے زہرخند سے لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"ارادے تو یہی نظر آرہے ہیں تمہارے بھی اور تمہارے گھر والوں کے بھی..." ولید پھر طنز سے باز نہیں آیا تھا۔

"گھر والوں کے بھی... کیا مطلب...؟" تیمور کو گھر والوں کے بارے میں ابھی کچھ بھی نہیں پتا تھا۔

"تم بھی گھر چھوڑ کر روڈ پہ آگئے... اور وہ بھی گھر سے بے گھر ہو گئے... جس کا مطلب ہے کہ تم لوگ اب یونہی گھر سے بے گھر رہو گے... کوئی کہیں... اور کوئی کہیں...؟" ولید کے اس نئے انکشاف پہ تیمور چند ثانیے کے لیے خاموش ہی رہا... پھر بے ساختہ کسی خیال نے مجبور کر دیا تھا۔

"عزت بھی گھر چھوڑ گئی...؟" اس نے صرف اس کا پوچھا تھا۔

"وہ گھر چھوڑ کے نہیں گئی... اسے زبردستی ساتھ لے کر گئے ہیں... وہ نہیں جانا چاہتی تھی' مجھے ماورا بھابھی نے بتایا ہے۔"

"تو اب وہ لوگ کہاں ہیں... ؟عزت کہاں ہے؟" تیمور کو ماں باپ سے بھی زیادہ عزت کی فکر ہو رہی تھی۔

"ایک رات میں' میں بس تمہارا پتا لگا پایا ہوں۔ ابھی سورج نکلا ہے... پورا دن پڑا ہے... اس کا پتا بھی لگا لوں گا اگر تم نے ساتھ دیا تو۔" ولید نے پھر بات اس پہ ڈال دی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں... تم عزت کی خبر لو..." تیمور کو بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے کیونکہ معاملہ عزت اور غیرت کا تھا... رضا حیدر زخمی شیر سے کم نہیں تھے' کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتے تھے... اور تیمور مر کے بھی ایسا نہیں چاہ سکتا تھا۔!

☼ ☼ ☼

ماورا صوفے پہ سو رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پہ رنگ ٹیون بجی تھی۔

"ولید...؟" وہ ولید کا نمبر دیکھ کر اور بھی بے چین ہو گئی تھی۔

"ہیلو...!" اس کی بے قراری اس کی ہیلو سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"ریلیکس... سب ٹھیک ہے... آپ پریشان نہ ہوں۔" ولید نے بڑے سکون سے اسے تسلی دی تھی۔

"تت... تیمور کہاں ہے؟" اس کے جاگے سوئے ذہن میں بھی بس وہ ہی وہ گردش کر رہا تھا۔

"میرے ساتھ ہے وہ... میرے گھر پہ..." اس نے اگلی اطلاع دی' وہ ٹھٹکی...

"کیوں... ؟وہ... وہ اپنے گھر کیوں نہیں آیا؟ اسے یہاں لے کر آؤ ولید۔" ماورا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"اسی لیے بول رہا ہوں... ریلیکس پلیز' تھوڑا صبر اور کنٹرول سے کام لیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا... وہ تو

میرے گھر بھی بڑی مشکل سے آیا ہے۔۔۔ وہ تو آنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔۔۔"
"میں خود آجاتی ہوں۔۔۔" ماورا کی بے قراری ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔
"ارے نہیں نہیں۔۔۔! آپ زحمت نہ کریں۔۔۔ میں ہوں ناں۔۔۔ آپ کے حق میں' آپ کے لیے ہی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ ابھی وہ مینٹلی ڈسٹرب ہے ابھی سمجھانا بے کار ہے۔۔۔ تھوڑا ٹائم دیں پلیز۔۔۔ اس کے اندر کا غبار ابھی باقی ہے۔ جب سارا غبار نکل گیا تو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔" ولید دونوں کو سمجھا سمجھا کے ہلکان ہو رہا تھا۔
"وہ اپنا غصہ اور غبار نکالے۔۔۔ مجھ پہ نکالے۔۔۔ میں تیار ہوں۔۔۔ میں سب سہ لوں گی۔ بس وہ لوٹ آئے۔۔۔ واپس آجائے۔۔۔ مجھے مل جائے۔۔۔ ولید! اس سے کہو' میرا ایک پل بھی نہیں گزر رہا۔۔۔ میرا دم گھٹ رہا ہے اس کے بغیر۔۔۔"
ماورا! کہتے کہتے روہانسی سی ہو گئی تھی اور ولید بے بسی سے چپ ہو کے رہ گیا تھا۔ پھر اس نے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی اور ماورا موبائل پکڑے روپڑی تھی۔ اور ابھی چند سیکنڈز ہی گزرے تھے کہ اس کا فون دوبارہ بج اٹھا تھا اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔
"ماورا تم رو رہی ہو۔۔۔؟" عافیہ بیگم اس کی آواز سنے بغیر ہی بھانپ گئی تھیں۔
"ہاں رو رہی ہوں۔۔۔ بہت رو رہی ہوں۔۔۔ کیونکہ میرا دل رو رہا ہے۔۔۔ امی! میرا دل رو رہا ہے۔" وہ ماں کی آواز کا سہارا ملتے ہی شروع ہو گئی تھی۔
"مگر کیوں؟ ہوا کیا ہے؟ صبح صبح کیوں رو رہی ہو۔۔۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" عافیہ بیگم کے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے۔
"وہ۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ کے چلا گیا۔۔۔ امی۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ کے چلا گیا۔۔۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا' اس نے گھر چھوڑ دیا اس نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ امی اس نے سب کچھ چھوڑ دیا۔۔۔ وہ بھی چلا گیا۔ سب چلے گئے میں' میں اکیلی رہ گئی۔"

وہ بلند آواز سے چیخ چیخ کے رو رہی تھی اور دوسری طرف عافیہ بیگم دم بخود سی اس کی بات سن رہی تھیں۔
"ہوا کیا ہے؟" عافیہ بیگم نے بڑی دیر بعد خود کو سنبھالا تھا۔
"رضا حیدر نے اسے سب بتا دیا۔۔۔ میرے بارے میں بہت زہر اگلا۔۔۔ لیکن مم۔۔۔ میں نے بہت یقین دلایا اسے۔۔۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ میں وہ ماورا نہیں رہی۔۔۔ میں بدل چکی ہوں۔۔۔ اب تو میرے چہرے پہ بھی وہ دکھائی دیتا ہے۔۔۔ لیکن امی۔۔۔ اس نے میری کوئی بات نہیں سنی۔۔۔ مجھے چھوڑ کے چلا گیا۔۔۔ میں کیا کروں؟ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔۔۔ امی! مجھے تیمور حیدر واپس لادیں۔۔۔ مجھے تیمور حیدر واپس لادیں۔۔۔ پلیز۔"
ماورا کو تو جیسے کوئی دورہ پڑا تھا۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔
"پلیز ماورا۔۔۔! چپ ہو جاؤ۔۔۔ وہ واپس تمہارے ہی پاس آئے گا۔۔۔ کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ وہ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔ بس تم ہمت اور حوصلہ سے کام لو۔" عافیہ بیگم نے بھی اسے سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی۔
"وہ نہیں آئے گا۔۔۔ امی۔۔۔ ولید کہتا ہے۔۔۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔" ماورا ماں کے سامنے ہر بات پہ رو رہی تھی۔
"ارے نہیں میری جان۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ ولید کو کیا پتا کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔۔۔؟" ایک اور تسلی اور ایک اور دلیل دی گئی تھی۔
"امی۔۔۔! ولید کو ہی تو پتا ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔۔۔؟"
ماورا کہتے ہوئے پھر سے سسک اٹھی تھی اور عافیہ بیگم اسے چپ کروانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ انتہائی شکست خوردہ سے انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا جب ککو دھیمے قدموں سے چلتی اس کے قریب آ گئی تھی۔ لیکن تیمور کو پھر بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ کوئی اس کے پاس آ کے کھڑا ہوا ہے۔
"ایک بات کہوں تیمور بھائی۔۔۔؟" اس نے بے حد آہستہ سے کہا۔ اب کی بار وہ چونک گیا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ہاں بیٹا کہو؟" اس نے بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے کے قابل کیا تھا۔
"ایک کپ چائے پی لیں۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" ککو نے جیسے التجا کی تھی۔ تیمور نے بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بہت آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"ہوں۔۔۔" تیمور اس کی التجائیہ نظروں کی آس توڑ نہیں سکا تھا۔۔۔ اور خاموشی سے سر جھکالیا تھا۔
"تھینک یو بھائی۔۔۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ اس کے سر جھکانے والی رضامندی پہ خوشی سے کہتی فوراً باہر نکل گئی تھی۔ ولید کہیں کام سے گیا ہوا تھا اور تیمور کو جہاں چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ وہیں کا وہیں بیٹھا ہوا تھا۔
تھوڑی دیر بعد ککو اس کے لیے چائے لے آئی تھی۔
"تھینک یو۔۔۔" تیمور نے بے حد آہستہ سے کہا۔ وہ سر جھکا کے چلی گئی۔
چائے کا کپ سامنے ٹیبل پہ رکھا تھا۔ اس سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی اور وہ اس بھاپ پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا جو رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔
"چائے غالباً پینے کے لیے رکھی گئی ہے۔۔۔ دیکھنے کے لیے نہیں۔" ولید نے اندر داخل ہوتے ہی لقمہ دیا۔۔۔

"کیا بتا۔۔۔؟" تیمور نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔
"تم پہلے چائے پیو۔۔۔" ولید جیسے تھک ہار کے اپنے بستر پہ بیٹھ گیا تھا۔
"نہیں۔۔ !تم بتاؤ مجھے۔۔۔ کچھ پتا چلا۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ پتا چلا اور کافی کچھ پتا چلا ہے۔" ولید نے گہری سانس کھینچی۔
"کیا۔۔۔؟" تیمور کا ایک لفظی سوال بے ساختہ تھا۔
"وہ لوگ قیام مرزا کے گھر پہ ہیں۔۔۔ اور ایک گھنٹہ پہلے قیام مرزا کی فیملی بھی دوبئی سے پاکستان پہنچ چکی ہے۔۔۔ یعنی اب دونوں فیملیز ایک ساتھ ہیں سوائے تمہارے۔۔۔ شیر اور بکری والا کھیل شروع ہو چکا ہے۔" تیمور کو بتاتے ہوئے ولید کا لہجہ اور تاثرات بہت تلخ ہو رہے تھے اور تیمور اس نئی اطلاع پہ جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اتنی اداسی؟" وہ چپ بیٹھی نجانے کس سوچ میں گم تھی کہ مونس مرزا بے آواز قدموں سے چلتا اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ عزت نے یک دم چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا مجھے پسند کرتے ہو؟" عزت نے اچانک ایک غیر متوقع سوال [illegible]۔
"ہاہاہا۔۔۔" مونس مرزا یک دم فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"اف۔۔۔ کتنا معصومانہ سا سوال ہے۔" وہ لطف اندوز ہوا۔
"سوال جیسا بھی ہے۔۔۔ تم مجھے جواب دو۔۔۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا مجھے پسند کرتے ہو؟" اس نے مونس مرزا کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔
"میں تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔ عشق بھی کرتا ہوں۔۔۔ پیار بھی کرتا ہوں اور پسند تو حد سے زیادہ کرتا ہوں۔۔۔ مت پوچھو میں کیا کیا کرتا ہوں۔" اس نے آہ بھرتے ہوئے لمبا چوڑا سا جواب دیا۔
"تو پھر میرے لیے ایک کام کرو۔۔۔ ہیلپ کرو میری۔۔۔" عزت نے اسے بہلا پھسلا کر اپنا کام نکلوانا چاہا تھا۔
"تم حکم کرو۔۔۔ عرض تمہیں زیب نہیں دیتی۔" مونس مرزا اس کو دیکھ دیکھ کے فدا ہوا جا رہا تھا۔
"مجھے ایک فون کال کرنی ہے۔۔۔" عزت نے آہستگی سے کہا۔۔۔ اس کا موبائل رضا حیدر نے کل رات کو ہی چھین لیا تھا۔
"بس؟! اتنا سا کام۔۔۔؟" مونس مرزا کو کسی بڑے کام کی توقع تھی جیسے۔۔۔
"ہاں۔۔۔!" عزت نے اثبات میں سر ہلایا اور مونس مرزا نے اپنا موبائل نکال کر اپنی ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے عزت کے سامنے پیش کر دیا تھا لیکن وہ اس کی ہتھیلی سے موبائل اٹھاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔۔۔!

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صائمہ اکرم چوہدری
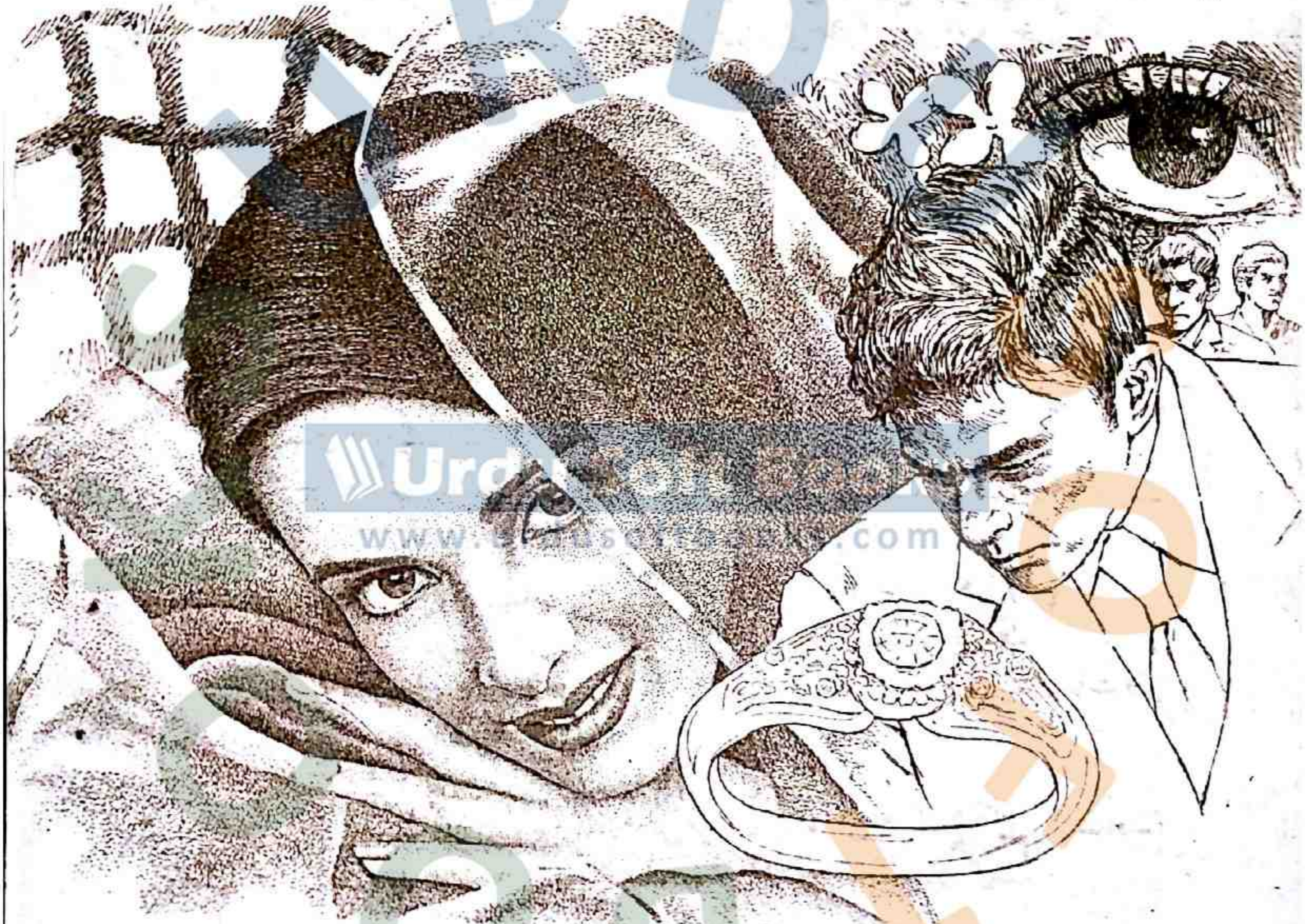
سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہوچکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

ناولٹ
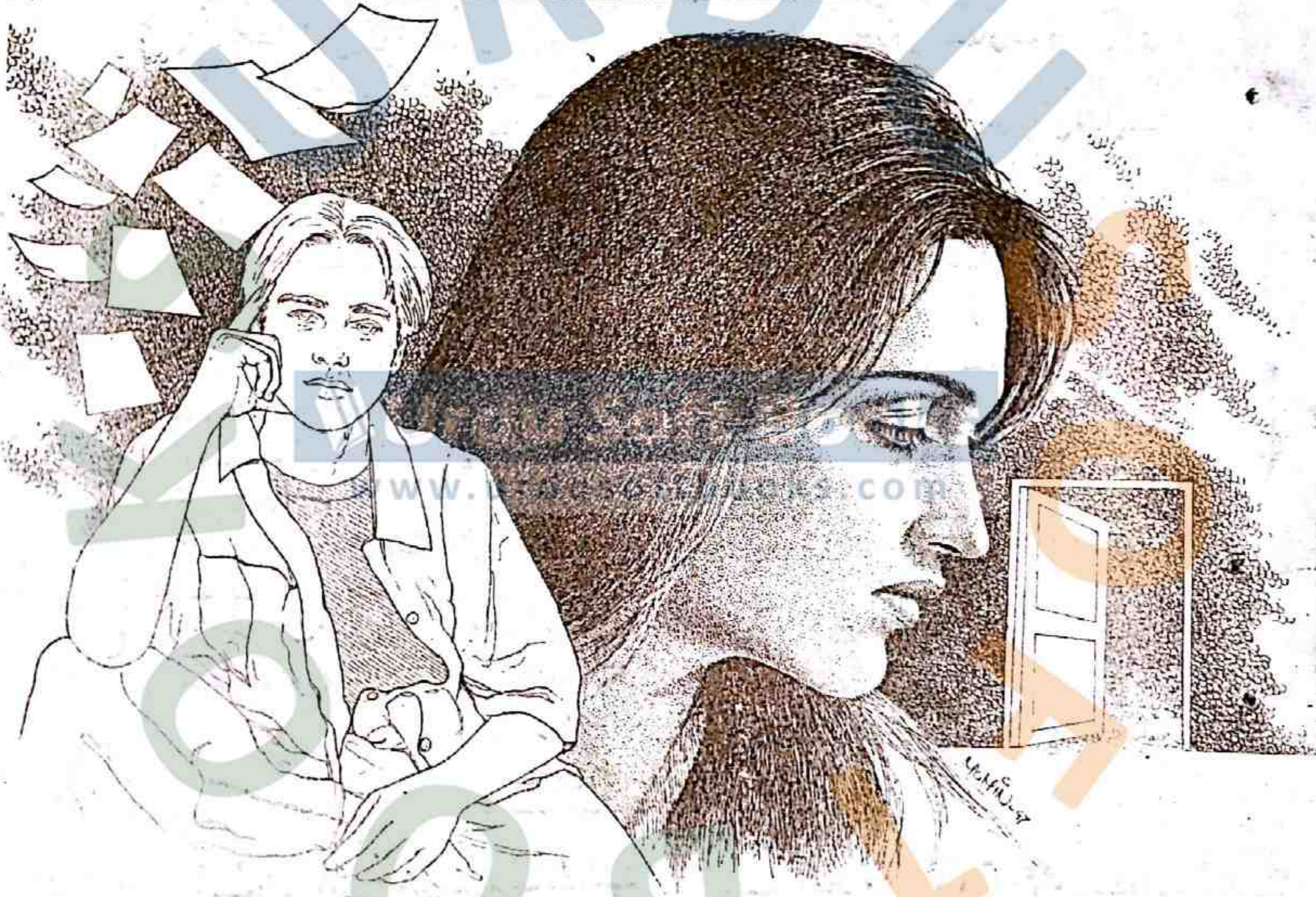
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑجاتا ہے اور وہ گرجاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارصم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہوچکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوادیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کررہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔
شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کردیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔
آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑدی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کردے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔
ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔
ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کردیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہوجاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔
عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہوجاتی ہے۔
شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔
ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔
ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنادیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہوجاتی ہیں۔

سولہویں قسط

آنے والے دنوں کا سورج عدینہ کے لیے اپنے دامن میں بے حد' خوف' وہم اور اندیشے لے کر طلوع ہوا۔ آپا صالحہ کے چہرے پر پھیلی زردی اور نقاہت عدینہ کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کی والدہ کے کئی ٹیسٹ ہوچکے تھے جن کی رپورٹس نے اسے اور زیادہ تشویش میں مبتلا کردیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چھڑی گھما کر اپنی والدہ کو کسی نہ کسی طرح ٹھیک کردیتی۔ ان ہی دنوں اسپتال والوں کی طرف سے آپا صالحہ کو سرجری کی تاریخ بھی دے دی گئی۔ جس کا پتا چلتے ہی آپا صالحہ میں تو لگتا تھا کوئی پارہ بھر گیا تھا۔
"آپ کن چکروں میں پڑگئی ہیں..." عدینہ ان کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو انہیں الماری میں منہ دیے ہوئے دیکھا۔
"تم میرے ساتھ اسٹور میں چلو..." انہوں نے عجیب سی فرمائش کی۔

"آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے' مجھے بتائیں۔ میں جا کر لے آتی ہوں۔" عدینہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم وہاں سے لوہے کا ٹرنک نکلواؤ' مجھے اس میں سے کچھ ضروری چیزیں نکالنی ہیں۔" ان کی بات پر عدینہ حیران تو ہوئی لیکن اس نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔

"آپ اس نیلے ٹرنک کی بات کر رہی ہیں ناں....." اس نے ایک دفعہ پھر تصدیق کے لیے پوچھا۔

"ہاں ہاں وہی....." آپا صالحہ نے لاپروائی سے کہتے ہوئے دودھ کا گلاس منہ سے لگالیا۔ وہ آج کافی مطمئن تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں منگواتی ہوں....." وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد اس نے مدرسے کی چند بچیوں کی مدد سے وہ صندوق اندر منگوالیا تھا' جسے دیکھتے ہی آپا صالحہ کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس صندوق میں آپا کی زندگی کے بہت سے راز چھپے ہوئے ہیں۔ عدینہ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ فوراً" ان کے پاس آکر کھڑی ہوگئی' آپا نے پہلی دفعہ یہ ٹرنک اس کے سامنے کھولا تھا۔ اس میں بے شمار پرانے کاغذات' کپڑے اور کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ اس گھر کی رجسٹری کے کاغذات ہیں' یہ تمہارے باپ نے حق مہر میں میرے نام کردیا تھا اور میرے بعد تم اس کی وارث ہو۔" ان کی بات سے عدینہ کو دھچکا سا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپا اس سے اس قسم کی گفتگو کریں گی۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ.....؟" اس نے شکایتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے....." آپا صالحہ زبردستی مسکرا کر— بولیں۔ "یہ چیک بک ہے۔ میں نے اس پر سائن کردیے ہیں۔ تم سارے پیسے اپنے اکاؤنٹ میں کل ہی ٹرانسفر کرالو۔" ان کی اگلی بات پر وہ ایک دم خوفزدہ ہوگئی۔

"آپ یہ ساری چیزیں مجھے کیوں دے رہی ہیں.....؟"

"اس لیے کہ ان تمام چیزوں پر تمہارا ہی حق ہے۔" وہ سادگی سے گویا ہوئیں۔

"آپ کے ہوتے ہوئے میں یہ سب کچھ کیسے رکھ سکتی ہوں....." عدینہ بوکھلا گئی۔

"اور جس وقت میں نہ رہی تو تمہیں کوئی بتانے والا بھی نہیں ہوگا کہ کون سی چیز کہاں پر ہے۔" آپا صالحہ کی صاف گوئی نے عدینہ کا دل دکھادیا۔

"رہنے دیں آپ....." وہ ناراضی کے اظہار کے طور پر تھوڑا سا رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

"اوں ہوں....." انہوں نے اپنی بیٹی کو ٹوکا "ایسے خفا نہیں ہوتے....."

"تو پھر آپ بھی ایسی باتیں مت کریں....." اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اچھا یہ جیولری دیکھو' تمہارے باپ نے شادی کے بعد تمہاری پیدائش پر تحفتاً" دی تھی مجھے اور

میں نے اسی وقت تمہارے لیے سنبھال کر رکھ لی تھی۔" عدینہ کو نہ جانے کیوں آپا کا لہجہ اس دفعہ نم آلود محسوس ہوا۔ عدینہ نے کچھ سوچا اور بالکل ان کے قریب آبیٹھی۔

"آپا! مجھے ان چیزوں کی قطعاً" ضرورت نہیں۔"

اس نے ماں کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا تو آپا صالحہ نے الجھ کر اپنی بیٹی کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"تو کس چیز کی ضرورت ہے...؟" ان کے منہ سے پھسلا۔

"آپ کے اعتبار کی..." وہ نظریں چرا کر بولی۔

"کیا مطلب...؟" وہ واقعی نہیں سمجھیں۔

"مجھے بس وہ دکھ، غم اور تکلیفیں بتائیں، جنہوں نے اتنے سال سے آپ کے دل کا سکون چھین رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے دل میں پڑی کسی گرہ کو کھول سکوں۔" ایک اعصاب شکن خاموشی کمرے میں پھیل گئی۔

"کیا کرو گی پوچھ کر..." خلاف توقع انہوں نے مزاحمت نہیں کی۔

"میرے دل و دماغ میں بچپن سے بے شمار سوال ہیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ ان سب کے جواب دے دیں مجھے۔" اس نے اٹک اٹک کر کہا، دل ہی دل میں وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں آپا صالحہ اس بات کا برا نہ مان جائیں۔

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو تم..." انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ عدینہ نے چند لمحے سوچا اور ان کے ٹرنک میں ہاتھ مار کر وہ سنگ مرمر کا کتبہ ان کے سامنے کیا، جسے دیکھتے ہی ان کا رنگ اڑ گیا تھا، بولنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کپکپا اٹھے۔

"یہ کتبہ کس کا ہے...؟" عدینہ نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پوچھا۔

"میرا..." آپا صالحہ کے دل میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔

"اچھا ہوا تم نے پوچھ لیا... میں اس کے بارے میں بھی تمہیں بتانا چاہتی تھی۔" انہوں نے اسے مزید حیران کیا۔

"کیا...؟" عدینہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی بڑے راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔

"جب میں مرجاؤں تو تم میری قبر پر یہی کتبہ لگانا۔" ان کی عجیب سی خواہش پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..." وہ خفا ہوئی۔

"موت برحق ہے بیٹا اور ہر انسان کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن آپ میری ماں ہیں اور کون سی اولاد، ایسی باتیں اپنے والدین کے منہ سے سن سکتی ہے۔" اس نے اس دفعہ کھل کر اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ اس کے اس انداز پر آپا صالحہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیں۔

"میں تمہیں جو کہہ رہی ہوں، بس وہ غور سے سنو۔ میری خواہش ہے، جب بھی میرا انتقال ہو تو تم میری قبر پر یہی کتبہ لگانا..."

"لیکن اس پر تو تاریخ وفات بہت سال پہلے کی ہے۔" عدینہ نے الجھن بھرے انداز سے کہا۔

"اس پر جو تاریخ ہے نا، سمجھو تمہاری ماں اسی دن مرگئی تھی..." وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی..." عدینہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔

"جب انسان کسی اپنے کی نظروں سے گرتا ہے نا تو سمجھو، اسی وقت جیتے جی مر جاتا ہے۔" آپا صالحہ کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں لال ہوئیں۔

"یہی وہ دن تھا، جب میں نے دنیا اور آخرت کی ذلت خود اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر ملی۔ میری زندگی وہیں تک تھی جو میں نے جی لی، اس کے بعد تو بس زندہ لاش کی طرح اپنا وقت ہی پورا کیا ہے۔" وہ آج پہلی دفعہ اپنی بیٹی کے سامنے کھلی تھیں۔

"تو پھر آپ کو اس کتبے پر اپنا اصل نام لکھوانا چاہیے تھا..." عدینہ کی بات پر انہیں کرنٹ سا لگا۔

"تمہیں کس نے کہا یہ میرا اصل نام نہیں۔۔۔" وہ ایک پریشان ہوئیں۔

"اس لیے کہ جس کا نام صالحہ ہو' وہ ایسا قدم نہیں اٹھائے گی جو اسے دین و دنیا میں رسوا کردے۔" اس نے بمشکل بات بنائی۔

"تو جس کا نام بختاور ہو' وہ بھی قسمت کی دھنی نہیں ہوتی۔۔۔" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تو آپ کا اصل نام بختاور ہے۔۔۔" عدینہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔ آپا صالحہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہیں۔

"لیکن اس کتبے کو بنانے کا مقصد کیا تھا۔۔۔؟" وہ الجھ کر ان کا مضطرب چہرہ دیکھنے لگی۔

"ایسے ہی۔۔۔" انہوں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"کچھ تو بتائیں پلیز۔۔۔ مجھے اس بات نے بہت سے شکوک میں مبتلا کر رکھا ہے۔" عدینہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"تمہیں لگتا ہو گا کہ یہ تمہارے باپ کی پہلی بیوی کا ہے' ہے ناں۔۔۔" انہوں نے اس کے دل کی بات بوجھی۔ "ایسا نہیں ہے' جب کبھی دنیا کی رنگینیاں مجھے اپنی طرف مائل کرتی تھیں تو میں اسی دن یہ کتبہ نکال کر دیکھ لیتی تھی کہ آخر کار مجھے اس قبر میں جانا ہے' جس پر یہ تختی لگے گی۔ یقین مانو' میرا دل فوراً" اپنی اوقات پر آجاتا تھا۔" اس دفعہ انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔

"لیکن اس کے لیے کتبہ بنوانا ضروری تو نہیں۔۔۔" عدینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میں نے بھی خاص طور پر نہیں بنوایا تھا اسے۔۔۔" انہوں نے نظریں چرائیں۔

"آپا! اپنی زندگی میں جیتے جی کون کرتا ہے ایسی حرکتیں۔۔۔" وہ جھنجلا سی گئی۔

"میرے جیسے پاگل لوگ' جو خود کو اذیت دینے کے لیے نت نئے طریقے ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔" ایک تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آکر ٹھہر گئی۔

"پھر بھی کچھ تو سوچا ہو گا۔۔۔" اس نے اصرار کیا۔

"بس یوں ہی ایک دفعہ ایسی دکان سے گزر ہوا جہاں قبروں کے کتبے بنائے جاتے تھے تو میرے قدم وہاں رک گئے۔ دکاندار نے پوچھا بی بی کسی کی قبر کی تختی بنوانی ہے کیا؟ میرا سر اثبات میں ہل گیا۔

"اس نے پوچھا نہیں کس کی۔۔۔؟" عدینہ حیران ہوئی۔

"پوچھا تھا میں نے کہا' ایک رشتے دار خاتون کی' اور اس کے کہنے پر اپنا نام اور تاریخ پیدائش بتادی اور ایسا بالکل لاشعوری طور پر ہوا۔" ان کی اس بات پر عدینہ کو ان کی ذہنی حالت پہ شبہ ہوا۔ وہ کھوجتی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیکن جب اس نے تاریخ وفات پوچھی تو میرے ذہن میں وہی دن آیا جس دن میں نے اس لادین ملحد شخص ہاشم سے کورٹ میرج کر کے اپنے لیے جہنم کی آگ خریدلی تھی۔" آپا صالحہ نے آخر کار اس راز سے پردہ اٹھا ہی دیا۔ ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور خود کو رونے سے روکنے کے لیے انہیں کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔

عدینہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ وہ ہونٹ بھینچے' خاموشی سے ان کی زندگی کی داستان سننے لگی۔

☆ ☆ ☆

شانزے کے فلیٹ میں آج ایک عجیب سی عدالت سجی ہوئی تھی۔۔۔ جہاں ہاشم رضا اپنی بیٹی کے سامنے موجود تھا۔ جسے وہ کسی صورت بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ شانزے کے چہرے پر ناراضی' دکھ' بے یقینی اور کیا کچھ نہیں تھا۔ وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

ایئرپورٹ پر ہونے والی اس ملاقات میں شانزے نے آخر کار انہیں پہچان ہی لیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تقدیر کبھی اس شخص کو اس کے سامنے

لے آئے گی جس کا کردار باپ کی حیثیت سے اس کی زندگی کی کتاب سے بہت سال پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا...؟" شانزے روتے روتے ایک دم چیخی۔

"ایک لمحے کے لیے بھی میرا خیال نہیں آیا آپ کو۔"

اس نے بدگمانی سے اپنے باپ کو دیکھا جو اس وقت کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس وقت شانزے کے فلیٹ میں موجود تھے۔ شانزے پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل رو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہاشم رضا کے حلق سے سارے سوالات کے جواب ایک دم اگلوا لے، جب کہ ان کے ہونٹوں پر تو گہری چپ کا تالا تھا۔

"آپ دونوں ہی حد درجہ خود غرض انسان تھے۔ دونوں نے صرف اپنے لیے سوچا اور نئی زندگی بسانے چل پڑے۔" وہ استہزائیہ نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"معاف نہیں کروں گی میں، آپ کو بھی اور اس عورت کو بھی جس نے مجھے جنم دیا۔" اس نے فرد جرم عائد کی۔

ہاشم رضا کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں انگارہ بن گئیں۔ پچھلے ایک گھنٹے میں وہ پورا ایک جگ پانی پی چکے تھے لیکن پیاس تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لفظ تھے کہ ان کا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے تھے۔

"کسی ایک نے بھی میرا خیال نہیں کیا، دونوں سر سے اتار کر پھینک کر چلے گئے اور دوبارہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔" شانزے کے لبوں پر ایک اور شکوہ مچلا۔

سامنے بیٹھے شخص نے ایک دفعہ پھر شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اس کے پاس اپنی بیٹی کے سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب موجود نہیں تھا اور کوئی اس وقت ڈاکٹر ہاشم رضا کو اس طرح سر جھکائے بیٹھے دیکھ لیتا تو اسے اپنی بصارت پر بالکل یقین نہ آتا کہ اس شخص کے سامنے ہزاروں کا مجمع ساکت ہو جاتا تھا۔ وہ اس وقت بالکل ایسے تھے جیسے ان کی قوت گویائی چھن گئی ہو۔ وہ شخص جس کی گفتگو میں دلائل کا سمندر بہتا تھا، اس وقت اس کی زبان پر مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک حشر برپا تھا لیکن وہ بے بس انداز سے اپنی اس بیٹی کو دیکھے جا رہا تھا جسے وہ اس وقت چھوڑ کر ملک سے باہر چلا گیا تھا جب وہ صرف چند دن کی تھی۔

"بتائیں ناں، کیوں کیا، آپ نے ایسا؟ کیا انسان اتنا بھی بھٹک سکتا ہے۔" شانزے اب ان کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ صورت میں ہو بہو اپنی ماں کی کاپی تھی جبکہ مزاج اس نے اپنے باپ کا چرایا تھا۔

"آپ بولتے کیوں نہیں ہیں اب..." وہ ایک دم چڑ کر بولی۔

"کیا بولوں..." ڈاکٹر ہاشم کی آنکھوں میں بے بسی کے سب ہی رنگ تھے۔

"کچھ بھی، جسے سن کر میرے اتنے سالوں کی محرومی، اذیت اور تکلیف کا مداوا ہو جائے..." شانزے کے لہجے میں بہت سے ان کہے دکھ ایک ساتھ جھلکے جسے سن کر ہاشم رضا بے چین ہو گئے لیکن اب بھی ان کے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

"آپ کے اور بہن بھائی بھی تو تھے، کسی نے بھی ایسا نہیں کیا۔ آپ نے ہی یہ مشکل راستہ کیوں چنا...؟" اس نے ایک اور شکوہ کیا۔

"بیٹا، بس سمجھ لو... کسی کے لہجے سے جھلکتے غرور کی سزا دینے کے لیے چن لیا گیا تھا مجھے..." ہاشم رضا کی بات پر شانزے کو جھٹکا لگا۔

ان کی یہ بات اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید ان سے بحث کرتی، اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ ہاشم رضا جلدی سے کھڑے ہوئے۔ شانزے نے انہیں روکنا چاہا لیکن اس وقت اس کا دماغ ان کے کہے ہوئے فقرے میں الجھا ہوا تھا کہ کسی کے غرور کی سزا انہیں ملی۔ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے اور گمراہی سے ہدایت کا سفر انہوں نے کیسے طے کیا۔ اس وقت سوالات بے شمار تھے لیکن شاید انہیں پوچھنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھلا اور ہاشم رضا کے ساتھ آتے ماہیر کو دیکھ کر شانزے کا

دماغ بھک کرکے اڑا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ باپ کے سامنے ہونے والی اس پہلی ملاقات میں ہی ماہیر کی آمد ہو جائے گی۔ کچھ دیر پہلے اس نے جو عدالت اپنے باپ کے لیے سجا رکھی تھی' اب اسی کٹہرے میں اسے کھڑا ہونا تھا کیونکہ ہاشم رضا الجھن بھرے انداز سے کبھی شانزے کو اور کبھی ماہیر کو دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ رات بہت عجیب رات تھی۔۔۔ بہت سے رازوں کی پوٹلیاں ایک ایک کرکے کھل رہی تھیں۔ عدینہ منہ کھولے اس داستان ہوشربا کو سن رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپا صالحہ کے سینے میں اتنے راز دفن ہوں گے۔ وہ اسے اپنے اور ہاشم کے متعلق تفصیل سے بتا چکی تھیں۔

"اس رات جب میں مظفر آباد جانے کے لیے راولپنڈی سے نکلی تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ مجھے اس طرح موت کے منہ میں جانے سے بچالے گا۔" آپا صالحہ کی آنکھیں رونے کی زیادتی سے متورم ہو چکی تھیں۔

"اینٹی الرجک میڈیسن کی دو گولیاں کھانے کے بعد میرا ذہن بالکل سوچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوسٹر مسافروں کو تھوڑی دیر ریسٹ کرانے کے لیے ایک مخصوص اسٹاپ پر رکی تو وہاں بے شمار ہوٹل تھے اور بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔" انہوں نے اپنے ماضی کا تلخ باب کھولا۔

"پھر کیا ہوا۔" عدینہ نے بے تابی سے ان کی بات کاٹی۔

"میں واش روم جانے کے لیے اٹھی اور وہاں ایک ہوٹل کے قریب مجھے چکر آیا اور میں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ایک میاں بیوی مجھے اٹھا کر ایک قریبی اسپتال میں لے گئے جہاں ایک گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا اور وہ لوگ مجھے ڈاکٹر کو دکھا کر اور میڈیسن دلوا کر کوسٹرز کے اڈے پر پہنچے تو بس وہاں سے جا چکی تھی۔" آپا صالحہ نے اس رات ہونے والے اصل واقعے کو تفصیل سے بیان کیا۔

"تو پھر آپ آزاد کشمیر کیسے پہنچیں۔۔۔؟" عدینہ کا سانس رک گیا۔

"مت پوچھو' کیسی قیامت خیز رات تھی وہ' میں ان میاں بیوی کے ساتھ بالکل اکیلی اور تنہا تھی لیکن اللہ انہیں اس نیکی کا اجر دے' جو اس رات انہوں نے میرے ساتھ کی۔" آپا صالحہ کی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو پھسلے۔

"میرے سارے کپڑے "اسناد' ڈاکومنٹس' سب کچھ میرے بیگ میں تھا جو اس بس کے ساتھ چلا گیا تھا' لیکن اللہ کا شکر تھا کہ میرا ہینڈ بیگ میرے پاس تھا۔ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے مظفر آباد جانے والی ایک اور کوسٹر میں سوار کرایا اور جب میں وہاں پہنچی تو پتا چلا کہ وہ پچھلی بس حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔" آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" عدینہ بے چین ہوئی۔

"میری دوست نیلم اور اس کے والدین نے میرا بہت ساتھ دیا۔ نیلم کے والد آرمی میں بہت اچھی پوسٹ پر تھے۔ انہوں نے ہی میرے سامان کے لیے بھاگ دوڑ کی تو انہیں پولیس اسٹیشن سے پتا چلا کہ اس لڑکی کے والدین سے وہ پہلے ہی رابطہ کر چکے ہیں' کیونکہ انہیں ایک لڑکی کی ڈیڈ باڈی پر میرا گمان ہو رہا تھا۔" آپا صالحہ ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"تو آپ کے پیرنٹس نے کیا کہا انہیں۔۔۔؟" اسے فوراً" تجسس ہوا۔

"انہوں نے وہ کٹی پھٹی لاش وصول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ سامان تو نیلم کے بابا نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرکے نکلوا لیا تھا لیکن۔" ان کا لہجہ گلوگیر ہوا اور وہ چپ ہو گئیں۔

"لیکن کیا۔۔۔؟" عدینہ نے بے تابی سے ان کی بات کاٹی۔

"پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں ان کے۔۔لیے کس قدر قابل نفرت تھی' انہوں نے اپنی مری ہوئی بیٹی کا

منہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا، پتا نہیں کس بدقسمت لڑکی کی لاش تھی لیکن میرے منہ پر طمانچہ مار کر مجھے میری اوقات یاد دلا گئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودیں۔

عدینہ کا بھی دل بھر آیا اس نے اپنے ہاتھ سے ان کے چہرے پر پھیلتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

"اگر نیلم اور اس کے والدین نہ ہوتے تو شاید میں کسی پہاڑی سے کود کر خودکشی کرچکی ہوتی یا زہر کھا کر مرگئی ہوتی۔ مجھ جیسی لڑکیوں کو تو مرہی جانا چاہیے۔" وہ خود اذیتی کا شکار ہوئیں۔

"آپا! اتنا کچھ آپ اکیلے ہی برداشت کرتی رہیں۔" عدینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"جب اکیلے اتنا بڑا قدم اٹھایا تو اس کی سزا بھی اکیلے ہی بھگتنا تھی۔ دعا کرو بیٹا، میرا رب مجھے معاف کردے..." آپا صالحہ پہلی دفعہ کھل کر اس کے سامنے اپنے دکھ پر روئی تھیں۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں دنیا بھر کی لڑکیوں کو بتاؤں گھر سے بھاگ کر اور والدین کی ناراضی کے ساتھ جو فیصلے کیے جاتے ہیں، ان میں دنیا تو انسان کے ہاتھ سے جاتی ہی ہے، لیکن بعض دفعہ دین بھی چلا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ہوش مندی سے فیصلے کریں۔" وہ اب ہچکیاں لے کر رو رہی تھیں۔

عدینہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں پہلی دفعہ آئی تھی کہ آپا اس کے اور عبداللہ کے درمیان کیوں اتنا زیادہ فاصلہ رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ اس ان دیکھی آگ سے اپنی بیٹی کو بچانا چاہتی تھیں جس میں وہ خود کئی سالوں سے جل رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

پچھم سے اٹھنے والی آندھی نے ایک دم ہی طوفان برپا کردیا...

مارگلہ کی پہاڑیاں، سڑکیں، درخت سب کچھ مٹی سے بھر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گرد کا طوفان ہے۔ ایک بگولہ سا اوریدا کے صحن میں بھی گول گول چکر کاٹ رہا تھا۔ جسے وہ غائب دماغی سے دیکھنے میں مگن تھی۔

"لو! اب اسلام آباد میں بھی آنے لگیں آندھیاں، تو باقی ملک کا تو اللہ ہی حافظ..." بوا رحمت بڑبڑاتے ہوئے پچھلے صحن سے دھلے ہوئے کپڑے جلدی جلدی اکٹھے کر رہی تھیں۔ برآمدے میں رکھے جھولے پر بیٹھی اوریدا کی نگاہیں بوا پر اور ذہن کہیں اور تھا۔

"توبہ توبہ... سفید کپڑوں کا تو بیڑا غرق ہی ہوگیا آندھی میں۔" بوا رحمت نے کپڑوں کی ایک پوٹلی اس کے جھولے میں لا پھینکی اور غور سے اوریدا کا افسردہ چہرہ دیکھا اور تعجب کے اظہار کے طور پر ناک پر انگلی رکھ لی۔

"بٹیا رانی، خیر تو ہے نا، آج کل بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہوجاتی ہو...."

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا بوا..." اوریدا ایک دم چونکی۔

"ظاہری سی بات ہے، اب میں ان دیواروں یا اس جھولے سے تو کہنے سے رہی۔" بوا رحمت ہنس پڑیں۔

"کیا کہہ رہی تھیں آپ..." وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئی۔

"خدانخواستہ باہر کی کسی چیز نے ذہن پر اثر تو نہیں کردیا۔ جو کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی۔" بوا رحمت اپنے پوپلے منہ کے ساتھ ہنسیں تو اوریدا کو غصہ آگیا۔

"بوا! ہر وقت کا مذاق بھی اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا پتا، انسان کس سچویشن میں بیٹھا ہے۔" وہ غصے سے جھولے سے اتری اور فوراً" ہی پاؤں پٹختی ہوئی اندر کی طرف بڑھی جیسے ہی اس نے لاؤنج کا دروازہ کھولا، سامنے سے آتے بڑے ابا کے ساتھ ٹکرائی اور بوکھلا گئی۔

"خیر تو ہے بہت عرصے کے بعد یہ ٹکریں مارنے والا سلسلہ شروع کیا ہے آپ نے۔" ڈاکٹر جلال کے ہلکے پھلکے لہجے پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"آئی ایم سوری، بڑے ابا..." وہ ایک دم ہی

شرمندہ ہوئی۔
"ذرا اچھی سی ایک کپ کافی تو بنا کر لائیں..." وہ مسکراتے ہوئے اپنے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئے۔
"یا اللہ! آج سورج کہاں سے نکلا ہے..." وہ وقتی طور پر ارصم کے رویے سے ہونے والی پریشانی سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ بڑے ابا کے کمرے میں تھی۔
"یہ ارصم کے رزلٹ والی بات درست ہے کیا...؟" انہوں نے اچانک ہی پوچھا۔ اوریدا گڑبڑا گئی۔
"جی ابا..." اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا جیسے اس کے فیل ہونے کی بڑی وجہ وہی ہو۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"
"آج CPSP (کالج آف فزیشن اینڈ سرجنز) کے ریجنل آفس میں پروفیسر ہمدانی صاحب ملے تھے ' بتا رہے تھے کہ ارصم کے آغا جی پچھلے دنوں کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے اس کے سلسلے میں..." انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔
"آغا جی یا بینش آنٹی نے نہیں بتایا آپ کو...؟" اوریدا کو حیرانی ہوئی۔
"بینش صرف اپنی اور اپنی اولاد کی کامیابی کی خبریں ہی شیئر کرنے کی عادی ہے۔" ان کا استہزائیہ انداز اوریدا کو عجیب لگا' وہ الجھ گئی۔
"خیر چھوڑو۔ عدینہ کی والدہ کو سرجری کی ڈیٹ مل گئی ہے۔ تم سے رابطہ ہوا اس کا۔" انہوں نے اچانک ہی بات بدلی۔
"آپ کو پتا تو ہے ' آج کل — چھٹیاں ہیں۔ وہ گھر گئی ہوئی ہے اپنے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"وہ آپ کی دوست ہے بیٹا اور اس کی والدہ کینسر کی پیشنٹ ہیں ' اسے اس مشکل وقت میں ضرورت ہوگی ۔ آپ کو رابطے میں رہنا چاہیے اس سے۔" ڈاکٹر جلال نے اسے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔
"آئی ایم سوری بڑے ابا ' بس دھیان نہیں رہا..."
اس نے فوراً" ہی اپنی غلطی مان لی۔
"اچھا جاؤ اور اپنی بڑی اماں کو بھیجو میرے پاس..."
ان کی بات پر وہ فوراً" ہی سر ہلاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی ' اچانک بڑے ابا نے اسے پیچھے سے اس کا نام لے کر پکارا۔
"جی بڑے ابا..." وہ فوراً" مڑی۔
"کوئی پرابلم ہے آپ کے ساتھ...؟" وہ اس دفعہ جانچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔
"نن نہیں... ایسی کوئی بات نہیں..."
"جب زندگی میں کوئی درست فیصلہ درست موقعے پر کر لیتے ہیں تو پھر اس پر بار بار نہیں سوچتے۔" ڈاکٹر جلال کے جتاتے ہوئے لہجے پر اوریدا کی سانس اٹک گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا جو میڈیکل کی کسی کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔
"اگر فیصلہ درست ہو تو ہمیں سکون کیوں نہیں آتا بڑے ابا...؟" وہ وہیں کھڑے کھڑے تھوڑا سا جھجک کر بولی۔
"ادھر آکر میرے پاس بیٹھو..." ان کا نرم لہجہ اوریدا کو اچھا لگا تھا۔ وہ خاموشی سے ان کی کرسی کے پاس رکھے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔
"سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ اوریدا..." انہیں اس کا اپنے قدموں میں بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔
"مجھے اچھا لگتا ہے ' آپ کے سامنے اس طرح بیٹھنا..." اوریدا کے بے ساختہ انداز میں بولے گئے جملے نے ' ان کے زخموں کے کئی ٹانکے بے دردی سے ادھیڑ دیے ' انہیں شاک سا لگا اور انہوں نے ایک دم چونک کر اپنی اس پوتی کو دیکھا ' جو اپنی پھپھو کی ساری شباہت چرا لائی تھی۔
"بتائیں ناں بڑے ابا..." اس نے نم — آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ دیکھنا ڈاکٹر جلال کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی نظریں ہٹائیں۔ اس کی شکل ہی نہیں انداز بھی بختاور عرف ڈیزی سے ملتے تھے۔

"جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر اس پر بار بار نہیں سوچتے' کیونکہ شیطان' درست فیصلہ کرنے پر انسان کو بار بار بہکاتا ہے۔" وہ بمشکل خود پر ضبط کر کے گویا ہوئے۔ وہ اس موضوع پر اس سے گھما پھرا کر ہی بات کر سکتے تھے۔

"ایسی صورت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے....؟" وہ مدد طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"انسان کو اللہ سے رجوع کرنا چاہیے' وہ اپنے بندے کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"ایک بات کہوں بڑے ابا....؟" وہ تھوڑا سا جھجک کر بولی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر کسی انسان سے کوئی غلطی ہو جائے اور وہ اللہ کے سامنے توبہ کر لے' تو وہ معاف کر دیتا ہے نا....؟"

"ہاں' بالکل...." ڈاکٹر جلال نے فوراً جواب دیا۔

"ہم بھی تو اسی اللہ کے بندے ہیں' ہم ایسا کیوں نہیں کرتے....؟" اوریدا کی بات نے انہیں تعجب میں مبتلا کیا۔ وہ بہت کم ان کے سامنے بولتی تھی لیکن کچھ عرصے سے دادا اور پوتی کے درمیان فاصلے بہت تیزی سے کم ہو رہے تھے۔

"وہ ذات تو غفور الرّحیم ہے' اس کی رحمت اور ظرف کا کسی انسان کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔" ڈاکٹر جلال پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔

"لیکن ماں باپ کا دل اور ظرف تو بڑا ہونا چاہیے نا اپنی اولاد کے معاملے میں۔" اوریدا کا لہجہ اس دفعہ عجیب لگا انہیں۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو اوریدا....؟" انہوں نے جانچتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا' وہ کشش و پنج کا شکار تھی۔

"پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے یا نہیں' ایک غلط فیصلہ بابا نے کیا اور اس کی سزا لمبی جدائی کی صورت میں بھگتی' ایک فیصلہ آپ نے طیبہ پھپھو کے لیے غلط کیا اور اس کی سزا پھپھو نے اکیلے بھگتی اور آپ سے خفا ہو گئیں۔" وہ بولتے بولتے رکی اور اس نے ڈاکٹر جلال کا مضطرب چہرہ دیکھا "کاش آپ سب لوگ ایک دوسرے کو معاف کر دیں تو کتنی زندگیاں پرسکون اور آسان ہو جائیں۔ یہ بات مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں ہے بڑے ابا' اس پر سوچیے گا ضرور...." وہ ان کا سارا سکون برباد کر کے بڑے آرام سے کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر بینش اور آغا جی کے گھر کے ماحول میں عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔ بینش کئی دنوں سے نہ تو اسپتال جا رہی تھیں اور نہ ہی دوسرے اسپتالوں سے آنے والی کالز کا ڈھنگ سے جواب دے پا رہی تھیں۔ ان کے پورے وجود پر پژمردگی' مایوسی اور غم کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس دن خلاف توقع آغا جی ان کے بیڈ روم میں چلے آئے' وہ جو راکنگ چیئر پر بیٹھی تھیں' انہیں دیکھ کر زبردستی مسکرائیں۔

"آغا جی خیریت' آپ مجھے بلوا لیتے....؟" وہ باپ کے احترام میں فوراً کھڑی ہوئیں۔

"ایک ضروری بات کرنی تھی' اس لیے سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔" وہ سنجیدہ انداز میں کہتے ہوئے سامنے رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کوئی پریشانی والی بات تو نہیں...." آج کل بینش کو عجیب و غریب وہم ستانے لگے تھے۔

"پریشانیوں نے تو لگتا ہے اس گھر کا راستہ ہی دیکھ لیا ہے۔" بات کرتے ہوئے آغا جی پہلی دفعہ بینش کو بہت بوڑھے اور ضعیف لگے۔

"کک کیا ہوا؟ کیا ارصم نے پھر کچھ کر ڈالا....؟" وہ بے چینی سے گویا ہوئیں۔

"کچھ کر ہی تو نہیں رہا' یہی بات تو تشویش کا باعث ہے۔" انہوں نے فکرمندی سے اپنے ماتھے کو مسلا۔

"وہ آج کل کالج نہیں جا رہا۔" انہوں نے وہ بم پھوڑ ہی دیا' جو وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے بغل میں چھپائے بیٹھے تھے۔

"اوہ میرے خدایا...." بینش مضطرب انداز میں کھڑی ہو گئیں' "میڈیکل کالج میں اتنی غیر حاضریوں کا

مطلب وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

"پہلے اس کے باپ کے بیسٹ فرینڈ بریگیڈیئر منصور سے کہہ کر اتنی مشکل سے اس کے پیپرز نکلوائے، پھر اس کے پروفیسرز سے اچھی علیک سلیک تھی تو معاملہ آسانی سے حل ہو گیا لیکن اب سفارش یا اپروچ سے اس کی حاضری تو مکمل نہیں کرائی جاسکتی۔" انہوں نے کھل کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"یہ دو پیپرز تو اسے پاس کرنے ہی پڑیں گے....."

"اتنا ذہین' لائق فائق بچہ تھا میرا۔ ہمیشہ پوزیشن لیتا تھا' کسی بدخواہ کی نظر ہی کھا گئی اسے ....." بینش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"یہ سب باتیں ٹھیک سہی لیکن اسے اس طرح برباد ہونے کے لیے بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔" ان کی بات درست تھی۔

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے آغا جی....." بینش ایک دم پرجوش ہوئیں۔

"کیا.....؟"

"آپ ڈاکٹر فواد سے اپائنٹمنٹ کیوں نہیں لیتے' ارصم کے لیے.....؟"

"ڈاکٹر فواد جو کہ سائیکاٹرسٹ ہیں....." آغا جی نے الجھ کر پوچھا۔

"ہاں ہاں وہی' ہوسکتا ہے' دو چار سیشن کے بعد ٹھیک ہوجائے ارصم' اور وہ اسے ٹریک پر لے آئیں۔" بینش پرامید لہجے میں بولیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ چلا جائے گا اس کے پاس....." آغا جی نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا مطلب.....؟"

"یہ تمہاری بھول ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جایا جاسکتا ہے۔" آغا جی نے ان کے خوش فہمی کے غبارے میں سے ایک دم سوئی مار کر ساری ہوا نکالی۔

"اچھا خاصا ایجوکیٹڈ' سینس ایبل بچہ ہے' مان جائے گا۔" بینش نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے' کوشش کر کے دیکھ لو' مجھے تو کوئی امید نہیں....." ان کی صاف گوئی بینش کو تڑپا گئی۔

"میری کہاں سنے گا وہ' آپ کریں نا اس سے بات.....؟"

"آج کل تو وہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتا تک نہیں' بات کیا خاک کرے گا۔" انہوں نے تپ کر جواب دیا۔

"تو پھر کس سے کہوں.....؟" وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوگئیں۔

"جلال بھائی سے بات کر کے دیکھو....." انہوں نے ایک نئی راہ سجھائی جو اس وقت بینش کو بالکل نہیں بھائی۔

"تایا ابا کی بھی کہاں سنے گا وہ' آج کل تو وہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کر رہا۔" انہوں نے نظریں چرا کر سراسر انہیں ٹالا تھا' ورنہ دل میں تو وہ بھی جانتی تھیں کہ تایا ابا بھی ارصم سے کافی خفا تھے اور جس سے وہ ناراض ہوتے' بالکل ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے۔ اس لیے ان سے بھی مدد کی کوئی امید نہیں تھی۔

"فی الحال تو اچھی سی چائے پلواؤ' پھر سوچتے ہیں۔ میرا تو دماغ تھک گیا ہے۔" آغا جی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر تھکے تھکے انداز میں کہا تو بینش سرہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼
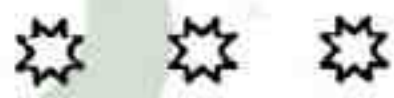
ارصم پچھلے ایک گھنٹے سے لان میں بیٹھا اسموکنگ کر رہا تھا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھتی اوریدا کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا' پرانی سی جینز پر اس نے ایک بوسیدہ سی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی' شیو بڑھی ہوئی اور بال بے ترتیبی سے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس حلیے میں وہ اپنے آپ سے ہی بے زار لگ رہا تھا۔ اس کا یہ حلیہ اوریدا کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔

"یہ ارصم ہے نا....." تیمور صاحب' ماہیر کے ساتھ

ابھی ابھی اسپتال سے معائنہ کرا کر آئے تھے۔ دونوں کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی جب تیمور کی نظر لان میں اکیلے بیٹھے ارصم پر پڑی۔

"جی ہے تو وہی...." ماہیر نے گاڑی کا ہینڈ بریک کھینچ کر دروازہ کھولا اور دونوں باپ بیٹا باہر نکل آئے۔

"یہ اس نے کیا مجنوں جیسا حلیہ بنا رکھا ہے....؟"

تیمور کو اسے دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا۔

"رزلٹ اچھا نہیں آیا اس کا' دو پیپرز میں لڑھک گیا ہے۔" ماہیر نے غیر سنجیدگی سے انہیں بتایا۔

"اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ انسان' اپنا ایسا حلیہ بنا کر اسموکنگ شروع کر دے۔" تیمور کو ہلکا سا غصہ آیا۔

"آج کل تو اس نے آنٹی بینش اور آغا جی کو بھی اچھے خاصے ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا ہے۔" ماہیر نے انہیں ایک نئی اطلاع دی' جسے سن کر تیمور اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکے۔ وہ آہستہ سے ارصم کی طرف بڑھے جو اپنی سوچوں میں گم' ساری دنیا سے بے نیاز بیٹھا تھا۔

بینش جو کہ ارصم کی تلاش میں اپنے پورشن سے ابھی ابھی باہر نکلی تھیں' وہ لان میں ارصم کے پاس تیمور اور ماہیر کو دیکھ کر سخت کوفت کا شکار ہوئیں' تیز تیز قدم بڑھا کر وہ ان تینوں کی جانب بڑھیں۔ تیمور اور ماہیر کی ان کی جانب پشت تھی جبکہ ارصم سر جھکائے پاؤں سے زمین کھرچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دو پیپرز میں پاس نہ ہونا اتنی بھی بڑی بات نہیں' جس کی سزا تم خود کو دے رہے ہو۔" تیمور کے لہجے میں چھپی برہمی بینش کو کم از کم اپنے بیٹے کے لیے اچھی نہیں لگی تھی۔

"اپنا نہیں تو اپنی ماں کا ہی کچھ خیال کرو۔ ساری زندگی اس نے اکیلے کاٹ دی' ورنہ جس عمر میں وہ بیوہ ہوئی تھی' اس عمر میں تو اکثر لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔" تیمور کے جذباتی انداز نے بینش کے پاؤں جکڑ لیے۔ ایک لمحے کو وہ سن ہو گئیں۔ تیمور سے اس رویے کی انہیں کہاں توقع تھی' وہ تو ساری ہی دنیا کو اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔

"تمہیں کچھ احساس ہے اس کا' تمہارے علاوہ ہے ہی کون اس کا۔ اب تم اپنی ماں کو اس عمر میں تکلیف دو گے؟ تم سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی مجھے۔" وہ ان کی اولاد کو سمجھا رہا تھا' جس کے لیے وہ ساری زندگی تایا ابا کے سامنے زہر اگلتی آئی تھیں۔ "کیا کچھ نہیں کیا بینش نے تمہارے لیے؟ وہ چاہتی تو دوسری شادی کر کے آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔" تیمور نے اب محبت بھرے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا' ارصم کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

"خبردار! مرد روتے نہیں ہیں۔" انہوں نے بے ساختہ ہی اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس سے زیادہ دیکھنا بینش کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ جس طرح چپکے سے آئی تھیں' اسی طرح خاموشی سے واپس پلٹ گئیں۔

"کیا ہوا! ارصم نہیں آیا تمہارے ساتھ....؟" انہیں اکیلے آتا دیکھ کر آغا جی حیران ہوئے۔

"وہ لان میں نہیں تھا۔" انہوں نے جھوٹ بولا۔

"اچھا' مجھے تو ملازمہ کہہ رہی تھی کہ وہ وہاں بیٹھا اسموکنگ کر رہا ہے۔" وہ حیران ہوئے۔

"شاید کہیں باہر نکل گیا ہو گا۔" وہ نظریں چرا کر بولیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کا دل بھر آیا۔ وہ قالین پر بیٹھ گئیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر اونچی آواز میں رونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

بڑی اماں نے آج بہت عرصے کے بعد اسٹور کی صفائی کرائی تھی۔ اسی صفائی کے دوران بختاور عرف ڈیزی کی بہت سی چیزیں ان کے ہاتھ لگی تھیں' جسے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی کیونکہ آج بختاور کی برسی بھی تھی۔ بہت سال پہلے اسی تاریخ کو اس کے مرنے کی اطلاع آئی تھی۔ اس دن طیبہ اپنی ماں سے ملنے ضرور آئی اور یہ اس کی

برسوں کی عادت تھی۔

"آپ کیوں ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر خود کو اذیت دیتی ہیں، مرچکی ہیں وہ..." طیبہ نے اپنی ماں کو گلے لگا کر تسلی دی۔

"اسی بات کا تو یقین نہیں آتا کہ اتنی خاموشی سے کیسے چلی گئی وہ..." بڑی اماں ایک دم رو پڑیں۔ ان کے ہاتھ میں بختاور کا وہ دوپٹہ تھا جس پر اس نے فرمائش کرکے کروشیے کی بیل بنوائی تھی۔

"نہیں ہر کام ہی چپکے سے کرنے کی عادت تھی، جیسے چوری چوری نکاح کیا اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور اس سے بھی زیادہ سکون سے دنیا سے چلی گئیں۔ اور پیچھے رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے آنسوؤں اور اذیت کا تحفہ دے گئیں۔" طیبہ کا لہجہ بھی نم ہوا۔

"کاش تمہارے بابا ڈیڈ باڈی گھر لانے کی اجازت دے دیتے، کم از کم یہ تسلی تو ہوتی کہ اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے اسے۔" بڑی اماں نے اپنی ململ کے سفید دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

"انہوں نے ساری زندگی غلط فیصلے کرنے کے علاوہ کیا ہی کیا ہے۔" طیبہ ایک دم تلخ ہوئیں۔

"کیا تھا اگر وہ اس لڑکے سے مل لیتے، کم از کم اپنی بیٹی سے تو نہ ہاتھ دھونا پڑتے انہیں۔" وہ دونوں ماں بیٹی باتیں کرتے کرتے لاؤنج کی طرف نکل آئی تھیں، جہاں سرمد بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی بڑی اماں کو سلام کیا۔

"اچھا چھوڑو تم پرانی باتوں کو، اب ان کو دہرانے کا کیا فائدہ۔" بڑی اماں نے سرمد کے سلام کا جواب دے کر بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

"بات غلط فیصلوں کی نہیں ہے اماں، بات احساس کی ہے، آج تک بابا کو اس چیز کا احساس نہیں ہوا۔"

"تمہاری شادی والے فیصلے پر تو بہت پچھتاتے ہیں وہ..." انہوں نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"ہونہہ۔ رہنے دیں..." انہوں نے ناگواری سے سر کو جھٹکا دیا۔ اسی وقت سرمد نے انہیں اشارہ کیا، جو بڑی اماں کی زیرک نگاہوں سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے سرمد میاں، یہ اپنی ماں کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟" انہوں نے فوراً ہی ٹوکا۔

"کچھ نہیں اماں، آج میں ایک خاص بات کرنے آئی ہوں تیمور سے..." طیبہ نے ہلکا سا سنبھل کر کہا تو وہ چونک گئیں۔

"کیسی بات...؟" انہوں نے حیرانی سے اپنی بیٹی کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"آپ سے تو ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں، لیکن آپ ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی ہیں۔" طیبہ نے ان سے بھی شکوہ کیا۔

"آئے ہائے، اب تو یوں کا رخ میری جانب تو مت موڑو میں نے ایسا کیا کر دیا۔" وہ برا مان گئیں۔

"ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں کہ تیمور بھائی سے اوریدا اور سرمد کے رشتے کی بات کریں۔" انہوں نے فوراً ہی شکوہ کیا۔

"بھئی اسی گھر میں بیٹھا ہے اوریدا کا باپ، جا کر کر لو اس سے بات..." انہوں نے جھٹ سے اپنا دامن بچایا۔ طیبہ بھی آج کچھ کرنے کا ہی عزم لے کر آئی تھیں، جھٹ سے اپنے بڑے بھائی کے پاس پہنچ گئیں، جو اس کی بات سن کر ہلکا سا مسکرائے۔

"بابا سے پوچھ لو، وہ جو فیصلہ کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں..." تیمور کی بات پر طیبہ کے چہرے پر ناگوار سا تاثر ابھرا۔

"لو ان سے خوامخواہ کروں بات، بیٹی تو آپ کی ہے..." طیبہ نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"میں نے تو جب اوریدا کو پاکستان بھجوایا تھا، اس کے بعد اس کے سارے فیصلے کرنے کا اختیار بھی انہیں دے دیا تھا۔" تیمور نے اپنی مجبوری بتائی۔

"سچ پوچھیں تو میرا بابا سے اس ٹاپک پر کیا، دنیا کے کسی موضوع پر بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" طیبہ کے لہجے میں چھپی ناراضی، تیمور کو اچھی نہیں لگی۔

"بس کرو طیبہ، کب تک خفا ہو گی ان سے..." انہوں نے فوراً ہی اپنی چھوٹی بہن کو ٹوکا۔

"بھول گئے آپ' انہوں نے کیا' کیا تھا میرے ساتھ' کس جاہل جنگلی اور اجڈ بندے کے پلے باندھ دیا مجھے' محض اپنی انا کی تسکین کے لیے۔" وہ ایک دم ہی اپنے بڑے بھائی کے سامنے رو پڑیں۔

"انہوں نے یہ فیصلہ اپنی انا کی تسکین کے لیے نہیں اپنے گھر کی رہی سہی عزت کو بچانے کے لیے کیا تھا۔" تیمور نے انہیں یاد دلایا۔

"نہیں کیا لگتا تھا کہ پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں' کیا میں انہیں ایسی لگتی تھی۔۔۔؟" وہ ایک دم غصے میں آئیں۔

"ڈیڈی اور میں بھی کہیں سے ویسے نہیں لگتے تھے' تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں قصوروار بابا نہیں' میں اور ڈیڈی ہیں۔ ہمارے کیے گئے غلط فیصلوں کی وجہ سے بابا نے عجلت میں تمہاری زندگی کا فیصلہ کیا۔" تیمور کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے طیبہ کو الجھا دیا۔

"جو بھی ذمے دار ہو' لیکن میری زندگی کو تو داؤ پر لگا دیا تھا نا۔۔۔" وہ ایک دم خفا ہوئیں۔

"بس کردو طیبہ' سرمد کے بابا بہت بدل چکے ہیں اب۔۔۔" تیمور نے چھوٹی بہن کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن کیا فائدہ۔۔۔؟ مجھے تو ساری زندگی اپنی جہالت کے گرداب میں پھنسائے رکھا۔" وہ کوئی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں۔

"اب چھوڑ دو پچھلی باتوں کو اور بس آنے والی زندگی کو دیکھو' اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچو۔۔۔" تیمور نے نرمی سے اپنی بہن کو مشورہ دیا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اوریدا کو میری بہو بنا دیں' شاید میرے دل پر لگے زخم کا مداوا ہو جائے۔" انہوں نے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"دیکھو طیبہ' ایک دفعہ پہلے بھی اماں نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تھی' میں نے تب بھی ان سے یہی کہا تھا کہ بابا سے پوچھ لیں اور میں آج تم سے بھی یہی کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے اپنی بات کو دہرایا تو طیبہ فیصلہ کن انداز میں ڈاکٹر جلال کے کمرے میں پہنچ گئیں' جنہوں نے بڑے سکون سے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کی بات سنی۔ وہ آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اپنے باپ سے خفا تھیں اور یہ خفگی' طیبہ کے چہرے' آنکھوں اور گفتگو کے ہر انداز سے عیاں ہوتی تھی۔ اس سے ان کا دل کرب سے پھٹنے لگتا' لیکن ضبط کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"دیکھو بیٹا' ایسی باتیں بیٹھ کر' آرام اور سکون سے ہوتی ہیں۔" انہوں نے نرمی سے انہیں ٹوکا' جو کمرے کے عین بیچ میں بے زاری سے کھڑی تھیں۔

"آپ کا جو فیصلہ ہے' آپ پلیز مجھے بتا دیں۔ ویسے اندازہ ہے مجھے' آپ کیا کہیں گے۔" طیبہ پر ان کے لہجے کی نرمی کا رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ الٹا انہوں نے بڑی طنزیہ نگاہوں سے اپنے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے' پہلے تم بتا دو کہ میں کیا کہوں گا۔۔۔" انہوں نے بڑے سکون سے سائیڈ میز سے اپنا چشمہ اٹھا کر لگایا اور اپنی بیٹی کو غور سے دیکھا۔ وہ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اس کی ناراضی دور نہیں کر سکے تھے۔

"مجھے لگتا ہے' آپ انکار کر دیں گے۔" طیبہ نے صاف صاف کہا اور کھڑکی کے پار دیکھنے لگیں۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں منع کر دوں گا تمہیں۔۔۔" ان کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔

"اس لیے کہ آپ نے کبھی بھی میری کسی خوشی کا خیال نہیں رکھا۔۔۔" انہوں نے پہلی دفعہ کھل کر باپ کے سامنے شکوہ کیا۔

"زندگی کے ایک فیصلے کو چھوڑ کر مجھے کوئی بھی ایسی بات بتا دو' جہاں میں نے تمہاری مرضی کو اہمیت نہ دی ہو۔" ڈاکٹر جلال کی بات پر وہ لاجواب ہو کر ایک لمحے کو سٹپٹا سی گئیں۔ ذہن پر زور ڈالنے پر بھی کوئی ایسی بات یاد نہیں آئی تو بے زاری سے گویا ہوئیں۔

"کاش آپ اسی ایک بات میں میری خوشی کا خیال

کرلیتے تو کم از کم میری زندگی تو سکون سے گزر جاتی۔"
"جنہوں نے اپنی مرضی سے فیصلے کیے' انہوں نے کون سی خوش باش زندگی گزارلی۔" ان کا اشارہ تیمور اور بختاور کی طرف تھا۔
"ڈیزی آپی کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتی' لیکن تیمور بھائی نے اپنی بیوی کے ساتھ جتنی زندگی گزاری' وہ ماشاء اللہ زبردست تھی' میں اس بات کی گواہ ہوں۔" انہوں نے پہلی دفعہ ان کے منہ پر ان سے اختلاف کیا۔
"اس کی ازدواجی زندگی تھی ہی کتنے سال...؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"وہ تو اللہ کی مرضی' لیکن آپ نہیں سمجھیں گے۔ اپنی مرضی کے چند سال بھی اس پوری اور لمبی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں جہاں آپ کا دل خوش نہ ہو۔" ان کا تلخ لہجہ ایک دفعہ پھر ڈاکٹر جلال کو ان کے غلط فیصلے کی یاد دلا گیا۔
"میں اس موضوع پر تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے مزاج کے برخلاف فوراً" ہی ہار مان لی۔
"تو پھر میں اسے اوریدا اور سرمد کے رشتے کا جواب سمجھوں...؟" وہ فوراً" ہی بدگمان ہوئیں۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا' مجھے تھوڑا ٹائم دو' میں اس سلسلے میں اوریدا کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے نظریں چرا کر افسردگی سے کہا۔
"ہماری دفعہ تو آپ نے کسی سے نہیں پوچھا تھا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی طیبہ اس بات کا شکوہ کر گئیں۔
ڈاکٹر جلال نے زخمی نظروں سے اپنی اس آخری اولاد کو دیکھا اور ایک تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی۔ "اس بات کا عذاب بھی تو میں نے اکیلے ہی بھگتا ہے اپنی جان پر۔" ان کے اس جملے میں صدیوں کی تھکن اور اذیت تھی۔
ایک لمحے کو تو طیبہ بھی چپ ہو گئیں' ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"بابا نے بہت ظلم کیا میرے ساتھ۔" شانزے کے چہرے کے ایک ایک نقش سے غم و غصہ چھلک رہا تھا' ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہے۔ ماہیر کے ساتھ وہ بلیو ایریا کے ایک ریسٹورنٹ میں موجود تھی۔
"اتنے سال کے بعد اچانک ملاقات نہ ہوتی تو شاید وہ مجھے ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہ کرتے۔" وہ بدگمانی کی انتہا پر تھی۔ ماہیر خاموشی سے اسے سن رہا تھا' اس نے اسے ایک دفعہ بھی اسے درمیان میں نہیں ٹوکا وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک دفعہ دل کھول کر اپنی بھڑاس نکال لے۔
"اب تم بتاؤ' میں کیا کروں...؟" وہ لمحہ آہی گیا تھا جس کا ماہیر کو پچھلے ایک گھنٹے سے انتظار تھا۔
"تمہیں انہیں معاف کر دینا چاہیے شانزے..." ماہیر نے آہستگی سے کہا۔
"میں ایسا نہیں کر سکتی..." وہ غم و غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ قدرے بلند آواز میں بولی۔
"انہوں نے تمہارے ساتھ نہیں اپنی جان پر ظلم کیا' اپنے گھر والوں اور اپنے اللہ کی ناراضی تو سمیٹی' ہی ساتھ خود ساختہ جلاوطنی بھی اختیار کیے رکھی۔ تمہارا کیا خیال ہے' وہ خوش رہے ہوں گے۔" ماہیر نے ایمانداری سے ہاشم رضا کی زندگی کا تجزیہ کیا۔
"یہ میرا پرابلم نہیں ہے۔" اس نے بے رخی سے جواب دیا۔
"تو تمہارا پرابلم ہے کیا؟" ماہیر نے ہلکی سی ناراضی سے اپنے سامنے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا' جس کے مزاج سے جھلکتا بچکانہ پن کبھی کبھی تو اسے اپنا امتحان لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
"میرا دکھ' میری زندگی کے بیس سال ہیں' جو میں نے اپنے والدین کے بغیر گزارے۔ کسی بچے سے اس کا بچپن چھین لیا جائے' اس کو اٹھا کر کسی اور کی گود میں ڈال دیا جائے' کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں۔" شانزے کا جسم دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔ ساتھ ہی آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔
"شانزے ٹیک اٹ ایزی یار..." ماہیر نے پانی کا

گلاس اس کی جانب بڑھایا۔
"پھپھو اپنی بے اولادی کا دکھ ختم کرنے کے لیے مجھے اپنے گھر لے تو گئیں، لیکن جب اللہ نے انہیں جڑواں بچوں سے نواز دیا تو وہ بھول گئیں کہ میں کون ہوں، میری کیا حیثیت ہے۔ ویسے بھی اس میں ان کا کیا قصور، اپنی اولاد کے سامنے کون پرائی اولاد کو اہمیت دیتا ہے، چاہے وہ اس کے سگے بھائی کا ہی خون کیوں نہ ہو۔" اسے سب ہی لوگوں سے شکوے تھے۔
"بہت ناشکری ہو تم۔ شکر کیا کرو کہ تمہاری پھپھو نے تم پر کبھی کوئی روک ٹوک نہیں کی اور تمہیں اپنی زندگی اپنے طریقے سے بسر کرنے کی اجازت دے دی۔" ماہیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"کاش وہ روک ٹوک کر لیتیں تو میں آج اس مقام پر نہ ہوتی، جس پر آج کھڑی ہوں۔" شانزے کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔
"کیوں، کیا ہوا ہے تمہیں۔ اچھی خاصی زندگی تو بسر کر رہی ہو۔" ماہیر کی بات پر اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔
"یہ اچھی خاصی زندگی نہیں ہے ماہیر۔ میں ہمیشہ اس گھر میں اجنبی سیارے سے آئی ہوئی مخلوق کی طرح رہی ہوں۔ قدم قدم پر مجھے میرے خاندان والوں نے اس بات کا احساس دلایا کہ میرے والدین نے ماضی میں کیا کیا غلطیاں کیں۔" اس کی آواز میں درد اور غم کی آمیزش ہوئی۔ ماہیر نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، وہ اس کا دکھ اب اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔
"ان رشتے داروں اور نام نہاد اپنوں سے بھاگ کر تو میں نے لاہور چھوڑا اور یہاں آگئی، اب بھی چھ ماہ میں گھر نہ جاؤں تو کسی کو میری ٹینشن نہیں ہوتی۔ ان ہی لوگوں کے اس رویے نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی ذاتی ایک پہچان بناؤں، جہاں لوگ میرا تعارف یہ کہہ کر کرانا چھوڑ دیں کہ یہ بختاور اور ہاشم کی بیٹی ہے۔" شانزے نے پہلی دفعہ کسی کے سامنے اپنی ماضی کے اس رخ کو آشکار کیا تھا۔

"تمہارے تایا اور پھپھو لوگ تم سے پیار نہیں کرتے تھے کیا۔۔۔؟" ماہیر کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔
"زندگی میں پیار سے بڑھ کر بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں ماہیر! ہر وہ خوشی یا غم جو بچے اپنے والدین سے شیئر کرتے ہیں میں نے اپنے تکیے اور کمرے کی دیواروں سے کیا۔ کتنی راتیں، صرف ستاروں کو گن گن کر گزاریں اپنے اندر موجود ہر جذبے کو اپنے ہی اندر بے دردی سے قتل کر دیا۔ کوئی تھا ہی نہیں جس سے میں شیئر کرتی۔۔۔" وہ آج پہلی دفعہ اس کے سامنے کھل کر رو رہی تھی۔ کئی سالوں کا جمع ہوا لاوا ایک دم ہی پھٹ پڑا تھا۔
"تم نے اپنی والدہ کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔" ماہیر کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔
"میں اس عورت کو کیوں تلاش کرتی، جس نے بے دردی سے اپنے جسم کے ٹکڑے کو خود سے علیحدہ کر کے زمانے کی ٹھوکریں کھانے کو پھینک دیا۔" اس نے پست آواز میں کہا۔
"پھر بھی شانزے! وہ تمہاری ماں تھیں۔۔۔" ماہیر نے اسے یاد دلایا۔
"وہ میری ماں تھیں، لیکن میں ان کی بیٹی نہیں، ان کے وجود کے لیے ایک گالی تھی، تب ہی تو مجھے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ نہیں سوچا۔" اس نے آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کیں۔
"انہیں تم سے جان چھڑانی ہوتی تو ایدھی کے جھولے میں ڈال دیتیں یا کسی اور جگہ چھوڑ کر چلی جاتیں، لیکن وہ تو تمہیں محفوظ ہاتھوں میں دے کر گئیں، اس کا مطلب ہے کہ انہیں تم سے محبت تھی۔" ماہیر کو اس ان دیکھی عورت سے ہمدردی محسوس ہوئی۔
"تم ان کی فیور مت کرو۔۔۔" وہ ایک دم چڑ گئی اور اس کے چڑنے پر ماہیر مسکرا دیا۔
"اف!! کیسے ہوگا تمہارے ساتھ گزارا، مجال ہے جو ذرا قوت برداشت ہو تم میں۔۔۔" ماہیر نے اسے

چھیڑا۔

"تو مت کرو مجھ سے شادی، میں کون سا مری جا رہی ہوں۔" وہ غصے سے اٹھی اور میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ماہیر نے اس کا وہی ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا تو وہ ایک دم سٹپٹا گئی۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے، ہاتھ چھوڑو میرا...." وہ جھنجلائی۔

"ہمت ہے تو چھڑا کر دیکھ لو...." ماہیر کی گرفت اور مضبوط ہو گئی، اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو دیکھ کر وہ تھوڑی دھیمی پڑ گئی اور دھپ کر کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"نخرے کم کیا کرو، سمجھیں...." ماہیر نے محبت سے اسے ڈانٹا۔

"انسان اسی کو نخرے دکھاتا ہے، جس پر اسے مان ہو کہ وہ اسے منا لے گا۔" شانزے نے اسے لاجواب کیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتا ہوا ایک دم ہنس پڑا۔

"پہلے آرام اور سکون سے کھانا کھاؤ، پھر اسے مسئلے کا کوئی حل نکالتے ہیں۔" ماہیر نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور وہ کسی پانچ سالہ بچے کی طرح ہونٹ لٹکائے اس طرح بیٹھی تھی، جس سے اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا چھین لیا گیا ہو۔

☼ ☼ ☼ ☼ ☼

وہ پہلی رات تھی جو آپا صالحہ اور عدینہ نے ماں بیٹی بن کر نہیں سہیلیاں بن کر گزاری تھی۔ آپا صالحہ کے ہر دکھ پر عدینہ کی آنکھیں برسنے لگتیں اور ان کی زندگی کے ہر نئے موڑ پر اس کی سانسیں رکنے لگتیں۔ وہ سانس روکے اپنی ماں کی ماضی کی داستان سن رہی تھی۔

"نیلم نے میرا بہت ساتھ دیا، وہ شادی کے بعد سڈنی چلی گئی، لیکن میری خاطر وہ ہر دوسرے دن وہاں سے فون کرتی، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کے والدین نے مجھے ہمیشہ نیلم کی جگہ ہی رکھا۔" آپا صالحہ تھکن سے چور لہجے میں مسلسل بول رہی تھیں۔

"وہ جو آزاد کشمیر میں آپ کے والدین ہیں، وہ نیلم آنٹی کے پیرنٹس ہیں۔" عدینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"نہیں، وہ میرے لیے بھی والدین کی ہی جگہ پر ہیں۔" انہوں نے فوراً" ہی اس کی تصحیح کی۔

"اچھا، پھر کیا ہوا....؟" عدینہ کو سب کچھ جان لینے کی بے تابی تھی۔

"میں سارا سارا دن روتی رہتی، ایک دفعہ میں نے سلیپنگ پلز کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی بھی کوشش کی۔" ان کی بات پر عدینہ کو دھچکا لگا۔

"لیکن نیلم کے والدین کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا، تب اس کی والدہ نے مجھے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے ایک قریبی مدرسے میں ڈال دیا، وہ میری زندگی کے اذیت ناک دن تھے۔ میں قرآن اور اس کی تفسیر پڑھتی اور مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ میرے آنسوؤں سے قرآن کے ورق گیلے ہو جاتے۔ نیلم کی ماں جی مجھے اس بے ادبی پر ٹوکتیں، لیکن میرا اپنے اوپر اختیار ہی نہیں تھا۔" ان کی آواز پست اور درد بھری تھی۔

"میں نے تو جو گناہ کیا، لاعلمی میں کیا اور جب اس حوالے سے آیات اور احادیث پڑھتی تو اللہ کی ناراضی کا خوف مجھے ساری ساری رات جگائے رکھتا، مجھے لگتا جیسے میرا سارا وجود گناہوں سے لتھڑا ہوا ہو، لیکن آفرین ہے نیلم کے والدین پر، انہوں نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا.... مجھے لے کر وہ کبھی کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس جاتے تو کبھی کسی دور دراز علاقے میں رہنے والے بزرگ کے پاس...." ان کی آواز ایک دفعہ پھر نم ہوئی۔

"میرے بابا سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی....؟" عدینہ نے ذرا سا جھجک کر پوچھا۔

"میں نے انہیں نکاح کے بعد دیکھا تھا۔" آپا صالحہ کے اس انکشاف نے عدینہ کو ہکا بکا کر دیا۔

"میں شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھی، لیکن ان دنوں تمہارے بابا کسی جماعت کے ساتھ تبلیغ کرنے مظفر آباد آئے ہوئے تھے، وہیں ان کی نیلم کے فادر

سے ملاقات ہوئی۔" آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کو اگلا سارا قصہ سمجھ میں آگیا۔

"نیلم کے بابا نے ان سے میرا کیس ڈسکس کیا تو پتا ہے انہوں نے کیا کہا۔۔۔؟" آپا صالحہ کی آنکھوں میں روشنی چمکی، عدینہ نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے کہا کہ اس عورت پر اللہ کا خاص کرم ہے جس نے اسے درست فیصلہ کرنے کی توفیق دی اور اس نے یہ فیصلہ کرکے اپنی آخرت بچالی، یہ ایک ایسی مثبت بات تھی، جو میں نے اس سارے کرب ناک دور میں پہلی دفعہ سنی۔۔۔"

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" عدینہ کا سارا وجود مجسم سماعت بن گیا۔

"تب نیلم کے بابا نے ان سے کہا کہ میں ان کے لیے بیٹیوں کی طرح ہوں اور وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اس لیے ان کی جماعت میں یا ان کے جاننے والوں میں کوئی ایسا شخص ہو جو مجھ سے نکاح کرسکے، تب انہوں نے کچھ بھی سوچے بغیر اپنا نام ان کے سامنے پیش کردیا۔" عدینہ نے محسوس کیا کہ مولوی رفیق کے نام پر آپا صالحہ کے چہرے پر حقیقی خوشی کے رنگ بکھرتے تھے۔

"تو پھر آپ دونوں کی شادی ہوگئی۔۔۔؟" عدینہ مسکرادی۔

"نہیں اس سے پہلے نیلم کے فادر نے ہر وہ کام کیا، جو ایک بیٹی کا باپ اپنی بیٹی کے تحفظ کے لیے کرسکتا تھا، انہوں نے اپنے شہر کے سب سے بڑے مفتی سے میرے پہلے نکاح کی تنسیخ کا فتویٰ لیا، حق مہر میں رفیق صاحب سے ان کا گھر لکھوایا اور پھر نہ صرف مجھے ان کے ساتھ رخصت کیا بلکہ ہر ہفتے میری خیریت سے آگاہ ہونے کے لیے فون پر بھی رابطہ رکھا۔" آپا صالحہ کے لہجے میں ان کے لیے ۔۔ محبت اور عقیدت کی فراوانی تھی۔

"انہوں نے اپنی خواہش پر میرا نام بختاور سے بدل کر صالحہ رکھا اور مجھے کہا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ اور ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کرو۔ انہوں نے کبھی بھول کر بھی مجھ سے میرے ماضی کا نہیں پوچھا، کبھی پلٹ کر کسی بات کا طعنہ نہیں دیا، لیکن اتنے اچھے انسان کا ساتھ بھی مجھے میرا تلخ ماضی بھولنے نہیں دیتا تھا۔ مجھے جب بھی اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو میں کئی کئی دن تک روتی رہتی۔ ایک بے سکونی تھی جو ابھی تک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔" ان کی سرخ آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے اور بولتے ہوئے ان کا گلا بار بار خشک ہورہا تھا۔

"تمہارے بابا دنیا کے بہترین انسان تھے جو اللہ نے کسی نیکی کے عوض میرے نصیب میں لکھ دیئے، میرے یکے بعد دیگرے کئی بچے پیدا ہوتے اور مرجاتے، مجھے لگتا کہ اللہ ابھی تک مجھ سے خفا ہے، وہ مجھے ان آیات کا حوالہ دے کر سمجھاتے جس میں بتایا جاتا تھا کہ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، میں نے جتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارا، وہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دور تھا، پھر تم میری گود میں آگئیں۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکیں۔

"تمہاری پیدائش پر مجھے ایسا لگا جیسے میرے والدین نے مجھے بددعا دی ہو کہ میرے گھر ہمیشہ بیٹیاں ہی پیدا ہوں، تمہاری پیدائش کے بعد مجھے وہ ننھی زینب بہت یاد آئی، جسے میں اس کے تایا اور پھپھو کے پاس چھوڑ آئی تھی۔" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگیں، عدینہ نے بے ساختہ انہیں اپنے ساتھ لگا کر تسلی دینے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا، آپا صالحہ کا جسم بخار کی حدت سے تپ رہا تھا۔

"آپا، آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔۔۔؟" وہ گھبرا گئی۔

"جب انسان کے وجود کے اندر ۔۔ پچھتاوے کی آگ ہو تو تپش کہیں نہ کہیں سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔" انہوں نے عدینہ کے ہاتھ سے بخار کی میڈیسن لی اور فوراً نگل لی۔

"تمہیں پتا ہے، زینب کو وہاں چھوڑنا میری زندگی کا ایک اور غلط فیصلہ تھا۔ مجھے اپنی بیٹی کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہیے تھا۔ اس میں اس ننھی جان کا تو کوئی

قصور نہیں تھا، لیکن میں نے سوچا تھا کہ میری محبت تو اس کے باپ کو نہ بدل سکی، شاید اپنی بیٹی کی چاہت میں وہ مزید بھٹکنے سے بچ جائے، لیکن پتا نہیں اس معصوم کے ساتھ کیا بیتی ہوگی۔" انہوں نے آج اپنی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب کر دیا تھا۔

"ان شاء اللہ آپ کی کامیاب سرجری ہو جائے تو میں آپ کو ایک سرپرائز دوں گی۔" عدینہ انہیں ڈاکٹر جلال اور بڑی اماں کے بارے میں بتاتے بتاتے رک گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آپا کو ٹھیک ہونے کے بعد سب کچھ بتا دے گی۔ اس کی بات پر وہ مسکرا دیں انہوں نے اس سرپرائز کے بارے میں کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔" اپنی بیٹی کی تسلی پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔ ایک بے نام سا اضطراب ان کے جسم وجاں میں چٹکیاں سی لینے لگا۔

"بس آپ سو جائیں، بہت باتیں ہو گئیں آج....." عدینہ نے اٹھ کر ان کا کمبل درست کیا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئیں۔ کمرے میں زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ تھیں، لیکن دونوں کے ذہنوں میں اس وقت بہت کچھ چل رہا تھا۔ عدینہ کے آج سارے گلے شکوے ختم ہو گئے تھے۔

وہ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب آپا صالحہ کی طبیعت ایک دم ہی خراب ہوئی، عدینہ نے گھبرا کر عبداللہ کو فون کیا اور وہ فوراً" گاڑی لے آیا، اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے جب ان لوگوں کی گاڑی راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوئی۔ آپا صالحہ کے چہرے پر زردیاں کھنڈی ہوئی تھیں، ان کی آنکھوں کی روشنی بالکل مدھم ہو گئی تھی اور وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بالکل شکست خوردہ انداز میں لیٹی ہوئی تھیں۔

اگلی صبح، ان کے سرجری سے پہلے کرائے جانے والے ٹیسٹ لیے گئے اور اس موقع پر عبداللہ کا ساتھ عدینہ کے لیے بڑی تقویت کا باعث بنا، اسے پہلی دفعہ اپنی ماں کے بروقت کیے گئے درست فیصلے کا احساس ہوا تھا۔ آپا صالحہ کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا تھا اور ان کی طبیعت بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، عدینہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے گھبرا کر اوریدا کو فون کر دیا اور وہ اگلے ایک گھنٹے میں ڈاکٹر جلال اور ماہیر کے ساتھ اس کے پاس پہنچ گئی۔ عدینہ بے اختیار ڈاکٹر جلال کے ساتھ لگ کر رو دی۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے اس بدقسمت انسان کو دیکھ رہی تھی جسے احساس ہی نہیں تھا کہ آپریشن تھیٹر میں بے حس حرکت پڑے ہوئے وجود سے ان کا کیا رشتہ ہے۔

"حوصلہ رکھو بیٹا....." انہوں نے اس کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا۔

"بڑے ابا، مجھے لگتا ہے جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ میری ماں کے لیے دعا کریں۔" وہ نہ جانے کیوں آج بہت کمزور پڑ گئی تھی۔

"اللہ انہیں زندگی اور صحت دے، بی بریو....." انہوں نے اسے حوصلہ دیا۔

"آپ پلیز ان کے لیے دل سے دعا کریں۔ مجھے لگتا ہے آپ کی دعا ان کو بچا سکتی ہے۔" عدینہ کا لہجہ وہاں کھڑے سب ہی لوگوں کو چونکا گیا۔

"عدینہ کیا ہو گیا ہے، حوصلے سے کام لو، اور خود بھی دعا کرو ان کے لیے۔" کاریڈور کے ایک کونے میں کھڑا عبداللہ اچانک ہی ڈاکٹر جلال کے سامنے آگیا تھا انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اوریدا کی طرف دیکھا۔

"یہ عبداللہ بھائی ہیں، ان کا نکاح ہو چکا ہے عدینہ سے۔" اوریدا نے جھجک کر تعارف کی رسم نبھائی۔

ڈاکٹر جلال اور ماہیر نے بڑے پرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ سلجھا ہوا یہ نوجوان ڈاکٹر کو پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا۔ پانچ گھنٹے کی اس سرجری کے عرصے میں پہلی دفعہ عدینہ کو اوریدا کی فیملی کی محبت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔۔ سرجری کے درمیانی عرصے میں بڑی اماں بھی بوا رحمت کے ساتھ اسپتال کا چکر لگا گئی تھیں۔ انہوں نے عدینہ کو تسلی دی تھی کہ وہ گھر جاتے ہی اس کی والدہ کی صحت یابی کے لیے وظیفہ کریں گی۔

ڈاکٹر جلال اور ماہیر مختلف ڈاکٹرز کے پاس چکر لگا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے اس جگہ کا بھی چکر لگا لیتے جہاں عدینہ، اوریدا اور عبداللہ کھڑے تھے۔ عدینہ کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور اسکے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس کا وجود کسی سولی پر لٹکا ہوا ہو۔

"پلیز بینچ پر تو بیٹھ جاؤ......" اوریدا نے اس کا بازو پکڑ کر زبردستی بٹھایا، وہ پچھلے دو گھنٹے سے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور دل ہی دل میں وہ اس بات سے بھی خوفزدہ تھی کہ جب ڈاکٹر جلال کا آپا صالحہ سے سامنا ہوگا تو کیا صورت حال ہوگی۔ ظاہری سی بات تھی کہ ایسے حالات میں تو وہ ضرور ان سے مل کر ہی جاتے' اسے ان لمحات کا سوچ کر ہی خوف آ رہا تھا۔

"کیسی ہو عدینہ......" ارصم کی آواز پر اوریدا کا دل بے اختیار تیزی سے دھڑکا۔ اس نے بے تابی سے پلٹ کر دیکھا' سامنے وہ دشمن جاں سفید کرتے شلوار میں ملبوس بڑے مضمحل انداز میں کھڑا تھا۔ وہ بالکل ہی دبے پاؤں ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا اور انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

"تم کیسے ہو ارصم......؟" عدینہ اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دونوں کو ہی اس کے آنے کی توقع نہیں تھی۔

"ٹھیک ہوں۔ آنٹی کیسی ہیں؟ مجھے تھوڑی دیر پہلے رحمت بوا نے بتایا تھا ان کی سرجری کا۔" وہ اوریدا کو نظرانداز کیے اس سے مخاطب تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر اوریدا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"بس دعا کرو ارصم' ابھی تو بہت مرحلے باقی ہیں۔" س کے گلے میں بے شمار آنسو اٹکے۔

"اللہ کرم کرے گا' میری کسی بھی قسم کی ہیلپ کی ضرورت ہو تو تم بے تکلفی سے بتا سکتی ہو۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"فی الحال تو اوریدا کو گھر چھوڑ آؤ' یہ صبح سے یہاں ہے میرے پاس......" عدینہ کو ایسی صورت حال میں بھی ان دونوں کا خیال تھا۔

اوریدا نے ایک دم حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں یار......؟"

"ایک دو گھنٹوں کے بعد ریسٹ کر کے پھر آ جانا' اس کے بعد تمہیں چھوڑ کر میں جاؤں گی فریش ہونے......" عدینہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی ارصم بول پڑا۔ "میرے خیال میں اسے تمہارے پاس ہی رہنا چاہیے......"

"میرے پاس ابھی بڑے ابا' ماہیر اور عبداللہ ہیں۔ اوریدا! تم جاؤ پلیز......" عدینہ کے لہجے میں اس دفعہ ہلکی سی برہمی تھی۔

"چلو......" اوریدا مرے مرے قدموں کے ساتھ ارصم کے ساتھ چل پڑی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی پیچھے پلٹ کر یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اس کے پیچھے آبھی رہی ہے کہ نہیں۔ اپنی بے وقعتی کا احساس اوریدا کی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ وہ چلتے چلتے رکی اور وہیں کھڑی ہو گئی۔ ارصم نے گاڑی کے پاس پہنچ کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور تھوڑا سا جھنجلایا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اوریدا کی طرف بڑھا' اور سخت غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے......؟" اس کے الفاظ اتنے سخت نہیں تھے جتنا لہجہ۔

"کچھ نہیں......" اوریدا کے حلق میں آنسوؤں کی کڑواہٹ گھلنے لگی۔ اس کا یہ اجنبی انداز اس نے کب دیکھا تھا۔

"میرے ساتھ جانا ہے کہ نہیں......" وہ ایک دم اس کے پاس آکر غصے سے بولا۔ اوریدا کے من میں کوئی پھانس سی چبھی' جس کی تکلیف سے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"نہیں......" اس دفعہ اوریدا کی آواز میں ایسی تلخی تھی کہ ارصم جاوید اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"الحمدللہ' آپا صالحہ کی سرجری کامیابی کے ساتھ ہوگئی ہے۔۔۔۔" عبداللہ کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ نے عدینہ کو ایک نئی زندگی بخش دی تھی۔
"آپ کو کس نے بتایا۔۔۔۔۔؟" وہ بے اختیار عبداللہ کے بالکل قریب چلی آئی۔
"ابھی ڈاکٹر جلال سے مل کر آیا ہوں' ان کی آپریٹ کرنے والے ڈاکٹرز سے بات ہوگئی ہے۔" عبداللہ نے اس دفعہ تفصیل سے بتایا۔
"تھینک گاڈ۔۔۔" اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔
"ابھی آپا کو اوٹی (آپریشن تھیٹر) سے روم میں شفٹ کردیں گے۔۔۔۔" عبداللہ کے کہنے کی دیر تھی کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھل گیا۔ جس لمحے آپا صالحہ کا بے جان وجود اسٹریچر پر ڈال کر باہر نکالا جارہا تھا' اسی وقت سامنے سے آتے ڈاکٹر جلال نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل سے نظریں ہٹائی تھیں۔ وہ بڑے پرسکون انداز میں ماہیر کے ساتھ کوریڈور کی دوسری طرف کھڑی عدینہ کی طرف بڑھ رہے تھے اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسٹریچر پر لیٹی ہوئی عورت کے چہرے پر ایک نظر نہ ڈالتے۔
"یا اللہ مدد۔۔۔۔" عدینہ کا رنگ فق ہوا۔ وہ ساکت نگاہوں سے ڈاکٹر جلال کو دیکھنے لگی۔ دل و دماغ میں ایک حشر سا برپا ہوا۔
"کاش۔۔۔۔ وہ آپا صالحہ کی طرف نہ دیکھیں۔۔۔۔" عدینہ نے دل سے دعا کی تھی جو قبولیت کے درجے کو نہ پہنچ سکی۔
ڈاکٹر جلال' ماہیر کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کوریڈور میں تیزی سے عدینہ کی طرف چلتے آرہے تھے۔ اسی وقت وہ اسٹریچر بالکل ان کے برابر سے گزرا۔ جسے وارڈبوائے تیزی سے آپریشن تھیٹر سے روم میں شفٹ کرنے کے لیے جارہے تھے۔ انہوں نے چلتے چلتے ایک سرسری سی نگاہ اس بے حس و حرکت پڑے وجود پر ڈالی اور انہیں لگا جیسے پورے اسپتال کی عمارت ان کے سر پر آگری ہے۔ اچانک ہونے والا یہ سامنا کسی خودکش دھماکے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر جلال کو اپنا سارا وجود ذروں کی صورت میں فضا میں بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ حلق میں بے شمار کانٹے ایک ساتھ چبھے۔ انہوں نے بے رحمی سے اپنی دھندلی آنکھوں کو مسلا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مغالطے کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کا دل گواہی دے چکا تھا۔
بہت سالوں کے بعد' ظالم تقدیر نے انہیں اس کے سامنے لاکر کھڑا کیا تھا' جسے وہ بہت سال پہلے اپنے دل و دماغ میں دفن کرچکے تھے۔ وقت نے بختاور کے نقوش پر اگرچہ گہرا اثر ڈالا تھا' لیکن وہ ان کا خون تھی پھر وہ اسے کیسے نہ پہچانتے۔ انہیں اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جسم کے ہر بن مو سے درد ابل ابل کر باہر نکلنے لگا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر لڑکھڑائے' انہیں بختاور کے اسٹریچر پر پڑے وجود اور سردخانے میں رکھی کسی لاش کے چہرے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔

(آخری قسط اگلے ماہ ان شاءاللہ)

بنت سحر

اُمید دستک

رات کا آخری پہر گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا... آنگن میں لگا اکلوتا امرود کا درخت چمگادڑ کی طرح پر پھیلائے عجیب سا لگ رہا تھا۔ عجیب چیزیں "خوف" زدہ کرتی ہیں... کچی مٹی کے گارے سے لیپی ہوئی دیواروں میں شامل ریت کے ذرے مدھم چاندنی میں چمک رہے تھے... وہ کھڑکی کا پٹ کھولے بیٹھی تھی... آنگن میں لگتا تھا کسی نے سفیدی پھیر دی ہو۔ اس کی نظر چاند پر تھی۔ چاند جس کے وجود پر لگا "داغ" بھی اسے معتبر ہونے سے نہ روک سکا۔ اپنے چہرے کی جلد کی سطح کھردری سی محسوس ہو رہی تھی۔ چہرے کے "داغ" معتبر نہیں کرتے۔ اس نے چاند کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"تیرا داغ تجھے معتبر کر گیا... مگر میرا داغ مجھے تنہائیوں کے شہر میں چھوڑ گیا۔ تنہائی میں محفلیں لگتی ہیں۔ لوگوں کو لگتا ہے تنہائیوں کی آوازیں نہیں ہوتیں۔ مگر لوگ تو بہرے ہیں۔ آوازیں تو صرف تنہائیوں کی ہی ہوتی ہیں۔"

وہ چاند سے باتیں کر رہی تھی۔ امرود کے پتوں کے وجود میں ہوا چھپ کر بیٹھ گئی۔ جیسے وہ کھڑکی والی لڑکی کی کہانی میں خلل کا سبب نہ بننا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جیسے تنہائیوں کے دیپ جلتے تھے۔ جن میں تیل نہیں بلکہ آنسو ڈالے جاتے۔ بھانبڑ جلتے وجود میں پارہ بھرنے لگتا۔ مگر زبان سے "اف" تک نہ نکلتی۔ وہ تنہائیوں کی ساحرہ تھی۔ کمال کا ضبط رکھتی تھی۔ طوفان کواڑ توڑنے لگتے، مگر وہ کچھ نہ کرتی۔ ننگے پاؤں کچے آنگن میں ٹہلتی، دوڑتی، رک جاتی، مگر ہنستی نہیں تھی۔

تارے چاند کی اوٹ سے اسے دیکھنے کی چاہ میں مچل گئے۔ مگر چاند نے انہیں ڈپٹ دیا۔ بھلا کوئی تک بنتی تھی کہ دوسروں کے "راز و نیاز" میں دخل اندازی کی جائے۔

وہ ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھی تھی۔ لکیروں کا ایک گہرا سا جال... اور ان میں سفر کرتی زندگی...

"لوگ اتنے دوغلے کیوں ہیں۔ تجھے قبول کرنے کا ہنر تو سیکھ لیا... مگر مجھے قبول کرنے کا ہنر بھول گئے۔ تمہاری روشنی پر جان دیتے ہیں، مگر میری محبتیں تو کچھ بھی نہیں، دل جوڑ نہیں سکتے تو توڑنے کی چاہ کیوں کرتے ہیں؟ آج سے میں بے نیازی کا ہنر سیکھ رہی ہوں۔ پتا ہے وہ کیا ہوتا ہے؟"

امرود کے پتوں میں چھپی ہوا بے چین ہوئی۔ چاند بھی جیسے منتظر سا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی پتنگوں کو جھلسانے لگی تھی۔ شاد نے ساز کے ٹوٹتے سروں کی طرح الفاظ کو دوبارہ جوڑا۔

"بے نیازی میں کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ وہاں صرف اور صرف ہم ہوتے ہیں اور ہمارا اللہ ہوتا ہے۔ پھر لوگوں کی حاجت نہیں ہوتی۔ کسی صورت بھی نہیں۔ رتی برابر بھی نہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ چاند کا سفر ختم ہونے کو تھا۔ وہ جھک کر کچھ کہہ رہا تھا۔

"لوگوں کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ بے نیازی کا ڈھونگ چوراہے میں رکھی ہنڈیا کی طرح پھوٹتا ہے۔"

چھپی ہوئی ہوا قطبین میں پرواز کر گئی۔ پرندوں کی آوازیں چاندی کے کشکول میں گرتے سکوں کی مثل ثابت ہو رہی تھیں۔ دور کہیں سے کوئلوں کی کرلاتی

آوازیں آرہی تھیں۔ شاید انہیں بھی تنہائی کا زہر مار گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گرمی نے ہر ذی روح کو جیسے جھلسا کر رکھ دیا تھا اور سارے میں موت کی سی ویرانی تھی۔ بے دم سی... خوف ناک سی... میں میلے دوپٹے سے پسینہ پونچھ کر بے دم ہوئی جارہی تھی۔ نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کا کوئی ٹکڑا تک نہ تھی ___ نماز استسقاء پڑھنے والی ہستیاں کہاں تھیں۔ اماں سیانی تندور میں لکڑیاں ڈال رہی تھیں۔

"شاد... اب تو اس دوپٹے کو چھوڑ دے... میرے پاس ایک نیا پڑا ہے، تجھے دے دوں گی۔" اماں سیانی کو ہر بات کا خیال رہتا تھا۔ آخر کو فوجی کی ماں تھی۔ میں

اس بات پر تڑپ گئی۔

"میں کوئی منگتی نہیں ہوں... میرے بھائی، بھرجائی سلامت ہیں ابھی... میں کسی کے دوپٹے کیوں اوڑھتی پھروں..."

کچھ فقرے ہمیں برسوں کا سفر طے کروا کے بولے جاتے ہیں۔ میں نے یہ کیسے کہا تھا یہ مجھے پتا تھا۔ تندور میں سوکھی لکڑیاں شریر شیطان کے چیلوں کی طرح جل رہی تھیں۔ چٹک... چٹک... سیانی کی ہنسی کیسی تیکھی تھی۔ چبھتی ہوئی میں دہل گئی۔

"کن خیالوں میں رہتی ہے تو... ماں باپ چلے جائیں تو کوئی ماں جایا اپنا نہیں رہتا۔ تیری بھابھی خود تو کھاٹ توڑتی ہے۔ ساری خواری تو تو کرتی ہے۔ اپنے آرام کے لیے تیرے بھائی، بھرجائی نے تیری بھی جوانی رول دی۔"

مجھے لگا کسی نے مجھے تندور میں دفن کر کے میرے اردگرد سواہ (راکھ) بھر دی ہو۔ "نہیں اماں سیانی... ایسی بات نہیں ہے... میرا بھرا بڑا ہی اچھا ہے۔" میری دلیل وزن سے خالی تھی۔ تندور جل رہا تھا۔

اماں میرے ساتھ آم کی چھاؤں میں زمین پر بیٹھ گئی۔

"میری دھی... جیسے تیرا خیال رکھتا ہے نا تیرا بھرا... اس بات کو پورا پنڈ (گاؤں) جانتا ہے۔ اصل

فرض تو بیاہ کا ہوتا ہے۔ ورنہ کھلانا، پلانا تو دشمن بھی گوارا کر لیتے ہیں۔"

بات سچی ہو تو کڑوی بھی ہوتی ہے۔ مجھے یقین آیا تھا۔ مٹی پر میں نے لکڑی سے کئی نقش اتار دیے تھے۔ سمجھ میں نہ آنے والے... پھر ہاتھ مار کر مٹا دیا۔ اب مٹی نقوش سے خالی تھی۔ آم کے بور کی باس نتھنوں میں گھس رہی تھی۔

"اماں سیانی... جلے چہرے والی سے کون بیاہ رچاتا۔ بھرا نے بہت کوشش کی، مگر جب نصیب کے دروازوں پر تالے ہوں تو کیا حاصل..."

اردگرد گرم ہوائیں بگولوں کی طرح اٹھی تھیں۔ سیانی اماں کے چہرے پر پسینہ ننھے قطروں کی طرح گرتا زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

"میرا منہ نہ کھلوا... شوکا دکان دار دو سال چکر لگاتا رہا... مگر سلامت نے تو گونگے کا گڑ کھا لیا... بیوی کی باتوں میں آگیا۔ مفت کی کنیز مل رہی تھی... مفت کی چیزیں کون چھوڑتا ہے۔"

میں پتھر بن گئی تھی۔

میں کچھ بھی نہ تھی... میں مفت کی چیز تھی۔ میں نے سیانی کے گھر کے آنگن میں خالی خالی نظریں دوڑائیں۔ لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز پگھلے سیسے کی طرح میری سماعت میں لگ رہی تھی۔ میں نے ساری زندگی اپنے بھرا، بھرجائی کی خدمت میں گزار دی... عید کے عید کپڑے ملتے تو میں ان کا احسان سمجھتی... بھرجائی کو آرام دیتے دیتے میرے اپنے ہاتھوں میں چھید ہو گئے۔ بالوں میں چاندی اتر آئی... دن کب چڑھتا... شام کب ڈھلتی... کچھ خبر نہ تھی۔ طویل آنگن میں جھاڑو لگاتے لگاتے کمر میں خم آگیا تھا۔ گھر کا سب سے چھوٹا اور خستہ حال کمرہ میرے پاس تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ تھا۔ بارش ہوتی چھت ٹپکنے لگتی۔ برتن رکھتی، برتن پانی سے بھر جاتے۔ بادلوں کی آوازیں صور اسرافیل کی طرح وجود میں کپکپی دوڑا دیتیں۔ مگر اف تک نہیں کرتی تھی۔ رات کا ساحر اندھیرا جب امرود کے پیڑ پر اترتا تو وحشت بڑھ جاتی۔ میں ڈر کے مارے میلے دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیتی۔ اگر ڈر ختم نہ ہوتا تو گھٹ گھٹ کے رونے لگتی۔ مگر ایک بات پر حیرت ہے، ابھی تک میری زبان پر ناشکری کا کلمہ نہ آیا تھا۔

تندور گرم ہو چکا تھا۔ میں نے پرات اٹھائی اور روٹیاں لگانے لگی۔ کم بخت آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی۔ وہ دھند جو کچھ نہ دیکھنے دے۔ اندھا کر دے۔ گرمی میں وجود جل رہا تھا۔ میں ضبط کرتی، روٹیاں لگاتی رہی۔

اماں سیانی چپ سی بیٹھی تھی۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس کا فوجی بیٹا لاپتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آج تک انتظار تھا۔ وہ ہر جمعرات نیاز بانٹتی تھی۔ منڈیروں پر مٹی کے دیے جلائے جاتے۔ آنگن بچوں سے بھر جاتا تھا۔ مجھے سیانی کی بات یاد آرہی تھی۔ ایک دن اس نے کہا تھا۔

"شاد... دعا کرنا میرا بیٹا واپس آجائے... پھر میں تجھے اپنے گھر بہو بنا کر لے آؤں گی۔"

میں کئی ثانیے ہنستی رہی تھی۔ اپنا جواب آج بھی مجھے یاد تھا۔ "سیانی اماں... یہ لالچ نہ دے... میں ویسے ہی دعا کر دوں گی۔ ہر ماں بیٹے کے لیے چاند سی بھولاتی ہے۔ جب تیرا بیٹا آیا تو مجھے کہاں یاد رکھے گی۔" میری آواز میں قدیم زمانوں کی تھکن تھی۔ وہ میرے ہاتھ چومنے لگی تھیں۔

"وعدہ کرتی ہوں... اگر مکروں تو ابلیس کہلاؤں... چہرہ داغ دار ہو تو کچھ نہیں ہوتا شاد... خوب صورتی تو دلوں کی ہوتی ہے۔"

کچھ لوگوں کو تسلیاں، دلاسے دینے کا کیسا ہنر آتا ہے۔ وہ بھی اس ہنر میں ماہر تھیں۔ اوہ... مجھے خیالوں میں کھو جانے کی کیسی بری عادت ہو گئی تھی۔ روٹیاں جل چکی تھیں۔ جلنے کی سی کیفیت میرے وجود پر آن وارد ہوئی تھی۔ جلنے کی باس سے میرا جی الٹنے لگا۔ جلدی جلدی روٹیاں اتارنے کی وجہ سے ہاتھوں کی اوپری جگہ سے جلد جھلس گئی تھی۔ جسم کے جلنے کی تکلیف ایک طرف... روح کے جلنے کی اذیت دوسری

طرف۔۔۔ روح کی اذیت کا پلڑا بھاری تھا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

"اگر جو آنسو کالے رنگ کے ہوتے تو انسان روتے ہوئے کیسے لگتے؟" ایک بیرن سوچ ذہن میں جھلملائی تھی۔ میں ہنس پڑی۔۔۔ زور سے۔۔۔ مگر نہ ہنسنا روک سکی۔۔۔ اور نہ ہی آنسو۔۔۔ مجھے اپنے آنسو صاف کرنے کا ہنر نہیں آتا۔ روٹیاں چنگیر میں ڈالے میں جانے والی تھی۔ جب رک گئی، روز رک جاتی ہوں۔ صرف اور صرف اس سوال کے لیے جو سیانی کیا کرتی تھی۔

"شاد۔۔۔ سنا ہے کنواری لڑکیوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔۔۔ تو میرے جمال کے لیے دعا کرنا۔۔۔ میرا پردیسی خیر سے گھر واپس آجائے۔ پھر بارات لے کر تمہاری بھرجائی اور بھائی کے در پر آؤں گی۔"

میں نے دروازہ تھاما اور پلٹی۔

"اماں سیانی! کنواری لڑکیوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ مگر صرف ان کی جن کے بالوں میں چاندی نہیں ہوتی۔"

میں یہ کہہ کر اپنے گھر کی طرف نکل گئی۔ اماں سیانی ساکت بیٹھی تھی۔ ہر روز کی طرح۔۔۔ شاد پر اسے ترس نہیں آتا تھا۔ پیار آتا تھا۔ گرہن لگے چہرے کچھ نہیں ہوتے، مگر یہ جو گرہن لگے دل ہوتے ہیں نا یہ ضرور بھٹکاتے ہیں۔ سیانی اماں نے مٹی کے سینے پر ہاتھ رکھا اور قسم کھائی۔

"قسم اس اللہ کی جو ہر ذی روح کا خالق ہے۔ اگر خیر سے میرا پتر واپس آگیا تو شاد کو اس آنگن میں لے آؤں گی۔ اگر ایسا نہ کروں تو اسی مٹی میں مٹی ہو جاؤں۔"

آم کے پیڑ پر بیٹھی چڑیا حیران رہ گئی۔ ہواؤں میں نمی سی چھا گئی۔ وقت کے تھال پر کسی عربی ساز کو بجایا جا رہا تھا۔ دن کا سورج روشنی گھٹانے لگا۔ وقت کو انتظار تھا۔ اس عہد کا جو سیانی نے کیا تھا۔ کیا خبر کیا پتا، جمال واپس آجائے، مگر دور پہاڑی پر کسی انجان جگہ ایک قبر جنگلی پھولوں سے مہک رہی تھی۔ وہ قبر کتبے سے خالی تھی۔ مگر ہوائیں واقف تھیں۔ سارے راز جانتی تھیں۔

مگر لب بستہ تھیں۔ انہیں اللہ کی طرف سے حکم ملا ہے کہ امید، آس، یقین کو سرسبز رکھا جائے، اف یہ زندگی۔۔۔

☆ ☆ ☆

بھرجائی نے پرات اٹھا کر پھینکی تھی۔ میں ڈر گئی۔ مجھے پتا تھا کون سا تماشا ہونے والا تھا۔ جلی ہوئی روٹیاں زمین پر پڑی تھیں۔

"کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی۔۔۔ کس کے خیالوں میں تھی جو روٹیاں جلا دیں۔۔۔ خدا غارت کرے تجھے۔۔۔ خدا جانے کیا سمایا رہتا ہے آج کل تیرے ذہن میں۔۔۔ آجائے تیرا بھرا تیری ٹانگیں تڑواتی ہوں۔" وہ غصہ ہوتی رہی۔

کفگیر سے اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا تھا۔ ایسا لگا ابھی آنکھ ابل کر باہر آن گرے گی۔ میں آدھا گھنٹہ پانی سے دھوتی رہی، نیل پڑ گیا تھا۔ میں نے روٹیاں اٹھاتے ہوئے ایک بار تو آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ جانے میری ان نظروں میں کیا تھا۔ سوال۔۔۔ یا۔۔۔ کچھ اور۔۔۔ وضاحتیں دینا بھی وقت طلب کام ہے۔ پانی سے نوالے نگلتی رہی۔

بھیا آئے تو بھرجائی نے ایک کی ہزار سنائی تھیں۔ وہ بکتے جھکتے رہے۔ میں مٹی کا مادھو بنی چپکی پڑی رہی۔ جیسے جان نہ رہی ہو۔ بے جان۔۔۔ مگر بات تو روح کی ہوا کرتی ہے۔ کوڑے تو روح پر لگے تھے۔ بے غیرت بھائی تو بہنوں کو بیچ دیتے ہیں۔ مگر وہ بے غیرت نہ تھے۔ روز، روز مار لگائی جاتی۔ لفظوں کی جنگ میں ہلکان ہو جاتے۔ اس سے اچھا تھا۔ وہ بے غیرت بن جاتے۔

اس دن اماں سیانی نے نیاز کی کھیر پکوانے کے لیے بلوایا تھا۔ انہیں لگتا تھا، نیازیں پردیسیوں کو بھولے رستے دکھاتی ہیں اور وہ واپس پلٹ آتے ہیں۔ بچوں کے شور سے آنگن گونج رہا تھا۔ شام چھائی ہوئی تھی۔ دائیں طرف منڈیر پر مٹی کے دیے جل رہے تھے۔ ان کی لو مدھم ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔ اماں سیانی

میرے ساتھ چولہے کے پاس ہی بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

"شاد... مجھے تیری بھرجائی کے ارادے صحیح نہیں لگتے۔ وہ ضرور کوئی سازش کرے گی۔ اگر ایسی کوئی بات ہو تو میرے گھر آجانا... جو روکھی سوکھی ہے مل کے کھالیں گے۔"

میں ہنس دی تھی... اور وہ ہنسنا آج بھی روز اول کی طرح مجھے یاد ہے۔ میں نے سوچا تھا بھلا بھیا کیوں بھرجائی کی باتوں میں آنے لگے۔

مجھے بھولنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ صبح شام کا کچھ پتا ہی نہ چلتا تھا۔ اس دن شام جانے کب رات کی چادر اوڑھ گئی، مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ جب میں سارے کام نپٹا کر گھر واپس آئی، آسمان نے بادل اوڑھ لیے۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ بجاتی رہی... دروازہ دھماکے سے کھلا تھا۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ عروج پر تھی۔ بھیا اور بھرجائی صحن میں کھڑے تھے۔ مجھے لگا وقت نے چال چل دی ہے۔ دور جنگلوں میں کوئی گھڑ سوار بینائی کھو بیٹھا تھا۔ میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔

"کہاں سے آرہی ہے بے غیرت... شریف زادیاں رات کے اس پہر گھروں سے باہر نہیں نکلتیں؟"

بھیا کیا کہہ رہے تھے۔ بادلوں کی آوازوں میں ٹوٹتے آشیانوں کے سے بین تھے۔ میں نے ملتجی نظروں سے بھرجائی کو دیکھا۔ "بھیا... میں تو اماں سیانی کے گھر نیاز کی کھیر پکانے گئی تھی۔ آپ بھرجائی سے پوچھ لیں۔ میں انہیں بتا کر ہی گئی تھی۔"

سانپ کے زہر سے زیادہ زہریلے الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ مجھے اس رات پتا چلا تھا۔ بھابھی نے زہر اگلا تھا اور میرا جسم نیل و نیل ہو گیا۔

"جانے کہاں سے آرہی ہے بدکردار... ہر روز جانے کس سے ملنے جاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے شوکے سے چکر چل رہا ہے اس کا... وہ بھی تو دو سال تک چوکھٹ پکڑے کھڑا رہا تھا۔" میں سن ہو گئی۔

بھائی تو ایسی باتیں کہنے والوں کے منہ توڑ دیتے ہیں۔ مگر انہوں نے وہ کیا جو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ جوتا اتار رہے تھے۔ وہ اذیت آج تک مجھے یاد ہے۔ میں روتی رہی۔ میرے سر پر انہوں نے جوتے مارے تھے۔ کیا انہیں میرے سر کی سفیدی بھی نظر نہ آئی ہو گی۔ میرے بال جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ میں ان کے پیروں میں گری ہوئی تھی۔ ان ہی پیروں کو میں دباتی تھی۔ وہ فرعون جیسے تھے۔ میری کمر پر آج تک وہ نشان ثبت ہیں... میری آنکھوں سے آنسو نہیں خون ٹپک رہا تھا۔

بھرجائی نے میرے منہ پر تھپڑ مارے تھے۔ میں خون تھوکتی رہی۔ بلکتی رہی۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ زور کی بارش تھی، میں ننگے سر تھی، میرے پاؤں میں جوتے نہ تھے، میرے پیر زخمی ہو گئے تھے۔ میں دروازہ بجاتی رہی، مگر دروازہ نہ کھلا... سنسان گلی میں اندھیرا تھا۔ بارش سے گلی جل تھل ہو رہی تھی، اماں نے مرتے وقت کہا تھا۔

"تمہارا بھائی، تمہارا محافظ ہے... وہ تمہارا خیال رکھے گا۔ پھولوں کی طرح رکھے گا۔"

میں گلی میں رات کے اس پہر بیٹھی اس بات کو سوچ رہی تھی۔ انہوں نے تو میری روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔ ہر رشتہ بدل جاتا ہے۔ مگر ایک رشتہ کبھی بھی نہیں بدلتا۔ وہ رشتہ اللہ کا ہوتا ہے۔ میں ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگ رہی تھی۔ غیروں کے دیے زخموں پر صبر آجاتا ہے، مگر اپنوں کے دیے زخموں پر صبر کبھی بھی نہیں آتا۔ میں روتی ہوئی اماں سیانی کے گھر گئی تھی۔ رات کے پردے پر ہیبت طاری تھی۔ دور کہیں آسمانی بجلی گری تھی۔ ساری رات اماں سیانی میرے زخموں کی ٹکور کرتی رہی تھی۔ میں چپ چاپ روتی رہی۔ وہ مجھے تسلیاں دے رہی تھی۔

"ماں باپ کے مرنے کے بعد ہر رشتہ اجنبی ہو جاتا ہے۔ سارے رشتے، ناتے جھوٹے اور عارضی ہوتے ہیں۔ اصل رشتہ تو ہمارا اللہ کی ذات سے ہوتا ہے۔ تیرا بھائی بیوی کی باتوں میں آکر بدل گیا۔ کوئی بات نہیں، اب دونوں اکٹھے رہیں... تم میرے پاس ہی رہو۔"

میں اسے کیسے بتاتی میرے بھائی نے تو میرے سر میں بھی ٹھوکریں ماری تھیں۔ بھائی تو بہنوں کے مان ہوتے ہیں۔ مگر میرا مان' بھرم سب کچھ کہیں دور دفن کردیا گیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھی۔ بے بس.... اور.... بے سہارا بھی.... اماں سمجھتی تھی جسم کے درد سے میں رو رہی ہوں' مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اصل وجہ تو روح کے زخم تھے۔

میں اماں سیانی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ ڈوبتی راتوں کے تارے میری سہیلی تھے۔ چاہے بول نہیں سکتے' مگر سن تو سکتے ہیں نا۔ ہوائیں منڈیر پر رکھے مٹی کے دیے بجھانے لگتی ہیں۔ تو میں ڈوبتی شام کو دیے پھر سے روشن کردیتی ہوں۔

اماں سیانی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس کے فوجی بیٹے کا انتظار تھا۔ جانے ہوائیں ہمارے سندیسے کیوں نہیں لے جاتیں۔ اماں مجھے روز آبخورے پانی سے بھرے رکھنے کی تلقین کرتی۔ اس کا کہنا ہے۔

"شاد بیٹا.... کچھ پرندے ہجرت کرکے دور دراز سے آتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی کرنا ہمارا فرض ہے۔ کیا پتا پیاسے دلوں کی اللہ سن لے۔"

میں اس کی باتوں پر ہنس دیتی۔ کانچ سی ہنسی۔ جو گھائل کرے۔ ہماری آنکھوں میں امید کے چراغ جل رہے ہیں کہ کیا پتا.... ہاں.... کیا پتا.... کسی کے آنے کا وقت تو متعین نہیں.... مگر کبھی کبھی دل چاہتا ہے پورے چاند کی رات کے ڈوبتے سمے دروازے پر دستک ہو.... اور ایک نیلی آنکھوں والا پردیسی دروازے کی آن بنا کھڑا ہو۔ میری مسحور ہوتی آنکھوں میں دیکھے اور ہولے سے ہنس دے۔

"تنہائیوں کی ساحرہ.... آؤ رونقوں کی محفل کے ہم سفر ہوجائیں۔" اف.... یہ میں بھی نا بار بار بھول جاتی ہوں۔

کچھ شہزادیوں کے دیس میں شہزادے کبھی نہیں آتے۔ وہ ساری زندگی دروازوں پر ہی نظریں جمائے رکھتی ہیں۔" سوچوں پر اختیار مشکل اور دلوں پر تو مشکل ترین.... لاحاصل انتظار.... آخری امید.... آنکھو کی چوکھٹ پر انتظار کسی ناگ کی طرح براجمان ہے' جو دیگ کی حفاظت کیا کرتا ہے۔ ڈاکیا آیا تھا۔ خط دے گیا۔ اماں سیانی گھر پر نہیں تھی۔ اماں سیانی کے بیٹے کی شہادت کی خبر تھی۔ میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ ان بوڑھی آنکھوں کا انتظار مرگیا تھا اور اگر انتظار مر جائے تو وجود کہاں باقی رہتے ہیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اماں سیانی کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔ اور آج تک میں اس بات پر قائم ہوں۔ اب بھی ہر جمعرات کھیر پکائی جاتی ہے۔ منڈیروں پر مٹی کے دیے سر شام ہی جل جاتے ہیں۔ تیز ہوا میں بھی بس وہ تھرتھرا جاتے' مگر گل نہ ہوتے۔

میرے سجدوں میں اب اس فوجی کا نام آنے لگا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں۔

"انہیں مردہ نہ کہو' وہ زندہ ہیں اور اپنے خدا کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔" ہواؤں میں دور کسی پہاڑی پر بنی ایک قبر پر لگے جنگلی پھولوں کی باس ہے۔ جو مسحور کرتی ہے۔ سکون دیتی ہے۔ اب میری روٹیاں نہیں جلتیں۔ بھیا اور بھرجائی لینے آئے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا بلڈ کینسر کا شکار ہوگیا تھا تو انہیں اپنے گناہ' اپنی غلطیاں یاد آئی تھیں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا' مگر اماں سیانی نے انہیں برا بھلا کہہ کر نکال دیا تھا' لیکن میں نے اپنے بھائی کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ میرے دل میں اب کسی کے لیے بھی نفرت نہیں تھی۔ ایک ٹھوکر کس طرح پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے' مجھے اب پتا چلا تھا۔ انسانوں کی نسبت اللہ سے تعلق جوڑنا آسان ہے۔ کیونکہ اللہ دھتکارتا نہیں' اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤ تو وہ خود بڑھ کر تھام لیتا ہے۔

جب بھی رات گئے کسی ٹوٹتے تارے کو دیکھتی ہوں' مجھے وہ رات یاد آنے لگتی ہے۔ جوتے' تھپڑ' ایک نئی اذیت.... مگر اللہ کی قربت نے مجھے معاف کرنا سکھا دیا ہے۔ میں نے تو بھیا' بھرجائی کو بھی معاف کردیا' بے شک معاف کرنے والے ہی سکون پاتے ہیں اور میں نے جان لیا ہے کہ دوسروں کی نظروں میں مقید انتظار اور امید کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں یہ ہی کررہی ہوں۔

☆

اتنے خاموش بھی نہ رہا کرو
غم جدائی میں یوں کیا نہ کرو

خواب ہوتے ہیں دیکھنے کے لیے
ان میں جا کر مگر رہا نہ کرو

کچھ نہ ہوگا گلہ بھی کرنے سے
ظالموں سے گلہ کیا نہ کرو

ان سے نکلیں حکایتیں شاید
صرف لکھ کر مٹا دیا نہ کرو

اپنے رتبے کا کچھ لحاظ منیر
یار سب کو بنا لیا نہ کرو

منیر نیازی

تمہاری چاہت کی چاندنی سے ہر اک شبِ غم سنور گئی ہے
سنہرے پوروں سے خواب ریزے سمیٹتی ہر سحر گئی ہے

اب اس کا چارہ ہی کیا کہ اپنی طلب ہی لاانتہا تھی ورنہ
وہ آنکھ جب بھی اٹھی ہے، دامانِ درد پھولوں سے بھر گئی ہے

نہ تھا نہ ہوگا کبھی میسر سکون جو تیرے قرب میں ہے
یہ وقت کی جھیل جس میں ہر لہر جیسے تھک کر ٹھہر گئی ہے

ضیا دلوں میں غبار کیا کیا تھے روئے بھی جی بھر کے جب ملے وہ
وہ ابر برسا ہے اب کے ساون کہ پتی پتی نکھر گئی ہے

ضیا جالندھری

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دُنیا مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتا یاد نہیں

حسن سے چُوک ہوئی اس کی ہے تاریخ گواہ
عشق سے بُھول ہوئی ہو یہ مجھے یاد نہیں

بربط ماہ پہ مضراب فغاں رکھ دی تھی
میں نے اک نغمہ سنایا تھا، تمہیں یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں ساغر کو خدا یاد نہیں

ساغر صدیقی

ہوا کچھ تو بتا کہ
اس عید پہ کس حال میں ہے وہ
اور اس کے پیرہن کا رنگ کیا ہے
اور اس کے گیسوؤں میں کون سے پھولوں
کا گجرا ہے
اور اس نے عید پر کس رنگ کی مہندی
لگائی ہے
کیا اب کے بھی میری خوشبو ہی سانسوں
میں بسائی ہے
ہوا تو کیا بتائے گی، تجھے معلوم ہی کیا ہے؟
کہ اب کی عید پر
اس کی سوچوں پر ”پہرا“ ہے

سلیم فوز

اذکار

اس ماہ کی منتخب ترین اسٹوریاں

معصومیت

لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کو فون کیا تو اس کے بھانجے نے فون اٹھایا۔

لڑکی..... "اپنے انکل کو فون دو۔"

بچہ..... "آپ کا نام؟"

لڑکی..... "اپنے انکل سے کہو ان کی جان من کا فون ہے۔"

جواب میں بچے نے جو بات کہی اسے سن کر لڑکی بے ہوش ہو گئی۔

اس نے معصومیت سے کہا۔ "لیکن آنٹی موبائل پر تو "کمینی" لکھا ہوا ہے۔"

(اقرا نمرہ..... کراچی)

جواب

ٹیچر "اگر آپ کا دوست اور محبوب دریا میں ڈوب رہے ہوں تو آپ کس کو بچاؤ گے؟"

طالب علم..... "ڈوب جانے دو دونوں کو سالے ایک ساتھ کر کیا کر رہے تھے۔"

(سحر سہیل..... کراچی)

سرکاری نوکری

"ہاں! تو آپ معذوروں کے کوٹے پر نوکری چاہتے ہیں..... کیا معذوری ہے آپ کی؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری ایک ٹانگ نہیں ہے..... یہ دھماکے میں اڑ گئی تھی!"

"گڈ! آپ کو ابھی لیٹر مل جائے گا۔ کل سے نوکری پر آجائیں۔"

"بہت شکریہ!"

"یہ سرکاری نوکری ہے۔ دفتری اوقات صبح نو سے شام پانچ تک ہے..... یہ خیال رکھیں کہ آپ کو ہر حال میں گیارہ بجے دفتر پہنچنا ہے۔"

"وقت نو بجے ہے تو پھر مجھے گیارہ بجے....."

"میں نے کہا نا کہ یہ سرکاری نوکری ہے۔ ہم لوگ نو سے گیارہ تک ادھر ادھر گھوم پھر کر گپ شپ اور مزاج پرسی کرتے ہیں..... گیارہ بجے کام شروع ہوتا ہے۔ آپ چلنے سے معذور ہیں۔ دو گھنٹے تک کیا کریں گے۔"

(انیقہ انا..... چکوال)

فکر

اسکاٹ نے اپنی نئی بی ایم ڈبلیو (BMW) اپنے آفس کے سامنے روکی..... ابھی کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ قریب سے گزرنے والے ٹرک نے ایسی زور سے ٹکر ماری کہ کار کا دروازہ دور جا گرا۔ اسکاٹ چیخ کر بولا۔

"اتنی قیمتی کار کا یہ حشر! ابھی کل ہی خریدی تھی۔ اب یہ کبھی پہلے جیسی نہیں ہو سکے گی۔"

پاس ہی کھڑے آدمی نے کہا۔ "میں نے آپ جیسا شخص اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا' آپ کو کار کی فکر ہے اور یہ احساس بھی نہیں کہ آپ کا پورا ہاتھ کندھے سے غائب ہے۔"

اسکاٹ کندھے کو دیکھتے ہوئے۔ "او میرے خدایا! یعنی میری نئی رولیکس کی گھڑی بھی گئی۔"

(ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور)

اعتماد

ایک آفس میں جونیئر نے غلطی سے اپنے باس کا نمبر ڈائل کر دیا اور کہا۔

"دو منٹ میں میرے کمرے میں کافی لے کر آؤ۔"

باس غصے سے چلایا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟"
جونیئر۔۔۔ "نہیں۔"
باس۔۔۔ "میں اس آفس کا مالک ہوں۔"
جونیئر۔۔۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟"
باس۔۔۔ "نہیں۔"
جونیئر۔۔۔ "شکر خدا کا۔"
کہتے کے ساتھ ہی کال بند کر دی۔
(شازیہ گلزار بھٹی۔۔۔ ضلع بکھر)

لاٹری

بیٹا۔۔۔ "ابا ہمارا بکرا چوری ہو گیا ہے۔"
باپ۔۔۔ "تو بیٹا تھانے جاؤ اور طالبان کے خلاف پرچا کٹوا دو' نہ کوئی ثبوت مانگے گا اور نہ ہی کوئی گواہ۔۔۔ اور اگر بات میڈیا تک چلی گئی تو این جی اوز ایک درجن بکرے لا دیں گے۔ یو این او اور او بامامذمت بھی کر دیں گے۔ اور تم بھی مفت میں میڈیا کے ذریعے مشہور ہو جاؤ گے اور تو اور امریکہ کی سپورٹ اور ہمدردی کے ساتھ ساتھ امریکہ کی نیشنلٹی اور ڈالرز بھی ملیں گے۔ بکرا کیا چوری ہوا تمہاری تو لاٹری نکل آئے گی بیٹا۔"
(یسریٰ حبیب۔۔۔ سکھر)

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون سوشل ورکر وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہ داری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے سہمی اور خوف زدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔
"خدا کی پناہ! کیسی خوف ناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟"
"کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔
"پھر آپ لوگ اسے کوٹھری میں بند کیوں نہیں رکھتے۔ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟" خاتون نے تشویش سے پوچھا۔
"مجبوری ہے' اسے کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔
(تحریم شاہد بخاری۔۔۔ کوٹ ادو)

سفارشی رقعہ

ڈاکٹر کے پاس پہنچ کر ایک خاتون بولیں۔
"میں آپ کو کیا بتاؤں مجھے کیا کیا بیماری ہے۔ دل کے تین والو بند ہیں۔ دل بڑھا ہوا بھی ہے۔ جوڑوں میں درد ہے۔ بدن میں خون نام کو نہیں' بھوک بالکل نہیں لگتی۔ جگر بڑھا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یرقان بھی رہتا ہے۔ بلڈ پریشر بھی نارمل نہیں۔ سوتے میں کبھی کبھی سانس بھی رک جاتی ہے۔ دن میں سانس تیز چلتی ہے۔ ہفتے میں پانچ دن بخار رہتا ہے۔ کھانسی کے ساتھ خون آتا ہے اور۔۔۔۔"
وہ سانس لینے کو رکیں۔ ڈاکٹر نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ خاتون سرخ و سفید اور ہٹی کٹی نظر آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سر جھکا کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگے۔
"آپ نسخہ لکھ رہے ہیں۔" خاتون جلدی سے بولیں۔
"ابھی تو میں نے پورا حال آپ کو سنایا ہی نہیں۔"
"نسخہ کون کم بخت لکھ رہا ہے۔ میں آپ کے لیے گور کن کے نام سفارشی رقعہ لکھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔
انجم شہزادی۔۔۔ کوئٹہ

شگفتہ جاہ

حسنِ سخن پر

باتیں خوشبو سی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زیتون کا تیل سالن کے طور پر استعمال کرو اور اسے (سر اور بدن میں) لگاؤ۔ یہ مبارک درخت سے حاصل ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل،۔

دودھ سے حاصل ہونے والے گھی یا جانوروں کی چربی کی نسبت نباتاتی تیل زیادہ مفید ہے۔ نباتاتی تیلوں میں زیتون کا تیل سب سے عمدہ اور مفید ہے۔ زیتون کے درخت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مبارک درخت فرمایا ہے۔

(ترمذی)

خوشبو،

امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اسراء (معراج) کی رات ایک مقام سے مجھے نہایت ہی اعلا خوشبو کی مہک آنے لگی۔

میں نے کہا۔" اے جبریل! یہ کیسی اچھی خوشبو ہے؟"

تو انہوں نے جواب دیا۔" یہ فرعون کی بیٹی کی کنگھی کرنے والی خادمہ اور اس کی اولاد کی ہے۔"

اس کی شان پوچھی گئی تو عرض کیا۔" فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرتے ہوئے اس مومنہ خاتون کے ہاتھوں سے اتفاقاً کنگھی گر پڑی تو اس کی زبان سے بے ساختہ اللہ کا نام نکل گیا۔

فرعون کی بیٹی نے کہا۔" خدا تو میرا باپ ہے۔"

اس کی خادمہ نے جواب دیا۔" نہیں میرا اور تیرے باپ کا پروردگار اللہ ہے۔"

فرعون کی بیٹی نے کہا۔" میں اس کی خبر اپنے باپ کو دوں گی۔"

اس نے کہا۔" کوئی حرج نہیں۔"

پس اس نے اپنے باپ کو ساری بات سنائی۔

فرعون نے اس خادمہ کو بلایا اور کہا۔" کیا تم میرے سوا کسی اور رب کو مانتی ہو؟"

اس نے کہا۔" ہاں، میرا اور تیرا پروردگار اللہ ہے۔"

فرعون نے اسی وقت حکم دیا کہ تانبے کی گائے کو آگ میں تپایا جائے۔ جب وہ بالکل آگ ہو جائے تو پھر اسے اور اس کے بچوں کو ایک ایک کر کے اس میں ڈال دیا جائے۔

اس مومنہ عورت نے فرعون سے کہا۔" میری ایک درخواست ہے۔"

فرعون نے کہا۔" کیا ہے؟"

اس نے کہا۔" میری اور میرے بچوں کی ہڈیاں ایک کپڑے میں جمع کر کے دفن کر دینا۔"

فرعون نے کہا۔" اچھا تیرے کچھ حقوق ہمارے ذمہ ہیں، اس لیے یہ منظور ہے۔"

بعد ازاں فرعون نے حکم دیا کہ ایک ایک کر کے اس کے بچوں کو تپتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔

جب دودھ پیتے بچے کی باری آئی (فرعون کے سپاہیوں نے جب اس بچے کو چھینا) تو وہ گھبرائی۔ (تو حق تعالیٰ نے دودھ پیتے بچے کو گویائی عطا فرمائی) اس نے (اپنی ماں سے) کہا۔

"امی جان! آپ افسوس نہ کریں، بلکہ (آگ میں) ڈال دیں۔ کیونکہ دنیا کا عذاب، آخرت کے عذاب سے بہت ہلکا ہے۔"

تب (ماں نے بچے کو آگ میں ڈال دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ چار چھوٹے بچوں نے بات کی وہ یہ ہیں۔

1۔ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔
2۔ صاحب جریج۔
3۔ یوسفؑ کی گواہی دینے والا۔
4۔ فرعون کی بیٹی کی مشاطہ کا بیٹا۔

(مسند احمد طالیمنیۃ: 309/1
اسنادہ صحیح)

یہ روایت صحیح ہے۔ اس کے سارے رجال ثقہ ہیں۔

یہ سچ ہے کہ!

٭ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو حسنِ اخلاق میں ہی بڑھ جاؤ۔
(حضرت معروف کرخیؒ)

٭ اگر زندگی میں کچھ بننا چاہتے ہو تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ (قائداعظم)

٭ اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے کیونکہ چراغ جلانے کا اصل وقت غروبِ آفتاب کے بعد آتا ہے۔
(ابوالکلام آزاد)

٭ مصنف کی وہ سطر جو اسے زندہ و جاوید بنادے، اس کی تمام تصانیف پر بھاری ہے۔
(وارث شاہ)

٭ انسان کو رشک سے بچنا چاہیے مگر جس رشک سے اصلاح کی امید ہو، اسے فی الفور اختیار کرنا چاہیے۔ (ارسطو)

٭ انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔ (افلاطون)

٭ ظاہر پر نہ جا، آگ دیکھنے میں سرخ نظر آتی ہے مگر اس کا جلایا ہوا سیاہ ہو جاتا ہے۔
(شیخ سعدیؒ)

٭ پرندوں کی چہکار، شاخوں کی سرسراہٹ اور نہروں کی روانی پر کان لگاؤ کیونکہ "حسن" سننے والوں کا حصہ ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

حاصل مطالعہ!

٭ کتابیں جوانی میں راہ نما، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق ثابت ہوتی ہیں۔
(البیرونی)

٭ دنیا میں انہی لوگوں کی عزت ہوتی ہے جنہوں نے استادوں کا احترام کیا۔
(سرسید احمد خان)

٭ اگر آپ مستقبل کی پیش بینی کرنا چاہتے ہیں تو ماضی کا مطالعہ کریں۔ (کنفیوشس)

٭ جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پاس سوچنے کے لیے بہت کم باتیں ہوتی ہیں اور بولنے کے لیے بالکل نہیں۔ (بیکن)

٭ علم کے ساتھ صحیح ذوق ہونا ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، ذوق صحیح نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے اثر ہے۔ (بابائے اردو)

٭ بالکل غلط ہونے سے تقریباً صحیح ہونا بہتر ہے۔
(وارن لعنٹ)

حورین زینب۔ کہروڑ پکا

انوکھا علاج!

حضرت ابن مبارکؒ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی کہ حضرت سات سال سے میرے جسم پر ایک پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ ہر طرح کا علاج کروا چکا ہوں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہو سکا۔"

آپ نے فرمایا: "جاؤ ایسی جگہ کنواں کھودو جہاں پانی کی ضرورت ہو، وہاں پانی جاری ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ کا پھوڑا ختم ہو جائے گا۔"

اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ تندرست ہو گیا۔

یہ واقعہ علامہ منذری نے امام بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ منذری فرماتے ہیں کہ اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے علاقے میں بھی ہوا۔

فریحہ، نوشین۔ ہالی روڈ

سنہری بات،

اچھی بات چاہے کوئی کیسے چلے باندھ لو کیونکہ جب موتی کی قیمت مقرر کی جاتی ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سمندر کی تہہ سے لانے والا شریف ہے یا ذلیل۔

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

بڑے لوگ، بڑی باتیں،

- دشمن سے ہر وقت بچتے رہو، مگر دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری بے جا تعریف کرنے لگے۔ (شیخ سعدیؒ)
- جنگ کے لیے تیار رہنا امن برقرار رکھنے کے لیے سب سے موثر طریقہ ہے۔ (جارج واشنگٹن)
- جو شخص لڑتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہو، اسے ایک نہ ایک دن لڑنا ہی پڑتا ہے۔ (گولڈ اسمتھ)
- چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال رکھو، معمولی سا سوراخ بہت بڑے جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔ (فرینکلن)
- انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔ (افلاطون)

سیدہ نسبت زہرا۔ کھرڑ پکا

صلح،

ایک دن حضرت بہلول بازار میں بیٹھے تھے کسی نے ان سے پوچھا۔

"بہلول! کیا کر رہے ہو؟"

حضرت بہلول نے فرمایا: "بندوں کی اللہ سے صلح کروا رہا ہوں۔ اللہ تو مان رہا ہے مگر بندے نہیں مان رہے۔"

کچھ دن بعد آپ قبرستان میں بیٹھے تھے۔ کسی نے پوچھا۔

"بہلول! کیا کر رہے ہو؟"

حضرت بہلول نے فرمایا۔

"اللہ کی بندوں سے صلح کروا رہا ہوں۔ آج بندے تو مان رہے ہیں مگر اللہ نہیں۔"

الوینہ دانش، فائزہ دانش۔ حیدرآباد

عقل کی بھی ایک حد ہے،

حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ کا فرمان ہے۔

"ایسے علاقے میں نہیں رہنا چاہیے، جہاں دینی مسئلہ بتانے والا عالم اور جسم کا علاج کرنے والا طبیب موجود نہ ہو۔ انسانوں کو قابو رکھنا جانوروں کو قابو رکھنے سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ جس طرح نگاہ کی ایک حد ہے، جس سے آگے وہ کام نہیں کرتی، اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے، جس سے آگے وہ بے کار ہے۔ شرک کے علاوہ ہر گناہ کی مغفرت کی امید ہے لیکن گمراہی کا معاملہ بہت سخت ہے۔"

(بحوالہ: ملفوظات امام شافعیؒ)

ندا طارق۔ فیصل آباد

ہار جیت،

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے کہ دنیا کے ہر میدان میں ہار جیت ہوتی ہے لیکن اخلاق میں کبھی ہار اور تکبر میں کبھی جیت نہیں ہوتی۔"

نوشین دانش۔ ہالی روڈ حیدرآباد

استغفار،

جب شیطان نے کہا کہ اے رب! تیری عزت کی قسم! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ بہکاتا رہوں گا جب تک ان کی روح ان کے جسموں میں رہے گی۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

"مجھے قسم ہے اپنی عزت و جلال کی اور اپنے اعلا مقام کی۔ جب تک وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں گے، میں ان کو بخشتا رہوں گا۔ (سبحان اللہ)

ثمینہ اکرم۔ کراچی

خالد جیلانی

کھلتا کسی کا کیوں میرے دل کا معاملہ

خالدہ ____ گاؤں اولکھ
اُداسیوں کی یہ شام اور یادوں کا یہ سماں
اپنی پلکوں پہ ہرگز ستارے نہ لائیں گے
رکھنا سنبھال کے تم چند خوشیاں میرے لیے
میں لوٹ کر آؤں گی پھر عیدیں منائیں گے

زرفشاں انصاری ____ کراچی
مناؤ عید بہار چمن کو یاد کرو
پیام شوق کے اک اک سخن کو یاد کرو
ہجوم شوق سے فرصت ملے تو اہل وطن
وطن سے دور کسی بے وطن کو یاد کرو

فری گل ____ بنوں
اس عید پر بھی مل نہ سکے تو کیا ہوا
جذبوں میں ہو خلوص تو عیدیں ہزار ہیں

نمرہ، اقرا ____ کراچی
یہ سال تیرے واسطے خوشیوں کا نگر ہو
کیا خوب ہو ہر روز تیری عید اگر ہو
ہر رات مسرت کے نئے گیت سنائے
لمحات کے پیڑوں پہ بھی شبنم کا ثمر ہو

شفق راجپوت ____ گوجرہ
دل میں پھر اک شور سا ہے برپا
کہ برس بعد دیکھا ہے چاند عید کا
دل میں ہے تیری یاد کا نشتر لگا ہوا
پھر کس طرح کریں اہتمام ہم عید کا

آسیہ فرید ____ ملتان
تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے بھی من کے دریچوں میں عید ہو جائے
میرے اُفق پہ اگر چاند بن کے چھائے وہ

رضوانہ شکیل راؤ ____ لودھراں
یہ سال تیرے واسطے خوشیوں کا نگر ہو
کیا خوب ہو ہر روز تیری عید اگر ہو
ہر رات مسرت کے نئے گیت سنائے
لمحات کے پیڑوں پہ بھی شبنم کا ثمر ہو

امبر گل ____ جھڈو (سندھ)
ملیں تجھے نہ دکھ زندگی میں
پھول کی طرح مہکے تو خدا کرے
زندہ رہے نام ابد تک تیرا
عید کی خوشیاں تجھے مبارک خدا کرے

لاریب، ماہ زیب ____ چونیاں
دل کسی ماہی بے تاب کی صورت اے دوست
تیری فرقت میں تڑپتا ہی رہا عید کے دن
تیری قربت کا زمانہ تیری فرقت کا ملال
کسی صورت بھی بھلایا نہ گیا عید کے دن

نیلم شہزادی ____ کوٹ مومن
عید کے اس حسین موقع پر
میری یادوں میں تو بھی شامل ہے
آنا کبھی اجنبی فضاؤں میں
تو مری زندگی کا حاصل ہے

پارس شاہ ____ لیہ
نخل سایہ دار کے جڑ سے اکھڑ جانے کے بعد
آج پہلی عید ہے تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد

درشن مولا یادم ____ سرگودھا
دل بہل جائے مسرت سے مرا عید کے دن
اے غم یار مرے پاس نہ آ عید کے دن
پھر مجھے کرب کی سولی پہ چڑھانے کے لیے
یاد آیا ترا پیمان وفا عید کے دن

حرا ملک ______ وہاڑی

اس برس کوئی حسین خواب اُن آنکھوں میں نہ تھا
اس برس ہم سے بھی دیکھا نہ گیا عید کا چاند

زیب مختیار ______ ملتان

ہماری عید تو وابستہ تیری دید سے تھی
جو تو نہیں تو بھلا عید کی خوشی کیسی

ندا طارق ______ فیصل آباد

کچھ لوگ مگر کسی طور بھلائے نہیں جاتے
کچھ لوگ روزِ عید پر بھی آتے نہیں یاد

ثمینہ اکرم ______ لیاری

تمہارے ساتھ گزارا ہے عہدِ غم میں نے
مجھے بھی عید کی خوشیوں میں یاد کر لینا

پاکیزہ ہاشمی ______ بہاول پور

کس سے احوال بیاں کرتا تری محفل میں
دل گرفتہ تھا کوئی، درد کا مارا تھا کوئی

ماروی ______ سکھر

وہ حادثہ جو ہوا اس کا رنج کیا کرتا
جو ہونے والا تھا، وہ بھی مرے قیاس میں تھا

شائستہ رحیم ______ ملتان

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی
اس ادا کا تری جواب نہیں
مہربانی بھی، سرگرانی بھی

حنیزہ علوی ______ بالہ

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو تماشا مرے غم خانے کا

عائشہ جمیل ______ کراچی

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں
آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

دگھنسیہ جمیل

خط ہمارے اور جواب آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ سب کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
سب تعریفیں اللہ کے لیے ہی ہیں جو دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔

پہلا خط شجاع آباد سے شازیہ الطاف ہاشمی کا ہے، لکھتی ہیں۔

شعاع ابھی ابھی ملا ہے اور میرا خط شامل نہیں تھا۔ اگر پہنچا ہے تو پھر ہماری محبت کی قدر نہیں کی گئی۔ اتنی مشکل سے منت ترلے کرکے رجسٹری کروایا تھا۔
"آپ نے میرا دل توڑا ہے" کوثر خالد صاحبہ کا شعر شاعری کی معیار پر تو پورا نہیں اترتا مگر محبت کے معیار پر پورا اترا۔
بہن ٹ تم کو جو جواب دیا ہے۔ پڑھ کر روتے روتے مسکرا اٹھی۔ (میرا خط جو نہیں چھپا تھا) صحابہ کرام والا واقعہ پہلے معلوم تھا مگر اب تازہ ہو گیا ہے۔ سروے میں شامل کر لیں نہیں تو ہمارے شجاع آباد میں بھی نہریں کم نہیں ہیں۔ چھلانگ مار دینی ہے میں نے۔
آخر میں ایک شعر آپ کی خدمت میں۔

آنکھوں کی نمی سے وہ مری بات سمجھ لے
دیوانے کوئی بات زبانی نہیں کرتے

ج۔ پیاری شازیہ ____ پہلے تو یہ بتائیں کہ شجاع آباد کی نہروں میں پانی ہے؟ اور اگر آپ سب نے ہمیں اسی طرح نہروں کی دھمکیاں دیں نا تو سن رکھیں، کراچی میں تو پورا سمندر ہے۔ اور چلیں آنسو پونچھیں امید دلائی ہے تو اللہ کی بندی صبر بھی کسی چیز کا نام ہے۔ وہ آپ نے سنا نہیں قتیل شفائی نے کیا کہا ہے۔

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

افسانہ شامل ہے۔
آنکھوں کی نمی سے بات سمجھانے کی کوشش نہ کریں۔ بھئی اگر انسان ہر جگہ رونے بیٹھ جائے تو اپنے ہی نین کھوئے گا کیونکہ مقامات آہ و فغاں بہت ہیں۔

ناظمہ زیدی نے چوک اعظم سے لکھا ہے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

ماڈل کچھ خاص اچھی نہ لگی، رمضان کا مطلب افسردہ نظر آنا تو نہیں؟ ہمیں تو رنگوں سے پیار ہے سو۔۔۔ پیاری نبی کی باتیں۔ سبحان اللہ "جب تجھ" ہمیشہ کی طرح بوجھل اور اداس، کتنے دکھ ہیں اس دنیا میں، دل افسردہ ہو گیا۔
ٹی وی سے ناتا بہت کم ہے سو بندھن پہ تبصرے سے معذرت۔ میرا فیورٹ سلسلہ "خط ہمارے" ہمیشہ کی طرح سر ب(گو کہ میرا خط نہ تھا مگر۔۔۔) ممناز یوسف جی میں نے بالکل بھی برا نہیں مانا اور نہ امی نے۔ آپ کی بات سو فیصد سچ ہے کہ ساس، نند اور بہو بہت کم ایسی ہوں گی جنہیں آپس میں شکوے شکایات نہ ہوں۔ انسان بڑا بے صبرا ہے۔ ہمیں سب کچھ ابھی چاہیے بدلہ، انتقام۔ مگر جو لوگ صبر کرتے ہیں اللہ انہیں نوازتا بھی ہے۔

"خواب شیشے کا" بہت اچھا ہے سچ میں، کوئی مبالغہ آرائی نہیں۔ مجھے ایسے گھریلو ناولز بہت اچھے لگتے ہیں

سیدھے سادے سے "اشک ندامت" واقعی حقیقت پہ مبنی تھا' ہمارے معاشرے میں بڑ99 مرد ایسے ہی ہوتے ہیں صرف ماں کی سن کے باقی ہر طرف سے کان بند.....

"محبت ہمسفر" بس اوکے تھا۔ افسردہ سی کہانی کا افسردہ سا اینڈ..... "سبق" بہت اچھا افسانہ لگا منفرد سا'

ایمل رضا' آپ کا ناول بہت اچھا تھا تھوڑا پیچیدہ تھا' آپ سے درخواست ہے کہ تھوڑے سادہ انداز میں افسانے لکھا کریں' اب اتنا دماغ کہاں ہوتا ہے گھریلو عورت کے پاس کہ وہ فلسفے کو سمجھے سو.....

"خواہشوں کا سفر" بھی ٹھیک تھی۔ کسی پڑھی ہوتی کہانی کا حصہ لگ رہی تھی۔

ج پیاری ناظمہ! دو دو لفافوں میں گوند اور ٹیپ میں جکڑا آپ کا خط بھی مل گیا ہے۔ افسانہ بھی مل گیا ہے۔ وہ ناقابل اشاعت تو نہیں مگر قابل اشاعت بھی نہیں' تھوڑی اور محنت کریں۔ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کا سلسلہ موصول نہیں ہوا۔ کیا آپ نے افسانے کے ساتھ بھجوایا تھا۔

کوئی بھی ناول منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کر کے معلومات حاصل کر سکتی ہیں 32721777 وہ آپ کو قیمت اور طریق کار کے بارے میں بتا دیں گے۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے آپ کو 720 روپے منی آرڈر کرنا ہوں گے۔ ایڈریس یہ ہے' خواتین ڈائجسٹ 37 ، اردو بازار کراچی ۔ رسالے صرف اور صرف آپ ہی وصول کریں اس کے لیے آپ اپنے پوسٹ مین کو ہدایت کر دیں کہ وہ صرف آپ کو ہی دے۔

عدینہ ابراہیم نے کوہاٹ سے محفل کو رونق بخشی ہے' لکھتی ہیں

میں کرن شعاع اور خواتین کی مستقل اور پچھلے گیارہ سالوں سے خاموش قاری ہوں۔ خط لکھنے کی بھی کچھ خاص وجوہات تھیں۔ مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ میری رائے سے یا خیالات سے کون متفق ہے اور کون نہیں لیکن ادارے سے اتنی توقع ضرور ہے کہ میرا خط شائع کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ واقعی آپ کے پرچوں میں "خاص بہنوں" کے علاوہ عام بہنوں کی بھی جگہ ہوتی ہے۔

سب سے پہلے تو میں ان بہنوں سے گزارش کرنا چاہوں گی کہ جو ٹا مینٹل کے ساتھ ساتھ ہر ایک رائٹر کی درگت بناتی نظر آتی ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی ان لوگوں کی کہ اگر رائٹرز بیچاری رومانٹک لکھیں تو جوابی کارروائی یہ ہوتی ہے کہ حقیقی زندگی سے دور..... فلمی ڈرامائی انداز ہے۔ ایسا حقیقت میں تو نہیں ہوتا۔

اگر حقیقی تلخیوں سے روشناس کرائیں تو فرمایا جاتا ہے کہ ہمارے مسائل آل ریڈی اتنے ہیں پلیز ان پرچوں میں مسئلے مسائل نہ لکھا کریں ہم لوگ انٹرٹینمنٹ کے لیے پڑھتے ہیں ڈپریشن گین کرنے کے لیے نہیں۔

اگر سمیرا حمید بے چاری خالصتاً "اردو میں" لکھیں اور الفاظ کچھ مشکل استعمال کرلیں تو ان کی شامت آجاتی ہے اگر عمیرہ احمد انگلش کے الفاظ استعمال کرلیں تو ان پہ تنقید کہ یہ کیا؟ انگلش کا استعمال! نمرہ احمد کی بے مثال تحریر پہ بجائے ان کو انکریج کریں تعریف کریں۔ فرمایا جاتا ہے مشن امپاسبل ہے۔ اف میرے خدا کدھر جائیں یہ رائٹرز ۔ پتا نہیں ایسے تنقیدی خطوط شائع کرتے وقت ادارے والے کتنی بڑی بڑی چٹانیں دلوں پہ رکھتے ہوں گے۔

یہ تو ہماری رائٹرز کا حال تھا اب کچھ قارئین کے سلسلے "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کی بات کرلوں۔

اس سلسلے میں تمام قارئین جو کہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی ہوتی ہوں گی کچھ کم' بہرحال وہ رائٹرز تو نہیں نا۔ لیکن ان کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ پچھلے کسی شمارے میں ایک بہن نے لکھا تھا کہ میری جٹھانیوں نے برتن اس انداز سے رکھے ایک دوسرے پر کہ میرا نیا سیٹ ٹوٹ گیا اور یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بس جی آگیا پھر تنقیدی لیٹر کہ یہ تو اتنی بڑی بات نہیں' بس بعض بہنیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا بناتی ہیں۔ اسی طرح پچھلے شمارے میں کسی بہن کی مت ماری گئی اور اس نے اپنا احوال لکھ بھیجا بس جی چھپنے کی دیر تھی تنقیدی خط آپہنچا۔ "بعض بہنیں ایسے ہی چھوٹی باتوں کو بڑا بنا کے پیش کرتی ہیں میں نے اس سے زیادہ تکالیف دیکھی ہیں' گوشت روز نہ پکنا اتنی بڑی بات تو نہیں کہ اسے دکھ درد کہا جائے۔"

اس بہن نے صرف ادارے کے سوال کا جواب دیا تھا کہ "میکے اور سسرال کے کھانوں میں کیا فرق محسوس ہوا" یہ سوال نہیں تھا کہ کھانے کے معاملے میں دکھ درد بیان کریں۔ اسی سوال کے جواب میں تھا کہ میکے میں گوشت پسند تھا یہاں جس وقت سبزی ہوتی میں نہ کھا سکتی تھی بس۔

ان جیسی بہنوں سے جو خود کو ادب کا درخشاں ستارہ سمجھتی ہیں گزارش ہے کہ خدارا کسی کی دل شکنی اور دل آزاری کا سبب نہ بنا کریں اگر 2 لفظ لکھ کر کسی کا دل خوش نہیں کر سکتیں تو 4 لفظ لکھ کر کسی کا دل نہ دکھایا کریں۔ کوئی انسان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ مکمل نہیں تو ہم انسانوں سے پرفیکٹ ہونے کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں۔

ج۔ پیاری عدینہ! ہم آپ کا خط ایڈٹ کر کے شائع کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں خدشہ تھا کہ کہیں قارئین یہ الزام نہ لگا دیں کہ ہم نے خاص طور پر آپ سے یہ خط لکھوایا ہے۔

پیاری بہن! شاعر نے تو کہا تھا ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں لیکن ہمارا نظریہ کچھ اور ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جن سے محبت ہوتی ہے ان کو انسان مکمل اور خامیوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کی چھوٹی سی کمی یا خامی بھی گراں گزرتی ہے۔ ہماری قارئین بھی شعاع سے محبت کرتی ہیں اس لیے بلا تکلف اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ اور یقین کریں کہ تنقید ہم دل پر پتھر رکھ کر نہیں خوشی خوشی شائع کرتے ہیں ایک اور بات کی وضاحت کردیں کہ ہر ماہ قارئین ہماری تعریف میں بھی خطوں میں بہت کچھ لکھتی ہیں وہ ہم بے شک ایڈٹ کردیتے ہیں۔ اور یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ "عام" ہیں اور جن بہنوں کے خط شائع ہوتے ہیں۔ "وہ خاص" ہیں۔ ہماری تمام قارئین جو ہمیں خط لکھتی ہیں وہ ہمارے لیے خاص ہیں۔ بہرحال اب خوش ہو جائیں آپ کا شمار بھی خاص 'لوگوں' میں ہونے جارہا ہے۔

جو کچھ آپ نے لکھا۔ وہ آپ کی رائٹرز سے محبت ہے لیکن جو بہنیں تنقید کرتی ہیں۔ ان کی رائے کا احترام اپنی جگہ بہت ضروری ہے۔

ترین آغا نے گاؤں پدانہ زرخیل ضلع شکارپور سے لکھا ہے

میں جس دیس کی باسی ہوں وہ دیس مجھے کبھی بھی یہ اجازت نہیں دے گا کہ میں اپنا نام لکھوں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں تعلیم حاصل نہیں کر سکتیں اور لڑکوں کے لیے تعلیم ضروری ہے اس لیے میں بھی ان پڑھ تھی..... تھی کا لفظ

اس لیے لکھا کیوں کہ اب میرے دو دو استاد ہیں جنہوں نے نا صرف لکھنا پڑھنا بلکہ زندگی گزارنے کا ہر ہنر سکھا دیا ہے اور میں بھی فخر سے کہتی ہوں کہ میں بھی شعاع اور خواتین پڑھتی ہوں اور یہ دونوں میرے پیارے استاد پیارے دوست اور پیارے ہم راز ہیں۔ سب بہنوں کی طرح میرے پاس بھی آتے ہیں مجھے لکھنے کا بھی بہت شوق ہے کچھ لکھے بھی ہیں افسانے مگر جب نمرا احمد کا "نمل" عمیرہ احمد کا "آب حیات" صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" آمنہ ریاض کا "دشت جنوں" پڑھتی ہوں اور سمیرا حمید کا "یارم" مریم عزیز کا "تعبیر" یاد کرتی ہوں تو دل کہتا ہے (ھائی چپ کری ویھ) چپ کر کے بیٹھو بس جی کہاں میں کہاں اتنی قابل رائیٹرز۔

پیاری ترین ! محفل میں خوش آمدید باب کیا کہیں کہ معاشرے کا چلن ہی ایسا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے وقت سب کو ہی انا اور غیرت یاد آجاتی ہے۔ آپ کے لیے مخلصانہ مشورہ ہے کہ فی الوقت لکھنے کا نہ سوچیں۔ صرف پڑھیں۔ ان شاء اللہ مطالعہ آپ کی سوچ میں وسعت پیدا کرے گا۔

مسلسل محنت اور کوشش کرتی رہیں تو ان شاء اللہ کامیابی ہو گی۔ آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اتنی پابندی اور باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا۔ یہ بات بہت خوش آئند ہے۔

صدف عنبرین لکھتی ہیں

اس زمانے سے شعاع، خواتین پڑھ رہی ہوں جس عمر میں آج میری بیٹی ہے (بارہ سال کی ہونے والی ہے ماشاء اللہ) شعاع کے مستقل سلسلے پڑھنے لگی ہے، مئی کا شمارہ بھی لاجواب تھا۔ خاص کر "سیاہ حاشیہ" زبردست صائمہ اکرم 'نایاب جیلانی کی تحریر بھی ایک عمدہ تحریر تھی۔ قانتہ رابعہ کے تو کیا کہنے 'سعدیہ حمید کا "میری ماں" پڑھ کر ایسا لگا کیا واقعی تمام مائیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں (اللہ میری امی کو لمبی، صحت مند زندگی دے) جون ایلیا کی غزل اچھی لگی حسب حال پایا اخلاق نہ برتیں گے مدادا نہ کریں گے (ہیں، رمضان میں بھی) آئینہ خانے کا سچ آپ کی حق گوئی کی تصویر ہوتا ہے۔ تاریخ کے جھروکے اس بار بہترین واقعہ پڑھنے کو ملا۔

ج۔ پیاری صدف — !شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

جون ایلیا کی غزل پر عید کے بعد عمل کریں گے۔ رمضان میں تھوڑی۔ ابھی تو شیطان قید نہیں ہے کیا؟

اور یہ کیا صرف تعریف... کیا ہم یقین کرلیں کہ واقعی آپ کو پورا پرچا بہت اچھا لگا ہے؟

بحیرا نیلم نے گجرات سے لکھا ہے

میں آپ سے بہت ناراض ہوں کیونکہ دو سال سے بار بار خط بھیجنے کے باوجود آپ شائع نہیں کرتیں۔ لگتا ہے آپ پرانی لکھاریوں کے خطوط کو شاید پہلے جگہ دیتی ہیں۔
یہ صرف محبت بھرا شکوہ ہے اگر برا لگا تو معافی چاہتی ہوں جناب، خط شائع کرکے ہمارے مان میں اضافہ کردیجئے گا۔

ج: ارے بھئی، بحیرا نیلم! ایسی بھی کیا ناراضی کہ شمارے پر تبصرہ بھی نہیں کیا۔ اس دفعہ تو مان میں اضافہ کررہے ہیں مگر آئندہ بھی پیار بھرے شکوے کیے تو جان لیں کہ آپ کے دل کی بات سیدھی ہمارے دل میں جگہ پائے گی۔ پھر شکایت مت کیجئے گا۔

افشاں خان اور عطیہ حق نواز نے شاہ پور چاکر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل رمضان المبارک کی مناسبت سے اچھا لگا۔ باقی پورا رسالہ بھی اس ماہ مبارک کی خوشبو سے معطر تھا۔ رقص بسمل بہت کم اوراق پر ہونے کی وجہ سے مزہ نہیں دیتا۔ "خواب شیشے کا" بھی روایتی سی کہانی لگ رہی ہے "آگے کیا ہوگا؟" جیسا کوئی سسپنس نہیں ہے۔ باقی مکمل ناول تینوں اچھے تھے۔ سب سے زیادہ "پیال ساز" اچھا لگا۔ اگلی اور ہوپ فلی آخری قسط کا بے صبری سے انتظار

ج: افشاں اور عطیہ! اسکول میں جاب کی وجہ سے آپ ہمیں خط نہ لکھ سکیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ شعاع سے ناتا قائم رہا۔
"خواب شیشے کا" روایتی اسٹوری سے ہٹ کر ثابت ہوگی۔ تھوڑا انتظار کریں۔ عفت سحر طاہر نے بہت سادہ انداز میں آغاز کیا ہے اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔

شبنم شمشاد نے یزمان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائیٹل اچھا تھا۔ سادہ سا، پیارا سا، قسط وار ناول کچھ خاص اچھے نہیں لگ رہے۔ بس گزارا چل رہا ہے۔ "پیال ساز" یہ تبصرہ محفوظ ہے اور سیاہ حاشیہ اچھی لگ رہی ہے۔ رضا آپی تھنک ہاشم ہے۔ باقی افسانے بھی ٹھیک ہی تھے بس۔ فرحت اشتیاق، راحت جبیں اور ہماری عزیز از جان سائرہ رضا! اچھا نہیں کیا آپ نے ہماری حورے کے ساتھ اور دل کہاں دھڑکتا ہے پھر؟ ہاں حمیرا بہت اچھی لگی ہمیں ہمارے جیسی۔
نایاب جیلانی کا ناول بہت اچھا لگا اور خواہشوں کا سفر اور لاسٹ منتھ بھی ایسی ہی ایک اسٹوری۔ یہ پلاٹ بہت پرانے ہوچکے اب۔ پہلے دو صفحات پڑھتے ہی ساری کہانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جیسے نبیہا والی اسٹوری تھی۔
"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں ایسی قاری بہن کا انتظار ہے جو کہے کہ ہاں میں ہوں پیا من بھائی، ساس ہے ماں جیسی اور نند بہن کا پرتو ہے۔
رفعت ناہید سجاد سے کچھ لکھوائیں۔ راحت جی! کوئی رنگوں، موسموں اور خوشبوؤں سے بھرا ناول لکھیں!
سائرہ رضا! آپ کی غیر حاضری بہت گراں گزرتی ہے۔
فرحت جی! ہم عالی کو بہت مس کررہے ہیں اور آپ کو بھی انیسہ سلیم بھی کھو گئی ہیں۔ اپنا سیانا اور سیانی بھی بہت یاد آتے ہیں، ہمیں اور ثمینہ عظمت علی کا منفرد مخصوص انداز کوئی چھوٹا سا افسانہ ہی سہی اور بہت سے لوگ ہیں اچھا لکھنے والے۔ ایمل رضا، سمیرا حمید اور بنت سحر بھی۔

ج: پیاری شبنم! شکر ہے آپ کو ٹائٹل تو پسند آیا۔ ورنہ تو اس ماہ کی ہماری محنت تو ضائع ہی گئی اور ہاں ساس نندوں سے نہ ڈریں۔ ہماری بہت سی قارئین کو ایسے ہی لوگ ملے ہیں جن کی آپ نے خواہش کی ہے۔

کہانیاں ہمیشہ ان کرداروں کی لکھی جاتی ہیں جو عام لوگوں سے ہٹ کر ہوں۔ اسی طرح جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے سلسلہ بھی ان کرداروں کو سامنے لانے کے لیے شروع کیا گیا ہے جنہوں نے ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا۔ معاشرے کے منفی کرداروں کے بیچ رہ کر زندگی گزارتے ہوئے صبر سے کام لیا۔ اگر سب اچھا ہی اچھا ہو تو اس میں کیا سبق ہوسکتا ہے۔

زوبیہ ستار نے کچا کھوہ سے لکھا ہے

میں نے تمام رسالوں کو بہت کم پڑھا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ کہ میری والدہ محترمہ ایک روایتی خاتون ہیں اور وہ رسالوں اور ناولوں کا پڑھنا اچھا نہیں سمجھتیں۔ چھپ چھپا کر تھوڑا بہت پڑھ لیتی ہوں۔ میں نے ایم اے کا

پہلا سال مکمل کیا ہے۔ دوسرا جاری ہے۔ دو تین کہانیاں بھی لکھ چکی ہوں۔ لیکن ابھی چھپوانے سے قاصر ہوں۔ شاعری اور اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے خود بھی شاعری کرتی ہوں کافی دن سے، سوچ رہی تھی کہ خط لکھوں لیکن آج ہمت باندھ ہی لی۔ تخاطب کا مطلب صرف بھولی سی شاعری بھیجنا تھا۔ شاعری کو میری طرف سے تحفہ ہی سمجھیے اور برائے مہربانی خصوصی طور پر چھاپا جائے۔

ج۔ پیاری قدسیہ ستار! آپ کی نظم میں رسالے والوں کی تعریف کچھ زیادہ ہی نہیں ہو گئی۔ ایسی تعریفیں ہمیں ہی ہضم نہیں ہو رہیں تو قارئین کو کہاں ہوں گی۔ ابھی فی الحال صرف پڑھائی پر توجہ دیں۔ ایسی نظمیں غزلیں شائع کرنے کا رسک ہم نہیں لے سکتے۔ آخر قارئین کو بھی منہ دکھانا ہے۔ قارئین کا صبر آزمانے کا حوصلہ ہم میں تو نہیں ہے۔

کائنات اصغر بوزدار نے ڈھرکی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

حمد و نعت کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے "جب تجھ سے ناتا جوڑا" اس سلسلے سے سیکھنے کو تو بہت کچھ مل رہا ہے مگر میں اس پر رائے نہیں دوں گی کیونکہ مجھے نہیں پتا اس میں حقیقت کتنی مقدار میں ہے۔ بندھن میں وہی پرانا "کپل" جس کا پہلے بھی انٹرویو لیا گیا تھا۔

حیا بخاری کے افسانے "اشک ندامت" میں باجی تو بڑی سیانی نکلی۔ ویلڈن حیا جی "سیاہ حاشیہ" وری گڈ۔

نایاب جیلانی "پگھلتا ہوا موسم" واہ! واہ! کہانی بڑی زبردست تھی۔ نایاب آپی! آپ کے ہیرو ہیروئن تو بڑی ترقی کر لی۔ لاابالی ہیرو، ہیروئن کو میاں بیوی بنا دیا اور ساتھ میں دو عدد بچے بھی گود میں کھلا دیے۔

ج۔ پیاری کائنات! ہمیں لگتا ہے لوڈشیڈنگ اور گرمی نے آپ کو زیادہ ہی متاثر کیا ہے تب ہی تو اس بار اتنا مختصر خط لکھا ہے ورنہ آپ تو ہمیشہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ ہی آتی ہیں۔

نایاب جیلانی واقعی کچھ سنجیدہ نظر آ رہی ہیں لیکن کیا کریں ہمیں تو ان کے وہی لاابالی ہیرو، ہیروئین زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ہم نایاب کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی اس انفرادیت کو نہ چھوڑیں۔

شازیہ قیصر نے گاؤں نروال سرائے عالم گیر سے لکھا ہے

اس دفعہ ٹائٹل واقعی رمضان کے عین مطابق تھا۔ سب سے پہلے جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے پڑھا اور اس لائن پر ایسی اچھوتی سوچ کے خوب صورت ذہن کو سلام۔

وعلیکم السلام، ہاہاہا کیونکہ میرے خط لکھنے کے بعد ہی آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا ویسے مجھے تو اس سارے قصے میں بہن ش۔ م چکوال معذرت کے ساتھ کوئی قابل گرفت ظلم والی کوئی بات نہیں لگی۔ آپ کو انہوں نے ایک ہفتے بعد ہی علیحدہ کر دیا پھر کیا مسئلہ تھا۔ ہمیں تو ساتھ دیتے ہوئے بھی سسرال والے منہ لگانا پسند نہیں کرتے۔ عامر قریشی کی شادی کا پڑھ کر بڑا اچھا لگا ہم تو خط آپ کے بھی ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی کہانی ہو۔ اس طرح سب ہی بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

پھر سلسلے وار ناولوں کو پڑھا۔ "خواب شیشے کا" بہت اچھا لگا ہے۔ ابھی تو یہ ابتدائی مراحل میں ہے سب ہی کردار کھل رہے ہیں۔ اس لیے اس کا تفصیلی تبصرہ اینڈنگ پر کروں گی ویسے مجھے عفت طاہر صاحبہ بہت پسند ہیں۔

"سیاہ حاشیہ" کی تو لگتا ہے ایک یا دو قسطیں رہ گئی ہیں اور ام ایمان کا "خواہشوں کا سفر" مجھے کچھ متاثر نہیں کر سکا اس ٹاپک پر کئی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ پلیز ہر مہینے کوئی ہنسا دینے والی غموں سے نکالنے والی مزاحیہ تحریر ضرور شامل کیا کیجیے۔

تاریخ کے جھروکے میں۔ سبحان اللہ واقعی اللہ کی قدرت انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ پکوان تو اب ہم رمضان میں ہی ٹرائی کریں گے۔

آخر میں آتے ہیں "پیال ساز" کی طرف آپ نے شروع میں اتنی تعریفیں کر دیں میں پڑھ رہی تھی کہ سوچا پہلے اینڈ سے تو پڑھ لوں لیکن آگے باقی آئندہ منہ چڑا رہا تھا میں نے وہیں کہانی پڑھنی روک دی کہ اکٹھے دونوں کہانیاں پڑھ کر تبصرہ کروں گی ویسے ایمل اور سمیرا کی کہانیاں دو دفعہ پڑھ کر سمجھ میں آتی ہیں اس لیے سکون سے پڑھوں گی۔

ج۔ پیاری شازیہ! آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی۔ ہمیں تو کبھی بھی ایسا نہیں لگا کہ سمیرا حمید اور ایمل رضا کی کہانیاں اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ دو دفعہ پڑھ کر سمجھ میں آئیں۔ اور "پیال ساز" تو بہت اچھی کہانی ہے۔ آپ پڑھ کر ہمیں اپنی

رائے ضرور لکھیں۔

ث۔م چکوال کے سلسلے میں ہمیں بھی ظلم والی بات تو نظر نہیں آئی لیکن کوئی محبت یا لگاؤ بھی نظر نہیں آیا۔ مزاحیہ تحریر کی کمی ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری مصنفین نہ جانے کیوں مزاح کی طرف توجہ نہیں دیتیں۔

سعدیہ شہزین شہزل نے لکھا ہے

خواب شیشے کا عفت سحر طاہر کے خیالات اور قابلیت کو شاباش بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ پگھلتا موسم نایاب جیلانی۔ واہ کیا خوب لکھا ہے بہت زبردست لکھتی ہیں۔ "پیال ساز" مر گئے۔ پڑھ پڑھ کے مزہ آرہا تھا۔ زنل بہت صابر لڑکی ہے بہت اچھا لکھا۔ نظمیں اور غزلیں واؤ کیا خوب ہیں۔ حمد نعت نبی کی پیاری باتیں بہت اچھی تھیں "کھلتا کسی پہ" خالدہ جیلانی صاحبہ قسمت کی اچھی، کتنے سویٹ سویٹ شعر پڑھتی ہوں گی۔ اور ایک بات قارئین سے، مجھے بہت افسوس ہوا کہ سمیرا حمید کے ناول پہ بار بار ایک ہی لفظ پاکستان کیا چھوٹا ملک ہے پاکستان یہ ہے پاکستان وہ ہے پلیز قارئین یہ رائٹر کا اپنا ایک خیال اور اظہار ہوتا ہے۔ تمام قارئین نے تو حد کردی۔ کمال ہے اگر پاکستان سمیرا حمید کو پسند نہ ہوتا تو وہ یہاں نہ رہتیں۔ مجھے بہت افسوس ہوا میری ایک رائے ہے کہ رائٹر جو لکھتا ہے اچھا لکھتا ہے تمام ملکوں میں ہر چیز میسر نہیں ہوتی تو اس لیے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ آئندہ کسی رائٹر پر بلاوجہ منہ مت کھولیں۔

ج پیاری سعدیہ.... آپ کی یہ بات کہیں خالدہ جیلانی پڑھ ہی نہ لیں۔ جس قسم کے اشعار اور قارئین کی نظمیں اور غزلیں موصول ہوتی ہیں۔ ان پر خالدہ کا ایک ہی تبصرہ ہوتا ہے۔ "جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں" سمیرا حمید بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ اور ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بار مختلف انداز سے لکھتی ہیں۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

پہلی شعاع سر آنکھوں پر.... عید شعر کیا بھیجیں.... عید سروے میں تو حصہ لینے کے اہل ہی نہیں.... کیونکہ ہم نے کبھی عید نہیں منائی کہ ہماری تو ہر روز ہی عید ہوتی ہے.... ہمارا بس چلے تو ہر پل لکھتے پڑھتے رہیں۔ آج اتوار ہے اور شمع دو دن لاہور رہ کر کزن ثوبیہ (ڈاکٹر بن رہی ہے ہوسٹل سے) کے ساتھ آئی ہے.... اور ہم نے کچھ پکایا ہی نہیں.... کیونکہ رضا سے کہا سبزی لا دو.... نہیں لایا.... اور وہ ثوبیہ کے گھر سے کھا آئی۔ ساتھ ساتھ ایک پلیٹ چاول لے آئی.... میں نے اور اس کی دادی نے کھا لیے۔ رضا باہر سے ناشتہ کر آیا تھا۔ اب رات دیکھو.... تین دن کا سالن آلو کریلے اور انڈے چلتے ہیں یا بازاری.... وہ سو رہے ہیں اور ہم قلم سے کھیل رہے ہیں۔ میرے ابا سدا اعتکاف سے رہے۔ وہ لکھ کر ضروری بات کرتے تھے.... پہلے پتا چل گیا ورنہ میں رضا سے کہتی تھی تم کس طرح کا اعتکاف پر بیٹھے کہ اچھی باتیں سن بول لیں۔ (بس ایک بار بیٹھا تھا) ناتا جوڑا.... آپ نے ساس 'سانپ' پر اچھا جواب دیا۔ میرا ناتا کدھر گیا؟ شائع کیوں نہ ہوا۔ پورے نام سے شائع کرنا۔ "رقص بسمل" تو اب شروع ہوا۔ نبیلہ کی پھپھو کیسی ہیں۔ انہیں جلد شفا ہو.... سیاہ حاشیہ حسب حال جاری ہے۔

افسانے اپنی جگہ سب اچھے تھے۔ قانتہ خوب صورت نصیحت لائیں "اشک ندامت" حیا کا واقعی اپنا ناتا تھا؟ اچھا تھا.... اب تو ساس کے ساتھ "لڈو" کھیلتی ہے ناں۔ "محبت ہم سفر میری" نکاح کے دو بولوں میں بڑی طاقت ہے۔ سبق کانوں کے کچے مرد.... جگنو یادوں کے دوسرے لفظوں میں "یاد میلہ" "پیال ساز" بہت کردار ہیں جو سمجھنا مشکل ہیں.... کاٹ کاٹ کر پڑھا.... صرف زنل اور باسل اچھے لگے.... اگر ایمل رضا کا نام نہ ہوتا تو شاید ہم شروع ہی نہ کرتے....

"پگھلتا ہوا موسم" نایاب نے حسب روایت نایاب ہی لکھا.... نہ نہ کرتے بھی نمی آہی گئی آنکھوں میں "میری ماں" بہترین ماں بیٹی.... بہترین تحریر.... بہترین انداز بہترین شعر۔ غزل داغ دہلوی کی اول رہی۔ شعر سب ہی بہترین تھے۔ مسکراہٹیں نئے انداز کی اچھی لگیں۔ کوثر امجد آخری ایس ایم ایس پر ہنسی آگئی۔ باتوں سے خوشبو پر تبصرہ کروں تو صفحہ بھر جائے لہٰذا شکریہ کہنا ہی ٹھیک ہے۔
مطیع الرحمٰن دل میں سما گئے۔ تاریخ کے جھروکے زبردست شاہ فیصل میری پسندیدہ ہستی ہیں۔

ج۔ پیاری کوثر! معذرت خواہ ہوں، آپ کا ناتا جوڑا ہے ڈھیر سارے خطوط میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن ایک بار اور تکلیف کرلیں اور ہمیں دوبارہ لکھ کر بھجوا دیں۔

شعاع پر تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ حمد و نعت میں آپ کی باری ضرور آئے گی۔ تھوڑا سا انتظار کرلیں عید کیوں نہیں منائیں آپ؟ عید تو ہمارا مذہبی تہوار ہے اور رمضان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوب صورت تحفہ.... چلیں اس بار عید ضرور منائیں .... نیا جوڑا سلوائیں اور اچھے اچھے کھانے پکا کر خود بھی کھائیں اور گھر والوں کو بھی کھلائیں .... اور پھر اگلے سال ہمیں اس کا احوال لکھ کر بھجوائیے گا۔

اور رمضان المبارک میں تین دن کا باسی سالن وہ بھی آلو کریلے.... یہ تو ظلم ہے سراسر۔

فوزیہ ثمرہٹ' ہانیہ عمران اور آمنہ میر گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پاکیزہ تاثر دیتی معصوم سی ماڈل پیاری لگی۔ خاص کر سر پر دوپٹہ اوڑھنے کا انداز دل کو بھایا۔ کیا یہ اہتمام صرف رمضان کے احترام میں کیا گیا ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ گجراتیوں کا خط پڑھ کر سر مبارک میں درد جاگ جاتا ہے۔ اس لیے پاس رکھے ٹوکرے کی نذر ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھا' دو دو گڈ نیوز ۔ ایک تو ارم کی منگنی ٹوٹی اور دوسرا عدینہ کا عبداللہ سے نکاح۔

مکمل ناول خواب شیشے کا ابھی تو ابتدائی مرحلے میں ہے۔ عفت جی کے کیا کہنے یہ ہماری وکھری ٹائپ کی رائٹر ہیں۔ رقص بسمل اتنا مختصر کہ تشنگی اور بڑھ گئی۔

"پیال ساز" ایک خوب صورت اضافہ شعاع میں لفظوں کی جادوگری' نانو کا کردار گریس فل اور باتیں دل کو سحر کر دینے والی زمل کے بابا کا یقیناً" نانو سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہو گا۔

نگار کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر یونی کے ماحول میں تو لڑکیوں کو احتیاط برتنی چاہیے۔ پگھلتا ہوا موسم۔ معذرت کے ساتھ ذرا بھی متاثر نہیں کر سکا۔ اسماء کی سنگ دلی پہ غصہ آیا بہت۔

ڈوبتے کنارے بیسٹ آف دی منتھ تھا۔ یہ ناول۔

خوشیوں کا سفر ام ایمان نے معاشرے کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔

جب سے تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ جب سے شروع ہوا ہے بس عجیب ہی عجیب ہے۔ ختم کریں اس سلسلے کو کیوں لکھنے والیوں اور پڑھنے والیوں کو گناہ گار کر رہی ہیں۔ غیبت کرنا اور سنانا دونوں غلط ہیں۔ ایک ریکویسٹ ہے بندھن میں کبھی حمزہ علی عباسی کو بھی لائیں۔ ثنا عبدالقیوم کا خط مزے کا تھا۔ شاعری میں حمزہ اقرا کا شعر اچھا لگا۔

ج۔ پیاری فوزیہ ثمرہٹ! آپ نے کہاں سے سن لیا کہ گجراتیوں کے خطوط سے ہمارے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ اتنے پیارے پیارے خلوص بھرے خطوط تو ہمارے لیے ٹانک کا کام دیتے ہیں۔ اور یہ اچھا طریقہ نکالا ہے آپ سب نے ہمیں جذباتی طور سے بلیک میل کر کے خط شائع کروانے کا۔ کوئی دا سو نہر میں چھلانگ لگانے جا رہا ہے تو کوئی بے وفا پکار رہا ہے۔ کوئی ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ سنو لڑکیوں! بہت نازک دل ہے ہمارا۔ آپ کی ایسی باتوں سے بند ہو گیا تو؟

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ حقیقت پر مبنی سلسلہ ہے ۔ زیادتی کے خلاف آواز تو اٹھانی چاہیے نا؟ ظلم سہنے والا بھی اتنا ہی بڑا مجرم ہے جتنا ظلم کرنے والا۔ آخر یہ روایت ہمارے ہاں کب تک چلتی رہے گی کہ ایک لڑکی کو بیاہ کر لایا جائے اور پھر اس کو بہو تو کیا نوکرانی کا درجہ بھی نہ دیا جائے۔

عافیہ جہانگیر نے صادق آباد سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت زیادہ بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ سر پر دوپٹہ پہنے ماڈل بہت پاکیزہ اور نیچرل لگ رہی تھی۔

پلیز پلیز پلیز ادریدہ اور ارصم کو جدا مت کیجئے گا۔ کیونکہ مجھے یہ دونوں ہی بہت پسند ہیں اور ہاں اس بینش کے ساتھ تو بہت اچھا ہو رہا ہے۔ ام ایمان قاضی کا ناولٹ بہت سبق آموز تھا۔

ج پیاری عافیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ صائمہ تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔

✡

عید... شکر گزاری، خوشیوں اور محبتوں کا دن۔
عید کی روشن سہانی صبح طلوع ہوتی ہے تو ہر طرف خوشیوں کا سماں ہوتا ہے۔ چوڑیوں کی کھنک مہندی سے سجے ہاتھ، رنگا رنگ ملبوسات سے سجی ہنستی کھلکھلاتی لڑکیاں، نئے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اپنی دنیا میں مگن ہنستے کھیلتے بچے اور کچن سے اٹھتی کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں اس دن تو خاتون خانہ کو بھی سجنے سنورنے کا خیال آجاتا ہے اور ساری مصروفیات سے نمٹ کر تھوڑی سی توجہ خود پر بھی دی جاتی ہے اور پھر ایک تعریفی جملہ یا سراہتی نظر دل میں خوشیوں کے ان گنت پھول کھلا دیتی ہے۔
ہر خاندان، ہر گھر کی کچھ منفرد روایتیں ہوتی ہیں اسی طرح خوشی منانے کا انداز بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ شعاع کی قارئین کا حلقہ بہت وسیع ہے، اس کے قاری ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر صوبے، ہر زبان کے لوگ شعاع کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔ ان کی روایتیں اور خوشی منانے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔
اس بار ہم نے سروے میں اسی حوالے سے سوالات کیے ہیں۔

سوالات یہ ہیں

1۔ آپ عید کیسے مناتی ہیں؟
2۔ عید پر کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں
3۔ کیا آپ کے خاندان میں عید کے موقع پر کوئی روایتی ڈش بنتی ہے، اس کی ترکیب ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ ہماری قارئین عید کی خوشی کا اہتمام کیسے کرتی ہیں؟

کتنے رنگوں سے روشن ہے عید کا چاند

ادارہ

فائزہ بھٹی، پتوکی

(1) اگر آپ لوگ سوچتے ہیں کہ یہ لڑکی اپنی شاپنگ خود کرتی ہو گی تو یہ غلط فہمی کی انتہا ہے۔ میں اکیلی ہی نہیں بلکہ ہم بہنوں میں سے کوئی بھی اپنے لیے کچھ نہیں لیتی۔ سب کچھ ہماری امی جی لے کر آتی ہیں۔ اگر پسند آئے تو ٹھیک اور اگر نہ آئے کوئی بات نہیں، عید والے دن تک پسند آجائے گا۔ اور پھر واقعی ایسا ہوتا ہے، عید کے دن بخوشی امی کی دلائی گئی ہر شے خود پر آزمائی جاتی ہے۔
میں جہاں رہتی ہوں وہ کوئی بڑا گاؤں نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا پندرہ بیس گھروں پر مشتمل علاقہ ہے۔ جس میں ہم کزنز اور سیکنڈ کزنز رہتے ہیں اپنے والدین سمیت۔ تو عید کے دن تیار ہو کر چاچو کے گھر (یہاں اب پھوپھو رہتی ہیں) عید کی نماز کے لیے ہم سب کزنز اکٹھی ہوتی ہیں اور عین آخری وقت پر دوڑ لگا کر لائن میں کھڑے ہونا اور پھر سب سے پہلے سلام پھیر کر باہر کی جانب دوڑنا جہاں دوسری کزنز صحن میں انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ پھر ادھر ہی دکان سے سموسے، دہی بھلے لے کر چھین جھپٹ کر کھانا مزہ دوبالا کر دیتا ہے۔ امیاں ہر عید ہر نماز کے بعد گھورتی ہوئی آپ کو ملیں گی (دعا جو نہیں مانگی) اس کے بعد دیوار پار دوسرے چاچو کے گھر دھاوا بول دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری پھوپھو کے گھر کزنز نے ڈیرا جمانا اپنا فرض جانا ہوا ہے (اماں گھر جا چکی ہیں) ہنسنے ہنسانے، ہاتھ آگے کر کر کے ہر ایک کی مہندی دیکھنا اور پھر جب میری باری آئے تو ہر ایک کا ایک

ہی سوال۔

"تم نے آج پھر الٹے ہاتھ پر ہی ڈیزائن ڈالا ہوا ہے۔"

"تم نے یہ میرے نہیں ڈالا نا۔" کچھ کی حسرت بھری آواز آئے گی آپ کو....

"میرے علاوہ کسی اور پر اچھا بھی تو لگے نا.... یہ صرف میرے لیے بنا ہے۔"

میرے لبوں پر بکھرا تبسم بھی آپ کو بھلا لگے گا۔ ادھر سے پھر واپس گھر کی طرف کیونکہ ابا حضور میری چائے کے انتظار میں دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ (یہ فقرہ غلط تو نہیں ہے نا۔)

پھر آدھے گھنٹے بعد ہم لوگ چھت پر سے ماموں کی چھت پر چھلانگیں لگاتے ہیں۔ چھت سے چھت ملنے کا کوئی تو فائدہ ہو (شارٹ کٹ راستہ)

آپ ہمیں بالکل ہی نکما نہ سمجھیں۔ دوپہر اور رات کا کھانا ہم بہنوں کے ذمے ہی ہوتا ہے۔ امی اس معاملے میں آزاد ہیں۔

قصہ مختصر سارا دن ایسے ہی پھر پھرا کر شام کو کوئی اچھا سا پروگرام دیکھنا (جو پی ٹی وی والے ذرا کم ہی لگاتے ہیں) اور رات کو دعاؤں کی قبولیت کی امید لیے ریڈیو آن کرنا .... جس کے بعد کبھی کبھار ہی تھکن اترتی ہے ورنہ تھکن میں اضافہ ہونا زیادہ بڑی بات تو نہیں .... دوسرے دن ساری کزنز ہماری گھر آتی ہیں۔

(2) آپ نے سوال کیا میں نے اپنی پسند کا پہلو چن لیا۔ اب بتاؤں گی کہ خود کے لیے کیا اہتمام کرتی ہوں۔ چاند رات کو کاموں سے فارغ ہو کر ٹی وی یا ریڈیو لگا کر ہم بہنیں بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ مہندی لگائیں گی اور میں پہلے لپ اسٹک کے شیڈ چیک کروں گی کہ کون سا صبح اچھا لگے گا۔ خوب دل سے نیل پالش بھی لگاتی ہوں۔ بعد میں خوب اچھے اچھے گانوں کے ساتھ گنگناتے ہوئے پہلے اپنے الٹے ہاتھ پر مخصوص ڈیزائن بناؤں گی۔ پھر سیدھے ہاتھ پر لگاؤں گی اور پھر دوسرا ہاتھ عالیہ کے آگے کر کے اس سے بھی لگواؤں گی۔ (جی مہندی کا انتہائی شوق ہے)

صبح کو کاموں کے دوران اپنی مہندی کا رنگ سب کو دکھانا بڑا اچھا لگتا ہے (رنگ جو اتنا اچھا آتا ہے) دیوار پار اپنی خالہ کی بیٹیوں اور بہوؤں کو بھی دکھاؤں گی۔ (میں اکیلی نہیں سب ایسا کرتی ہیں پھر میرا تو ایک ہاتھ آگے ہونا بنتا ہے نا....)

میرا نہیں خیال آج تک کوئی عید ایسی گزری ہو جس میں میں نے مہندی نہ لگوائی ہو اور چوڑیاں نہ پہن رکھی ہوں۔ ہاں تو پھر لگی نا میں سب کو خوش و مطمئن (بظاہر) یہی تو سب چاہتی ہوں۔ میں خوش میرے گھر والے خوش۔

(3) معاملہ کچھ یوں ہے کہ میری سب کزنز کے گھر سویاں بنتی ہیں مگر ہمارے گھر میں سویاں کبھی بھی نہیں بنیں کیونکہ ہمارے گھر میں کوئی نہیں کھاتا۔ اس خاص صبح سویوں کے بدلے میں زردہ اور نمکین چاول ہر بار بنانا فرض ہے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے ہر کزن کو انتظار ہوتا ہے کہ کب ہمارے گھر سے ادھر چاول جائیں اور کب وہ اپنی پیٹ پوجا کر سکیں۔ ماموں، چاچو، پھوپھو لوگ بھی یہی پسند کرتے ہیں۔ پھر جیسے ہی چاول تیار ہوں، چاول بھری پلیٹیں اور دہی بھری کٹوریاں اور تازہ دودھ ان کے گھروں میں دینا ہمارا فرض ہوتا ہے۔

نہ کوئی خاص ڈش نہ کوئی خاص ترکیب۔ اب بھلا بتائیں ایسی کونسی ترکیب ہے جو آپ کو نہ پتا ہو پھر ایویں وقت کا ضیاع۔

ارم کمال.... فیصل آباد

(1) عید نام ہے رنگوں کا، مہکتی بہاروں کا، جگمگاتی مسکراہٹوں کا، ایک دوسرے سے گلے مل کر محبتیں ٹرانسفر کرنے کا اور دوسروں کے لیے اپنا دل وسیع کرنے کا۔ میں شعبان کے مہینے سے ہی تھوڑی تھوڑی تیاری شروع کر دیتی ہوں تاکہ تیاری بھی ہو جائے اور بجٹ بھی متاثر نہ ہو۔ لور لور پھرنا تو مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ اس طرح چاند رات تک تیاری ہو جاتی ہے۔ چاند رات کو گھر کی صفائی کرنا، سجاوٹ کرنا، کپڑے استری کر کے ہینگ کرنا، کچن میں عید کے لوازمات سے نبرد آزما ہونا پھر مہندی لگانا، صبح سب سے پہلے نماز پڑھ کر ناشتہ تیار کرنا، مرد حضرات کی نماز کے سلسلے میں مدد کرانا ان کو بھیج کر محلے میں سویاں اور زردہ بانٹنا ساتھ ساتھ سب کے عید مبارک کے فون آنے شروع ہو جاتے ہیں میرا ایک پاؤں کچن میں ہوتا ہے، ایک کمرے میں فون سننے کے لیے، اس ہلچل میں بڑا مزا آتا ہے پھر مہمانوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے ان کو اچھے سے سرو کرنا کمپنی دینا، کسی کو عیدی دینا، کسی سے عیدی لینا ان خوشیوں بھرے لمحات میں عید گزر جاتی ہے۔

(2) عید سے متعلق بہت سے خصوصی کام کرنے کا ہر سال ارادہ کرتی ہوں مگر ہائے یہ مہنگائی مجھ سے جیت جاتی ہے پھر بھی میں عید پر میں نئی بیڈ شیٹس 'صوفہ کورز' نئے دستر خوان 'تولیے ضرور خریدتی ہوں 'اس کے علاوہ کوکنگ کے لیے اسپیشل لوازمات جیسے چٹنیاں 'مسالے' سوسز' مہمانوں کے لیے بیکری آئٹمز' چنا چاٹ اور سوئیٹ ڈشز کا خصوصی اہتمام کرتی ہوں' جہاں تک اپنے سنگھار کا تعلق ہے تو پارلر جاکر فیشل' آئی بروز بنوانا اور چوڑیاں پہننے کا اہتمام صرف عید کے موقع پر ہی ہوتا ہے۔

(3) عید پر ہر گھر میں روایتی ڈشز بنتی ہیں اور اس کی ترکیبیں تقریباً" سب کو ہی آتی ہیں اس لیے اس کی ترکیب کا کیا لکھنا۔

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی' کراچی

(1) ہر عید پر میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر عید خوشی سے مناؤں؟ اداس نہ ہوں جبکہ چند سال پہلے میں بھی عید بہت اہتمام سے مناتی تھی مگر اب عید پر تو معیز بہت ہی زیادہ یاد آتا ہے..... ہنستی بولتی تو ہوں مگر میرا دل بہت اداس' ویران اور مغموم رہتا ہے۔ اس لیے عید پر اپنے لیے کوئی اسپیشل اہتمام نہیں کرتی۔ دل ہی نہیں کرتا.....

عید پر جب اکرم قبرستان جاتے ہیں تو میں بہت زیادہ بے قرار ہو جاتی ہوں۔ معیز اکرم سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے۔ مگر پھر صبر کرتی ہوں اللہ کی رضا کی خاطر.....

عید کی صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد قرآن پاک پڑھ کر معیز اکرم کو ایصال ثواب کرتی ہوں۔ کچن میں جاکر شیر خرما اور ناشتا تیار کرتی ہوں۔ بچوں کو تیار کرکے عید گاہ روانہ کیا۔ خود غسل کرکے نئے سوٹ زیب تن کرکے نماز عید ادا کی..... گھر (میکہ) والوں کو فون پر عید کی مبارک باد دی۔ دوستوں کو عید مبارک باد کے پیغامات سینڈ کیے اور پھر مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہتا ہے۔

میں عید پر کہیں بھی نہیں جاتی اب تو امی کے گھر بھی جانا موقوف ہوا..... (دل ہی نہیں چاہتا) یوں میرا پورا دن مہمان داری میں گزر جاتا ہے۔ یہ بھی دل کو لگانے کا اچھا بہانہ ہے۔ اکرم کی شکر گزار ہوتی ہوں جو کہ پورا خیال رکھتے ہیں کہ میں اداس نہ ہوں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ میں خوش رہوں۔

(2) عید پر میں اپنے گھر آنے والے عزیز' رشتہ داروں اور احباب کی خاطر مدارت اور تواضع کے لیے خصوصی اہتمام کرتی ہوں۔ طرح طرح کے مشروبات' کئی طرح کی سویٹ ڈشز اور کئی اقسام کے کھانے تیار کرتی ہوں.... یہ تہوار پر ہماری روایت بھی ہے اور اچھی مہمان داری کا حکم مذہب بھی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے سویٹ ہوم کی آرائش و زیبائش کے لیے بھی خصوصی اہتمام کرتی ہوں گھر کی ہر چیز نئی نکور اور گھر کا ہر کونا صاف ستھرا چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں پورے رمضان میں انتھک محنت کرتی ہوں۔

اپنے گھر کے علاوہ اپنے بچوں غنویٰ' اسود' عبدالمقیت کی عید کی تیاری کا بھی خصوصی اہتمام کرتی ہوں.... ان کی عید کی تیاری رمضان سے پہلے ہی شروع کر دیتی ہوں۔

عبدالمقیت (مومن) اور اسود رحمٰن تو بہت اسپیشل تیاری کرتے ہیں۔ عید کی نماز کا سوٹ' میچنگ سینڈل' پینٹ شرٹس' شوز' گھڑی' چشمہ' والٹ' نئی ٹوپی' رومال.... ہر چیز کے لیے بار بار بازاروں کی خاک چھاننا' غنویٰ کا بھی بہت خاص سوٹ سلوانا ساتھ میچنگ اشیاء خرید کر مجھے دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اکرم کی اور میری عید کی تیاری بہت سادہ ہوتی ہے۔ ہم اپنے لیے کوئی بھی خصوصی اہتمام نہیں کرتے۔ صرف گھر اور بچوں کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

(3) ہمارے خاندان میں عید پر کوئی ایسی خاص روایتی ڈش تو نہیں بنتی جس کا میں بطور خاص ذکر کروں.... مگر میٹھے میں امی کے گھر کھوئے والی کھیر اور سسرال میں بادامی شیر خرما ضرور بنتا ہے۔ ساتھ بریانی اور چکن کڑھائی.... عید پر میں تو بچوں کی پسند کو مد نظر رکھ کر میٹھی اور نمکین ڈشز بناتی ہوں۔ کسٹرڈ ٹرائفل' پلاؤ اور ساتھ شامی کباب عید پر ہمارے گھر بننے والی ڈشز ہیں۔

اسپیشل کسٹرڈ ٹرائفل

کسٹرڈ ونیلا اور اسٹرابری فلیور میں لے لیں۔ آدھا لیٹر دودھ میں اسٹرابری اور آدھا لیٹر دودھ میں ونیلا فلیور کا کسٹرڈ تیار کرلیں۔ دونوں کو بنا کر الگ الگ ٹھنڈا کرلیں۔

ایک کپ خشک میوہ جات (باریک کٹے ہوئے) لے لیں۔

ایک پیکٹ نیسلے کریم اور ایک ٹن کاک ٹیل فروٹ لے لیں۔ کسی بڑے پیالے میں پہلے ونیلا کسٹرڈ ڈالیں (ٹھنڈا ہونے کے بعد) اس پر کاک ٹیل فروٹ (آدھے) خشک میوہ جات (آدھے) آدھی کریم پھیلا دیں یہ تینوں چیزیں تہ در تہ بچھائیں پھر اوپر سے اسٹرابری کسٹرڈ پھیلا دیں۔ اور اوپر باقی بچے فروٹ، کریم اور آخری تہ خشک میوہ اور پسا ناریل ڈال کر تہ مکمل کر دیں۔ ٹھنڈا ہونے کے لیے فرج میں رکھ دیں (روزے کی حالت میں میرے منہ میں تو پانی آ گیا۔ آپ کے بھی آ جائے گا....) یہ میٹھا خوب ٹھنڈا کر کے مزہ دیتا ہے۔ اس عید پر ٹرائی کریں اور اپنے گھر والوں اور دوست احباب سے داد سمیٹیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

تسنیم کوثر..... کراچی

(1) پہلے سوال کا جواب کہ ہم عید کیسے گزارتے ہیں تو جناب ہم تو عید کو نہایت مسرت و فخر سے ویلکم کرتے ہیں۔ عید کا دن تو بے حد مصروف گزرتا ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے ہاں کچھ ڈسپلن ہے جس کی وجہ سے ہر کام وقت پر ہو جاتا ہے۔ عید کے دن کی ہڑبونگ جو اکثر گھروں میں ہوتی ہے ہمارے ہاں یہ سب نہیں ہے۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے تمام چیزیں ہم رات سے ہی تیار کر لیتے ہیں کیونکہ الحمد اللہ ہمارے ہاں مہمان بہت آتے ہیں اور جناب عید کی نماز کے بعد بچوں کو عیدی دیتے ہیں۔ آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات لذیذ شیر خرمے، دہی بڑے، چنا چاٹ، کباب، مٹھائی سے ہوتی ہے اور اس طرح عید کا دن خوشی خوشی گزر جاتا ہے۔

(2) دوسرے سوال کا جواب عید کا خاص اہتمام تو جناب عید کا اہتمام تو تقریباً ہر گھر ہی میں ہوتا ہے، جس میں عید کے خصوصی ملبوسات بچوں کے، چوڑی، مہندی، شوز وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہی سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔ ایک خاص اہتمام میں گھر کی مکمل صفائی کشن صوفوں کے کور تبدیل کرتے ہیں۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج کی سیٹنگ میں تھوڑا بہت ردوبدل کرتے ہیں اور خاص طور پر عید کے دن آنے والے مہمانوں کی تواضع کا بھی خصوصی اہتمام ہوتا ہے اور بس۔

(3) ہماری روایتی ڈش عید کے دن لذیذ ترین شیر خرما ہے

سمیعہ سحر قریشی..... ضلع بہاول نگر

(1) میری عید سب کی طرح خاص عید ہوتی ہے کیونکہ عید، عید ہوتی ہے۔ سب سے پہلے عید کی تیاری۔ جیولری ڈریس، جوتے اور چوڑیاں سب چیزیں میچنگ اور ہلکی پھلکی ہونی ضروری ہیں۔ عید آنے سے پہلے عید کی تیاری ہوتی ہے اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

(2) عید پر اہتمام میں خاص کر گھر کی صفائی، ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر سیٹ ہونی چاہیے۔
ماشاء اللہ سے بہنوں کے بچے۔ بھائیوں کے بچے، ہر جگہ بچے ہی بچے تو ہوئی نہ بچہ پارٹی۔ کسی کو جوس اور کسی بچے کو بوتل کسی بچے کو کھیر کھانی ہوتی ہے۔ عید آتی ہے لیکن تھکن ہو جاتی ہے۔

(3) جی ہاں۔ ہمارے گھر میں کھیر گرمی کی عید ہو چاہے سردی کی عید، پھر چاہئے اور اس عید پر میں بناؤں گی پسندے ان شاء اللہ۔ آپ کھائیں گی پیاری آپی؟ (آپ کھلائیں گی تو ضرور کھائیں گے سمیعہ)

سلمیٰ زبیر..... لاہور

(1) رمضان کا بابرکت مہینہ گزرنے کے بعد عید کی جو خوشی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو نئے کپڑے، نئے جوتے مہندی اور چوڑیوں والے ہاتھ۔ دوستوں کے گھر آنا جانا، مل کے عید کی نماز پڑھنا اس کے بعد سب سے بڑا اور اہم کام بڑوں سے عیدی وصول کرنا۔ ابھی میرا شمار عیدی لینے والوں میں ہوتا ہے اس لیے خوب پیسے بٹورتے ہیں پھر دوپہر میں بریانی اور چکن بنتا ہے۔ پیٹ پوجا کرنے کے بعد تھوڑا گھر کا کام کر کے کزن اور دوستوں کے گھر جاتے ہیں، کچھ گھر آتے ہیں ہمارا چھوٹا سا گاؤں ہے اور اس دن تو کوئی روک ٹوک نہیں کھل کے موج مستیاں کرتے ہیں۔

(2) ویسے تو عید کی ہر چیز ہی خاص ہوتی ہے۔ دو تین روزے جب رہ جاتے ہیں تو گھر کی صفائی کرتے ہیں پھر بازار کے چکر لگانا شروع ہو جاتے ہیں۔ چاند رات کو بس کپڑے استری ہوتے ہیں عید کے روز لائٹ کا کیا بھروسا! پھر سارے پھل منگواتے ہیں۔ عید کے پہلے روز تو گہما گہمی بہت ہوتی ہے۔ پھر دوسرے روز فروٹ چاٹ، دہی بڑے اور پکوڑے گھر پر ہی مابدولت بناتے ہیں اور وہ بھی "دسپر

ڈور پر، بس یہی اہتمام ہوتا ہے۔
(3) خاص ایسی ڈش تو نہیں جو ہر عید پر لازمی بنتی ہے ہاں ....! کچھ نہ کچھ ضرور بنتا ہے میری آپی آسیہ.... رس ملائی بہت مزے کی بناتی ہیں اس کی ترکیب۔

رس ملائی

اشیاء :

دودھ	ایک کلو
چینی	ایک کپ
خشک دودھ	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
گھی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

دودھ میں چینی الائچی اور بادام پستے ڈال کر ابال لیں خشک دودھ میں بیکنگ پاؤڈر انڈا اور گھی ملا کر گوندھ لیں ہاتھ چکنا کر کے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنالیں جب دودھ میں جوش آجائے تو درمیانی آنچ کر کے ساری گولیاں ڈال دیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلاتی رہیں دس منٹ بعد یہ پھول جائیں گی۔ دودھ گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں۔

عظمیٰ شفیق.... جڑانوالہ

(1) عجیب بات ہے کہ چاند رات کو جب عید کے دن کی پلاننگ کر کے سوؤں تو عید کا دن بور گزرتا ہے اور دل بھی اداس رہتا ہے۔ جب عید کا دن پلان نہ کروں تو عید کا دن بہت اچھا لگتا ہے۔

میں عید کے دن صبح پانچ بجے اٹھتی ہوں۔ نماز پڑھ کے اللہ کا شکر کرتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ عید پہ دل اداس نہ ہو۔

دوپہر بارہ بجے تک لگتا ہے کہ عید کا دن ہے بعد میں وہی عام روٹین۔ سب سے پہلے مزیدار سی دودھ والی سویاں بناتی ہوں۔ بچوں کو اچھا سا تیار کرنے کے دوران اونچی آواز میں نعت سننا بے حد پسند ہے۔ تیاری سے فارغ ہونے کے بعد میں اور میری دس سالہ بیٹی امائمہ عید کی نماز پڑھنے جاتی ہیں۔ شوہر پہلے ہی جاچکے ہوتے ہیں۔

پھر ناشتے کا دور چلتا ہے پھر بچے عیدی وصولتے ہیں تو اپنا بچپن بہت یاد آتا ہے۔ کچن کی صفائی وغیرہ کر کے ٹی وی

ہوتا ہے اور میں ہوتی ہوں۔ امی، بھائی، بہن، دادی، چچی سب لاہور میں رہتے ہیں تو عید کے دوسرے یا تیسرے روز لاہور جاتے ہیں۔ سب سے مل کر لگتا ہے کہ عید آئی ہے۔

(2) سچ بتاؤں میں عید کے دن خاص اہتمام کوئی نہیں کرتی، بس سادہ سی چکن کڑاہی چلتی ہے، باقی بازار کے لوازمات چلتے ہیں۔ عید کے پروگرام چھوڑنا مشکل امر ہے۔

(3) جب میں چھوٹی تھی تو نوٹ کرتی تھی کہ امی ہر چھوٹی عید پر تنجن بناتی ہیں اور وہ بھی نہایت مزیدار، اب شوہر میٹھے کے بہت ہی شوقین نکلے تو امی سے ترکیب پوچھی ویسے مجھے میٹھا بالکل پسند نہیں۔ سوائے چائے کے اور تنجن مزیدار لگتا ہے کیونکہ امی کی خاص ترکیب ہے آپ بھی نوٹ کرلیں کام آئے گی۔

تنجن

اجزا :

چاول	تین پیالی
تازہ دودھ	آدھا کپ
لونگیں	چار عدد
بادام	دس عدد
کشمش	دس عدد
چھوٹی الائچی	چھ عدد
چینی	دو پیالی
زردے کا اور سبز سرخ رنگ	حسب ضرورت
گھی	ایک پیالی
پانی	حسب ضرورت
نمک	ایک چمچہ

ترکیب :

کھلے برتن میں پانی ڈال کر لونگ، نمک ڈال دیں۔ جوش آجائے تو چاول ڈال کر 2 کنی تک ابال کر چھان کر رکھ لیں اس کے بعد چینی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اس کا شیرہ تیار کریں۔ چھوٹی الائچیاں بھی ڈال دیں پھر چاول ڈال کر اس میں سرخ سبز، زردے کا رنگ دودھ میں مکس کر کے ڈال دیں اوپر سے بادام، کشمش ڈال کر دم دیں پندرہ منٹ تک پھر ڈش میں نکال کر ابلے دو انڈے اور کھوئے سے سجا دیں۔ مزیدار تنجن تیار ہے مجھے اور میری امی کو دعا دیں۔

افشاں خان، عطیہ حق نواز..... شاہ پور چاکر

(1) اب تو عید سادگی سے ہی مناتی ہوں۔ وہ بچپن والا جوش و خروش تو اب خواب ہوا۔ ہاں بچوں کی خوشی دیکھ کر عید کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہم بھی حمدان اور وصی کے لیے بھرپور تیاری کرتے ہیں۔ اپنے لیے عید کی تیاری بس نئے کپڑوں تک ہی رہتی ہے۔

(2) ہمارے یہاں عید کی نماز کے فوراً بعد خاندان کے مرد حضرات کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے ساری تیاری صبح سویرے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے خاندان میں "پھولوں کی چاٹ" اور "شیر خرما" عید کی لازمی ڈشیں ہیں اور سب گھروں میں لازمی بنتی ہیں تو چاٹ میں بنا لیتی ہوں اور شیر خرما بھابھی۔ باقی بھی گھر کے سموسے بنا لیتے ہیں یا دہی بڑے اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک یا شربت۔

(3) روایتی ڈش تو ہماری "شیر خرما" ہی ہے۔ جب تک اماں تھیں تو وہ بہت لذیذ شیر خرما بناتی تھیں۔ لیکن اب تو ہم پیکٹ سے ہی بنا لیتے ہیں اور عید کے دن بریانی بھی لازمی بنتی ہے۔ اس کی ترکیب بھی آپ کو بریانی مسالا پیکٹ سے مل جائے گی۔ ہاہاہاہا

شازیہ الطاف ہاشمی..... شجاع آباد

(1) عید کا آغاز میاں صاحب کی تنخواہ ملنے سے ہوتا ہے دفتر سے واپس آتے ہیں پھر جلدی جلدی انہیں کھانا دے کر بازار کا رخ کرتے ہیں۔ فاطمہ، آمنہ پرجوش سرخ چہروں سے تتلیوں کی طرح اڑتی ہیں کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ آج ابو نے لمبی شاپنگ کروانی ہے۔ سب سے پہلے نفیس اور موسم کے حساب سے پیارے سے رنگوں والے کپڑوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اس کے بعد جوتے خریدتے ہیں پھر مرحلہ آتا ہے۔ چوڑیوں انگوٹھیوں کا، چار سالہ آمنہ اور چھ، سات سال کی فاطمہ زیورات کی وہ وہ ورائٹی پسند کرتی ہیں کہ ہنس ہنس کر نقاب اترنے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ لپ اسٹک لے دیں، امی یہ نیل پالش لے دیں اور اپنے قد سے بھی بڑے ہار پسند کرتی ہیں۔ اپنی اپنی چیزیں شاپر جوتے خود پکڑتی ہیں۔ کپڑے بھی ریڈی میڈ لیتی ہیں اور اپنی اپنی پسند سے لیتی ہیں۔ اس کے بعد کھانے کی باری آتی ہے جو پیک کروا لیتے ہیں۔ مہندی، چوڑیاں، تین چار چار ہیئر کیچ چوٹیاں، آمنہ کو اپنے بالوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ بہت چھوٹے گھنگھریالے بالوں میں پورا اسٹائل سجا لینا چاہتی ہے۔ مہندی لگوانے ہمسایوں کے گھر لے جاتی ہوں کیونکہ مجھے مہندی کے ڈیزائن بنانے نہیں آتے۔

عید کی صبح اللہ کا نام لے کر شروع ہوتی ہے۔ پہلے زردے کے چاول بھگوتی ہوں، جو میں بہت اچھا بناتی ہوں۔ زرد زرد میٹھا نرم زردہ پاس پڑوس میں بھجواتی ہوں پھر بچیوں کو ناشتا کرواتی ہوں کپڑے رات کو ہی استری کر کے رکھتی ہوں۔ گھر صاف ستھرا کرنے کے بعد فاطمہ آمنہ کو نہلاتی ہوں۔ انہیں تیار کر کے ایک خوب صورت سی "سیلفی" لیتی ہوں بلکہ بہت ساری سیلفیاں بناتی ہوں پھر وہ اپنے ابو سے عیدی لیتی ہیں۔

اس کے بعد میری تیاری کا ٹائم آتا ہے اور میں تیار ہو کر عیدی لیتی ہوں (بھئی میاں سے اور کس نے عیدی دینی ہے) چکن پلاؤ، مینگو شیک، مٹھائی (جو فریج میں ٹھنڈی ہونے کو رکھی ہوتی ہے) مزیدار پلاؤ کھا کر ہم چاروں "چل چلئے دنیا دے اوس نکرے" موٹر سائیکل پر باہر نکل جاتے ہیں نہر نہر آم آم کو گھورتی ہوں۔ نہروں کے پانی میں گوہر نایاب تلاشتی ہوں۔ اسی آوارہ گردی میں شام ہو جاتی ہے۔ پھر بوتلیں پی کر واپس آجاتے ہیں۔

(2) خاص اہتمام نئی نکور چادریں، نئے کپڑے، جوتے اور نئے برتنوں میں کھانا یہی خاص اہتمام ہوتا ہے۔

(3) خاندان میں تقریباً سب ہی زردہ ہی بناتے ہیں۔ اور زردہ بنانا ہر کوئی جانتا ہے اس لیے ترکیب نہیں لکھ رہی سادہ سے لوگ ہیں زردہ کھا کر خوش ہو لیتے ہیں۔

شازیہ قیصر۔ گاؤں نروال تحصیل سرائے عالمگیر

(1) تو جناب ہمارے ہاں تو عید کی تیاری رمضان میں ہی شروع ہو جاتی ہے لیکن کچھ سالوں سے رمضان گرمیوں میں آ رہے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ عید کی خصوصی اور تفصیلی صفائیوں سے رمضان سے پہلے ہی فارغ ہوا جائے۔

عید کے دن دل تو ویسے ہی خوش ہوتا ہے کہ سب اکٹھے ہوں گے۔ آج کل کے اس مصروف دور میں مل بیٹھنے والی محفلیں خواب ہی ہو گئی ہیں۔

عید کے دن میں صبح اٹھ کر فجر کی نماز ادا کرتی ہوں۔ مختلف سورتیں پڑھ کر میں قبرستان جاتی ہوں پھر واپس آ کر امی کے ساتھ سویاں بنانے میں مدد کرتی ہوں۔ برتن نکالتی

ہوں۔ بھائی میرے باہر ملک ہوتے ہیں۔ امی عید پر بھی اکیلی ہوں گی۔ یہ سوچ کر میں عید کرنے امی کے پاس آجاتی ہوں پھر میں، بچوں کو تیار کر کے عید گاہ/ مسجد بھیجتی ہوں اور خود بھی تیار ہو جاتی ہوں کیونکہ شوہر آتے ہیں ملنے' ویسے عید کا دن بہت ہی مصروف گزرتا ہے۔ میرا تو کام ہی برتن دھونا ہے۔ عید کے دن سسرال میں بھی اور میکے میں بھی کوئی نہ کوئی مہمان آتا رہتا ہے۔ اس کو بھی ساتھ ساتھ دیکھتی ہوں ویسے کوکنگ ساری میری امی کرتی ہیں۔ اس معاملے میں میں ٹینشن فری ہوتی ہوں۔

(2) عید پر خصوصی اہتمام تو میرے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ گھر بہت صاف ہو کیونکہ سب نے اکٹھا ہونا ہوتا ہے' میں تو رمضان میں ساری نئی بیڈ شیٹس' کورز' پردے نکالتی ہوں اور عید سے دو دن پہلے لگا لیتی ہوں۔ اور اپنے اور بچوں کے' امی کے کپڑے 29 روزے کو استری کر کے رکھ دیتی ہوں اور اپنے شوہر کے تو کپڑے استری کر کے میکے آتی ہوں۔ اپنے لیے خصوصی شاپنگ کرتی ہوں۔ میرے خیال میں عورتیں اپنے ساتھ بہت زیادتی کرتی ہیں کہ بچوں کے کپڑے بلکہ سب کے کپڑے لیتی ہیں اور خود کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

رات کو مہندی لگواتی ہوں۔ میرے شوہر کو مہندی اور مہندی کی خوشبو بہت پسند ہے اور خوب دل لگا کر تیار ہوتی ہوں لیکن اس دفعہ تو میں اتنی کنفیوژ ہوں کہ اتنی گرمی ہے۔ کیسے تیار ہوں گے۔

(3) ہماری پوری فیملی میں عید کے دن کھیر اور سویاں بنتی ہیں اور ہماری امی کے ہاتھوں کی کھیر بہت پسند ہے پوری فیملی کو اور میری دوستیں بہت تعریفیں کرتی ہیں۔ امی صبح پانچ بجے اٹھ کر کھیر چڑھاتی ہیں اور وہ دس بجے پانچ گھنٹوں میں تیار ہوتی ہے اور اس کا ٹیسٹ ایسا ہوتا ہے جیسے آپ کھویا کھا رہے ہوں اس میں میوہ بہت ڈالا جاتا ہے۔ جو میں انتیسویں روزے کو پیس کر رکھ دیتی ہوں۔ اس کی ترکیب یوں ہے۔

کھیر

اشیاء :

دودھ	5 کلو
چاول	آدھا کلو
چینی	حسب ذائقہ
میوہ	پسا ہوا بہت زیادہ

ترکیب :

چاول رات کو بھگو دیں اور صبح پیس لیں۔ دودھ کو ابالیں جب ابال آجائے تو اس میں آہستہ آہستہ چاول ڈالیں تاکہ گھٹلیاں نہ بنیں پھر آنچ آہستہ کر دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دیکھتی رہیں پھر اس میں چینی ڈالیں جب گاڑھی ہونے لگے تو مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے تھوڑا میوہ ڈالیں۔ جب گاڑھی ہو جائے اور اس کی یعنی دودھ کی رنگت چینج ہو جائے تو اتار لیں۔ ڈونگوں میں ڈالتے ہوئے میوہ مکس کریں پھر آخر میں ڈونگوں کے اوپر ڈالیں۔ بہت ہی مزیدار کھیر ہوتی ہے میرے تو منہ میں پانی آگیا۔

ہاں ایک اور بات اس کھیر کا دیگچہ دھوتے ہوئے مجھے آپ سب ضرور یاد کریں گے ہاہاہاہا۔ اس کے علاوہ سویاں۔ مٹھائیاں اور کیک ہوتے ہیں اور کولڈ ڈرنک سرو کی جاتی ہیں۔

طلعت ثناء۔۔۔۔ سیال شریف

(1) عید کے دن عام دنوں سے ہٹ کر تمام خاندان سے ملنا ملانا ہوتا ہے جو کہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں عید کے دن بچوں کو بھی صبح صبح نماز سے پہلے تیار کر دیتی ہوں۔ میاں صاحب بھی تیار ہو کر بچوں کے ساتھ نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں' کاموں سے فارغ ہو کر میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔

بچوں اور میاں صاحب کو بھیج کر کچن کی راہ لیتی ہوں کیونکہ ہر عورت کا عید کا دن تو کچن کے سنگ گزرتا ہے۔

عید کے دن میری خاص مصروفیت یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو جو عیدی ملتی ہے وہ میرے پاس جمع کرا دیتے ہیں اور پھر ہر تھوڑی دیر بعد اس کا حساب کتاب ہوتا ہے اور وہ اس جمع و تفریق میں اتنے ماہر اور حاضر دماغ ہوتے ہیں کہ کسی قسم کی ڈنڈی مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

عید کی رات کو جبڑوں میں شدید درد ہوتا ہے کیونکہ سارا دن بول بول کر اور ہنس ہنس کر منہ تھک جاتا ہے عید کے دوسرے دن پکنک پہ جانا اچھا لگتا ہے۔

(2) عید پر خصوصی اہتمام تو تفصیلی صفائی سے ہوتا ہے جو عید سے پہلے ہی کر لی جاتی ہے اور کچن کی بھرپور صفائی ہوتی ہے کیونکہ عورت کی عید تو کچن میں گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ پوری فیملی کے نئے کپڑے بناتی ہوں اور ہاں بیڈ

شیٹ اور گلاس بھی نئے منگوائے جاتے ہیں اور اگر پیالیاں ٹوٹ جائیں تو ٹی سٹ بھی نیا آتا ہے۔ گھر کو سجانے کے لیے ڈیکوریشن پیس بھی خریدے جاتے ہیں اور کھانے پینے کا تو خصوصی اہتمام ہوتا ہے تمام سامان عید سے پہلے منگوا لیا جاتا ہے۔ روسٹ کو مسالہ وغیرہ لگا کر رات کو فریج میں رکھ دیتی ہوں۔ کباب بھی ایک دن پہلے بن جاتے ہیں اور سویٹ ڈش بھی ٹھنڈی نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔ سوہ بھی ایک دن پہلے ہی۔ عید والے دن اور بکھیڑا بہت ہوتا ہے۔ عید پر میں پلاؤ بناتی ہوں اور کڑاہی گوشت بھی ہوتا ہے۔ تمام چیزیں کولڈرنک کے ساتھ سرو کرتی ہوں۔ مجھے جو کام سخت مشکل لگتا ہے۔ وہ ہے عید کے دن روٹیاں بنانا اور وہ بھی اس گرمی میں کیونکہ تندور تو بند ہوتے ہیں۔

مستحق لوگوں کو ضرور یاد رکھتی ہوں۔ اور عید والے دن کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ عید کی خوشیوں میں سب کو یاد رکھیں پلیز۔

(3) ہم پنجاب میں رہتے ہیں تو تقریباً" تمام پنجاب والوں کی ایک سی روایتی ڈشیں ہیں۔ حلوہ' پلاؤ' کوفتے' کباب تقریباً" تمام ملک میں کھائے اور پکائے جاتے ہیں۔ سب کو ان کی ترکیب پتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص روایتی ڈش نہیں جس کی ترکیب لکھوں۔

روزینہ نعیم' یاسمین نعیم۔ کھیالی گوجرانوالہ

(1) عید خوشی کا نام ہے۔ بچپن میں تو بہت ہی جوش اور جذبے کے ساتھ مناتی تھی۔ نئے کپڑے' نئی جیولری جوتے' ہر چیز خود بازار جا کر اپنی پسند سے لیتی تھی اور پھر عید والے دن صبح صبح اٹھ کر نہا کر تیار ہو کر (پورے میک اپ) کے ساتھ اپنی دوستوں کا انتظار کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ اب تو جی عید تھوڑی سی بور ہی گزرتی ہے۔ تو جی سب سے پہلے تو عید کی آمد کے لیے گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ آپی کے ساتھ مل کر عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے پوری گلی میں سویاں بانٹتے ہیں جو کہ ہر دفعہ میری پیاری امی ہی بناتی ہیں خوب مزے دار۔ اس کے بعد دادی' چچی لوگ ملنے آتے ہیں اور عیدی دے کر جاتے ہیں جو میں ملتے ہی اپنے پرس میں سنبھال لیتی ہوں۔ دینے کی نوبت ابھی تک آئی نہیں کیونکہ ابھی تو ہم چھوٹے ہیں جی اور حوریم' احمد' علی' حمین' جنت کو تو ابو ہی عیدی دیتے ہیں اور ہمیں بھی۔

(2) عید کا اہتمام تو کپڑوں سے ہی کرتے ہیں۔ آپی بازار جا کر لا دیتی ہیں اور ہم پہن لیتے ہیں۔ چاند رات کو کپڑے پریس کر کے رکھ دیے جاتے ہیں اور پھر باری آتی ہے مہندی کی تو وہ میں اور یاسمین مل کر ایک دوسرے کو لگا دیتے ہیں ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ رات کے ایک بجے تک (میری فرمائش پر) ابو جی صبح کے لیے دودھ لا کر رکھتے ہیں اور پھر یاسمین کے ہاتھ جوڑنے کے بعد ہم چھت پر سونے کے لیے چلے جاتے ہیں۔

صبح اٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ امی ابو اور بھائی سے عید ملتے ہیں۔ تھوڑی سویاں کھاتے ہیں' تھوڑا ٹی وی دیکھتے ہیں اور پھر باری آتی ہے دوستوں کے گھر جانے کی۔ ہائے دوستوں کو تو بھول ہی گئی' تو جی انہیں موبائل سے عید کے میسج بھیجتے ہیں۔ آپی' پھوپھو' خالہ' ماموں سب کے فون آتے ہیں اور ہم ادھر ادھر ہو جاتے ہیں کہ کہیں ہم کو بات ہی نہ کرنی پڑ جائے (شرماتے ہیں جی اور تو کوئی بات نہیں) دوستوں کے گھر جاتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ عیدی لیتے ہیں اور پھر ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم اپنے پیارے رسالوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کیونکہ بوریت دور کرنے کا بہترین طریقہ ہے اور باتیں بھی سنتے ہیں کہ عید کے دن بھی ان ڈائجسٹوں کی جان نہ چھوڑنا۔

(3) روایتی ڈش تو کوئی خاص نہیں ہے۔ بس امی صبح اٹھ کر سویاں بناتی ہیں' جو ہم سب کھاتے ہیں۔ یہ ہے کہ ہم لوگ چاند رات کو آلو انڈے بناتے ہیں یہ روایت ہے ہمارے گھر کی کیونکہ عید والے دن صبح میٹھا کھانے کے بعد یہ ضرور کھائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ چنے کی چاٹ' پاپڑی چاٹ یا پھر دہی بڑے بناتے ہیں اور بھائی بازار سے نمکو' کیک' بوتلیں' مٹھائی وغیرہ لاتے ہیں۔

بقیہ دستک

حیران ہی رہ گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ ایک موبائل کمپنی کی طرف سے آئے تھے اور میری تصاویر لینا چاہتے تھے۔ بس یہیں سے قسمت کھلی اور بس۔"

"او کے سعدیہ آپ کا "خدا اور محبت" سیزن ٹو آئے گا تو پھر ان شاء اللہ بات کریں گے۔"

علی رحمٰن

"کیا حال ہے علی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"دیار دل" کو بہت ایوارڈ ملے۔ آپ کو بھی۔ بہت مبارک ہو۔"

"شکریہ۔ واقعی اتنی پذیرائی ہوگی۔ یقین نہیں تھا۔ اور مجھے اپنے ایوارڈ کی بھی بہت خوشی ہے۔ حالانکہ میرا تو اتنا زیادہ کام نہیں تھا۔"

"مگر جتنا بھی تھا شان دار تھا۔ بہت کمال کی اداکاری کی تھی آپ نے اور آپ واقعی بہت کمال کے فنکار ہیں۔ اللہ سلامت رکھے آپ کو۔"

"بہت شکریہ آپ کا۔"

"اب کافی عرصے سے غائب ہیں۔ کہاں ہیں؟"

"کہیں غائب نہیں۔ ڈراموں سے آج کل تھوڑا دور ہوں کیونکہ فلم کی پروموشن چل رہی ہے۔ "جانان" اور "یلغار" کی ان دونوں فلموں میں اگرچہ میرا بہت بڑا رول نہیں ہے مگر اچھا رول ہے۔ بس یہ ہو جائے تو پھر ان شاء اللہ ڈراموں کی طرف توجہ دوں گا۔"

"اور رمضان المبارک کیسے گزرے؟"

"اچھے۔۔۔ بہت اچھے۔"
"عید کے موقع پر خرچ کرتے ہیں۔"
"کرتا ہوں۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔"
"آج کل کہاں ہیں؟ ملک کے اندر یا باہر۔"
"آج کل تو پاکستان میں ہی ہوں۔ فلموں کی وجہ سے۔ بس جلد از جلد کام مکمل کروانا چاہتا ہوں۔"
"چلیں ٹھیک ہے پھران شاءاللہ بات کریں گے۔"
"اوکے' جی۔"

ماہا وارثی

"کیا حال ہے ماہا۔ آج کل اسکرین سے غائب ہو؟"
"اللہ کا شکر ہے۔ اور تھورا وقفہ خود ہی دیا ہے۔ کیونکہ ہر وقت اسکرین پر رہنا اچھا نہیں لگتا۔ اور ابھی حال ہی میں تو میرے سارے سیریلز ختم ہوئے ہیں۔ جیسے "مان" اور "گزارش" تو سوچا۔ تھوڑا وقفہ دوں۔ تاکہ لوگ مجھے یاد تو کریں۔"
"آج کل کہاں ہو۔ ٹورنٹو میں یا پاکستان میں۔"
"آج کل میں اپنے والدین کے ساتھ ٹورنٹو میں ہوں۔ اور بہت مزے کررہی ہوں۔"
"عید کی شاپنگ کرلی۔"
"میں کہاں کرتی ہوں۔ میری عید کی ساری شاپنگ امی کرتی ہیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں ہوتا کہ کیا کیا تیاریاں کررہی ہیں امی۔ ہاں البتہ چھوٹے بھائی کے لیے میں تھوڑی بہت شاپنگ ضرور کرتی ہوں۔ اپنے لیے بھی کرتی ہوں۔ مگر عید کے لیے نہیں۔ وہ امی کا کام ہے۔"
"پاکستان میں کس کے پاس رہتی ہو۔"
"کراچی میں ہوتی ہوں تو گیسٹ ہاؤس میں اور لاہور میں ہوتی ہوں تو پھر اپنے چچا کے گھر رہتی ہوں۔"
"اوکے ماہا۔ پھر بات کریں گے۔"
ان شاءاللہ۔

سدھارے، جی ہاں! انہیں بھی بالآخر بھارتی فلم میں کام مل گیا۔ (بھئی ہمارے فن کار بھارتی فلم ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہیں۔) عدنان صدیقی فلم "مام" میں سری دیوی کے شوہر کا کردار کررہے ہیں۔ فلم کی کہانی تو سری دیوی کے گرد ہی گھومتی ہے۔ (یہ ہی چالاکی ہے ان کی کہ....؟) جو اپنی سوتیلی بیٹی پر ظلم کرتی ہے اور یہ سوتیلی بیٹی بنی ہے سجل علی.... سجل علی اس فلم میں سری دیوی کی سوتیلی بیٹی کا کردار ادا کررہی ہیں۔ سجل کی یہ بولی وڈ میں پہلی فلم ہے۔ عدنان صدیقی پاکستان میں ٹی وی کے ایک منجھے ہوئے مقبول ترین اداکار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان ٹی وی کا یہ ہیرو بھارتی فلم کے پردے پر کیا جوہر دکھاتا ہے۔ (سجل علی اور عدنان صدیقی، فواد خان کی طرح اپنے آپ کو بھارتی انڈسٹری میں منواتے ہیں یا پھر..... بھئی گھر کو آتے ہیں؟)

آپ سے کیا پردہ

واصفہ سہیل

مناسب

صنم جنگ کا کہنا ہے کہ اگر ٹی وی فن کار فلموں میں کام کرتے ہیں تو یہ فلموں کی ترقی کے لیے بہت اچھی بات ہے۔ لیکن میں ابھی اپنے آپ کو فلم کے لیے مناسب نہیں سمجھتی۔ (بالکل صنم! آپ فلم کی اداکارہ ہیں بھی نہیں۔) ویسے اگر کوئی اچھا اسکرپٹ ملا تو فلموں میں بھی کام کرلوں گی۔ (یعنی ابھی تک جو لوگ کام کررہے ہیں ان کا اسکرپٹ..... بھئی اچھا نہیں ہے نا۔) مگر میرے فین چاہتے ہیں کہ میں صرف ابھی مارننگ شوز تک ہی محدود رہوں۔ (صنم یہ فین وہی تو نہیں جن کی زندگی میں آپ ابھی کچھ عرصہ قبل شامل ہوئی ہیں اور جو رہتے بھی آپ کے گھر میں ہیں یا آپ ان کے.... بھئی شوہر بھی تو فین ہو سکتا ہے نا۔)

جوہر

لیجیے جناب عدنان صدیقی بھی بھارتی فلموں کو

مشورہ

لگتا ہے عمران عباس کے پاس آج کل کچھ کام نہیں ہے' جب ہی وہ لوگوں کو درخت لگانے کے مشورے دے رہے ہیں۔ (ویسے یہ کوئی بری بات نہیں... بھئی درخت لگانا؟) عمران کہتے ہیں کہ.... "یہ موسم آم' جامن اور دیگر پھلوں کا ہے۔ میری آپ سے (جی ہم سے نہیں بھئی عوام سے....) گزارش ہے کہ جو بھی پھل کھائیں اس کے بیج پھینکیں نہیں۔" (کیا مطلب ہے بھئی... یعنی... اوہ....) بلکہ انہیں پلاسٹک بیگ میں سنبھال کر اپنی گاڑی میں رکھ لیں.... (اور اگر گاڑی نہ ہو تو....؟) جب بھی آپ گھر سے باہر نکلیں اور کوئی ایسی جگہ دیکھیں جو خالی ہو' وہاں ان بیجوں کو بو دیں۔ (اور اگر کسی نے زمین کھودتے دیکھ کر دھر لیا تو....؟) مون سون کی بارشیں بھی ہوں گی جو انہیں اگنے میں مدد دیں گی۔ اس طرح ہم کتنے زیادہ درخت اگا سکتے ہیں۔ (مذاق سے قطع نظر عمران عباس کا مشورہ برا نہیں بلکہ بہت اچھا ہے۔)

مصروفیت

اب کیا کریں ہم کہ فواد خان آج کل اتنے اِن ہیں کہ ہمیں ان کی کوئی نہ کوئی خبر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ ہی دیکھیں اب فواد خان بولی ووڈ کے مقبول ایوارڈ "آئی فا" 2016ء کی میزبانی بھی کریں گے۔ جو چوبیس جون کو اسپین کے شہر میڈرڈ میں منعقد کی جائے گی۔ فواد خان کے ساتھ کرن جوہر بھی اس شو کی میزبانی کریں گے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ "کپور اینڈ سنز" کے ہدایت کار شکن بٹرا اور پروڈیوسر کرن جوہر جلد ہی فواد خان کے ساتھ ایک اور فلم بنانے والے ہیں' اس سلسلے میں ان کی ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ فواد خان کرن جوہر کی فلم "اے دل مشکل ہے" میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یعنی پاکستانی فواد خان بھارتی فلم انڈسٹری میں بہت مصروف و مقبول ہیں۔
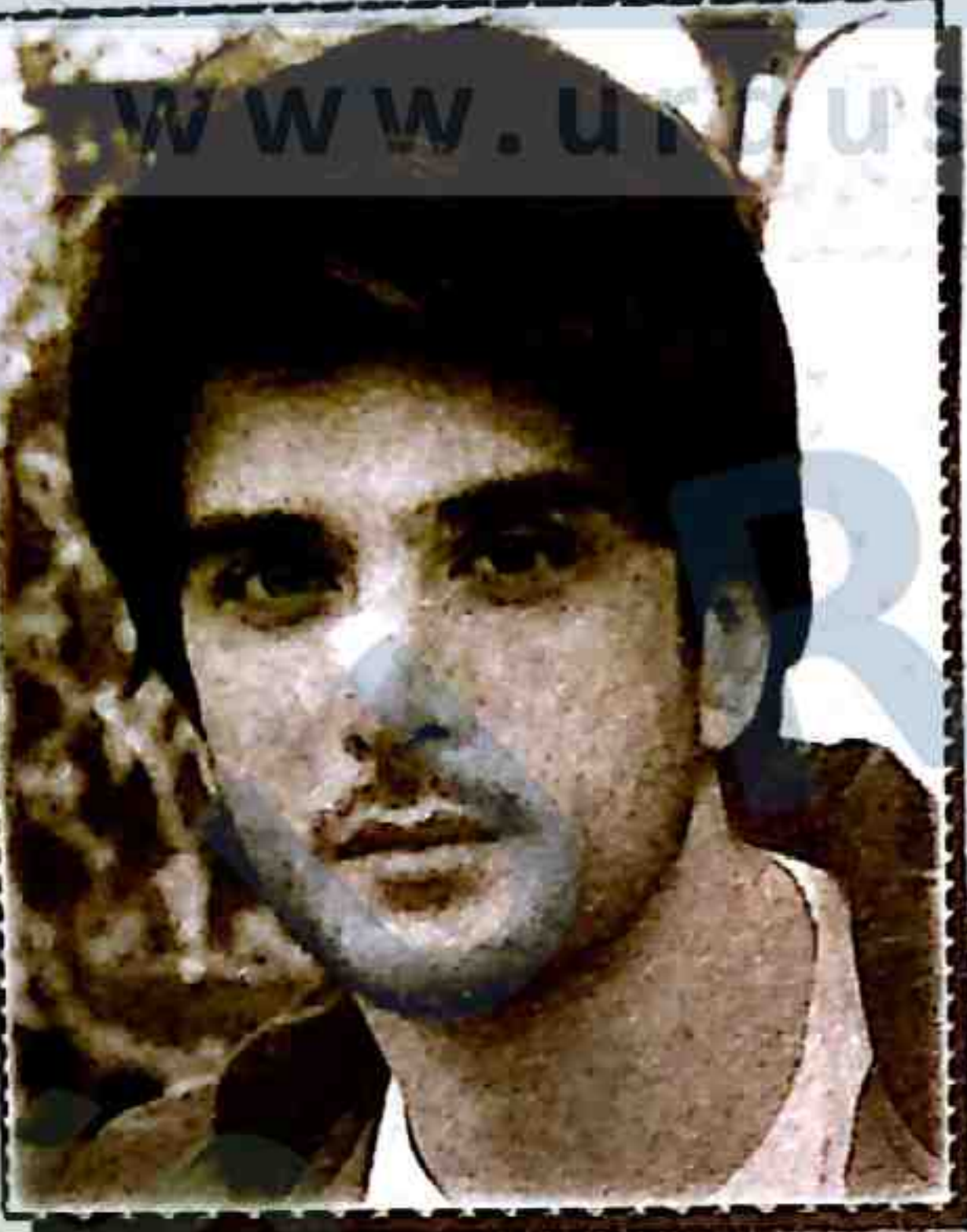
کچھ ادھر ادھر سے

جامعہ کراچی شعبہ اردو کے استاد یونس حسنی نہیں بھولتے' ایک دن کہنے لگے۔

"ہندوؤں کی تنگ نظری ان کے رہن سہن سے بھی جھلکتی ہے۔ ان کے قدیم مقدس مقامات' گھروں اور مندروں کو دیکھو' چھوٹے چھوٹے کھولی نما تنگ و تاریک کمرے اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں' دروازے ان کی سوچ اور تنگ نظری کی عکاس ہیں۔"

(سیلانی.... دیکھتا چلا گیا)

ڈاکٹر عبدالقدیر سے سوال کیا گیا کہ آپ نے مشرف کے دباؤ میں آکر ٹی وی پر اعترافی بیان کیوں پڑھا' تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"بصورت دیگر میرا حشر ذوالفقار علی بھٹو والا کیا جاتا تھا' جس کا مجھے علم ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا' جس کے دوران مجھے وہ سب بتانا پڑتا جس سے پاکستان کو مشکلات پیش آتیں۔"

(فاروق اقدس.... سیاست پارے)

سال میں تین تین نوکریاں بدلنے والے اینکرز' جید صحافی یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کسی انسان کی جذباتی نظریاتی وابستگی کیا بلا ہوتی ہے۔

(سوشل میڈیا)

مہندی کے ڈیزائنز

ادارہ

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپیشل کباب

اجزا :

قیمہ	ایک پاؤ
انڈے	دو عدد
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی پیاز	ایک عدد
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
بیسن	ایک کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
باریک کٹا ہوا دھنیا	حسب ضرورت
باریک کٹی ہری مرچ	حسب ضرورت

ترکیب :

پہلے انڈوں کو پھینٹ لیں۔ اب ایک پیالے میں انڈے میں نمک ملا کر گرم تیل میں تل کر ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ اس کے بعد قیمے کے اندر انڈے اور تمام اجزا ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب انہیں کباب کی شکل دے کر فرائی کرلیں۔ اسپیشل کباب تیار ہیں۔

بوہری فرائیڈ چکن اسٹکس

اجزا :

بون لیس چکن	دو کپ
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
باریک کٹی ہری مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ

کوٹنگ کے لیے اجزا :

انڈے	دو عدد
بیسن	دو چائے کے چمچے
بریڈ کرمبز	ایک کپ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

چکن میں اوپر دیے ہوئے تمام اجزا شامل کر کے تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب انہیں اسٹکس پر لگائیں۔ اب انڈے اور بیسن کو ملا کر آمیزہ تیار کرلیں۔ چکن اسٹکس کو آمیزے میں ڈپ کریں۔ پھر بریڈ کرمبز میں رول کر کے دوبارہ آمیزے میں ڈبو کر تل لیں۔

شاہی قلفہ

اجزا :

دودھ	ڈیڑھ کلو
چینی	تین چوتھائی کپ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
کھویا	ایک کپ
کنڈینسڈ ملک	چار کھانے کے چمچے
چھوٹی الائچی	ایک چائے کا چمچہ
کریم	دو سو گرام
بادام اور پستے	چار کھانے کے چمچے
کیوڑا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

دودھ کو چینی کے ساتھ اتنا پکائیں کہ ایک کلو رہ جائے۔ اب اس میں کارن فلور کا پیسٹ ڈال کر گاڑھا کریں۔ پھر اس میں کھویا ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ آمیزے کو نکال کر ٹھنڈا کریں۔ اب اس میں تمام اجزا

ڈال کر چمچے سے اوپر نیچے کریں اور سانچے میں نکال کر جمنے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر قلفہ نکال کر سلائس کاٹیں اور پیش کریں۔

اچاری بریانی

اجزا :

چکن	ایک کلو
نمک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چھ عدد
دہی	ایک کپ
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
تلی پیاز	آدھا کپ
ٹماٹر	تین عدد
تیل	آدھا کپ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
چاول	آدھا کلو
کیوڑا	ایک کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی

اچاری اجزا:

کلونجی اور رائی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
میتھی دانے	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
تیزپتا	آدھا

ترکیب :

چاولوں کو صاف کر کے بھگو دیں پھر الگ سے ایک دیگچی میں ثابت گرم مسالا، ادرک لہسن کا پیسٹ ٹماٹر کاٹ کر چکن میں ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ اب اس میں تلی پیاز، دہی، نمک، پسی لال مرچ، ہلدی اور ہری مرچ ڈال کر ڈھانک دیں اور دس منٹ پکنے دیں۔ پھر اس میں اچاری مسالا ڈال کر اتنا پکائیں کہ پانی خشک ہو جائے۔ اب الگ سے چاولوں کو ابال کر نتھار لیں۔ اس کے بعد چاول اور مسالے کی تہہ لگاتے جائیں ایک ایک کر کے پھر اوپر کیوڑا اور زردے کا رنگ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ اچاری بریانی تیار ہے۔ پیش کرنے سے پہلے چاولوں کو اوپر نیچے کر کے ملا لیں۔

چاکلیٹ کریم کیک

اشیاء :

انڈے	چار عدد
آئسنگ شوگر	ڈھائی کپ
میدہ	تین چوتھائی کپ
فریش کریم	ڈیڑھ کپ
ایسنس	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
چاکلیٹ	ایک چاکلیٹ بار
کوکو پاؤڈر	چار چمچے

ترکیب :

ایک پیالے میں انڈوں کی زردی، آدھی آئسنگ شوگر اور ایسنس ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں کہ آمیزہ مکھن کی طرح ہو جائے۔ ایک علیحدہ پیالے میں انڈوں کی سفیدی کو اتنا پھینٹیں کہ پیالہ الٹا کرنے پر وہ گرے نہیں، پھر اس میں بقیہ آئسنگ شوگر، کوکو پاؤڈر اور میدہ ملا کر اچھی طرح پھینٹیں کہ آمیزہ یکجان ہو جائے۔ سانچے میں مکھن لگا کر بٹر پیپر بچھائیں۔ اس پر تھوڑا سا مکھن لگائیں اور آمیزہ ڈال دیں اور پہلے سے گرم اوون میں بیس سے پچیس منٹ تک بیک کریں۔ کیک تیار ہو جائے تو اسے نکال کر تھوڑا ٹھنڈا ہونے پر بیچ میں سے دو حصوں میں کاٹ لیں۔ ایک حصے میں کریم اور چاکلیٹ کو پگھلا کر ڈال دیں، پھر دوسرا حصہ ڈھک دیں۔ کریم سے کیک کو چاروں طرف سے اچھی طرح پھیلا کر ہموار کر لیں۔ پھر چاکلیٹ سے اس کی سجاوٹ کریں اور فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

اُدارہ

حسن و صحت اور کھانے

عید کی تیاری

فیشل

فیشل 'چہرے کو کسی کلینزر سے اچھی طرح صاف کرنے کا عمل ہے 'جس سے جلد میں ایک نئی قوت حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ مارکیٹ میں مختلف قسم کے فیشل دستیاب ہیں۔ فیشل اعصابی تناؤ کے لیے بہت مفید ہے۔

عید سے ایک دن پہلے چاند رات کو آپ فیشل کریں' عید کے دن آپ کا چہرہ ترو تازہ اور خوب صورت نظر آئے گا۔

فیشل کے لیے کسی اچھی کریم سے چہرے کا ہلکا سا مساج کریں۔ اب کسی برتن میں کھولتا ہوا پانی ڈالیں اور اس میں اپنی پسندیدہ خوشبو کی جڑی بوٹیاں یا تیل یا پھر پودینے کی چند پتیاں ڈال دیں۔ چہرے اور گردن کو تولیے سے خوب اچھی طرح سے ڈھانپ لیں اور بھاپ لینا شروع کر دیں۔ برتن سے آپ کے چہرے کا فاصلہ کم از کم دو فٹ ہو 'خوب اچھی طرح پسینہ آجائے تو تولیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کرلیں۔

ایسی خواتین جن کی جلد خشک اور پختہ ہے وہ اپنے چہرے پر کولڈ کریم 'نائٹ کریم یا تیل کی ہلکی مالش کریں۔ حتیٰ کہ کریم یا تیل جلد میں پوری طرح جذب ہو جائے۔ عام طور پر مالش کا عمل بیس سے پچیس منٹ تک کیا جاتا ہے۔ مالش سے جلد پر صحت مندی اور رونق نظر آنے لگتی ہے۔

ماسک

ماسک کے بغیر کوئی فیشل مکمل نہیں ہوتا۔ تیار ماسک بازار میں بھی دستیاب ہیں۔ اپنی جلد کے مطابق آپ ماسک خود بھی تیار کر سکتی ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ ماسک چہرے پر سب جگہ برابر لگانا چاہیے۔

یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ماسک آنکھوں 'نتھنوں اور ہونٹوں پر نہ لگے۔ ماسک تقریباً" دس سے پندرہ منٹ چہرے پر لگانا ضروری ہے 'اس کے بعد اسے روئی کی مدد سے نیم گرم پانی سے صاف کیا جائے۔

ماسک اپنی جلد کی ساخت کی مناسبت سے استعمال کرنا چاہیے۔ جلد کی تین اقسام ہوتی ہیں۔ چکنی جلد۔ نارمل جلد۔ خشک جلد۔ آپ اپنی جلد کے مطابق ماسک لگائیں۔

چکنی جلد کے لیے ماسک :

پپیتے کا گودا لے کر اس میں آدھے لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو بیس منٹ کے لیے چہرے پر لگالیں۔ یہ جلد پر نمودار ہونے والے اضافی تیل کو روکے گا۔

خشک جلد کے لیے ماسک :

خشک جلد کے لیے ضروری ہے کہ اس کو باقاعدگی سے موئسچرائز کیا جائے۔ چہرے کو کبھی رگڑیں نہیں 'بلکہ ہلکے سے تھپتھپا کر خشک کریں۔

ایک چمچہ شہد 'ایک چمچہ زیتون کا تیل اور لیموں کے رس کے چند قطرے لے کر اس کو ملالیں 'اب اس کو چہرے پر آدھے گھنٹے کے لیے لگالیں پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔ خشک جلد ترو تازہ ہو جائے گی۔

نارمل جلد کے لیے ماسک :

ایسی جلد پر ہمیشہ پھلوں کے ماسک استعمال کریں۔ کیلے کو میش کرلیں۔ اس میں شہد یا لیموں کا رس ملا کر بیس منٹ چہرے پر لگا رہنے دیں 'پھر پانی سے دھولیں۔

میک اپ

عید چونکہ موسم گرما میں آرہی ہے۔ اس لیے آپ عید کے دن میک اپ میں جو اشیاء استعمال کریں وہ واٹر پروف ہوں تاکہ پسینہ آنے کی صورت میں میک اپ بہہ کر چہرہ خراب نہ کرے۔ لیکوئڈ آئی شیڈو لگائیں۔ مسکارا اس طرح سے لگائیں کہ آپ کی پلکیں ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں۔

ہونٹ

موسم گرما میں ہونٹ بھر کر لپ اسٹک لگائیں۔ اچھی اور معیاری کمپنی کی لپ اسٹک استعمال کریں جو گرم اور مرطوب ہوا میں بھی ہونٹوں پر برقرار رہے اور ہونٹوں کو جاذب نظر رکھے۔ اچھی پروڈکٹس کے استعمال سے ہونٹ دیر تک نرم رہتے ہیں۔